امام ابو حنیفہؒ، امام ابو مالکؒ،
امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ
کے حالات و واقعات زندگی

# سفیرانِ حرم

آئمائے کرام کی خدمت میں
جان آصف (مرحوم)
کا اظہار عقیدت

# فہرست


| | صفحہ نمبر |
|---|---|
| ستارہ علم وادب | 6 |
| امام ابو حنیفہؒ (امامِ اعظمؒ) | 11 |
| امام ابو مالکؒ (امامِ مدینہؒ) | 47 |
| امام شافعیؒ (سفیرِ حرم) | 115 |
| امام احمد بن حنبلؒ (سفیرِ رسول) | 375 |

# ستارہ علم وادب

یہ ستمبر 2003ء کی بات ہے جب میں نے خان صاحب کو فون کیا۔ بہت عرصہ ہو گیا تھا ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کچھ میری مصروفیات، کچھ خان صاحب کے اوقاتِ ملاقات! الغرض ملنا ملانا تو بالکل ہی مفقود ہو کر رہ گیا تھا۔ بس کبھی کبھار انہوں نے فون کر لیا یا میں نے۔

فون پر آواز پہچان کر بہت خوش ہوئے مگر فوراً ہی درپیش مسائل کو برا بھلا کہنے لگے۔ مسائل سے مراد صحت کے معاملات تھے۔ غالباً 2000ء سے ذیابیطس کا مرض شروع ہوا تھا اور اس روز انہوں نے کچھ عارضہ قلب کی طرف بھی اشارہ کیا۔ کچھ جلدی میں بھی تھے، اس لیے تفصیل سے بات نہ ہو سکی۔ بس یہ طے ہوا کہ رمضان المبارک کی ابتدا سے پہلے ایک طویل ملاقات رکھی جائے تا کہ دل کھول کر ماضی کی یادیں تازہ کی جا سکیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ خان صاحب یاروں کے یار تھے اور اس معاملے میں کبھی انہوں نے اپنی مصروفیات کو آڑے نہیں آنے دیا۔ البتہ یہ میری ہی کوتاہی تھی کہ ملاقات کے لیے وقت نہیں نکال پاتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خان صاحب سے فون پر یہ مختصر سی گفتگو آخری گفتگو ہوگی۔ میں پھر کبھی ان کی زندگی سے بھرپور آواز نہ سن سکوں گا۔ ہماری ملاقات رمضان سے قبل ہو نہ سکی اور رمضان میں مجھے معلوم تھا کہ خان صاحب صرف عبادات کی طرف پوری طرح متوجہ رہتے ہیں، لہٰذا میں نے فون بھی نہ کیا اور یوں دسمبر آ گیا اور وہ خبر جانکاہ بھی آ گئی کہ خان صاحب اب ہمارے درمیان نہ رہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

علم وادب کا یہ منفرد ستارہ، احباب کے دل کا سہارا، لاکھوں قارئین کا پیارا، 23 فروری 1940ء قبل طلوع آفتاب رات ایک بجے یوپی (انڈیا) کے شہر رام پور کے افق پر طلوع ہوا۔ والد محترم فیروز شاہ خان ایک جاگیردار تھے اور رام پور کے شرفاء میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ جاگیردارانہ ماحول کے باوجود نہایت نیک و متقی، مذہب و تصوف سے خصوصی لگاؤ رکھنے والے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نومولود جس کا نام آصف شاہ خان رکھا گیا تھا، اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کے زمانے سے ہی مذہبی رنگ میں رنگ گیا۔ یہ رنگ اس وقت بھی نہ اترا جب جوانی کے فلمی شوق اسے بمبئی کی فلم نگری میں لے گئے۔



ہمیں نہیں معلوم کہ اب کتنے لوگ ایسے ہوں گے جو خان صاحب کی انڈیا اور پاکستان میں فلمی دلچسپیوں اور مصروفیات کے بارے میں جانتے ہوں گے۔ خان صاحب کا مخصوص حلقۂ احباب تو بہرحال ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہے لیکن ان کے بے شمار قارئین بہرحال ان کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ تاریخ کے رمز شناس تھے، نہایت اعلیٰ پائے کی تاریخی کہانیاں تحریر کیں۔ صوفیائے کرام سے خصوصی دلی لگاؤ رکھتے تھے لہٰذا صوفیا و اولیاء کے سوانح بیان کرنے کا حق ادا کر دیا لیکن درحقیقت خان آصف ایک ہمہ صفت و ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ وہ اپنی طرز کے منفرد شاعر و ادیب ہی نہیں تھے، فنونِ لطیفہ کے دیگر شعبوں کا بھی عملی تجربہ رکھتے تھے۔ اسکرپٹ رائٹنگ کی تربیت خان صاحب نے مشہور بھارتی ہدایت کار و فلم ساز بی آر چوپڑا کے اسٹوڈیو میں مشہور شاعر جناب اختر الایمان کی نگرانی میں حاصل کی۔ اسی لیے وہ ہمیشہ اختر الایمان کا نام نہایت عزت و احترام سے لیتے تھے۔ یہاں ہم یہ بات بھی واضح کر دیں کہ خان صاحب اپنی بے لاگ رائے کے اظہار میں نہایت نڈر و بے باک انسان تھے۔ جب ان پر خان صاحبی کا دورہ پڑتا تھا تو پھر وہ ہمہ شما کو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن جو اہلِ علم و ہنر ان کی نظر میں معتبر تھے۔ ان کی بعض خامیوں سے بھی صرفِ نظر کر جاتے تھے۔ مثلاً اختر الایمان کی شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے مگر اس حوالے سے گفتگو چھڑ جائے تو نرم رویہ اختیار کرتے۔

خان صاحب دوسری بار غالباً 1968ء میں پاکستان آئے تو پھر یہیں کے ہو رہے۔ شعبہ صحافت سے وابستگی اختیار کی اور روزنامہ ''حریت'' سے منسلک ہو گئے۔ ''حریت'' کے فلمی صفحے کے لیے مضامین لکھتے رہے۔ فلمی دنیا سے بھی رابطہ کیا اور جناب فضل احمد کریم فضلی کے ساتھ فلم ''ایسا بھی ہوتا ہے'' کی تکمیل کے دوران میں کام کیا۔ جناب ابراہیم نفیس نے ایک فلم بنائی تھی ''دل والے'' اس کے گانے بھی لکھے۔ الغرض غمِ روزگار نے بالاخر روزنامہ جسارت تک پہنچا دیا اور اس کے پہلے مدیر جناب عبدالکریم عابد کی نگاہِ انتخاب قطعہ نگاری کے لیے خان صاحب پر ٹھہری۔ جسارت میں ملکی و غیر ملکی حالاتِ حاضرہ پر ایک قطعہ روزانہ اور ایک طویل نظم ہفتہ وار لکھنا خان صاحب کی ذمے داری قرار پائی۔ اس ذمے داری کو جس خوبی و چابک دستی سے ادا کیا گیا، اس کی مثال کوئی دوسری نہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت رئیس امروہوی مرحوم کا نام نامی اخبارات کی دنیا میں قطعہ نگاری کے حوالے سے نہایت معتبر و مستند سمجھا جاتا تھا، ان کے سامنے کس کا چراغ جلتا مگر ابھی ایسے گواہ موجود ہیں جن کی موجودگی میں رئیس صاحب نے فرمایا ''میرا جانشین آ گیا۔''

بعد میں جب روزنامہ جسارت عتاب کا شکار ہوا اور حکومتِ وقت نے اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی

توخان صاحب نے ایک فکشن میگزین کا اجراء کیا جس کا نام ''داستان ڈائجسٹ'' تھا۔ یہ ماہنامہ 1982ء تک جاری رہا پھر بند ہوگیا۔ یہ 1983ء کے اوائل کا ذکر ہے جب خان صاحب نے مجھے بتایا کہ مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، جناب معراج رسول کی نگاہِ مردم شناس ان کی جانب ہوگئی ہے اور وہ ان سے شاید کچھ مضامین اہلِ تصوف پر لکھوانا چاہتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آئمہ پر لکھوانے کا خیال ہے۔

واضح رہے کہ میری خان صاحب سے دعا سلام تو تقریباً 1974ء سے تھی اور پھر یہ مراسم اس قدر بڑھے کہ روزانہ کی نشستیں معمول بن گئیں۔ زندگی رہی تو کبھی ان نشستوں کے شرکاء کا احوال بھی تحریر کروں گا۔

خان صاحب ان دنوں ایک دوسرے ماہنامے کے لیے یہ مضامین تحریر کررہے تھے اور اس پیشکش کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ قریبی حلقۂ احباب کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ خان صاحب اس زمانے میں میرے مشورے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ میں نے ان کے شکوک وشبہات کو دور کرتے ہوئے یہی مشورہ دیا کہ آپ ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ سے منسلک ہوجائیں۔

مجھے اس وقت یہ اندازہ بھی نہ تھا کہ عن قریب میں بھی اسی ادارے سے وابستہ ہوجاؤں گا۔ خان صاحب نے پہلا مضمون لکھا اور ابھی وہ شائع بھی نہ ہوا تھا کہ ایک روز انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ جاسوسی ڈائجسٹ میں تمہاری ملازمت کے لیے میں نے بات کرلی ہے۔ میں ان دنوں بے روزگار اور بہت پریشان حال تھا لہٰذا فوراً پہنچ گیا۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی پروف ریڈنگ کی ذمے داری میرے سپرد ہوئی اور پھر زیرِ نظر کتاب میں شامل تمام مضامین میری ہی نظر سے گزر کر اشاعت پذیر ہوئے۔

خان صاحب اپنی دیگر خوبیوں کے ساتھ نہایت اعلیٰ درجے کے پروف ریڈر بھی تھے۔ اپنے ماہنامے داستان ڈائجسٹ کے اہم مضامین وکہانیوں کی بھی خود پروف ریڈنگ کرتے پھر بھی تسلی نہ ہوتی اور کوئی دفتر میں ملنے آجاتا تو اس کے آگے رکھ دیتے کہ بھائی ایک نظر تم بھی ڈال لو، کہیں کوئی غلطی نہ رہ گئی ہو۔ اس معاملے میں وہ بہت کریزی تھے۔ لہٰذا جب یہ مضامین کتابت میں ہوتے تو بار بار مجھے فون کرتے اور تاکید کرتے کہ غلطی نہ جانے پائے۔ اس کے باوجود بھی اگر غلطی رہ گئی تو خان صاحب کا موڈ بہت آف ہوجاتا۔ آتے ہی شکوہ کرتے۔

''یار شیخ! غلطی چلی گئی۔ حالانکہ میں نے تم سے سخت تاکید کے ساتھ کہا تھا کہ غلطی نہ جانے پائے۔''
خان صاحب مجھے اکثر ''شیخ'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے، یہ ان کی محبت کا ایک انداز تھا۔



زیرِ نظر کتاب ''سفیرانِ حرم'' کے تمام مضامین خان صاحب نے معراج صاحب کی فرمائش پر تحریر کیے۔ یہ آئیڈیا بھی معراج صاحب ہی کا تھا کہ صوفیاء کے بجائے آئمہ کے سوانح تحریر کیے جائیں اور ایسے عام فہم ودل نشین انداز میں کہ ہر علمی سطح کا قاری اس میں دلچسپی لے اور چاروں آئمہ کے گراں قدر علمی کارناموں سے واقف ہوسکے۔ اس تلوار کی دھار پر چلتے ہوئے اس امر کا خیال بھی رکھا جائے کہ مسلکی اختلافات کسی بدمزگی کا سبب نہ ہونے پائیں۔

خان صاحب نے یہ ذمے داری احسن طور پر انجام دی مگر بدقسمتی سے یہ سلسلہ تادیر جاری نہ رہ سکا ورنہ چاروں مشہور آئمہ امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ اور امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے بعد دیگر آئمہ کرام پر بھی لکھنے کا منصوبہ تھا۔ کاش یہ سلسلہ جاری رہتا تو اہلِ علم ونظر دیکھتے کہ کیسے کیسے نابغہ روزگار، گوہرِ نامدار تاریخ اسلام کے دامن پر جگمگا رہے ہیں۔

یہ سلسلہ کیوں منقطع ہوا؟ یہ ایک الگ کہانی ہے جس کا ذکر یہاں بے محل ہوگا۔ قابلِ قدر ذکر یہ ہے کہ ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد کتابیات پبلی کیشنز کی روحِ رواں عنبرین اعجاز نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ یہ ادبی ومذہبی اعتبار سے نادر وشہکار تحریریں اگر کتابی صورت میں محفوظ نہ کی گئیں تو وقت کی گرد تلے دب کر کہیں ہمیشہ کے لیے نابود نہ ہوجائیں۔ اس خاکسار کو خان صاحب سے جو قلبی تعلق رہا ہے، اس کے پیشِ نظر اس کارِ خیر میں ان کی حوصلہ افزائی کرتا رہا اور وہ آخری فون کال بھی اسی حوالے سے کی گئی تھی تاکہ خان صاحب سے مشورہ اور اجازت لے لی جائے۔ میری بات سن کر چونکے اور بولے ''یار! تم بھی بہت دور کی کوڑی لاتے ہو، میں تو ان مضامین کو بھولے بیٹھا ہوں۔ دوسری مصروفیات ہی مزید کچھ کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔''

میں نے کہا ''آپ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں تاکہ آپ کی یہ محنت ضائع ہونے سے بچ جائے ورنہ پہلے جو نقصانات آپ کی بے پروائیوں کے سبب ہوئے ہیں، ان کا ماتم بھی میں ابھی تک کررہا ہوں۔''
میری اس بات کا مطلب وہ خوب سمجھتے تھے، ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے ''بس شیخ! اب تو صحت کا ماتم ہے۔ ملو گے تو تفصیل سے بات چیت ہوگی۔ باقی جو تمہارا دل چاہے کرو۔ میری جان پر دیگر اور عذاب بہت ہیں۔''

یہاں ہم اس افسوس ناک حقیقت کا اظہار بھی کرتے چلیں کہ خان صاحب اپنی بے شمار تحریروں کا ریکارڈ کبھی نہ رکھ سکے۔ ماہنامہ داستان میں کئی معرکہ کی کہانیاں لکھیں، فلمی دنیا کے حوالے سے بہت کچھ لکھا، خصوصاً

"سرحد کا بیٹا" کے عنوان سے شہرۂ آفاق اداکار دلیپ کمار کی سرگزشت نہایت طویل عرصے تک لکھی مگر خود ان کے پاس بھی اس کا ریکارڈ نہ تھا۔ روزنامہ جسارت میں جو نظمیں اور قطعات لکھے، ان کا بھی کبھی ریکارڈ نہ رکھا۔ میں ہمیشہ اس نقصان کا ان سے شکوہ کرتا اور وہ ایک ادائے بے نیازی سے یہ کہہ کر بات ٹال دیتے۔

"چھوڑو شیخ! خدا تمہیں خوش رکھے، چائے پلاؤ۔ یار! ایک چھوٹا بسکٹ کا پیکٹ بھی منگا لینا۔ پان تو تمہارے پاس سانچی ہوگا؟"

خان صاحب کی ادائیں بے شمار تھیں، باتیں ناقابلِ فراموش، تیور ہمیشہ تیکھے ہی رہتے۔ اپنے اصولوں اور نظریات میں نہایت سخت مزاج۔ اس حوالے سے کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی کو خاطر میں لاتے۔ نثر کے میدان میں مولانا ابوالکلام آزاد سے متاثر تھے۔ باقی کسی کے قلم کا زور تسلیم نہ کرتے۔ شاعری میں علامہ اقبالؒ کو اردو شاعری کے فیلڈ مارشل کا خطاب دے رکھا تھا۔ اول مسلمان، دوم پاکستانی اور پھر پٹھان تھے۔ اپنے تمام پسندیدہ موضوعات پر نہایت محققانہ نظر رکھتے اور ایسی ایسی باریک موشگافیاں دورانِ گفتگو بھی کرتے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ کبھی موقع ملا تو انشاء اللہ ایک علیحدہ مضمون اس حوالے سے لکھوں گا۔

ایک روز عشقیہ شاعری پر بات ہو رہی تھی اور شریکِ بزم حضرات کا موقف یہ تھا کہ عشق کے موضوع پر خدائے سخن میر تقی میر سے بہتر شعر کسی اردو شاعر نے نہیں کہے۔ یہ گویا خان صاحب کے ممدوح علامہ اقبالؒ پر حملہ تھا۔ فوراً اپنے مخصوص انداز میں مداخلت کرتے ہوئے بولے "جناب! میں علامہؒ کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ عشق کے موضوع پر اس سے بہتر شعر آپ میر صاحب کا سنا دیں۔"

دو عالم سے بے گانہ کرتی ہے دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

کچھ دیر کی بحث کے بعد سب کو تسلیم کرنا پڑا کہ علامہؒ کا شعر اپنا جواب نہیں رکھتا۔

آخر میں اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے قارئین سے میں یہ گزارش کروں گا کہ وہ مرحوم کے لیے ایک بار ضرور ایصالِ ثواب کریں۔ آپ کے ایمان کو تازہ، آپ کی دینی معلومات میں اضافہ کرنے والی اس کتاب کے مصنف کا یہ آپ پر حق ہے۔ اللہ آپ کو یہ حق ادا کرنے کی توفیق دے!

سرتاپا نیاز
سید انور فراز

# امامِ اعظم

## امام ابو حنیفہؒ

کوفہ۔ ۸۰ھ تا ۱۵۰ھ

شہر کوفہ کی ایک پُرسکون رات تھی۔ سرد ہواؤں نے دن بھر کے تھکے ماندے انسانوں کو تھپک تھپک کر گہری نیند سلا دیا تھا۔ ناگہاں ایک یہودی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے برابر کے مکان کی چھت پر ایک سایہ دیکھا۔ پھر وہ شدید اضطراب کے عالم میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے رخصت ہو چکی تھی اور دل و دماغ پر خوف و دہشت کے سائے لرز رہے تھے۔

وہ ایک آسودہ حال یہودی تاجر تھا۔ مسلم آبادی کے درمیان اس کے مذہبی عقائد، جان و مال اور عزت و آبرو اس طرح محفوظ تھے جیسے وہ کسی اسرائیلی مملکت کا باشندہ ہو۔ اسے انسانی معاشرے کی تمام آزادیاں حاصل تھیں۔ مگر گزشتہ شب کے ناقابلِ بیان منظر نے اسے ایک عجیب و غریب کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ سارا دن فکر و پریشانی میں گزرا۔ یہاں تک کہ اندھیری رات سر پر آ گئی۔ گھر کے تمام افراد ہر شے سے بے نیاز ہو کر سو گئے لیکن یہودی تاجر جاگتا رہا۔ وہ کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ نصف شب کے قریب

بادِ خنک کے جھونکوں سے اس کی پلکیں بھاری ہونے لگی تھی کہ اچانک سامنے کے مکان پر وہی سایہ ابھرا۔
یہودی کی حالت غیر ہونے لگی اور پھر وہ رات بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔

تیسری رات بھی اس نے سائے کو اسی انداز میں دیکھا۔ پھر وہ مسلسل کئی دنوں تک یہ منظر دیکھتا رہا۔ آخر یہودی کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ ایک شب اس نے اپنی بیوی کو شریکِ راز کرتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھ سے اس شخص کی گریہ وزاری نہیں دیکھی جاتی۔''

''کس کی گریہ وزاری؟'' بیوی نے حیرت زدہ لہجے میں سوال کیا۔ وہ اپنے شوہر کی بات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔

یہودی تاجر نے برابر کے مکان کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد حسبِ معمول وہی سایہ نمودار ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھ سر کی بلندی تک اٹھے اور پھر وہ غلاموں کی مانند دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ سکوتِ شب میں سائے کی ہلکی آواز ابھری، وہ ایک مخصوص لہجے میں کچھ بول رہا تھا۔ یہودی عورت ہمہ تن گوش ہو گئی اور پھر اس نے سائے کی زبان سے ادا ہونے والے عربی الفاظ کا مفہوم سمجھ لیا سایہ حالتِ نماز میں اپنی کتابِ مقدس کی آیات پڑھ رہا تھا۔

''یہ تو نعمان معلوم ہوتے ہیں۔'' بیوی نے تیز سرگوشی میں اپنے شوہر سے کہا۔

''ہاں یہ نعمان ہی ہیں۔'' یہودی تاجر نے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''خاموشی سے سنتی رہو۔''

عورت اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ہو کر سائے کی آواز سننے لگی۔

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ (اے مجرمو! آج کے دن نیک لوگوں کی صف سے الگ ہو جاؤ) آواز ابھری اور پھر سائے نے اسی ایک جملے کی تکرار شروع کر دی۔ یہودی تاجر اور اس کی بیوی کی سانسیں رک سی گئیں۔ وہ دونوں انتہائی خوف و دہشت کے عالم میں آسمانی کلام سن رہے تھے۔

''اے مجرمو! آج کے دن ان سے علیحدہ ہو جاؤ۔''

کچھ دیر تک مسلسل آواز آتی رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ ڈوبنے لگی۔ اب آواز کی جگہ انسانی ہچکیاں گونج رہی تھیں۔ سایہ بے اختیار رو رہا تھا۔ یہودی عورت زیادہ دیر تک اس فغان نیم شبی کو برداشت نہ کر سکی اور اس نے اپنے کان بند کر لیے۔

کچھ دن بعد یہودی تاجر نے اس راز کو عام کر دیا۔ اس نے کوفے کے لوگوں سے کہا ''نعمان کا



کردار ہمارے لیے ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے مگر نہ جانے ان سے ایسا کون سے گناہ سرزد ہو گیا ہے کہ وہ یومِ حساب کے خوف سے رات رات بھر چیختے ہیں، آنکھوں سے اشکِ ندامت کا سیلاب جاری رہتا ہے اور آہِ سحر گاہی کی لے اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ سننے والوں کو ان پر ترس آنے لگتا ہے۔''

اور جب دوسرے شہریوں نے رونے والے شخص سے فغانِ نیم شبی کا سبب پوچھا تو اس سوختہ جاں نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ یہ آیتِ قرآنی میرے ہی لیے نازل ہوئی ہے۔'' یہ کہتے کہتے اس شب زندہ دار کے ہونٹ کانپنے لگے تھے اور چہرہ زرد ہو گیا تھا۔

''میں اس دن سے اپنے رب کی پناہ مانگتا ہوں جب بچے بوڑھے ہو جائیں گے، پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑنے لگیں گے اور آسمانوں میں شگاف پڑ جائیں گے۔''

نصف شب کے سناٹوں میں اپنے خالق کے حضور خم رہنے والے کفر کی تاریکیوں میں ایمان و راستی کے اجالے، اپنے وقت کے روئے زمین پر سب سے زیادہ دانش مند، عابدوں اور زاہدوں کی جماعت میں سربلند، پرہیزگاروں سے پرہیزگار، اہلِ دل کا صبر و قرار، مسافرِ مدینہ و نجف، راہِ خدا میں سربکف، شعلہ بجاں قرآں بدست، یہ تھے مردِ حق پرست حضرت نعمان بن ثابت امامِ اعظم ابوحنیفہؒ۔

☆☆☆

شکستِ ایران سے پہلے یہاں ایک معزز خاندان آباد تھا۔ عام طور پر لوگوں کی اکثریت آتش پرست تھی۔ اس لیے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ خاندان بھی اپنے آباواجداد کی طرح آگ کی پوجا کرتا تھا مگر جب فاران کی چوٹیوں سے نیا آفتابِ ہدایت طلوع ہوا تو اس خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک شخص زوطی نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ انتہائی باغیانہ اقدام تھا۔ فارس کے آتش پرستوں کو ان کی یہ ادا پسند نہیں آئی۔ زوطی کے ساتھ قدم قدم پر نفرت آمیز سلوک کیا گیا۔ یہاں تک کہ ان پر ایران کی زمین تنگ ہو گئی۔ مجبوراً زوطی نے کوفے کا رخ کیا۔ اس شہر کو حضرت علیؓ کے عہد میں دارالخلافہ ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اسی مقام پر زوطی کو گوشۂ عافیت نظر آیا۔ نتیجتاً وہ کوفے میں سکونت پزیر ہو گئے۔ حضرت علیؓ سے انہیں خاص عقیدت حاصل تھی۔ اس لیے کبھی کبھی دربار میں حاضر ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے۔ ایک مرتبہ نوروز کے دن جو پارسیوں کا عید کا دن ہے، زوطی نے بطور نذر فالودہ بھیجا۔ حضرت علیؓ نے ان کی محبت کا خیال کرتے ہوئے قبول تو فرما لیا مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد کیا۔ ''ہمارے یہاں ہر روز نو روز ہے۔'' اس واقعے سے پتہ چلتا ہے کہ زوطی کو کسی نہ کسی حد تک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دربار میں

رسائی حاصل تھی۔

یہاں کچھ عرصے قیام کے بعد قدرت نے انہیں اولادِ نرینہ کی دولت سے سرفراز فرمایا۔ زوطی نے لڑکے کا نام ثابت رکھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ ابھی ثابتؒ بچے ہی تھے کہ زوطی نے انہیں ایک دن کمالِ عقیدت کے ساتھ حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کیا اور دُعا کی درخواست کی۔ امیر المومنینؓ ان کے اس عمل سے بہت خوش ہوئے' ثابتؒ کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے زوطی اور ان کی اولاد کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

حضرت ثابتؒ کے حالات پر وقت نے گہرا پردہ ڈال دیا ہے۔ تذکرہ نویسوں کے بیان سے بس اتنا پتا چلتا ہے کہ آپ تجارت کے ذریعے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ ۸۰ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت ثابتؒ کی عمر چالیس سال تھی۔ خدا نے زوطی کے خاندان کو مزید وسعت دی اور چراغ سے چراغ روشن ہوا۔ ثابتؒ نے اپنے لڑکے کا نام نعمان رکھا مگر دنیا نے اس بچے کو امام اعظمؒ کے لقب سے یاد کیا۔ زوطی نے اسلام کی راہ میں جو تکلیفیں برداشت کیں جس طرح اپنے دل پر ہجرت کا زخم کھایا تھا۔ خدا نے اسی انداز میں انہیں سرخرو فرمایا۔ امام اعظمؒ کی پیدائش خاندان زوطی کے لیے فخر کی اتنی روشن علامت تھی کہ یہ مرتبہ کسی شہنشاہ کو بھی حاصل نہیں۔ ایوان کسریٰ کے فلک بوس مینارے سنگ وخشت کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئے اور محلاتِ شاہی تحقیر وملامت کا قبرستان ٹھہرے۔ مگر زوطی کے گھر کی کچی دیواروں کو خدا نے اس قدر بلند کیا کہ لوگ انہیں جوشِ عقیدت میں بوسہ تو دے سکتے ہیں ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ یہاں تک کہ بڑے سے بڑا ہوش مند صاحب کرامت بھی اس دانشکدے کے سامنے پہنچ کر احتراماً اپنا سر جھکا دیتا ہے۔

ممکن ہے کہ اس سلسلے میں بعض ظاہر پرست عقلی توجیہات سے کام لیں مگر اہلِ دل کو یقین ہے کہ نسلِ زوطی کی سربلندی میں حضرت علیؓ کی دعائیں بھی شامل تھیں۔ دیگر عقیدت مندوں کا تو ذکر ہی کیا۔ خود امام اعظمؒ کے پوتے حضرت اسماعیلؒ علی الاعلان فرماتے تھے۔ ''میں اسماعیل بن حماد بن ثابت ہوں۔ ہم لوگ نسلِ فارس سے ہیں اور کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آئے' ہمارے دادا ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ثابتؒ بچپن میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کے خاندان کے حق میں دعائیں خیر کی تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ دعا بے اثر ثابت نہیں ہوئی۔''

حضرت اسماعیلؒ کے اس بیان کے بعد وہ روایت بھی باطل قرار پاتی ہے جسے حاسدین نے شہرت



دینے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ امام اعظمؒ کے مخالفین آپ کو غلام زادہ کہا کرتے تھے مگر یہ تہمت کے سوا کچھ نہیں۔ اور بالفرضِ محال اگر یہ ثابت بھی ہو جائے تو اس سے حضرت ابوحنیفہؒ کی عظمت وتقدس میں کوئی فرق نہیں آتا۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

آپ کی کنیت ابوحنیفہؒ تھی جسے اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ اکثر لوگ حقیقی نام تک بھول گئے اگر آج کسی عام شخص کے سامنے نعمان بن ثابتؒ کا ذکر کرو تو وہ حیرت زدہ ہو کر پوچھتا ہے کہ یہ کون بزرگ تھے؟ قدرت کا عجیب راز ہے کہ جس نے تمام عمر شہرت کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا' وہ رہتی دنیا تک امام اعظمؒ قرار پایا۔ آپ کی کسی اولاد کا نام حنیفہ نہیں تھا۔ مگر پھر بھی ابوحنیفہ ٹھہرے۔ تحقیق کرنے والوں نے قرآن حکیم کی اس آیت (فَاتَّبِعُوْا مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام اعظمؒ کی کنیت اسی نسبت سے مشہور ہوئی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ امام اعظمؒ کی صاحبزادی کا نام حنیفہ تھا۔ ایک بار آپ عورتوں کے ایک مخصوص مسئلے کا فوری جواب نہ دے سکے مگر آپ کی لڑکی حنیفہ نے انتہائی مضبوط دلیل دے کر سوال کرنے والی خاتون کو مطمئن کر دیا۔ حضرت امام اپنی اولاد کی ذہانت سے بہت متاثر ہوئے اور اسی دن سے آپ نے ابوحنیفہ کی کنیت اختیار کی۔ محققین کے نزدیک یہ روایت غیر معتبر ہے۔ حضرت حمادؒ کے سوا امام اعظمؒ کی کسی اولاد کا نشان نہیں ملتا۔

☆☆☆

حضرت ابوحنیفہؒ کے بچپن کا زمانہ فتنوں سے لبریز تھا۔ ہر طرف ظلم و ناانصافی کی حکومت تھی۔ بندگانِ خدا کے حقوق پامال ہو رہے تھے اور حکمرانوں کو اپنی ذات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ خلیفہ عبدالملک نے حجاج بن یوسف کو عراق کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس جابر شخص نے انسانی حدود سے نکل کر سفاکی کے وہ مظاہرے کیے تھے کہ ان کے آگے درندوں کی خون آشامی بھی ہیچ تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس دورِ گمراہی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ ''اگر دوسرے تمام پیغمبروں کی امتیں مل کر اپنے اپنے زمانے کے بدکاروں کو پیش کریں اور ہم صرف حجاج کو مقابلے پر لائیں تو خدا کی قسم ہمارا پلہ بھاری رہے گا۔'' حجاج بن یوسف کے علاوہ بھی کچھ لوگ اقتدار کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے زمین پر تباہ

کاریاں پھیلا رہے تھے۔ یہ ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھیں جو تہذیب آدم کو اژدہے کی مانند جکڑے ہوئے تھیں۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے اسی قبیلۂ ستمگراں کے بارے میں کہا تھا۔ ''ولید شام میں، حجاج عراق میں، عثمان حجاز میں، قرہ مصر میں۔ واللہ تمام دنیا ظلم سے بھر گئی۔''

یہ مملکتِ اسلامیہ کی خوش نصیبی تھی کہ تمام جفا پیشہ حکمران یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ حجاج بن یوسف ۹۵ھ میں مر گیا اور ۹۶ھ میں فرشتۂ اجل نے ولید کی سانسیں غصب کر لیں۔ ولید کے بعد سلیمان بن عبدالملک مسندِ خلافت تک پہنچا وہ ایک لائق فرماں روا تھا۔ اسلامی دنیا پر سلیمان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے حضرت عمر ابن العزیزؒ کو مشیرِ سلطنت بنایا اور مرتے وقت تحریری وصیت کی کہ میرے بعد عمر ابنِ عبدالعزیز کو خلافت کی ذمہ داریاں سونپی جائیں۔ سلیمان نے ۹۹ھ میں وفات پائی۔ وصیت کے مطابق عمر ابن عبدالعزیزؒ منصبِ خلافت پر فائز ہوئے اور حکومت کا رنگ ہی بدل ڈالا۔ نظامِ عدل و انصاف قائم کرنے کے علاوہ آپ نے مذہبی علوم کو اس قدر ترقی دی کہ ہر طرف علم و حکمت کے چرچے عام ہو گئے۔

حالات کے اس پس منظر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ولید اور حجاج کے دور میں تحصیل علم کے راستے مسدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اس لیے حضرت ابو حنیفہؒ بھی فطرت کے تقاضوں کی تکمیل نہ کر سکے۔ مجبوراً آپ کو خاندانی پیشے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ پیدائشی ذہانت اس میدان میں بھی نمایاں رہی اور آپ نے بہت جلد اپنی موروثی تجارت کو وسعت دے کر نئی بنیادوں پر استوار کیا لیکن جیسے ہی سلیمان کے عہدِ خلافت میں گھر گھر درس و تدریس کا شہرہ ہوا آپ کے دل میں بھی تعلیم کو مکمل کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔

اسی زمانے میں اتفاق سے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے حضرت ابو حنیفہؒ کی آتشِ شوق کو بھڑکا دیا۔ آپ ایک دن بازار جا رہے تھے کہ کوفے کے مشہور بزرگ امام شعبیؒ کا مکان راستے میں پڑتا تھا۔ آپ جب امام کے سامنے سے گزرے تو انہوں نے ایک طالب علم سمجھ کر اپنے قریب بلا لیا اور محبت آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

حضرت ابو حنیفہؒ نے ایک سوداگر کا نام لیتے ہوئے کہا اپنا کاروباری مقصد بیان کیا۔

امام شعبیؒ نے دوبارہ سوال کیا ''میرا مطلب یہ تھا کہ تم پڑھتے کس سے ہو؟''

''کسی سے بھی نہیں۔'' ابو حنیفہؒ نے بظاہر سادگی سے جواب دیا تھا مگر امام شعبیؒ کی نگاہوں سے الفاظ میں چھپا ہوا درد پوشیدہ نہ رہ سکا۔



''تم علماء کی صحبت میں بیٹھا کرو۔'' امام شعبیؒ نے انتہائی شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''مجھے تمہارے اندر بڑی صلاحیتیں نظر آتی ہیں، جاؤ ان صلاحیتوں کو تلاش کرو اور قدرت کی بخشی ہوئی لازوال نعمتوں کا شکر ادا کرو۔'' یہ کہہ کر امام شعبیؒ اپنے مکان میں تشریف لے گئے اور حضرت ابو حنیفہؒ راستے بھر اس مرد بزرگ کے الفاظ پر غور کرتے رہے، ایک عجیب کرب تھا۔ عجیب ذہنی خلش تھی جس نے کئی راتوں تک امام اعظمؒ کو سونے نہیں دیا۔ بالآخر آپ نے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں ایک اہم فیصلہ کیا جس نے نہ صرف ابو حنیفہؒ کی ذاتی حیثیت کو بدل ڈالا بلکہ تاریخِ اسلام پر بھی گہرے نقوش ثبت کیے۔

☆☆☆

حضرت حمادؒ کوفے کے مشہور امام تھے۔ آپ کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ استادِ وقت کا درجہ رکھتے تھے۔ مشہور صحابی حضرت انسؓ بن مالک سے حدیث سننے کا شرف حاصل تھا۔ اس وصفِ خاص نے حضرت حمادؒ کی شخصیت کو سورج سے زیادہ روشن بنا دیا تھا۔ مزید یہ کہ بڑے بڑے تابعین کی صحبت سے فیض یاب ہوئے تھے۔ نتیجتاً کوفے میں آپ کے مدرسے کو جو شہرت و مرتبہ حاصل تھا۔ وہ کسی دوسرے مکتب کی تقدیر نہ بن سکا۔ حضرت ابو حنیفہؒ نے بھی آپ ہی کی ذات میں اپنے درد کا درماں تلاش کیا۔

اس زمانے میں درس کا طریقہ یہ تھا کہ استاد کسی مسئلے پر زبانی گفتگو کرتا تھا جسے شاگرد یاد کر لیتے تھے اور اگر کبھی کسی خاص نکتے کا تحریر کرنا ضروری ہوتا تو اسے لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ ابو حنیفہؒ پہلے دن بائیں صف میں بیٹھے۔ دائیں قطار میں وہ لوگ شامل تھے جنہیں علمی اعتبار سے مجلس پر فوقیت حاصل تھی۔ دراصل یہ مکتب کی ایک رسم تھی جس کے ذریعے نئے اور پرانے شاگردوں میں امتیاز قائم رکھا جاتا تھا۔ شروع میں ابو حنیفہؒ کو بھی اس مرحلے سے گزرنا پڑا لیکن چند روز بعد ہی حضرت حمادؒ کو یہ تجربہ ہو گیا کہ تمام حلقے میں ایک شخص بھی حافظے اور ذہانت کے اعتبار سے ان کا ہمسر نہیں ہے تو حکم دے دیا کہ ابو حنیفہؒ سب سے آگے بیٹھا کریں۔ مستند حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ امامِ اعظمؒ فقہ کا علم حاصل کرنے کے لیے دوسرے بزرگوں کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرتے تھے لیکن بنیادی طور پر وہ حضرت حمادؒ ہی کے تربیت یافتہ تھے۔ تمام عمر شاگردی کے اس رشتے پر نازاں رہے۔ زندگی میں جس طرح استاد کی تعظیم کی وہ رسمِ احترام انہی پر ختم ہو گئی۔ مرنے کے بعد بھی عقیدت کا یہ حال تھا کہ اپنے بیٹے کا نام حماد رکھا۔

☆☆☆

فقہ کے بعد ابو حنیفہؒ نے علمِ حدیث کی طرف توجہ کی کیونکہ حدیث کے بغیر اجتہاد ممکن نہیں تھا۔ اس سلسلے میں جب ہم امامِ اعظمؒ کے شوقِ جستجو پر نظر ڈالتے ہیں تو عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی ہے جوشِ طلب کا یہ عالم تھا کہ آپ نے کوفے کے ایک ایک محدث کی بارگاہ میں حاضری دی۔ پھر بھی تشنگی کا احساس باقی رہا تو بصرے کی طرف رخ کیا۔ یہاں بھی نامور محدثین کا اجتماع تھا۔ امام حسن بصریؒ شعبہؒ اور قتادہؒ کے فیض کے چشمے جاری تھے۔ اگرچہ حسن بصریؒ ۲۱۱ھ تک زندہ رہے مگر ابو حنیفہؒ کا ان کے درس سے استفادہ کرنا ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ قتادہؒ اور شعبہؒ کی شاگردی کے لیے بے شمار تذکرے ملتے ہیں۔ قتادہؒ اس پائے کے محدث تھے کہ ان کے علم و فضل سے کوئی ایک شخص بھی منکر نظر نہیں آتا۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے تھے۔ ''کوئی ان باتوں میں قتادہؒ کے برابر ہو تو ہو مگر ان سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا۔'' شعبہؒ کا یہ مرتبہ ہے کہ حضرت سفیان ثوریؒ فنِ حدیث میں انہیں امیر المومنین کہتے تھے۔ امام شافعی کا قول ہے کہ ''شعبہؒ نہ ہوتے تو عراق میں حدیث کا رواج نہ ہوتا۔''

شعبہؒ نے ۱۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ سفیان ثوریؒ کو ان کے مرنے کی خبر ہوئی تو کہا ''آج فنِ حدیث بھی مر گیا۔'' شعبہؒ کو ابو حنیفہؒ کے ساتھ ایک خاص تعلق تھا۔ غیر موجودگی میں اکثر ان کی ذہانت اور دانشمندی کی تعریف کرتے ایک بار امامِ اعظمؒ کا ذکر آیا تو کہنے لگے۔ جس طرح میں جانتا ہوں کہ آفتاب روشن ہے اسی یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ علم اور ابو حنیفہؒ ہم نشین ہیں۔''

حضرت امام بخاریؒ کے استاد یحییٰ بن معین سے کسی نے پوچھا۔ ''آپ ابو حنیفہؒ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟''

جواب میں فرمایا ''بس یہ کافی ہے کہ شعبہؒ نے انہیں حدیث و روایت کی اجازت دی اور شعبہؒ آخر شعبہؒ ہی ہیں۔''

امامِ اعظمؒ کو بصرہ اور کوفہ کی درسگاہوں سے حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ حاصل ہوا لیکن آپ اسے ناکافی سمجھتے تھے۔ تکمیل کی سند حاصل کرنے کے لیے حرمین جانا ضروری تھا جو مذہبی علوم کے حقیقی مراکز تھے۔ الغرض جس زمانے میں آپ مکہ معظمہ پہنچے ہر طرف درس و تدریس کا شور تھا۔ فنِ حدیث کے استادوں نے الگ الگ اپنی درس گاہیں قائم کی تھیں۔ ان میں حضرت عطا بن ابی رباحؒ کا حلقہ سب سے زیادہ وسیع اور مستند خیال کیا جاتا تھا۔ عطاؒ مشہور تابعی تھے۔ آپ نے دو سو صحابہ کی خدمت میں رہ کر اجتہاد کا درجہ حاصل کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ عطا ابن ابی رباحؒ کے ہوتے



ہوئے لوگ میرے پاس کیوں آتے ہیں؟ حج کے زمانے میں حکومت کی طرف سے ہمیشہ ایک اعلان کیا جاتا تھا کہ ''عطاؒ کے سوا کوئی شخص فتویٰ دینے کا مجاز نہیں ہے۔'' جب امامِ اعظمؒ استفادے کی غرض سے حضرت عطاؒ کی درسگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ نے حضرت ابو حنیفہؒ سے ان کے عقیدے کے بارے میں پوچھا۔

جواباً امامِ اعظمؒ نے کہا۔ ''میں اسلاف کو برا نہیں کہتا۔ گناہ گار کو کافر نہیں سمجھتا۔ قضا و قدر کا قائل ہوں۔''

یہ سن کر حضرت عطاؒ نے ابو حنیفہؒ کو اپنے درس میں شامل ہونے کی اجازت دے دی۔ امامِ اعظمؒ استاد کے ادب اور حصولِ علم کے خیال سے اکثر خاموش رہتے مگر جب بھی بولتے آپ کی دانشورانہ صلاحیتیں ظاہر ہو جاتیں۔ آخر وہ وقت آ ہی گیا جب حضرت عطاؒ اپنے اس شاگردِ خاص کو احترام کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اور پھر کچھ دن بعد حاضرینِ مجلس نے یہ منظر بھی دیکھا کہ جیسے ہی امامِ اعظمؒ حلقۂ درس میں جاتے حضرت عطاؒ دوسرے لوگوں کو ہٹا کر انہیں اپنے پہلو میں جگہ دیتے ان تمام واقعات میں اہلِ نظر کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔

☆☆☆

تقریباً بائیس سال کی عمر میں ابو حنیفہؒ نے مدینہ منورہ کا سفر اختیار کیا۔ یہ شہر مقدس حدیث کا مخزن بھی تھا اور رسالت مآب ﷺ کی آخری آرام گاہ بھی۔ یہاں سات افراد حدیث و فقہ میں درجۂ کمال رکھتے تھے۔ یہ تابعین کی ایک معزز جماعت تھی۔ شرعی مسائل میں عام طور پر لوگ ان ہی حضرات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب امامِ اعظمؒ دیارِ رسولؐ میں پہنچے تو ان بزرگوں میں سے صرف دو اشخاص زندہ تھے۔ ایک سلیمانؒ دوسرے سالم بن عبداللہؒ۔ سلیمانؒ حضرت میمونہؓ کے غلام تھے اور حضرت میمونہؓ کو رسول کریمؐ کی زوجہ مطہرہ ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اسی نسبتِ خاص کے سبب حضرت سلیمانؒ کو سات فقیہوں کے گروہ میں دوسرا نمبر حاصل تھا۔ سالمؒ حضرت عمر فاروقؓ کے پوتے تھے انہوں نے اپنے والد محترم حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی آغوشِ محبت میں تربیت حاصل کی تھی۔ امامِ اعظمؒ ان دونوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے علم کی کتاب میں نئے باب کا اضافہ کیا۔

☆☆☆

امامِ اعظمؒ کے علم کی تشنگی کا یہ حال تھا کہ زندگی کے آخری ایام تک حصولِ تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔

اکثر حرمین تشریف لے جاتے اور مہینوں قیام فرماتے۔ حج کی تقریب میں اسلامی ممالک کے گوشے گوشے سے بڑے بڑے اہلِ کمال مکہ معظمہ آ کر جمع ہوتے تھے۔ امام اعظمؒ ان بزرگوں سے ملاقات کرتے اور آفتابِ علم کی تیز شعاعوں سے اپنے دل و دماغ کو روشن کرتے۔ علم کا وہ کون سا دریا تھا جس کے کنارے ابوحنیفہؒ نہ پہنچے۔ فضل و کمال کا وہ کون سا چشمہ تھا جس سے امام اعظمؒ سیراب نہ ہوئے۔ تحقیق و جستجو کا وہ کون سا آبشار تھا جس کے پانی کا ذائقہ نعمان بن ثابتؒ نے نہ چکھا ہو۔ یہی وہ آتشِ شوق تھی جس کے شعلوں نے انہیں قبر تک جلایا۔ اور پھر ان کی قبر کی خاک اہلِ ایمان کے لیے اکسیر بن گئی۔

مکہ معظمہ کے قیام کے دوران ہی ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امام اعظمؒ کی ذہانت اور اجتہاد کی شہرت دور دور پھیل گئی تھی۔ ظاہری علوم رکھنے والوں نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابو حنیفہؒ کے علم کی بنیاد محض قیاس پر ہے۔ اس ہی دنوں عبداللہ بن مبارکؒ نے بیروت کا سفر کیا۔ عبداللہ بن مبارک، امام اعظمؒ کے مشہور شاگرد تھے لیکن یہ فنِ حدیث کی تکمیل کے لیے امام اوزاعیؒ کی صحبت سے فیضیاب ہونا چاہتے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں امام اوزاعیؒ نے ان سے پوچھا ”کوفے میں ابوحنیفہؒ نام کا کون شخص پیدا ہوا ہے جو دینِ اسلام میں نئی نئی باتیں نکالتا ہے؟“

عبداللہ بن مبارکؒ نے امام کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی کے ساتھ گھر واپس چلے آئے۔ دو تین دن بعد دوبارہ گئے تو کچھ کاغذات لیتے گئے۔ امام اوزاعیؒ نے ان کے ہاتھ سے وہ کاغذات لے لیے سرنامے پر لکھا تھا ”قَالَ نعمان بن ثابت۔“

امام اوزاعیؒ بہت دیر تک ان تحریروں کا مطالعہ کرتے رہے پھر عبداللہ بن مبارکؒ سے پوچھا۔ ”یہ نعمان بن ثابت کون بزرگ ہیں؟“

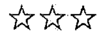
عبداللہ بن مبارکؒ نے جواب دیا ”عراق کے رہنے والے ایک شخص ہیں میں نے ان کی صحبت میں کافی وقت گزارا ہے۔“

”یہ بڑے مرتبے کا انسان ہے۔“ امام اوزاعیؒ کا لہجہ انتہائی اثر انگیز تھا۔

عبداللہ مبارکؒ نے کہا ”یہ وہی ابوحنیفہؒ ہیں جن کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ وہ دین میں نئی نئی باتیں پیدا کرتے ہیں۔“ امام اوزاعیؒ کے چہرۂ مبارک پر ندامت کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر چند لمحوں بعد انہوں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ حج کی تقریب سے فارغ ہو کر جب امام اوزاعیؒ مکہ معظمہ پہنچے تو ابوحنیفہؒ سے ملاقات ہوئی، گفتگو کے دوران ان ہی مسائل کا ذکر آیا۔



اتفاق سے عبداللہ بن مبارکؒ بھی موجود تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ابوحنیفہؒ کی تقریر سن کر امام اوزاعیؒ حیران رہ گئے جب ابوحنیفہؒ مجلس سے تشریف لے گئے تو امام اوزاعیؒ نے فرمایا۔ ”اس شخص کے کمال نے لوگوں کو حاسد بنا دیا ہے۔ بلاشبہ میری بدگمانی غلط تھی جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔“ بعد میں حضرت ابو حنیفہ نے فنِ حدیث میں امام اوزاعیؒ کی شاگردی اختیار کی۔ علم کی راہ میں یہ جوشِ طلب، اخلاقِ عالیہ کا یہ مظاہرہ، یہ فراخ دلی، یہ انکسار، اپنی مثال آپ ہے۔



ایسا ہی ایک واقعہ حضرت امام باقرؒ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ جب ابوحنیفہؒ دوسری بار مدینہ گئے تو امام موصوف کی خدمت میں حاضری دی۔ ان کے ایک ساتھی نے تعارف کی رسم ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی ابوحنیفہؒ ہیں۔“

حضرت امام باقرؒ نے بہت غور سے آپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم ہی قیاس کی بنیاد پر ہمارے دادا کی حدیثوں سے اختلاف کرتے رہو۔“

ابوحنیفہؒ نے نہایت ادب سے کہا ”معاذ اللہ! حدیث کی کون مخالفت کر سکتا ہے؟ آپ اجازت دیں تو کچھ عرض کروں۔“

حضرت امام باقرؒ نے اپنی رضامندی ظاہر کی تو ابوحنیفہؒ نے سوال کیا۔ ”مرد ضعیف ہے یا عورت؟“

”عورت۔“ حضرت امامؒ نے فرمایا۔

”وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا؟“ ابوحنیفہؒ نے دوسرا سوال کیا۔

”مرد کا۔“ امام باقرؒ نے جواب میں کہا۔

”اگر میں اپنے قیاس کا سہارا لیتا تو یہ کہتا کہ عورت کو زیادہ حصہ ملنا چاہئے کیونکہ ظاہری قیاس کی بنیاد پر ضعیف اس رعایت کا زیادہ حقدار ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ابوحنیفہؒ نے ایک اور سوال کیا۔ ”نماز افضل ہے یا روزہ؟“

”نماز۔“ امام باقرؒ نے جواب دیا۔

”اس اعتبار سے حائضہ عورت پر نماز کی قضا ہونی چاہئے نہ کہ روزے کی اور میں بھی روزے ہی کی قضا کا فتویٰ دیتا ہوں۔“

ابوحنیفہؒ کا جواب سن کر امام باقرؒ نے فرطِ مسرت میں آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اس ملاقات کے

بعد ابو حنیفہؒ نے حضرت امام باقرؒ کی خدمتِ عالیہ میں ایک طویل عرصہ گزارا اور حدیث وفقہ کے سلسلے میں بہت سی نادر معلومات حاصل کیں۔ حضرت امام جعفر صادقؒ کی صحبتوں سے بھی آپ نے فائدہ اٹھایا۔

حضرت امام مالک بن انسؒ عمر میں ابو حنیفہؒ سے تیرہ سال چھوٹے تھے مگر ابو حنیفہؒ اکثر ان کے درس میں حاضر ہوتے تھے۔ علامہ ذہبیؒ نے اپنے ایک تذکرے میں لکھا ہے کہ امام مالکؒ کے سامنے ابو حنیفہؒ اس طرح باادب ہوکر بیٹھتے تھے جیسے کوئی شاگرد استاد کے سامنے بیٹھتا ہے۔ بعض کوتاہ اندیش حضرات نے اس واقعے کو بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا ہے اور امام اعظمؒ کے مرتبے کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر وہ قدرت کے اس مسلمہ اصول کو نظر انداز کر گئے کہ زمین سے اٹھنے والا گرد وغبار سورج تک نہیں پہنچ سکتا، یہ علم کی قدر شناسی کی انتہا تھی جسے کم نظر لوگوں نے تماشا بنا دیا۔ اگر وہ خود امام مالکؒ کے طرزِ عمل کو دیکھ لیتے تو شاید اس بے ادبی کے مرتکب نہ ہوتے۔

عبداللہ بن مبارکؒ کی روایت ہے کہ ایک بار میں امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر تھا' ایک درویش تشریف لائے جن کی امام نے بہت تعظیم کی اور انہیں برابر بٹھایا جب وہ چلے گئے تو فرمایا۔ ''جانتے ہو یہ کون صاحب تھے؟ یہ ابو حنیفہؒ عراقی تھے جو پتھر کے اس ستون کو اگر سونے کا ثابت کرنا چاہیں تو کوئی انہیں روک نہیں سکتا۔'' کچھ دیر بعد دوسرے بزرگ آئے امام مالکؒ نے ان کی بھی تعظیم کی مگر ابو حنیفہؒ سے کم۔ وہ اٹھ کر گئے تو لوگوں سے کہا۔ ''یہ سفیان ثوریؒ تھے۔''

دنیا کی رسموں میں الجھے ہوئے لوگوں نے مردانِ خدا کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ورنہ ان پر یہ راز فاش ہو جاتا کہ وہ لوگ علم وکردار کی بنیادوں پر ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ ان کے یہاں عمر کی کوئی قید نہیں تھی۔ اگر ابو حنیفہؒ نے امام مالکؒ کے سامنے مثالی ادب کا مظاہرہ کیا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ امام مالکؒ بہر حال امامِ وقت تھے ابو حنیفہؒ نے علم کے راستے میں ایک خاکروب کا بھی احترام کیا ہے۔ مشہور روایت ہے کہ ایک مسئلے میں جب ذہن الجھ گیا تو آپ صبح کے وقت اپنے مکان کے سامنے ٹہلنے لگے۔ خاکروب نے حسبِ عادت سلام کیا مگر امام اعظمؒ خیالات میں اس قدر مستغرق تھے کہ معمول کے مطابق اسے جواب نہ دے سکے۔ خاکروب کو فکر لاحق ہوئی اس نے آپ کی ذہنی پریشانی کا سبب پوچھا۔ ابو حنیفہؒ نے اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن خاکروب کو آپ سے بہت محبت تھی۔ اس کی ضد قائم رہی۔ بالآخر آپ کو مجبوراً اپنے مسئلہ بتانا پڑا۔ یہ کتّے سے متعلق ایک علمی تحقیق تھی۔ خاکروب اس سوال کا جواب جانتا تھا اس نے ایک لمحے میں امام اعظمؒ کو مطمئن کر دیا۔ اس واقعے کے بعد جب بھی خاکروب ابو حنیفہؒ کے دروازے کے سامنے سے گزرتا اور اس وقت آپ موجود ہوتے تو آپ احتراماً



کھڑے ہو جاتے۔ بعض دوستوں اور ملاقاتیوں نے اس طرزِ عمل کا سبب پوچھا تو امام اعظمؒ نے فرمایا۔ ''یہ خاکروب ایک مسئلے میں میرا استاد ہے۔ ابو حنیفہ کو اس بات سے شرم آتی ہے کہ وہ استاد کے سامنے بے ادبی کا مظاہرہ کرے اور بے نیازانہ بیٹھا رہے۔''

جس کی غیرتِ احساس کا یہ عالم ہو اس شخص کے جذبات کا صحیح اندازہ کرنا امرِ محال ہے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ امام اعظم اپنے استادوں کا بے حد احترام کرتے تھے مگر ان کے جذبات کی شدت کو ثابت کرنے کے لیے کوئی آخری پیمانہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک اس صفت میں بھی کوئی امام کا حریف نہیں تھا۔ ہم قدرت کے رازوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں لیکن پھر بھی گمان ہوتا ہے کہ شاید اسی وجہ سے خدا نے انہیں امامِ اعظم کے درجے تک پہنچایا۔

مشہور بزرگ عمرو بن سلیمان عطارؒ کہتے ہیں کہ میں قیامِ کوفہ کے دوران حضرت امامِ اعظم کی مجلسِ درس میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں آپ کے نامور شاگرد امام زفرؒ کی شادی ہوئی۔ حضرت امام اعظمؒ بھی اس تقریب میں موجود تھے۔ جب نکاح کا وقت آیا تو امام زفرؒ نے حضرت امام اعظمؒ سے یہ رسم مسنون ادا کرنے کی درخواست کی۔ حضرت ابو حنیفہؒ نے خطبہ نکاح پڑھا اور بعد میں فرمایا۔ ''یہ زفر بن ہذیلؒ مسلمانوں کے اماموں میں ایک بڑے امام ہیں اور دین کی نشانیوں میں ایک نشانی ہیں۔ یہ اپنی خاندانی وجاہت اور علم وفضل کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔''

امام زفرؒ کی قوم کے کچھ لوگوں نے یہ تعریفی کلمات سن کر کہا کہ اگر امام اعظمؒ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نکاح پڑھاتا تو ہمیں اتنی خوشی نہ ہوتی۔ مگر کچھ لوگوں نے اپنی خاندانی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے امام زفرؒ کے اس عمل پر نکتہ چینی کی۔ ''جب تمہارے اہلِ خاندان اور شرفائے قوم یہاں موجود تھے تو تم نے خطبہ نکاح کے لیے ایک غیر شخص کا انتخاب کیوں کیا؟''

اپنے رشتے داروں کی یہ گفتگو سن کر امام زفرؒ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آپ نے تعلقات کی نزاکتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا'' آپ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ حضرت امامؒ کے سوا میرا اعزیز ہے کون؟ اگر اس وقت والد محترم بھی ہوتے تو خدا کی قسم میں انہیں ابو حنیفہؒ پر ترجیح نہ دیتا۔''

اس کے برعکس ابو حنیفہؒ کے اساتذہ بھی آپ کا اس قدر ادب واحترام کرتے تھے کہ لوگ یہ مناظر دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتے تھے۔ محمد بن فضل کا بیان ہے کہ ایک بار ابو حنیفہؒ ایک حدیث کی تحقیق کے لیے حضرت خضیبؒ کے پاس تشریف لے گئے میں بھی ساتھ تھا۔ خضیبؒ نے انہیں آتے دیکھا تو فوراً اٹھ

کھڑے ہوئے اور نہایت تعظیم کے ساتھ لاکر اپنے برابر بٹھایا۔ اسی طرح مکہ معظمہ کے مشہور محدث عمرو بن دینارؒ درس دیتے وقت ابوحنیفہؒ کی موجودگی میں کسی اور سے خطاب نہیں کرتے تھے۔

تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں مگر انہیں یکجا کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ ابوحنیفہؒ کی زندگی کے اس پہلو کو دیکھنے کے بعد قرآن حکیم کا وہ فیصلہ یاد آجاتا ہے جس میں وضاحت کے ساتھ خداوند ذوالجلال نے اپنی مرضی بیان کی ہے **ھل جزاء الاحسان الا الاحسان** (احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں ہے)

☆☆☆

امامِ اعظمؒ نے اگرچہ حضرت حمادؒ کی زندگی ہی میں اجتہاد کا درجہ حاصل کرلیا تھا مگر آپ کے شاگردانہ خلوص نے یہ گوارا نہیں کیا کہ استاد کے ہوتے ہوئے اپنی مجلس الگ آراستہ کریں۔ خود ابوحنیفہؒ فرماتے تھے کہ جب تک حمادؒ زندہ رہے میں نے ان کے مکان کی طرف کبھی پاؤں نہیں پھیلائے۔ حضرت حمادؒ نے ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ ان کے انتقال سے کوفے میں ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ اہلِ شہر بہت مضطرب تھے۔ مجبوراً حضرت حمادؒ کے بیٹے کو مسندِ درس پر بٹھایا گیا۔ اگرچہ وہ ایک لائق فرزند تھے لیکن ادب و زبان کی طرف زیادہ مائل تھے۔ آخر کچھ دن بعد موسیٰ بن کثیر نے ان کی جگہ لے لی۔ یہ بزرگ فقہ کے بہت بڑے ماہر نہ تھے مگر عمر اور تجربے میں انہیں امتیاز حاصل تھا۔ اکثر فقیہوں کی صحبتیں اُٹھائی تھیں اس لیے لوگوں پر ان کا خاص اثر تھا چند روز تک موسیٰ بن کثیر کا درس جاری رہا جب وہ حج کو چلے گئے تو حضرت ابو حنیفہؒ سے درخواست کی گئی کہ آپ مسندِ درس کو شرف بخشیں۔

امامِ اعظمؒ اس عہدے کو قبول کرنے سے پہلے مسلسل انکار کرتے رہے آپ واضح الفاظ میں فرماتے تھے کہ میں ان ذمہ داریوں کا اہل نہیں ہوں مگر لوگ ابوحنیفہؒ کے اس اعترافِ عجز کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ وہ پیہم اصرار کرتے رہے۔ انجام کار امامِ اعظمؒ نے علم کی وراثت کو قبول کرلیا اور انتہائی انکسار کے ساتھ استاد کی جگہ بیٹھ کر پہلا درس دیا۔ اہلِ کوفہ آپ کی علمی موشگافیوں اور اندازِ تقریر میں کھو گئے۔ لیکن خود ابوحنیفہؒ کو اطمینانِ قلب حاصل نہیں تھا۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو اس جلیل القدر منصب کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔

اسی زمانے میں امامِ اعظمؒ نے خواب دیکھا کہ آپ پیغمبرِ اسلامؐ کا مزار مبارک کھود رہے ہیں۔ خوف و دہشت سے آنکھ کھل گئی۔ ابوحنیفہؒ نے یہی سمجھا کہ میری نااہلیت کی طرف اشارہ ہے۔ پھر بھی آپ نے



علمِ تعبیر کے استاد سے رجوع کیا۔ خواب کی تعبیر دینے والے بزرگ نے بتایا کہ آپ مردہ علم کو زندہ کریں گے۔ اس تعبیر سے امامِ اعظمؒ کو تسکین ہوئی اور آپ اطمینان کے ساتھ درس دینے لگے۔

شروع میں حضرت حمادؒ کے پرانے شاگرد ہی شریکِ درس ہوئے لیکن کچھ عرصے بعد وہ شہرت ہوئی کہ کوفے کی اکثر درس گاہیں ٹوٹ کر امام اعظم کے حلقے میں شامل ہوگئیں۔ انتہا یہ کہ خود ابوحنیفہ کے اساتذہ بھی آپ سے استفادہ کرتے تھے اور دوسرے لوگوں کو اس درس میں شریک ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔

وہ چراغ جو ثابتؒ کے گھر روشن ہوا تھا۔ جس کی روشنی میں حضرت علیؓ کی دعائیں شامل تھیں، اب وہی معرفت کا چراغ اپنی تیز شعاعوں سے ساری دنیا کو روشن کررہا تھا۔ اسپین کے علاوہ اسلامی دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو امامِ اعظمؒ کی شاگردی کے تعلق سے آزاد رہا ہو۔ جن جن مقامات کے رہنے والے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان سب کا شمار ممکن نہیں۔

☆☆☆

امامِ اعظمؒ کا حلقۂ اثر کسی طرح بھی خلیفۂ وقت سے کم نہیں تھا۔ ابوحنیفہؒ کی اسی شہرت و عظمت کو دیکھ کر بعض کم نظر حضرات نے آپ کو عراق کے سیاسی انقلابات میں ملوث کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ محض خیالِ خام تھا۔ ایک پُرفریب بدگمانی تھی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے حضرت زید بن علیؓ کی بغاوت میں امامِ اعظمؒ کو بھی شریک قرار دیا ہے۔ یہ واقعہ ۱۲۱ھ کا ہے۔ اس وقت ہشام بن عبدالملک خلیفہ تھا۔ حضرت زین بن علیؓ خاندانِ سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ابوحنیفہؒ کو سلسلۂ اہل بیت سے ایک خاص عقیدت تھی۔ شاید اسی غلط فہمی کی بنیاد پر حضرت زید بن علیؓ کے ساتھ امامِ اعظمؒ کا نام بھی شامل کیا گیا۔

۱۲۵ھ میں ہشام کا انتقال ہوا۔ خلافت کی ذمے داری ولید بن یزید سے منتقل ہوتی ہوئی مروان تک پہنچی۔ بہت عرصے سے عباسی خلافت کے لیے زیرِ زمین کام ہو رہا تھا۔ مروان کے عہد میں یہ تحریک زیادہ شدت اختیار کرگئی۔ ابومسلم خراسانی نے تمام ملک میں سازشوں کا جال پھیلا دیا تھا۔ بیشتر فسادات کا مرکز عراق تھا اور عراق میں خاص طور پر شہر کوفہ۔ مروان نے سیاسی ریشہ دوانیوں کو ختم کرنے کے لیے یزید بن عمر کو عراق کا گورنر مقرر کیا۔ یہ شخص نہایت جلد اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ علمائے کرام کی شمولیت کے بغیر حکومت کا استحکام ممکن نہیں۔ یزید، مذہب کے ستونوں پر ایوانِ خلافت کی تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ نتیجتاً اس نے

عراق کے سارے نامور فقیہوں کو طلب کیا اور انہیں اہم ترین ملکی خدمات پر مامور کر دیا۔ وہ امام اعظمؒ کو میر منشی اور افسر خزانہ مقرر کرنا چاہتا تھا مگر آپ نے صاف انکار کر دیا۔

"تمہیں جبراً منظور کرنا ہوگا۔" یزید بن عمر نے قسم کھا کر کہا۔

"میں انکار کرتا ہوں۔" امام اعظمؒ نے انتہائی باوقار لہجے میں فرمایا "تیرے قسم کھانے سے میرا ارادہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ انشاءاللہ تو مجھے آخری سانس تک ثابت قدم پائے گا۔"

یہ بڑا واضح انکار تھا اور رسم دنیا کے اعتبار سے توہینِ حاکم بھی۔ وقت کی نزاکت دیکھ کر امام اعظمؒ کے قریبی دوستوں نے بھی سمجھایا کہ آپ یزید بن عمر کی بات مان لیں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر ابو حنیفہؒ کے پائے استقامت میں ہلکی سی بھی جنبش نہیں ہوئی۔ آپ نے مزید فرمایا "میں تو یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ یزید مجھے مسجدوں کے دروازوں کو گننے کا حکم دے اور میں اس کی تعمیل کروں پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ایک مسلمان کے قتل کا فرمان لکھے اور میں اس پر اپنی مہر ثبت کر دوں۔"

یہ ایک ایسا جواب تھا جس سے یزید عمر کے کان آشنا نہیں تھے۔ وہ غضب ناک ہو گیا اور اس عالمِ طیش میں حکم دیا کہ ہر روز امامؒ کے دس درے لگائے جائیں۔ کچھ دن تک اس ظالمانہ حکم کی تعمیل ہوتی رہی مگر ابوحنیفہؒ اپنی ضد سے باز نہیں آئے آخر مجبور ہو کر یزید نے آپ کو چھوڑ دیا۔ ایک روایت ہے کہ امامِ اعظمؒ اس اذیت ناک مرحلے سے گزرنے کے بعد مکہ معظمہ روانہ ہو گئے اور ۱۳۶ھ کے آخر تک وہی قیام پذیر رہے۔

☆☆☆

۱۳۲ھ میں وقت نے کروٹ لی۔ بنوامیہ کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ آلِ عباس جو زمانہ دراز سے تاج و تخت کے خواہش مند تھے انہیں ان کے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ اس خاندان کا پہلا فرمانروا ابوالعباس سفاح تھا۔ اس نے چار سال تک حکومت کی اور ۱۳۶ھ میں وفات پائی۔ سفاح کے بعد اس کا بھائی منصور تخت نشین ہوا۔ عباسیوں نے اموی خاندان سے اس قدر بھیانک انتقام لیا تھا کہ اس کی نظیر انسانی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ ظلم و ستم کی انتہا یہ ہے کہ خلفائے بنوامیہ کی قبریں کھدوا کر ان کی ہڈیاں تک جلا دی گئی تھیں۔ ہر طرف فتنے سر اٹھا رہے تھے۔ ان بغاوتوں کو کچلنے میں سفاح اور منصور دونوں اعتدال کی حدوں سے بہت دور نکل گئے تھے۔ خلافتِ عباسیہ کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے انہوں نے اپنے ہم مذہبوں پر وہ قہر توڑے کہ مروان کے جبر و تشدد کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ تمام لوگوں کی آنکھیں مملکت



اسلامی کے نئے جانشینوں پر لگی ہوئی تھیں مگر سفاح اور منصور نے مخلوق کو بہت زیادہ مایوس کیا۔

ایک موقع پر منصور نے اپنے بچپن کے دوست عبدالرحمٰن سے پوچھا "ہماری حکومت کو مروان کی سلطنت سے کیا نسبت ہے؟"

عبدالرحمٰن نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جواب دیا "مجھے تو دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔"

دوست کی بے باکی دیکھ کر منصور شرمندہ ہو گیا مگر اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔

ظلم کے شعلے یہاں تک بھڑکے کہ خاندانِ سادات بھی ان کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سادات ایک طویل عرصے سے خلافت کا منصوبہ بنا رہے تھے مگر سفاح کے انتقال تک ان کی کوئی سازش ظاہر نہیں ہوئی تھی صرف بدگمانی کو جواز بنا کر منصور نے سادات کی بنیادیں کھود ڈالیں، جو لوگ ان میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے ان پر زیادہ قیامتیں ٹوٹیں۔ آخر تنگ آ کر ۱۴۵ھ میں محمد نفس ذکیہؒ جن کا تعلق سادات سے تھا، چند آدمیوں کے ہمراہ مدینے کی طرف بڑھے یہاں کچھ دنوں میں ایک بڑی جمعیت پیدا ہو گئی۔ مشہور مذہبی پیشوا بھی ان کے ہمنوا ہو گئے تھے۔ انتہا یہ کہ حضرت امام مالکؒ نے بھی فتویٰ دے دیا تھا۔

"منصور نے جبراً بیعت لی ہے خلافت محمد نفس ذکیہؒ کا حق ہے۔"

نفس ذکیہؒ نہایت دلیر اور فنِ جنگ سے واقف تھے لیکن تقدیر کے فیصلوں کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ حضرت نفس ذکیہؒ میدان کارزار میں اس طرح لڑے کہ ان کی شجاعت کے آگے سرفروشی کے لیے بے شمار افسانے دھندلے پڑ گئے۔ مگر فتح ان سے بہت دور تھی۔ بالآخر رمضان ۱۴۵ھ میں انہوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

خلیفہ منصور بہت خوش تھا کہ اس کے راستے کا ایک سنگِ گراں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا۔ حضرت نفس ذکیہؒ کے بعد ان کے بھائی حضرت ابراہیمؒ نے پرچم حق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حضرت ابراہیمؒ کی جنگی تیاریوں کا اس قدر شور تھا کہ کچھ دنوں کے لیے منصور کے ہوش و حواس جاتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب حرم میں دو نئی کنیزیں داخل ہوئیں تو اس نے ان سے بات تک نہیں کی۔ کسی نے اس بے رخی کا سبب پوچھا تو منصور نے جواب دیا۔ "اس وقت تو ذہن پر بس ایک ہی خیال مسلط ہے کہ ابراہیم کا سر میرے آگے یا میرا سر ابراہیم کے آگے رکھا جائے۔"

اسی کش مکش کے دوران امامِ اعظمؒ کے ایک گہرے دوست ابراہیم بن میمون نے آپ سے سوال کیا ''کیا ہمیں خلیفہ کے مظالم پر خاموش رہنا چاہئے۔''

ابو حنیفہؒ نے فرمایا ''امر بالمعروف بلاشبہ فرض ہے مگر اس کے لیے سامان شرط ہے۔''

ابراہیم بن میمون نہایت دیندار عالم تھے لیکن مذہبی جوش میں ان کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ امامِ اعظمؒ کی تمام نصیحتوں کو نظرانداز کر کے ابو مسلم خراسانی کے پاس پہنچے۔ یہی شخص تمام فتنوں کا بانی تھا۔ ابراہیم بن میمون نے مسلمانوں کے قتل عام کے سلسلے میں اس سے نہایت بے باکی کے ساتھ گفتگو کی۔ ابو مسلم خراسانی نے فساد پھیلنے کے خوف سے انہیں قتل کرا دیا۔ جب امام اعظمؒ کو اس جانگداز سانحے کی خبر ملی تو آپ بہت روئے۔

۱۴۵ھ میں نفس ذکیہؒ کی شہادت کے بعد حضرت ابراہیمؒ نے علم بلند کیا تو دوسرے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ امام اعظمؒ نے بھی تاکید کی اس وقت ابو حنیفہؒ کے مجاہدانہ جذبے کا یہ حال تھا کہ آپ بہ نفسِ نفیس اس جنگ میں شریک ہونا چاہتے تھے مگر کچھ مجبوریاں دامن کش تھیں جس کے باعث آپ اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ بعض کتابوں سے آپ کے ایک خط کا بھی پتا چلتا ہے امام اعظمؒ نے یہ حضرت ابراہیمؒ کے نام تحریر کیا تھا۔

''میں آپ کی خدمت میں چار ہزار درہم ارسال کر رہا ہوں۔ اس وقت یہی میرا اثاثہ ہے۔ اگر لوگوں کی امانتیں میرے پاس نہ رکھی ہوتیں تو میں بھی میدانِ جنگ میں آپ سے آملتا۔''

کچھ لوگوں نے اس خط کی صحت سے انکار کیا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ آپ نے حضرت ابراہیمؒ کی ہر طرح سے مدد کی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ بذاتِ خود جنگ میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ حضرت ابراہیمؒ نے میدان جنگ میں مثالی شجاعت کا مظاہرہ کیا لیکن شکست کھائی۔ امام اعظمؒ کو تمام عمر ان کی موت کا قلق رہا۔ اپنی عدم شرکت کے بارے میں آپ اکثر فرماتے تھے۔

''افسوس کہ میں اس جنگ میں شریک نہ ہو سکا۔ کاش میں بھی اس جماعت میں شریک ہوتا جو حق و انصاف کی سربلندی کے لیے ظالموں سے جہاد کر رہی تھی۔'' یہ اظہارِ افسوس کوئی ایک دن کی بات نہیں تھی جب تک زندہ رہے اپنی زبانِ مبارک سے یہی کلمات ادا کرتے رہے۔

☆☆☆

بغاوت و جنگ کی اس ہولناک مہم سے فراغت پانے کے بعد منصور ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا



جنہوں نے حضرت ابراہیم کا ساتھ دیا تھا۔ امام اعظمؒ بھی ایک اعتبار سے مخالفوں میں شامل تھے۔ منصور نے سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر سب سے پہلے پایہ تخت کو ہاشمیہ سے بغداد منتقل کیا اور پھر یہاں پہنچتے ہی اس نے ابو حنیفہؒ کے نام فرمان بھیجا کہ فوراً دربار میں حاضر ہوں۔ امامِ اعظمؒ بنو امیہ کی تباہی کے بعد مکہ معظمہ سے کوفہ تشریف لے آئے تھے۔ منصور کا خط ملتے ہی آپ بغداد روانہ ہو گئے۔ خلیفہ کے قریبی مصاحب ربیع نے آپ کو ان الفاظ کے ساتھ دربار میں پیش کیا۔ ''آج یہ شخص دنیا کا سب سے بڑا عالم ہے۔''

منصور نے آپ کے استادوں کے اسمائے گرامی پوچھے۔ جواباً امام اعظمؒ نے ان تمام بزرگوں کے نام بتا دیئے جن کا سلسلۂ شاگردی بڑے بڑے صحابہ تک پہنچتا تھا۔ اس تفصیلی گفتگو کے بعد منصور نے آپ کے لیے قضا کا عہدہ تجویز کیا۔

''میں اپنے ناتواں جسم میں اس بارِگراں کو اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا۔'' امامِ اعظمؒ نے انتہائی ذہانت سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کی۔ آپ منصور کے ارادوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے الفاظ کا سہارا لیا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' منصور غضب ناک ہو گیا۔

''جب میں آپ کے نزدیک جھوٹا ہوں تو پھر ایک جھوٹا شخص کس طرح قاضی ہو سکتا ہے۔'' منصور امامِ اعظمؒ کی منطق کے سامنے لاجواب ہو گیا۔ مگر بعد میں آپ نے اپنے عذر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ''میں نسلی اعتبار سے عجمی ہوں اس لیے اہلِ عرب کو میری حکومت ناگوار گزرنے لگی۔ سلطنت کی رسموں کے مطابق مجھے درباریوں کی تعظیم کرنی پڑے گی اور یہ میرے بس کی بات نہیں۔''

منصور کو آپ کی یہ حقیقت بیانی گراں گزری۔ وہ ہر حال میں اپنے حکم کی تعمیل چاہتا تھا۔ امامِ اعظمؒ کی طرف سے مسلسل انکار سن کر وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور قسم کھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تمہیں یہ عہدہ قبول کرنا ہوگا۔''

امامِ اعظمؒ نے بھی اسی شدت سے قسم کھائی۔ ''میں ہرگز قبول نہیں کروں گا۔''

آپ کی اس جرات پر تمام اہلِ دربار حیران رہ گئے۔ منصور کے مصاحبِ خاص ربیع نے غصے میں آ کر کہا ''تم امیر المومنین کے مقابلے میں قسم کھاتے ہو؟''

"ہاں۔" امام اعظمؒ نے فرمایا "اس لیے کہ امیرالمومنین کی قسم کا کفارہ ادا کرنا میری نسبت زیادہ آسان ہے۔" ابوحنیفہؒ نے اپنے عملی کمالات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر شخص کو بے زبان کر دیا تھا مگر اقتدار کا نشہ کسی زبان کو نہیں سمجھتا۔ منصور کا دل پہلے ہی آپ کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ اس تازہ واقعے کو حکومت کی نافرمانی قرار دے کر اس نے امام اعظمؒ کو قید خانے میں ڈال دیا جب اس کا دل چاہتا تو آپ کو زنداں سے نکال کر مذہبی بحثیں کرتا رہتا۔ بہت دنوں تک یہی معمول رہا۔

☆☆☆

قرانِ حکیم کی ایک آیت مقدسہ کا مفہوم یہ ہے۔ "اگر تمہارے ماں باپ بڑھاپے کی حدوں تک پہنچ جائیں تو خبردار ایک لفظ بھی ایسا نہ کہنا جس سے ان کی دلآزاری ہو۔" رسالت مآب ﷺ بھی اکثر فرماتے تھے جس کا مفہوم یوں ہے "ہلاک ہو جائے وہ شخص جس نے بوڑھے ماں باپ کو پایا اور اپنی مغفرت نہ کرا سکا۔" قران و حدیث کے اس حکم کی روشنی میں آپ دیکھیں گے کہ کوئی بھی بزرگ ماں باپ کی خدمت کے بغیر قبولیت کی منزل تک نہیں پہنچا۔ حضرت اویس قرنیؒ اور بایزید بسطامیؒ نے تو ماں کے احترام کے سلسلے میں وہ مثالیں پیش کیں کہ آج ان واقعات کی شہرت ایک تاریخی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اگر ہم امام اعظمؒ کی سیرت کا مطالعہ بغور کریں یہاں بھی وہی جذبہ کارفرما نظر آئے گا جو اویس قرنیؒ اور بایزید بسطامیؒ کے لیے باعثِ نجات بن گیا تھا۔ حضرت ابوحنیفہؒ کے والدِ محترم آپ کے سن بلوغت تک پہنچنے سے پہلے انتقال کر گئے تھے لیکن مادرِ گرامی طویل عرصے تک زندہ رہیں اور امام اعظمؒ کو ان کی خدمت کے بے شمار مواقع میسر آئے۔ عام عورتوں کی فطرت کے مطابق آپ کی والدہ ماجدہ کچھ شکی مزاج تھیں۔ علمائے کرام کے مقابلے میں' قصے بیان کرنے والے واعظوں کو زیادہ پسند کرتی تھیں۔ کوفے میں عمرو بن ذر ایک مشہور واعظ تھے۔ ان سے آپ کو بے حد عقیدت تھی جب بھی کوئی شرعی مسئلہ پیش آتا تو امام اعظمؒ کو حکم دیتیں کو عمرو بن ذر سے پوچھ آؤ۔ ابوحنیفہؒ تعمیل ارشاد کے لیے عمرو کے پاس جا کر مسئلہ پوچھتے۔ وہ انتہائی ندامت کے ساتھ معذرت کرتے کہ میں آپ کے سامنے کس طرح زبان کھول سکتا ہوں، امام اعظمؒ فرماتے کہ والدہ محترمہ کا یہی حکم ہے اکثر ایسا ہوتا کہ عمرو بن ذر مسائل کا جواب دینے سے قاصر رہتے تو امام اعظمؒ سے درخواست کرتے کہ آپ مجھے بتا دیں میں اسی کو آپ کے سامنے دہرا دوں گا۔

کبھی کبھی اصرار کرتیں کہ میں خود چل کر دریافت کروں گی چنانچہ آپ گھوڑے پر سوار ہوتیں اور امامِ



اعظمؒ پیدل ساتھ ساتھ چلتے۔ خود مسئلے بیان کرتیں اور جب اپنے کانوں سے جواب سن لیتیں تب کہیں جا کر انہیں اطمینان حاصل ہوتا۔ ایک بار کوئی مسئلہ پیدا ہوا تو امام اعظمؒ سے پوچھا کہ مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ ابوحنیفہؒ نے انتہائی وضاحت سے جواب دیا سن کو بولیں۔ "تمہاری سند نہیں اگر زرقہ تصدیق کر دیں تو مجھے اعتبار آ جائے گا۔"

امام اعظمؒ ادب واحترام کے ساتھ اٹھے تمام کام ترک کر کے مادرِ گرامی کو زرقہ کی خدمت میں لے گئے اور صورت حال بیان کی زرقہ نے جواباً کہا "آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں میں کیا عرض کروں؟"

امام اعظمؒ نے فرمایا "اس سلسلے میں' میں نے یہ فتویٰ دیا تھا۔"

زرقہ نے کہا "بالکل درست ہے۔" زرقہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر والدہ محترمہ کو اطمینان ہوا اور پھر گھر واپس تشریف لائیں۔

☆☆☆

ابن ہبیرہ نے امام اعظمؒ کو بلا کر میر منشی مقرر کرنا چاہا مگر آپ نے صریحاً انکار کر دیا۔ حکومت واقتدار کے نشے میں اسے ابوحنیفہؒ کی یہ روش گراں گزری۔ نتیجتاً اس نے آپ پر سرکشی کا الزام عائد کر کے کوڑے لگوائے۔ اس وقت امام اعظمؒ کی والدہ حیات تھیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے "مجھے اپنی تکلیف کا ذرا بھی خیال نہیں تھا۔ لیکن یہ سوچ کر شدید اذیت کا احساس ہوتا تھا کہ میری وجہ سے مادرِ گرامی کے دل کو صدمہ پہنچ رہا ہے۔" یہ تھی قران وحدیث کے احکام کی عملی تفسیر۔ اسی جذبۂ احترام کے باعث خدا ان سے راضی ہوا اور وہ نعمان بن ثابت سے ابوحنیفہؒ کے درجے تک پہنچے۔ یہ ماں کی تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے جابر حاکم کے سامنے حق کی آواز بلند کی۔ اسیرِ زنداں ہوئے اور خدا کی راہ میں اپنے جسم کو ہدفِ ستم بننے کے لیے پیش کیا۔ یہ ماں کے ادب ہی کا صلہ تھا کہ انہیں مجلس میں آتا دیکھ کر استاد بھی تعظیماً کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور یہ ماں کی دعائیں ہی تھیں کہ وہ ہر معرکہ حیات میں سرخرو ہوئے۔ یہاں تک کہ ماضی و حال کے تمام اہلِ علم نے انہیں امام اعظمؒ کہہ کر پکارا اور مستقبل پر بھی ان ہی کی گرفت محسوس ہوتی ہے۔

☆☆☆

آپ اس قدر صادق القول اور بے باک تھے کہ اظہارِ حقیقت کے سلسلے میں کسی دباؤ کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ یہ آپ کی گرفتاری سے پہلے کا واقعہ ہے کہ خلیفہ منصور اور اس کی بیوی حرہ خاتون میں گفتگو کے دوران تلخی پیدا ہو گئی اسے شکایت تھی کہ خلیفہ انصاف نہیں کرتا۔ منصور نے اس بات کا فیصلہ کرنے کے

لیے ایک منصف کی تجویز پیش کی حرہ خاتون نے امام ابوحنیفہؒ کا نام لیا۔ منصور نے اسی وقت آپ کو دربار میں طلب کرلیا۔ خاتون نے اپنی نشست پردے کے قریب رکھی تاکہ وہ خود اپنے کانوں سے امام اعظمؒ کا فیصلہ سن سکے۔

''شرع کے اعتبار سے ایک مرد کتنے نکاح کرسکتا ہے؟'' منصور نے آپ سے سوال کیا۔

''چار۔'' امام اعظمؒ نے مختصر جواب دیا۔

منصور پیچھے کی طرف مڑا اور پس پردہ بیٹھی ہوئی اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ ''سنتی ہو۔''

حرہ خاتون نے آہستہ سے اقرار کیا۔ منصور خاموش ہوگیا اس کے نزدیک مسئلہ ختم ہوگیا۔ امام اعظمؒ نے چند لمحوں تک صورت حال کا جائزہ لیا اور پھر آپ کے باوقار آواز سے مجلس کا یہ سکوت ٹوٹ گیا۔

''بے شک اسلام میں چار نکاح جائز ہیں مگر یہ اجازت اس شخص کے لیے مخصوص ہے جو عدل و انصاف پر قدرت رکھتا ہو ورنہ ایک سے زیادہ شادیاں مناسب نہیں۔ پھر بھی کوئی ایسا کرتا ہے تو گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔''

یہ واضح اور مکمل جواب سن کر منصور خاموش ہوگیا اور آپ اجازت طلب کر کے گھر تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ حرہ خاتون کا ایک خادم پچاس ہزار درہم لے کر حاضر ہوا۔

''خاتون نے نذر بھیجی ہے اور ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ کنیز آپ کی حق گوئی کی نہایت مشکور ہے۔''

امام اعظمؒ نے وہ رقم واپس کرتے ہوئے فرمایا ''خاتون سے کہنا کہ میں نے جو کچھ خلیفہ کے سامنے بیان کیا وہ میرا فرضِ منصبی تھا اس میں کوئی غرض پوشیدہ نہ تھی۔''

☆☆☆

شروع میں کوفے کے گورنر ابن ہبیرہ نے سرکاری عہدہ قبول نہ کرنے کے سلسلے میں امام اعظمؒ کے جسمِ مبارک کو تشدد کا نشانہ بنایا مگر جب آپ کے پائے استقامت میں لغزش نہ ہوئی تو عقیدت مندوں کے حلقے میں شامل ہوگیا۔ وہ اکثر کہا کرتا ہے۔ ''اگر آپ کبھی کبھی تشریف لے آتے تو مجھ پر احسان ہوتا۔'' امام اعظمؒ جواب میں فرماتے ہیں ''میں تم سے مل کر کیا کروں گا مہربانی سے پیش آؤ گے تو خوف ہے کہ کہیں تمہارے دام میں گرفتار نہ ہوجاؤں۔ اگر اپنے اقتدار کا مظاہرہ کروگے تو میری ذلت ہے تم جو سیم وزر کا انبار رکھتے ہو مجھے اس کی ضرورت نہیں میرے پاس جو دولت ہے تم اسے چھین نہیں سکتے۔ پھر یہ تعلق کس طرح قائم ہو؟'' امام اعظمؒ کو اسی فطری قناعت و بے نیازی نے نام و نمود اور امرائے وقت کی



محفلوں میں شرکت سے باز رکھا۔

☆☆☆

پیشے کے اعتبار سے آپ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے لیکن تجارت سے ذاتی فائدہ مقصود نہیں تھا۔ پوری انسانی تاریخ میں ایسے چند ہی لوگ نظر آئیں گے جو صرف مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچانے کے لیے دولت جمع کرتے تھے۔ امام اعظمؒ نے اپنے تمام دوستوں اور ملنے والوں کے روزینے مقرر کردیے تھے۔ علمائے کرام اور محدثین کی جماعت کے لیے تجارت کا ایک حصہ مخصوص تھا۔ اس سے جو فائدہ حاصل ہوتا تھا۔ وہ سال کے اختتام پر ان حضرات کو پہنچا دیا جاتا۔ گھر والوں کے لیے جو چیز پسند کرتے اسی مقدار میں خرید کر محدثین اور علماء کے پاس بھی بھجواتے۔ شاگردوں میں سے اگر کوئی مالی الجھنوں کا شکار ہوتا تو اس کی تمام ضرورتیں پوری کرتے تاکہ وہ اطمینانِ قلب کے ساتھ علم حاصل کرسکے بہت سے لوگ جنہیں افلاس کی وجہ سے تحصیلِ علم کا موقع نہیں ملتا تھا وہ امام اعظمؒ ہی کی دستگیری کی بدولت بڑے بڑے مراتب تک پہنچے۔ قاضی ابو یوسفؒ بھی ان ہی افراد میں شامل تھے۔

یہ تھا ابوحنیفہؒ کی دولت کا استعمال۔ اب رہا آدابِ تجارت کا سوال تو اس میں امام اعظمؒ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آج کے سوداگر آپ کو تاجر ہی تسلیم نہیں کریں گے۔ ایک دن ایک عورت آپ کے پاس ایک قیمتی کپڑے کا تھان لے کر آئی اور کہنے لگی کہ اسے فروخت کرادیجیے۔ امام اعظمؒ نے قیمت دریافت کی عورت نے سو درہم بتائے۔ آپ نے فرمایا۔ ''دام کم ہیں'' اس عورت نے کہا کہ دو سو سمجھ لیجیے۔ حضرت ابوحنیفہؒ نے فرمایا ''اس تھان کی قیمت کسی بھی طرح پانچ سو درہم سے کم نہیں۔'' عورت حیران ہوکر آپ کے چہرہ مبارک کو دیکھنے لگی پھر آہستہ سے بولی ''آپ شاید مذاق کررہے ہیں۔'' جواب میں امام اعظمؒ نے عورت کو اپنے پاس سے پانچ سو درہم دے دیے۔ اور کپڑے کا تھان رکھ لیا۔ اس احتیاط اور دیانتدارانہ طرزِ عمل نے آپ کے کاروبار کو نقصان پہنچانے کے بجائے زیادہ فروغ دیا۔

آپ لوگوں کی عزتِ نفس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ مخالفین آپ کی ذات کو ہدفِ ملامت بناتے تو کبھی شکایت نہ کرتے۔ مگر جب کوئی شخص کسی دوسرے انسان کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتا تو بے قرار ہوجاتے اور اپنی حد تک اسے رسوائی سے بچانے کی تدبیر کرتے۔ ابراہیمؒ بن عتبہ چار ہزار درہم کے مقروض تھے قرض کی ادائیگی نہ ہونے کے باعث اس قدر شرمندہ رہتے تھے کہ گھر سے نکلنا تک چھوڑ دیا۔ آخر ابراہیمؒ کے ایک قریبی دوست نے چندہ کرکے انہیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلانا چاہا۔ لوگوں

نے اپنی حیثیت کے مطابق اس سلسلے میں تعاون کیا۔ جب وہ امامِ اعظمؒ کے پاس گئے تو آپ نے پوچھا۔ ''کل کتنا قرضہ ہے؟'' ابراہیمؒ بن عتبہ کے دوست نے رقم کی مقدار بتائی۔

''چند پیسوں کے لیے اتنے لوگوں کو کیوں تکلیف دیتے ہو؟'' یہ کہہ کر آپ نے چار ہزار درہم ادا کر دیئے۔ تاریخ میں اس قسم کے بے شمار واقعات ملتے ہیں جنہیں پڑھ کر امامِ اعظمؒ کی دریا دلی اور شدتِ احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

ذہانت اور تدبر اور عقل و فراست میں آپ کا کوئی حریف نہیں تھا۔ یہاں تک کہ مخالفین بھی آپ کے ان اوصاف کو تسلیم کرنے کے لیے مجبور تھے۔ خارجہ بن مصعب کہا کرتے تھے ''میں کم از کم ایک ہزار عالموں سے ملا ہوں جن میں عاقل صرف تین چار اشخاص دیکھے ان میں ایک ابوحنیفہؒ تھے۔ علامہ ذہبی کا قول ہے ''اولادِ آدم میں جو لوگ نہایت ذکی گزرتے ہیں ان میں ابوحنیفہؒ کا بھی شمار ہوتا ہے'' محمد انصاری کہا کرتے تھے کہ ''ابوحنیفہؒ کی ایک ایک حرکت بات چیت' اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے میں دانش مندی کا اثر پایا جاتا ہے۔'' علی بن عاصم کے الفاظ ہیں ''اگر آدھی دنیا کی عقل دوسرے پلے میں رکھی جاتی تو ابوحنیفہؒ کا پلہ بھاری رہتا۔''

ابوالعباس کو خلیفہ منصور کے دربار میں رسائی حاصل تھی لیکن یہ بدطینت شخص امامِ اعظمؒ کا دشمن تھا اور ہر وقت آپ کو نقصان پہنچانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ ایک دن ابوحنیفہؒ کسی ضرورت سے دربار میں گئے اتفاقاً ابوالعباس بھی وہاں موجود تھے۔ آپ کو دیکھتے ہی دوسرے لوگوں سے کہنے لگا ''آج ابوحنیفہؒ میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جائیں گے۔ امامِ اعظمؒ جس مقصد سے تشریف لائے تھے ابھی وہ بیان کرنے بھی نہیں پائے تھے کہ ابوالعباس بول پڑا۔ ''امیر المومنین کبھی کبھی ہمیں حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کی گردن مار دو ہمیں قطعاً علم نہیں ہوتا کہ وہ شخص مجرم ہے یا بے قصور' اس صورت میں ہمیں خلیفہ کی حکم کی تعمیل کرنی چاہیے یا نہیں؟'' ابوالعباس نے بڑا ٹیڑھا سوال کیا تھا۔ تمام درباری امامِ اعظمؒ کی طرف دیکھنے لگے خود منصور بھی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''تمہارے نزدیک خلیفہ کے احکام حق ہوتے ہیں یا باطل؟'' امامِ اعظمؒ نے ابوالعباس کو جواب دیتے ہوئے نیا سوال کر ڈالا۔ منصور کے سامنے کس کی طاقت تھی جو احکامِ خلافت کو باطل کہہ سکے۔ مجبوراً ابوالعباس کو کہنا پڑا کہ خلیفہ کے تمام احکام حق ہوتے ہیں۔ یہ سن کر امامِ اعظمؒ نے فرمایا ''پھر حق کی تعمیل



میں کسی سے کیا پوچھنا؟'' اس جواب کے ساتھ ہی ابوالعباس کا چہرہ اتر گیا اس کی سازش بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ایک شخص اپنی بیوی سے ناراض ہو گیا اور اس نے قسم کھا کر کہا کہ جب تک تو مجھ سے نہیں بولے گی میں تجھ سے کبھی بات نہیں کروں گا۔ عورت سخت مزاج تھی اس نے بھی غصے میں وہ قسم کھالی اور وہی الفاظ دہرائے جو شوہر نے کہے تھے۔ جب نفرت اور غصے کا وقتی سیلاب گزر گیا تو دونوں کو افسوس ہوا۔ شوہر نے اس سلسلے میں حضرت امام سفیان ثوریؒ سے رجوع کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہر حال میں قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ وہ شخص انتہائی مایوسی کے عالم میں امامِ اعظمؒ کی خدمت میں پہنچا اور اپنے اس مشکل مسئلے کا حل دریافت کرنے لگا۔ آپ نے فرمایا ''شوق سے باتیں کرو کسی پر کوئی کفارہ نہیں'' جب حضرت سفیان ثوریؒ کو یہ بات معلوم ہوئی تو بہت برہم ہوئے اور امامِ اعظمؒ سے کہنے لگے کہ آپ لوگوں کو غلط مسئلے بتایا کرتے ہیں۔ ابوحنیفہؒ نے اس شخص کو دوبارہ بلا کر کہا ''حضرت سفیان ثوریؒ کی موجودگی میں پورا واقعہ تفصیل سے بیان کرو۔'' جب شوہر اپنا مسئلہ بیان کر چکا تو امامِ اعظمؒ سفیان ثوریؒ سے مخاطب ہوئے ''میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ کسی پر کوئی کفارہ نہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' سفیان ثوریؒ اب بھی پہلے کی طرح غیر مطمئن تھے۔

''جب بیوی نے شوہر کو مخاطب کر کے وہ الفاظ کہے تو عورت کی طرف سے بات کی ابتدا ہو چکی پھر قسم کہاں باقی رہی؟''

حضرت سفیان ثوریؒ امامِ اعظمؒ کا جواب سن کر حیران رہ گئے اور ستائشی لہجے میں فرمانے لگے ''حقیقتاً جس اہم نکتے تک آپ کے ذہن کو بروقت رسائی حاصل ہوتی ہے وہاں تک ہم لوگوں کا خیال بھی نہیں پہنچتا۔''

ایسا ہی ایک اور واقعہ مشہور ہے کہ جس میں امامِ اعظمؒ کی ذہانت نے ایک اہم ترین کردار ادا کیا تھا اور ایک آسودہ حال خاندان کو تباہی سے بچا لیا تھا۔ ایک شخص کسی ذاتی رنجش کی بنیاد پر اپنے خسر سے ناراض رہتا تھا جب وہ کاروباری سلسلے میں شہر سے باہر جانے لگا تو اس نے اپنی بیوی پر پابندی عائد کرتے ہوئے کہا ''اگر تو میری عدم موجودگی میں اپنے باپ کی گھر گئی تو میری طرف سے تجھے تین طلاق ہیں۔'' یہ کہہ کر شوہر چلا گیا بیوی سختی سے شوہر کی ہدایت پر کاربند رہی۔ اسی اثناء میں عورت کا باپ شدید

بیماری میں مبتلا ہو گیا گھر کے لوگوں نے اسے اطلاع دی کہ مگر وہ شوہر کے حکم سے مجبور تھی یہاں تک کہ باپ کا آخری وقت قریب آ پہنچا۔ ماں نے پیغام بھیجا، بھائیوں نے اصرار کیا لیکن وہ اپنے مکان کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلی اور پھر کچھ دن بعد اطلاع ملی کہ باپ دنیا سے گزر گیا اس نے یہ صدمہ بھی برداشت کرنے کی کوشش کی لیکن بہر حال ایک کمزور دل عورت تھی' جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور باپ کی میت کا آخری دیدار کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ دفن میں شرکت کی اور پھر فوراً ہی واپس آ گئی تین چار ماہ بعد جب شوہر لوٹ کر آیا تو اسے خسر کے انتقال کی خبر ملی۔ بیوی سے دریافت کیا تو اس نے سچائی کے ساتھ اقرار کیا کہ صرف دفن کی رسم میں شریک ہونے کے لیے باپ کے گھر گئی تھی۔ شوہر ایک عقلمند شخص تھا اس نے بیوی کے جذبات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا کہ وہ سنگین حالات میں بھی اس کے حکم کی پابند رہی لیکن باپ کے انتقال کے صدمے کو برداشت نہ کر سکی۔ یہ ایک اضطراری فعل تھا جس آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ مگر شوہر کی شرط کے مطابق طلاق ہو چکی تھی۔ شوہر کو اس واقعہ کا بے حد افسوس تھا۔ دراصل یہ بات اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے شہر سے باہر جاتے ہیں حادثاتی طور پر خسر کا انتقال ہو جائے گا۔ مجبوراً شوہر نے بیوی کو گھر سے رخصت کر دیا اور اس وقت کے تمام علمائے کرام سے اس سلسلے میں رجوع کیا۔ ہر امام کا ایک ہی جواب تھا کہ طلاق ہو چکی ہے سیدھی سی بات تھی۔ شرط ٹوٹتے ہی طلاق کا واقع ہو جانا ایک فطری عمل تھا۔ وہ بیوی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور شرع اسے ازدواجی تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ایک عجیب اذیت ناک کش مکش تھی۔ بظاہر اس پیچیدہ مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ آخر ایک دن کسی نے اسے رائے دی کہ وہ امامِ اعظمؒ کے سامنے اپنی مشکل بیان کرے۔ شوہر کو یہاں بھی اپنے حق میں فیصلے کی کوئی امید نہیں تھی لیکن چارو ناچار ابوحنیفہؒ کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد امامِ اعظمؒ نے فرمایا'' طلاق واقع نہیں ہوئی وہ اب بھی تمہاری بیوی ہے تم کسی کفارے کے بغیر اس سے ازدواجی تعلق قائم رکھ سکتے ہو۔'' یہ فتویٰ سننے کے بعد اس شخص کی خوشی ناقابلِ بیان تھی۔ وہ امامِ اعظمؒ کے علم وفضل کی تعریفیں کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔ پھر چند ہی دنوں میں یہ بات زبان زد خاص وعام ہو گئی کہ جس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں سارے علماء ناکام رہے اسے امام اعظمؒ نے آسانی سے حل کر دیا۔ ایک مرتبہ پھر یہ بات مشہور ہو گئی کہ ابوحنیفہؒ اپنے قیاس کی بنیاد پر غلط فیصلے دیتے ہیں۔ جب اس ذیل میں بعض علمائے کرام نے امامِ اعظمؒ سے وضاحت طلب کی تو آپؒ نے انتہائی



عجز وانکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔'' موت کے بعد انسان کا دنیا سے ہر تعلق ختم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اپنی دولت اور جائیداد پر بھی اس کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ جب وہ عورت شوہر کی نافرمانی کرتے ہوئے اپنے باپ کے گھر گئی تو فی الحقیقت وہ مکان اس کے باپ کا ملکیت نہیں رہا تھا' انتقال کے بعد وہ خود ہی وراثت میں ایک قانونی حصے دار تھی۔ نتیجتاً اس نے باپ کے مکان میں نہیں اپنے گھر میں قدم رکھا اس طرح عورت کے فعل پر شوہر کی عائد کردہ شرط کا اطلاق نہیں ہوگا اور نکاح ہر صورت میں برقرار رہے گا۔'' یہ نکتہ سن کر تمام علماء حیران رہ گئے اور بعض کی زبان سے نکلا۔'' واللہ! اس میدان میں کوئی شخص ابو حنیفہؒ کی ہمسری نہیں کر سکتا۔''

☆☆☆

ضحاک خارجیوں کا مشہور سردار تھا جو بنی امیہ کے دور میں کوفے پر قابض ہو گیا تھا۔ ایک دن وہ امام اعظمؒ کے پاس آیا اور تلوار دکھاتے ہوئے بولا'' توبہ کرو۔''

'' کس بات سے؟'' آپ نے بے خوفی کے ساتھ پوچھا۔

ضحاک نے کہا'' تمہارا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کے جھگڑے میں ثالث کو تسلیم کر لیا تھا جب وہ حق پر تھے تو پھر ثالث کے کیا معنی ہیں؟''

امامِ اعظمؒ نے فرمایا'' اگر تم مجھے قتل ہی کرنا چاہتے ہو تو دیگر بات ہے ویسے اگر صورت حال کی تحقیق منظور ہے تو مجھے کچھ کہنے کی اجازت دو۔''

'' میں بھی مناظرہ ہی چاہتا ہوں۔'' ضحاک نے کہا'' تم مجھے مطمئن کر دیا پھر میرے سامنے عقیدے سے توبہ کرو۔ اگر ان دونوں میں سے تم کوئی کام نہ کر سکے تو پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' خارجی سردار نے اپنی شمشیر کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

امامِ اعظمؒ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔ آپ نہایت اطمینان سے اس خوفناک صورت حال کا مقابلہ کر رہے تھے۔'' اگر کسی وجہ سے یہ بحث نتیجہ خیز نہ ہو سکی تو پھر فیصلہ کس طرح ہوگا؟'' ابوحنیفہؒ نے ضحاک سے سوال کیا۔

'' ہم دونوں ایک شخص کو منصف بنائے دیتے ہیں۔'' خارجی سردار نے تجویز پیش کی'' وہ شخص فیصلہ کرے گا کہ ہم میں سے کون غلطی پر ہے۔''

امامِ اعظمؒ نے ضحاک کی تجویز سے اتفاق کیا اور اسی کے آدمیوں میں سے ایک شخص کو منصف بنا دیا

جب مناظرے کے ابتدائی مراحل طے ہو چکے تو امامِ اعظمؒ نے فرمایا ”یہی کام تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی کیا تھا پھر ان پر کیا الزام ہے؟“

ضحاک یہ سن کر دم بخود رہ گیا اور پھر کچھ دیر بعد سر جھکائے ہوئے خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

☆☆☆

آپ کی بے باکی کا یہ معیار کہ خلیفۂ وقت بھی زبانِ مبارک پر مہر خاموشی نہ لگا سکا۔ زہد و تقویٰ کا یہ عالم کہ سیم وزر کے انبار بھی آپ کو صراطِ مستقیم سے نہ ہٹا سکے۔ ضبطِ نفس کی یہ شان کہ لوگوں نے تمام عمر دل آزاریاں کیں مگر آپ حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔

بعض کم ظرف مخالفین کو جس قدر برے الفاظ یاد تھے وہ سب کے سب آپ کے نام سے منسوب کر دیے گئے تھے۔ ایک شخص نے آپ کو بھرے مجمع میں ماں کے حوالے سے فحش ترین گالی دی مگر آپ نے اسے دعائیہ کلمات سے یاد کیا۔ ایک گستاخ نے آپ کو سرِ محفل زندیق کہہ کر پکارا آپ نے جواباً فرمایا ”خدا تمہاری مغفرت کرے وہ خوب جانتا ہے کہ تمہاری رائے میرے بارے میں درست نہیں ہے۔“

ایک شخص آپ کی محفل میں شریک ہوا۔ بیٹھتے ہی آپ کے متعلق نازیبا گفتگو کرنے لگا۔ شاگرد بہت زیادہ برہم ہوئے۔ وہ اس کے خلاف سخت کارروائی کرنا چاہتے تھے مگر آپ نے منع فرمادیا۔ درس کے دوران بھی اس شخص کو قرار نہیں تھا اور جب درس ختم ہو گیا تو تب بھی راستے میں آپ کو برا بھلا کہتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ اپنے مکان کے دروازے پر پہنچ کر ٹھہر گئے اور پہلی بار اس شخص سے مخاطب ہوئے ”بھائی یہ میرا گھر ہے میں اندر جارہا ہوں اگر کچھ کہنے کو باقی رہ گیا ہے تو کل کے لیے اٹھا کر نہ رکھیو!“

حضرت امامِ اعظمؒ کی مخالفت میں بعض لوگوں نے اخلاقیات کو اس حد تک پامال کر ڈالا تھا کہ ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے آج بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ابوحنیفہؒ نے علم کے کوچے میں قدم رکھا تھا اور آپ کی ذہانت کے قصے خاص و عام میں شہرت پا رہے تھے۔ ایک دن حضرت امامؒ اپنی دکان پر جانے کے لیے گھر سے نکل رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور آتے ہی آپ سے پوچھنے لگا ”کیا تمہارے والد کا انتقال ہو چکا ہے؟“ حضرت امامؒ نے اثبات میں جواب دیا پھر کہنے لگا ”سنا ہے تمہاری والدہ بہت حسین وجمیل عورت ہیں تم ان کا نکاح میرے ساتھ کردو۔“ اجنبی کا لہجہ اس قدر ناشائستہ تھا کہ غصے کی شدت سے حضرت امامؒ کا پورا جسم کانپنے لگا مگر آپ نے نوعمری کے باوجود اپنے جذبات پر قابو پالیا۔



”وہ عاقل و بالغ ہیں، مذہبی اعتبار سے ایسی عورت پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔“ حضرت امامؒ نے بڑے صبر و تحمل سے فرمایا۔ ”فرزند ہونے کی حیثیت سے حکم تو نہیں دے سکتا لیکن تمہاری درخواست ان تک پہنچائے دیتا ہوں“ یہ کہہ کر حضرت امامؒ مڑے ابھی آپ نے اندر جانے کے لیے دروازے پر پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ وہ شخص زور سے چیخا آواز اس قدر کربناک تھی کہ آپ گھبرا کر پلٹ پڑے، حضرت امامؒ نے دیکھا اجنبی زمین پر پڑا ہوا ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ دل پر تھے اور منہ سے دل خراش چیخیں نکل رہی تھیں۔ پھر چند ہی لمحوں میں ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔ حضرت امامؒ نے اجنبی کے مردہ جسم کو قریب سے دیکھا اور افسردہ لہجے میں فرمایا ”نعمان کے صبر نے اسے کھالیا۔“

☆☆☆

خود ہر قسم کی جسمانی اذیتیں برداشت کیں اور کبھی اف تک نہیں کی مگر جب دوسرے کی تکلیف دیکھتے تو بے قرار ہو جاتے ایک بار مسجد میں بیٹھے تھے کہ کسی نے آکر کہا ”فلاں شخص چھت سے گر پڑا۔“ آپ یہ سب سن کر اس قدر زور سے چیخے کہ مسجد کے تمام حاضرین چونک اٹھے پھر آپ ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے اس شخص کے گھر پہنچے اور بہت دیر تک غم خواری کرتے رہے۔ جب تک وہ مکمل صحت یاب نہیں ہو گیا روزانہ صبح کو اس کے گھر تشریف لے جاتے اور تیمارداری کرتے اس کے برعکس اپنے اوپر مصیبت نازل ہوتی تو یوں برداشت کرتے کہ لوگوں کو سخت تعجب ہوتا۔

☆☆☆

رسالت مآب ﷺ کا فرمان مقدس ہے کہ ”وہ شخص ہم میں سے نہیں جس کے پڑوسی اس سے ناخوش ہوں۔“ اس حدیثِ پاک کی روشنی میں انسانی تہذیب پہلی بار پڑوسی کے حقوق سے آشنا ہوئی۔ امامِ اعظمؒ بھی اپنے ہمسایوں کے ساتھ کمالِ مہربانی سے پیش آئے اور بعض اوقات ان کے دل جوئی کے لیے تکالیف اٹھانے سے بھی گریز نہ کرتے۔ آپ کے محلے میں ایک موچی رہتا تھا جو فطرتاً انتہائی رنگین مزاج تھا۔ وہ دن بھر مزدوری کرتا شام کو بازار سے شراب اور گوشت خرید کر لاتا پھر اس کے دوست احباب جمع ہوتے اور رات گئے تک محفل ناؤ نوش آراستہ رہتی۔ اس ہنگامہ مستی میں موچی مزے لے لے کر یہ شعر پڑھتا۔

”لوگوں نے مجھے ہاتھ سے کھو دیا اور کیسے بڑے شخص کو کھو دیا جو لڑائی کے دن کام آتا۔“

امامِ اعظمؒ ذکر الٰہی کی وجہ سے رات بھر جاگتے تھے اس لیے موچی اور اس کے دوستوں کی پُرشور

آوازیں سنتے مگر دل شکنی کے خیال سے کبھی اعتراض نہ کرتے۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ اتفاق سے ایک رات کوتوال شہر ادھر آنکلا اور اس نے موچی کو گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا۔ اہل محلہ بہت خوش تھے۔ دوسری رات سکون سے گزری۔ امام اعظمؒ اس خاموشی پر حیران تھے کہ اور صبح ہوتے ہی اپنے دوستوں سے ذکر کیا کہ کل رات ہمسائے کی آواز سنائی نہیں دی۔ لوگوں نے موچی کی گرفتاری کا واقعہ بیان کیا۔ یہ سنتے ہی آپ بے قرار ہو گئے درباری کپڑے پہنے سواری طلب کی اور دارالامارت کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت خلیفہ منصور کا بھتیجا عیسیٰ بن موسیٰ کوفے کا گورنر تھا۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ امام اعظمؒ تشریف لائے ہیں۔ فوراً اپنے درباریوں کو استقبال کے لیے بھیجا اور حکم دیا کہ آپ کو دارالامارت کے صحن تک سواری پر لائیں جب آپ دربار میں داخل ہوئے تو گورنر عیسیٰ اپنی نشست سے اٹھا اور نہایت ادب سے لا کر اپنے قریب بٹھایا پھر عرض کرنے لگا۔ ”آپ نے کیوں زحمت کی؟ مجھے بلا بھیجتے میں خود حاضر ہو جاتا۔“ امام اعظمؒ نے جواباً فرمایا ”ہمارے محلے کے ایک موچی کو آپ کے کوتوال نے گرفتار کر لیا ہے میں اسے اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔“ عیسیٰ نے اسی وقت داروغہ جیل کو موچی کی رہائی کا حکم دیا کچھ دیر بعد امام اعظمؒ اپنے ہمسائے کو لے کر گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔

راستے میں امام اعظمؒ نے موچی سے پوچھا۔ ”کیوں ہم نے تمہیں کھویا تو نہیں؟“ یہ اسی شعر کی طرف اشارہ تھا جسے موچی شراب پی کر پڑھا کرتا تھا۔

”نہیں آپ نے ہمسائیگی کا حق ادا کر دیا۔“ یہ کہتے ہوئے موچی رو پڑا اور اس نے عیش پرستی سے توبہ کر لی اور امام اعظمؒ کے حلقہ درس میں بیٹھنے لگا یہاں تک علمِ فقہ میں مہارت حاصل کی اور فقیہہ کے لقب سے مشہور ہوا۔

☆☆☆

پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی کام میں آپ کو لغزش کا ذرا سا بھی شائبہ محسوس ہوتا تو اس کام کو ترک کر دیتے۔ اگرچہ وہ کام جائز ہی کیوں نہ ہوتا۔ مشہور واقعہ ہے کہ کسی شخص نے اپنی بکری گم ہو جانے کی شکایت کی۔ امام اعظمؒ نے کئی سال تک اس خوف سے بکری کا گوشت نہیں کھایا کہ کہیں گم شدہ بکری کسی قصاب تک نہ پہنچ گئی ہو۔

حضرت داؤد طائیؒ کا بیان ہے کہ میں نے بیس سال تک کبھی آپ کو تنہائی یا مجمع میں ننگے سر اور ٹانگیں پھیلائے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب میں نے عرض کیا کہ کبھی تنہائی میں تو پاؤں سیدھے کر لیا کیجئے



میری اس خواہش کے جواب میں امام اعظمؒ نے فرمایا ”مجمع میں تو بندوں کا احترام کروں اور تنہائی میں خدا کا احترام ختم کر دوں یہ کیسی عجیب بات ہے؟“

ایک شخص آپ کا قرض دار تھا۔ اتفاق سے اس کے علاقے میں کسی کی موت ہو گئی۔ جب آپ وہاں نماز جنازہ پڑھانے کے لیے تشریف لے گئے تو چاروں طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی، صرف ایک مکان کے قریب کچھ سایہ تھا اور یہ مکان اسی شخص کی ملکیت تھا جس کے ذمے آپ کی رقم واجب الادا تھی۔ شدید گرمی کے باعث کچھ لوگوں نے امام اعظمؒ سے سائے میں کھڑے ہونے کی درخواست کی مگر آپ نے انکار کر دیا۔ بعد میں آپ نے چند دوستوں کے پوچھنے پر بتایا ”وہ شخص میرا مقروض تھا اگر میں اس کے مکان کے سائے میں کھڑا ہو جاتا تو کچھ لمحوں کا یہ آرام سود میں شامل ہو جاتا۔“

ایک بار آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راہ میں دو بوڑھی عورتیں بھی کھڑی تھیں۔ آپ کو دیکھ کر ایک ضعیفہ نے اپنی ساتھی عورت سے کہا ”انہیں جانتی ہو، یہ ابوحنیفہؒ ہیں بڑے پاک باز اور شب بیدار۔ عشا کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرنے والے۔“ امام اعظمؒ بوڑھی عورت کی بات سن کر لرز گئے آپ کا معمول تھا کہ رات کو ذکر الٰہی میں مشغول رہتے مگر کچھ دیر آرام بھی فرماتے اس واقعے کے بعد آپ کے معمولات میں فرق آ گیا مکمل طور پر شب بیدار رہتے۔ نماز فجر کے بعد تھوڑی دیر آرام اور پھر درس میں مشغول ہو جاتے۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے تو آپ کی صحت متاثر ہونے لگی۔ بعض قریبی دوستوں اور شاگردوں نے اس محنتِ شاقہ سے باز رکھنے کی کوشش کی تو آپ نے ان بوڑھی عورتوں کا واقعہ سناتے ہوئے فرمایا ”میں اس دن سے ڈرتا ہوں جب میرا خدا مجھ سے پوچھے گا کہ ابوحنیفہؒ وہ شکل کیوں بنائی تھی کہ جسے دیکھ کر لوگ دھوکا کھاتے تھے۔“

☆☆☆

خوفِ خدا کی یہ کیفیت تھی کہ معمولی باتوں پر آپ کا جسم کانپنے لگتا تھا۔ ایک دن بازار جا رہے تھے کہ ایک لڑکے کے پاؤں پر آپ کا پاؤں پڑ گیا۔ وہ شدت درد سے چیخ کر بولا ”تو خدا سے نہیں ڈرتا؟“ لڑکے کی بات سن کر آپ پر غشی طاری ہو گئی۔ مشہور بزرگ مسعرؒ بن کدام آپ کے ہمراہ تھے، انہوں نے آگے بڑھ کر سنبھالا۔ ہوش میں آئے تو حضرت مسعرؒ نے کہا ”ایک لڑکے کی بات پر اس قدر بے قرار ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے؟“

امام اعظمؒ نے فرمایا ”کیا عجب ہے کہ اس لڑکے کی آواز غیبی ہدایت ہو۔“

اسی طرح ایک بار چند لڑکے بارش کے پانی سے کھیل رہے تھے۔ امامِ اعظمؒ اس طرف سے گزرے تو بچوں کو نصیحت فرمانے لگے کہ اس طرح نہ کھیلو تمہارے چوٹ لگ جائے گی۔ آپ کی بات سن کر دوسرے بچے تو فرار ہو گئے مگر ایک لڑکا وہیں ٹھیر گیا جب امامِ اعظمؒ بالکل نزدیک پہنچ گئے تو آپ سے مخاطب ہوا ''امام ہماری فکر نہ کرو ہم زخمی ہو گئے تو زیادہ سے زیادہ ہمارے ماں باپ پریشان ہوں گے' لیکن اگر تم پھسل گئے تو پوری قوم زخمی ہو جائے گی'' یہ کہہ کر وہ لڑکا اپنے ساتھیوں کے پیچھے بھاگتا ہوا چلا گیا۔ امامِ اعظمؒ سناٹے میں آ گئے اور چہرہ خوف و دہشت سے زرد ہو گیا۔ اکثر اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے تھے ''وہ بھی ایک غیبی تنبیہ تھی۔''

☆☆☆

آپ کے روز و شب کا مختصر خاکہ کچھ اس طرح ہے کہ صبح کی نماز کے بعد مسجد میں درس دیتے۔ تمام قابلِ ذکر مسائل کا جواب تحریر کرتے۔ پھر تدوین فقہ کی مجلس منعقد کی جاتی جس میں بڑے بڑے نامور شاگردوں کا اجتماع ہوتا۔ جو مسائل اتفاقِ رائے سے طے ہوتے انہیں قلم بند کر لیا جاتا۔ نمازِ ظہر..... پڑھ کر گھر آتے اور کچھ دیر آرام کرتے۔ نمازِ عصر کے بعد دوستوں سے ملتے۔ بیماروں کی عیادت' مرنے والوں کی تعزیت اور غریبوں کی خبر گیری کرتے۔ نمازِ مغرب کے بعد درس کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا اور عشا تک جاری رہتا۔ نمازِ عشا پڑھ کر عبادت میں مشغول ہو جاتے اور اکثر رات بھر نہ سوتے۔

یزید بن کمیت اپنے وقت کے مشہور بزرگ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں ایک بار نمازِ عشا میں ابوحنیفہؒ کے ساتھ شریک تھا' امام نے سورۃ **اذازلزلت** پڑھی تمام لوگ نماز پڑھ کر چلے گئے۔ میں وہیں ٹھہرا رہا۔ ابوحنیفہؒ کو دیکھا وہ ٹھنڈی سانس بھر رہے تھے میں یہ سوچ کر اٹھ آیا کہ کہیں ان کی عبادت میں خلل نہ پڑے۔ صبح کو مسجد میں گئے تو سب سے پہلے ابوحنیفہؒ پر نظر پڑی۔ اسی طرح غم زدہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی ہاتھ میں تھی اور بڑی رقت سے کہہ رہے تھے:

''اے ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر بدی' دونوں کا بدلہ دینے والے! اپنے غلام نعمان کو آگ سے بچانا۔''

کثرتِ ریاضت' گریۂ نیم شبی اور مسلسل نفس کشی کے باعث حضرت امامِ اعظمؒ کے سامنے سے کئی حجابات اٹھ گئے تھے۔ صلاحیتِ کشف اس قدر بڑھ گئی تھی کہ آپ غیر محسوس چیزوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیا کرتے تھے۔ ایک حدیثِ رسولؐ کا یہ مفہوم ہے کہ اگر کوئی شخص نماز کی پابندی کرے تو وضو کا پانی گناہوں کو دھو دیتا ہے۔ حضرت امامِ اعظم ابوحنیفہؒ ایک دن مسجد میں تھے کہ اچانک آپ کی نظر وضو کرنے والے



اشخاص پر پڑی۔ ان میں سے کچھ کے جسموں سے وضو کا پانی ٹپک رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی گناہ بھی دھلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ حضرت امام کو پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا تھا اس لیے آپ بہت دیر تک حیران و پریشان بیٹھے رہے پھر یہ مناظر تسلسل کے ساتھ نظر آنے لگے۔ ایک دن ایک نوجوان کو وضو کرتے دیکھا اس کے چہرے اور ہاتھوں پر مسلسل پانی بہہ رہا تھا مگر گناہ کے دھلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ حضرت امامِ اعظمؒ کو دلی تکلیف پہنچی اور آپ نے فوراً منہ پھیر لیا جب وہ نوجوان وضو کر چکا تو آپ نے اس سے فرمایا ''کہ نماز کے بعد مجھ سے مل کر جانا'' نوجوان اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا کہ آج امامِ اعظمؒ نے اسے اپنی گفتگو سے شرف یاب کیا تھا۔ غرض نماز ختم ہوئی تو آپ نے اسے ایک گوشے میں بلا کر فرمایا ''تم اپنے ماں باپ کے نافرمان ہو روزانہ ان کی دل آزاری کرتے ہو جب تک تمہارے والدین تمہیں معاف نہیں کریں گے اس وقت تک یہ عبادت و ریاضت کچھ کام نہیں آئے گی۔ ماں باپ کے مقام کو سمجھو ان کی خدمت کرو اور ان کے بے قرار دلوں کو اپنے حسنِ عمل سے سکون بخشو۔''

نوجوان افشائے راز کی ندامت سے کانپنے لگا اور پھر اس نے روتے ہوئے حضرت امامؒ سے کہا ''آپ میرے حق میں دعا فرما دیجیے کہ میں اس لعنت سے نجات پا جاؤں۔''

حضرت امامِ اعظمؒ نے اس پر سر پر اپنا دستِ شفقت رکھا اور دعائیں دے کر رخصت کر دیا پھر اس کے بعد آپ کسی کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھتے تھے۔ محض اس خوف سے کہ کہیں کسی کا کوئی گناہ سامنے نہ آ جائے۔ یہ آپ کا شدید عالم کرب تھا۔ بالآخر ایک رات پچھلے پہر حضرت امامؒ نے اپنے خدا سے عجیب و غریب دعا مانگی۔

''اے قادرِ مطلق! نعمان سے اس کا یہ کشف چھین لے۔ اس سے تیرے بندوں کے گناہ نہیں دیکھے جاتے۔ اے بے حساب دینے والے! اپنے گدا ابوحنیفہؒ کو ایسی بینائی نہ دے۔ اسے ستّارالعیوب! نعمان کے گناہوں کی پردہ پوشی فرما'' حضرت امامِ اعظمؒ یہ دعا اس وقت تک مانگتے رہے جب تک آپ کے کشف کی صلاحیت ختم نہیں ہو گئی۔

☆☆☆

خلیفہ منصور نے علم و عمل کے اس سورج کو اندھیرے کی زنجیریں پہنا کر زنداں کے حوالے کر دیا تھا۔ مگر روشنی کا سفر پھر بھی جاری تھا' تیز شعاعیں سنگ و آہن کی دیواروں سے گزر کر کھلے میدانوں میں اتر آئی تھیں۔ علم کے پیاسے تمام اسلامی ممالک سے سمٹ کر بغداد میں جمع ہو رہے تھے۔ اسیری کے باوجود

امامِ اعظمؒ کی تقدیس وشہرت روز بروز بڑھتی رہی تھی۔ خود بغداد کے علما جن کا اس شہر پر کافی اثر تھا آپ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر منصور آپ کے خلاف کوئی گستاخانہ قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔

یہاں تک کہ قید خانے میں بھی آپ کے درس کا سلسلہ جاری رہا۔ فقہ حنفی کی عمارت کے مضبوط ترین ستون امام محمدؒ نے اسی تاریک مقام پر آپ سے تعلیم حاصل کی۔ جس خوف سے نجات پانے کے لیے خلیفہ نے امامِ اعظمؒ کو بیڑیاں پہنائی تھیں۔ وہ اب بھی روزِ اول کی طرح برقرار تھا۔ انجام کار اس نے اپنا نامۂ اعمال سیاہ کر ڈالا۔ روز و شب کے ہنگامے جاری تھے۔ زمین اپنے محور پر گھوم رہی تھی لیکن یہ راز خلیفہ منصور اور اس کے خادم کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ امامِ اعظمؒ کو زہر دیا جا چکا ہے۔

جیسے ہی زہر کا اثر محسوس ہوا آپ سجدے میں چلے گئے، اپنے رب کی تسبیح بیان کی اور نہایت عاجزی سے کہا "اے اللہ! تیرا بندہ نعمان حاضر ہے۔" سجدے ہی سے زندگی کا آغاز کیا اور سجدے ہی پر کاروبارِ حیات ختم ہو گیا، تجھی سے ابتدا ہے اور تو ہی انتہا ہو گا۔

☆☆☆

آپ کے انتقال کی خبر اس قدر تیزی سے پھیلی کہ پورا بغداد امڈ آیا۔ قاضی شہر حسن بن عمارہ غسل دیتے وقت کہتے جاتے تھے۔ "خدا کی قسم تم سب سے بڑے فقیہ تھے، بڑے عابد و زاہد تھے۔ تم میں ساری خوبیاں جمع تھیں۔ تم نے اپنے جانشینوں کو مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبے کو پہنچ سکیں۔" غسل سے فارغ ہوتے ہی لوگوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ پہلی بار نمازِ جنازہ میں پچاس ہزار آدمی شامل تھے آنے والے مسلسل آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ چھ بار نماز جنازہ پڑھی گئی اور عصر کے قریب میت کو دفن کیا جا سکا۔

امامِ اعظمؒ نے اپنی زندگی میں وصیت کی تھی کہ آپ کو خیزران کے مقبرے میں دفن کیا جائے۔ آپ کے خیال میں یہ جگہ مغصوب نہیں تھی۔ چنانچہ اسی وصیت کے مطابق خیزران کے مشرقی جانب آپ کی قبر مبارک تیار کی گئی۔ مورخ خطیب نے لکھا ہے کہ دفن کے بعد بھی بیس دن تک لوگ آپ کی نماز جنازہ پڑھتے رہے۔ مقبولیت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔

ابن جریح نے مکہ معظمہ میں آپ کے انتقال کی خبر سن کر کہا "بہت بڑا عالم جاتا رہا۔" شعبہؒ جو آپ کے استاد اور بصرے کے امام تھے یہ اندوہناک اطلاع پا کر غمگین ہو گئے اور پھر بڑے کربناک لہجے میں



کہا "آج کوفے میں اندھیرا پھیل گیا۔" اس واقعے کے چند روز بعد عبداللہ بن مبارکؒ امامِ اعظمؒ کی قبر پر حاضر ہوئے اور رو کر کہا "ابوحنیفہؒ! تم پر خدا رحمتیں نازل کرے، ابراہیم رخصت ہوئے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے۔ افسوس تم نے ساری دنیا میں اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔"

سلطان الپ ارسلان سلجوتی نے ۴۵۹ھ میں آپ کے مزار کو نئے انداز سے آراستہ کیا اور اس کے قریب ہی ایک مدرسہ تعمیر کیا یہ بغداد میں پہلا مدرسہ تھا۔ اس کی رسمِ افتتاح میں تمام معززینِ شہر اور علمائے کرام شریک ہوئے۔ اتفاق سے اسی وقت مشہور شاعر ابوجعفر مسعود ادھر آ نکلا۔ امامِ اعظمؒ کی قبر پر نظر پڑتے ہی اس نے بے ساختہ یہ شعر پڑھا۔

"تم دیکھتے نہیں علم کس طرح ابتر ہو رہا تھا، پھر اس شخص نے اسے ترتیب دیا جو اس قبر میں سو رہا ہے"۔

مشہور سیاح ابن بطوطہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے۔ "اس وقت تمام بغداد میں مشہدِ ابوحنیفہؒ کے سوا ایسی کوئی جگہ موجود نہیں ہے جہاں سے مسافروں کو کھانا ملتا ہو۔"

ایران کا شہنشاہ سلطان ناصر الدین قاچار اپنے سفر کے حالات لکھتے ہوئے ایک مقام پر تحریر کرتا ہے۔ "میں نے امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے مزارِ مقدس پر فاتحہ پڑھی اور نذر چڑھائی۔ علم کی شان دیکھو جس کی بدولت کوفے کے ایک تاجر نے یہ رتبہ حاصل کیا کہ بارہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اس کے مزار پر بڑے بڑے شہنشاہوں کے سر جھکتے ہیں۔"

☆☆☆

شیخ بوعلیؒ بن عثمان کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت بلالؓ کی قبر کے نزدیک سویا ہوا تھا میں نے خواب میں دیکھا کہ حضور اکرمؐ باب بنی شیبہؓ سے ایک معمر شخص کو آغوش مبارک میں لیے ہوئے تشریف لائے اور مجھے حیرت زدہ دیکھ کر فرمایا کہ "مسلمانوں کا امام اور تمہارے ملک کا باشندہ ابوحنیفہؒ ہے۔"

حضرت یحییٰ معاذ رازیؒ نے رسول کریمؐ سے خواب میں عرض کیا کہ "میں آپ کو کس جگہ تلاش کروں؟"

رسالت مآبؐ نے فرمایا "ابوحنیفہؒ کے علم کے قریب۔"

☆☆☆

# امامِ مدینہ

## امام ابو مالکؒ

مدینہ۔ ۹۳ھ تا ۱۷۵ھ

عمر بن عبدالعزیز کی آنکھیں اشکبار تھیں اور وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے۔ ''خدا کی قسم ساری دنیا ظلم سے بھر گئی۔'' چشمِ فلک تاریخ کے ہولناک ترین مناظر دیکھ رہی تھی۔ تاریکی سے کوئی ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے کتابِ زیست کا ایک ورق الٹ دیا۔ خانہ کعبہ پر سنگ باری ہو رہی تھی۔ وہ مقام جو زمین پر اللہ کی سب سے روشن نشانی تھا۔ جس کے سائے میں ہر شخص کو پناہ حاصل تھی، آج اسی کے دل پر پتھر برس رہے تھے۔ یہ کیسا اذیت ناک لمحہ تھا کہ وہی لوگ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی تعمیر پر مشقِ ستم کر رہے تھے جو دن رات میں پانچ وقت دعا مانگا کرتے تھے۔ ''اے اللہ! محمد مصطفیٰ ﷺ پر اس طرح رحمت نازل فرما۔ جیسے تو نے ابراہیمؑ اور ان کی آل پر اپنی رحمت نازل فرمائی۔''

پھر سنگ باری ختم ہوئی۔ جابرانِ وقت کو جس کی تلاش تھی وہ ان کے ہاتھ آ گیا تھا۔ امام حسینؓ پہلے ہی مجلسِ شہدا کی رونق میں اضافہ کر چکے تھے۔ اب عبداللہ بن زبیرؓ بھی شہید کر دیے گئے تھے۔ یہ وہی مردِ

بیباک تھا جس کے بارے میں امیر معاویہؓ نے یزید کو وصیت کرتے ہوئے کہا تھا ''لومڑ کی طرح چالیں چلنے والا اور شیر کی مانند حملے کرنے والا، عبداللہ بن زبیرؓ ہاتھ آ جائے تو بے دریغ اس کے دست و پا کاٹ دینا۔'' یزید تو اپنے باپ کی وصیت پر عمل نہ کر سکا مگر حجاج بن یوسف نے صدیق اکبرؓ کے نواسے کا جسم ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا۔ اب وہ اس مکان کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں ایک نابینا خاتون گوشہ نشین تھیں۔

''میں نے تیرے بیٹے کی دنیا خراب کر دی۔'' حجاج نے اسما بنت ابوبکرؓ سے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ بصارت سے محروم یہ نوے سالہ کمر خمیدہ ماں، بیٹے کی موت کی خبر سن کر نوحہ خوانی پر مجبور ہو جائے گی اور خاندان بنو امیہ کا جشنِ فتح زیادہ ہنگامہ خیز ہو جائے گا مگر وہ جابر و سفاک جیت کر بھی ہار گیا۔ سرورِ کونین کی ہمشیرہ نسبتی، خلیفہ اول کی پاکباز بیٹی، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی غم گسار بہن اور زبیرؓ بن عوام کی جانباز بیوی نے اپنے فرزند کے قاتل کو شکست دے دی۔

''حجاج! اس کا ماتم کر کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے تیری آخرت خراب کر دی۔''

پھر کسی نے کانپتے ہاتھوں سے تاریخ کا دوسرا ورق پلٹا۔ ضمیر کی پستیوں میں رینگنے والے حکمرانوں کی شمشیریں بے نیام ہوئیں پھر زہر میں بجھی ہوئی تلواروں نے اپنی ہی ملت کی شہ رگیں کاٹ دیں۔ جواں سال شہید کی لاش تڑپتے تڑپتے ساکت ہو گئی تھی۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم اپنے خون میں نہایا ہوا دربارِ خلافت کے فرش پر لیٹا تھا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ اس وقت ظالم و مظلوم دونوں مطمئن تھے۔ مظلوم کے چہرے پر اس لیے طمانیت تھی کہ اس نے اپنی جان دے کر ملک و ملت کو انتشار سے بچا لیا تھا اور ظالم یوں آسودہ حال تھے کہ انہوں نے اپنے اقتدار کے بے بنیاد مکانوں کو ابن قاسم کی بڑھتی ہوئی شہرت کے سیلاب سے محفوظ کر لیا تھا۔

پھر کسی لرزتے ہاتھ نے تاریخ کا ایک اور ورق الٹا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے سابق حکمرانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اپنی ذات پر دنیا کی ہر آسائش حرام کر لی۔ جس کے ملبوساتِ حریری کا بوجھ کئی اونٹ مل کر بھی نہیں اٹھا سکتے تھے، اس کا پیرہن چمڑے کے پیوند تک پہنچ گیا۔ جس مردِ جلیل نے ڈھائی سال تک ماضی کا رشتہ حال سے جوڑے رکھا جس کے طرزِ حکومت کو خلافتِ راشدہ سے تعبیر کیا گیا، اسے فتنوں سے بھری ہوئی یہ زمین...... زیادہ دن تک برداشت نہ کر سکی۔ وہ جو انسانوں کے درمیان خیر کی علامت تھا، اسے زہر دے دیا گیا۔ بھلائی نے دنیا سے پیٹھ موڑ لی۔



متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

پھر سازشوں کے غبار سے سفاح کا چہرہ ابھرا۔ فرزندانِ اسلام کی لاشوں کے انبار پر خلافتِ عباسیہ کی بنیاد رکھ دی گئی۔ ظلم کا ایک مینار گرا تو دوسرا اس سے زیادہ بلند ہو گیا۔ سفاح رخصت ہوا تو اس کے بھائی منصور نے قتل و غارت کی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ جبر و تشدد کی داستان کے جو باب ادھورے رہ گئے تھے۔ انہیں منصور نے اس طرح مکمل کیا کہ خلفائے بنو امیہ کی قبریں کھو کر ان کی ہڈیاں تک جلا ڈالیں پھر بھی جذبۂ لہو آشامی تسکین نہ پا سکا تو اس نے سادات کے گھر کا رخ کیا۔ حضرت محمد بن ابراہیم جیسے یوسفِ دوراں کو زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا۔ حضرت نفس ذکیہ نے ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، خاک و خون میں ملا دیے گئے۔ ان کے بھائی حضرت ابراہیم نے علم و فضل اور شجاعت کی تاریخ رقم کرنی چاہی، مگر سارے اوراق ہوا میں بکھر گئے۔ یہ منصور کے راستے کی آخری چٹان تھی جو ضرباتِ مسلسل سے ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔ اب اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اپنے گھروں میں سہمے ہوئے سادہ دل بندے سوچ رہے تھے کہ برسوں سے انسانی سروں پر سایہ فگن رہنے والی شمشیریں نیام میں چلی جائیں گی اور مخلوق خدا کو کچھ دن کے لیے اماں مل جائے گی مگر یہ ان کا خیال خام تھا۔

اماں کیسی ابھی تو موجِ خوں سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

اور بازوئے قاتل نہیں ٹھہرا۔ ابھی امام اعظمؒ کے خون میں غیرت موجزن تھی۔ منصور نے انہیں بھی کارِ خلافت میں شریک کر کے دنیا کو یہ تاثر دینا چاہا تھا کہ پوری ملت اسلامیہ اس کے دستِ حق پرست پر بیعت کر چکی ہے اور وہ متفقہ طور پر امیر المومنین کے منصب تک پہنچا ہے مگر ابو حنیفہؒ نے انکار کر دیا۔ علم کی پشت پر جہالت کے تازیانے برسائے گئے۔ مجلسِ درس میں خریدے ہوئے انسانوں کو بھیجا گیا کہ وہ اپنی بے لگام زبانوں سے امام کی شان میں نازیبا کلمات کہیں، ماں کے حوالے سے انہیں فحش ترین گالیاں دیں تا کہ سب سے بڑا فقیہہ خوف زدہ ہو کر خلافتِ عباسیہ کے آگے سر جھکا دے لیکن وہ بڑا صبر و تحمل والا تھا۔ اس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ مسلسل لوگوں کو غیرتِ نفس کا سبق دیتا رہا۔ اس کے دروازے پر انسانی ہجوم دیکھ کر دولت و اقتدار کی نفی ہوتی تھی۔ خلافت کے ماتھے پر شکن ابھر آئی اور پھر اسے بھی زنجیریں پہنا کر زنداں کی تاریکیوں میں ڈال دیا گیا۔ منصور کو یقین تھا کہ قید خانے کے شب و روز امامؒ کے

مزاج کو بدل ڈالیں گے مگر جب اسیرِ سیاست کی نازک مزاجیاں اور بڑھ گئیں تو قہر وستم نے نیا رنگ اختیار کرلیا۔ منصور اچانک مہربان نظر آنے لگا۔ منصوبہ سازی مکمل ہو چکی تھی۔ لطف وعنایات کے پردے میں امامؒ کو زہر دے دیا گیا۔ بنو امیہ نے بہترین آدم عمر بن عبدالعزیزؒ کی سانسیں غصب کرلیں اور عباسیوں نے فخرِ عالم ابوحنیفہؒ کے دل وجگر کا کام تمام کردیا۔ دونوں ایک ہی راستے سے گئے۔ حساب برابر ہو گیا۔

قاضیِ شہر حسن بن عمارہ اس مردِ آزاد کو غسل دیتے ہوئے کہتے جاتے تھے ''ابوحنیفہ! تم نے اپنے جانشینوں کو مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبے کو پہنچ سکیں۔'' مگر ابھی ایک خلوت نشین اور باقی تھا جو سرِ دربار بھی منصور کو غاصب کہہ کر پکار سکتا تھا۔ اب خلافت کے حاشیہ برداروں کو اسی کی تلاش تھی۔

☆☆☆

حجاج نے خانہ کعبہ پر سنگ باری کا حکم دے کر پہلے ہی مکہ معظمہ کی حرمت کو پامال کر ڈالا تھا۔ اب مدینہ رسولﷺ اقتدار پرستوں کی زد میں تھا۔ اسی مقام مقدس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

(یہ زمین پر ایسی ادب گاہ ہے جو عرش سے بھی زیادہ نازک تر ہے۔ اسی جگہ جنید بغدادیؒ اور بایزید بسطامیؒ (جیسے بزرگ) اپنے ہوش وحواس کھو آئے ہیں۔)

اسی مقام مقدس کے ایک گوشے میں وہ مردِ حق پرست لوگوں کو زندگی کا درس دیا کرتا تھا۔ اسے کسی آمرِ وقت سے غرض تھی نہ کسی جابر حاکم سے سروکار۔ وہ جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ اسے بہ حسن وخوبی انجام دے رہا تھا مگر اہلِ ہوس پر اس کی یہ گوشہ نشینی بھی گراں تھی۔ امام ابوحنیفہؒ کو زہر دینے کے بعد خلافتِ عباسیہ کے زرخرید غلام اسی درویشِ خدامست کے تعاقب میں تھے۔ عقلِ عیار کی فتنہ سامانیوں کو ابھارا گیا اور نئے انداز سے منصوبہ سازی کی گئی۔

تاریخوں میں مشہور ہے کہ خلیفہ منصور اس سازش سے بے خبر تھا مگر اہلِ نظر جانتے ہیں کہ یہ بے خبری بلا سبب نہیں تھی۔ بڑی رازداری کے ساتھ منصور نے اپنے چچا زاد بھائی جعفر کو مدینے کا عامل مقرر کیا۔ یہ ایک بہترین شاطر تھا جسے سیاست کی بازی کھیلنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ جعفر ایک دن اپنے دل میں نفاق وکدورت چھپائے ہوئے اسی بندۂ آزاد کے حلقۂ درس میں جا پہنچا۔ قدم رکھتے ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ گل ویاسمین کے درمیان آ پہنچا ہے۔ محفل میں عود وعنبر کی خوشبو میں سلگ رہی تھیں۔ پورا



ماحول معطر تھا۔ ہر چیز مہکی ہوئی تھی۔ کثافت کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ سوائے جعفر کے دماغ کے جس پر نفرت وحسد کے غبار کی تہہ جمی ہوئی تھی۔

ہزاروں انسان اس طرح سر جھکائے بیٹھے تھے کہ ان کی سانسوں کی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جعفر نے ادب واحترام کا یہ مظاہرہ خلیفہ کے دربار میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ چہرۂ اقتدار پر رنگ وملال ابھر کر ڈوب گیا۔ کسی نے عاملِ مدینہ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ مزاجِ شہریاری پر بات گراں گزری لیکن جعفر نے منافقانہ جذبوں پر مصلحت کا پردہ ڈال لیا اور خاموشی سے پچھلی قطار میں بیٹھ گیا۔

وہ مردِ آزاد حدیثِ رسولﷺ کا درس دے رہا تھا۔ اس کے لہجے کے جلال سے در ودیوار لرزاں تھے۔ کسی کی بھی یہ جرأت نہ تھی کہ اس کی طرف نظر بھر کر دیکھ لیتا۔ ہر آنکھ سجدہ ریز دکھائی دیتی تھی۔ خود جعفر بھی چند لمحوں کے لیے اپنے آپ کو ایک حقیر انسان سمجھنے لگا مگر اس نے جلد ہی اپنی بگڑتی ہوئی حالت پر قابو پا لیا۔ اس کا عیار ذہن بہت تیزی سے نشیب وفراز پر غور کررہا تھا۔ اگر وہ اسی طرح اس نادار شخص سے متاثر ہوتا رہا تو پھر خلافت کا اہم ترین منصوبہ کس طرح تکمیل تک پہنچے گا۔ جعفر دل ہی دل میں اپنے آپ سے مخاطب ہوا اور پھر یہ سوچ کر اس کی گردن میں کجی آ گئی کہ وہ خلیفۂ وقت کا بھائی ہے۔ جب وہ چلتا ہے تو اس کے ساتھ سپاہ عظیم گردش کرتی ہے، جب وہ بولتا ہے تو اس کے لفظوں میں شمشیروں کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ جب اس کی آنکھ کو جنبش ہوتی ہے تو لوگوں کی ہنستی کھیلتی زندگی پر سکوتِ مرگ طاری ہو جاتا ہے، وہ عظیم ناقابلِ تسخیر قوتوں کا مالک ہے پھر یہ فقیر اور اس کے چند مفلس ہم نوا خلافتِ عباسیہ پر کس طرح غالب آ سکیں گے؟ خیالات کے اس طلسم نے جعفر کو سکون بخشا اور وہ خوف ودہشت کے اس دائرے سے باہر نکل گیا جو کچھ دیر پہلے فقیر کے جلالِ معرفت نے اس کے چاروں طرف کھینچ دیا تھا۔ اس احساس کے ساتھ ہی جعفر کے جسم کو حرکت ہوئی، اس نے اپنے سر کو اس طرح اٹھایا جیسے وہ کسی بلند مقام پر بیٹھا ہو اور درس دینے والا اپنے حاضرین کے ساتھ پستیوں میں سفر کر رہا ہو۔ اس کی فریب کار عقل عجیب عجیب پیکر تراش رہی تھی مگر یہ کیسی بدنصیبی تھی کہ اتنی بڑی محفل میں جعفر تنہا اپنی ذات کا تماشائی تھا۔ بہت دیر گزر جانے کے بعد بھی کسی کو اس کی موجودگی کا احساس نہ ہوا۔ ایک قیامت اور گزر گئی۔ اگرچہ حاضرین کی یہ بے خودی حدیث رسولﷺ کی سماعت کے باعث تھی لیکن عاملِ مدینہ سمجھ رہا تھا کہ اسے قصداً نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ فاسد خیالات نے ایک بار پھر سر ابھارا۔ جعفر کی نظر میں وہ فقیر ہی سب سے بڑا مجرم تھا جس کے اشارے پر اس کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کیا جا رہا تھا۔

اور فقیر کو یہ خبر بھی نہیں تھی کہ اس کی محفل میں کون، کس ارادے سے آیا ہے؟ وہ تو ساری دنیا سے بے نیاز علم کے پیاسوں کو اپنے آقا کا فرمانِ مقدس سنا رہا تھا۔ یکا یک حاضرین میں سے کسی نے بلند آواز میں کوئی سوال پوچھا۔

اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے مگر آواز بہت دھیمی تھی ''آہستہ بولو۔'' اس نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ''یہ محفلِ حدیث ہے۔ کیا تم نے قرآن کا یہ حکم نہیں سنا کہ لوگو! اپنی آوازیں نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو۔ معاذ اللہ! میری آواز نبیؐ کی آواز نہیں، مگر جب بھی کوئی حدیث بیان کی جائے تو یہی سمجھو کہ در پردہ رسول کریمؐ ہی تم سے مخاطب ہیں۔'' تیز آواز میں سوال کرنے والا شرمسار ہو گیا۔

جعفر کے ذہن پر ایک اور ضرب پڑی۔ ''یہ کیسی محفل ہے؟ کیسے ناظرین ہیں اور کیسا عجیب ہے وہ شخص جو مسند درس پر بیٹھا ہے؟''

اس لیے آج تک خلیفہ کو ہی مجرم سمجھا تھا۔ اس کے نزدیک دربارِ خلافت ہی دنیا کی واحد ادب گاہ تھی مگر آج اس فقیر نے ادب واحترام کا مفہوم ہی بدل ڈالا تھا۔ جعفر دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا رہا اور لوگ اپنی سانسیں روکے ہوئے اس شخص کی باتیں سنتے رہے جو مسندِ درس پر خود بھی اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے وہ کسی باجبروت شہنشاہ کے سامنے موجود ہو۔

بالآخر درس حدیث ختم ہوا۔ نشست کے آداب بدل گئے۔ پہلے سب کے سب دوزانو ہاتھ باندھے ہوئے بیٹھے تھے۔ اب قدرے بے تکلفانہ انداز میں بیٹھ گئے مگر حدِ ادب اسی طرح قائم تھی۔ فقہ کا دور شروع ہوا۔ لوگ اپنے اپنے مسائل بیان کرنے لگے۔ وہ شخص نہایت دلاویز انداز میں ہر مسئلے کا حل بتانے لگا۔ اس طرح کہ پوچھنے والا مطمئن ہو جاتا اور اس کے ذہن میں کوئی خلش باقی نہ رہتی۔ اگر کوئی کم عقل بات کی تہہ تک نہ پہنچ پاتا تو مرد آزاد بار بار سمجھاتا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کا ہلکا سا عکس بھی نظر نہ آتا۔ یہ علم کی عجیب مجلس تھی۔

جعفر بھی اپنا ایک مسئلہ لے کر آیا تھا مگر جب لوگوں کے مسائل ختم ہوتے نظر نہ آئے تو وہ درمیان میں بول پڑا۔ عاملِ مدینہ کی اس بے وقت مداخلت سے محفل کا نظم وضبط درہم برہم ہو گیا۔ لوگوں نے پہلی بار جعفر کی موجودگی کا احساس کیا اور اپنی نشستوں سے مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ جہاں سے یہ آواز بلند ہوئی تھی۔ لوگ احترامِ مجلس میں زبان سے تو کچھ نہیں کہہ سکے مگر ان کی نظریں بتا رہی تھیں کہ وہ عامل مدینہ کے اس عمل سے خوش نہیں تھے۔ جعفر کو لمحہ بہ لمحہ یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس محفل میں بیٹھنے



رہنے والے کسی بھی سرکاری عہدیدار کو نا قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ یہاں صرف ایک شخص کی حکومت تھی جو مسند درس پر بیٹھا تھا اور جس کے ماننے والے کسی دوسری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ جعفر کے دل ودماغ کو ایک اور صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے ذہن میں مسلسل گرہیں پڑتی جا رہی تھیں اور ہر گرہ ایسی تھی جسے آسانی سے کھولا نہیں جا سکتا تھا۔

''اطمینان سے بیٹھو۔'' درس دینے والے نے کہا ''خلافِ معمول اس کی آواز سے تلخی نمایاں تھی۔

''یہ مجلس حدیث وفقہ ہے۔ یہاں کے آداب دوسری درس گاہوں سے مختلف ہیں۔ کیا تم نے اسے بازار سمجھ لیا ہے کہ جیسے جی چاہا آواز لگا دی۔ بعد میں آنے والے کو پہلے آنے والے پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ یہ سخت ناانصافی ہے۔ خدا کی زمین پر برسوں سے یہی ہو رہا ہے کہ طاقتور، کمزوروں کو پامال کرتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں مگر اس محفل میں ایسا نہیں ہوتا۔ جو دیر سے آتا ہے وہ دیر میں اپنا مقصد حاصل کرے گا۔''

اس مردِ آزاد نے جعفر کے دل ودماغ پر چھایا ہوا اقتدار کا سارا نشہ اتار دیا تھا۔ اس قدر بے باک گفتگو سن کر عاملِ مدینہ شرم وندامت سے پسینے میں نہا گیا مگر اس کا کام پہلے سے زیادہ سہل ہو گیا۔ وہ نہایت عیاری کے ساتھ اس معصوم شخص کے گرد سیاست کا جال بچھا رہا تھا۔

''میں حکومتِ وقت کا ایک مصروف ترین نمائندہ ہوں۔ میرے کاندھوں پر تم لوگوں کی ذمے داریوں کا بارِ گراں ہے۔ مجھے اور بھی بے شمار کام ہیں۔ میں حاضرینِ مجلس کی طرح زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔''

''تیرے کاندھوں اور تیری ذمہ داریوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟'' مردِ آزاد کے چہرے پر ناگواری کا تیز رنگ ابھر آیا۔ ''خدا نے مخلوق کی جو ذمے داریاں اپنی ذات پر فرض کر رکھی ہیں، ان کا اندازہ کسی انسان کو نہیں ہو سکتا مگر اس کے یہاں بھی وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ کوئی کام وقت سے پہلے نہیں ہوتا۔'' اس شخص کی ایک ہی دلیل نے جعفر کی منطق کے محل کو مسمار کر دیا تھا۔ ''سائل جب کسی کے در پر مانگنے جاتا ہے تو اپنی مرضی کا مالک نہیں رہتا۔ اب یہ دینے والے پر منحصر ہے کہ وہ کب دیتا ہے اور کیا دیتا ہے۔'' اس جواب کے بعد جعفر کی جو کچھ حیثیت باقی رہ گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔

جب وہ درویشِ عرب تمام لوگوں کے سوالات کے جواب دے چکا تو جعفر بن سلیمان سے مخاطب ہوا ''میرے سامنے آ کر بیٹھو پھر سوال کرو۔''

جعفر انتہائی کوشش کے باوجود اپنے دلی جذبات چھپانے سے قاصر تھا۔ وہ اپنی نشست سے اس طرح اٹھا کہ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور قدموں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ شاید عالِمِ مدینہ کی یہ کیفیت غصے کو برداشت کرنے کے سبب تھی۔ وہ حاضرین کے درمیان سے گزرا اور مسندِ درس کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ دیکھنے والے صاف دیکھ رہے تھے کہ درویشِ عرب بلندی پر تھا اور عالِمِ مدینہ ایک سائل کی مانند نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ مجلس کے ظاہری تقاضے پورے ہو گئے تو حدیث وفقہ کے عالم نے جعفر کی طرف دیکھا۔ یہ ایک خاموش اشارہ تھا کہ اب اسے سوال کرنے کی اجازت ہے۔

''آپ کے نزدیک جبری طلاق کی کیا حقیقت ہے؟'' جعفر بن سلیمان نے لب کشائی کی مگر اس کے لہجے میں غرور وتمکنت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اہلِ محفل نے محسوس کیا کہ یہ کسی طرح بھی ایک سائل کا لہجہ نہیں تھا مگر وہ مردِ فقیہہ اس گستاخی پر خفا نہیں ہوا۔ یہ ایک ذاتی معاملہ تھا اور ایسے موقع پر وہ مردِ بزرگ بے مثال قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے سرخ چہرے پر غیر معمولی ٹھہراؤ تھا۔

''میرے نزدیک جبری طلاق، طلاق نہیں ہے۔'' مجلس میں بارعب آواز ابھری اور پھر ہر شے ساکت ہو گئی۔

''امامِ اعظم ابوحنیفہؒ جبری طلاق کو تسلیم کرتے ہیں۔'' جعفر نے اس مردِ فقیہہ کی بات کو رد کرنے کے لیے دلیل پیش کی اور ایسے شخص کا حوالہ دیا جو فقہ کا سب سے بڑا امام تھا، جس کے فیصلے بڑے بے باک ہوتے تھے۔

''ابوحنیفہؒ کا اپنا اجتہاد تھا۔ اپنی رائے تھی۔'' مردِ فقیہہ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا ''میں ابوحنیفہؒ کے فیصلے کو غلط نہیں کہتا۔ صرف اختلاف کرتا ہوں۔ خدا امامؒ پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے تھے، پوری صداقت کے ساتھ بیان کر گئے۔ یہ اپنے اپنے ذہن کی رسائی ہے۔ میں ابوحنیفہؒ سے حسنِ ظن رکھتا ہوں اور دوبارہ واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ جبری طلاق، طلاق نہیں ہے۔''

جعفر بن سلیمان اپنی صریح جہالت کے باوجود بہت دیر تک بحث کرتا رہا مگر وہ مردِ آزاد بڑے تحمل سے ایک ہی بات کہتا رہا۔ بار بار دہرائے جانے کے باوجود اس کے الفاظ میں سرِ مُو بھی فرق نہیں آیا۔ ''میرے نزدیک جبری طلاق، طلاق نہیں ہے۔''

آخر جعفر خاموش ہو گیا۔ اس کا منصوبہ تکمیل تک پہنچ چکا تھا وہ چپ چاپ اٹھا اور فقیر کی مجلس درس سے نکل کر چلا گیا۔ کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ جعفر بن سلیمان کی آمد کے بارے میں کسی خاص



زاویے سے سوچتا۔ اس محفل میں صاف باطن لوگ جمع ہوتے تھے اور اپنے تشنہ ذہنوں کی پیاس بجھا کر واپس چلے جاتے تھے۔ جعفر کی رخصت کے بعد اس مردِ درویش کے کچھ شاگردوں نے اشارتاً کہا بھی کہ عالِمِ مدینہ کی آمد بے سبب نہیں تھی مگر فقیہہ عرب نے یہ کہہ کر سب کو خاموش کر دیا کہ بدگمانی حرام ہے۔

جعفر بن سلیمان نے جس سازش کا منصوبہ تیار کیا تھا اب اُس کے خاکے میں رنگ بھرنے کی ساعت آ گئی تھی۔ کہنے والے یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ خلیفہ منصور کا جاسوس تھا۔ جسے ایک خاص مقصد کے تحت بغداد سے مدینہ بھیجا گیا تھا۔ بہرحال جاسوس کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی اور اب وہ شمع کی روشنی میں بڑی رازداری کے ساتھ منصور کو ایک خفیہ اور اہم خط تحریر کر رہا تھا۔ جعفر نے عباسی خلیفہ کو لکھا تھا:

''خدا آپ کی بلند اقبالی کو دشمنوں کے حسد وشر سے محفوظ رکھے۔ وہ شخص جو اپنے آپ کو فقیہہ عرب سمجھتا ہے۔ نہایت مغرور ہے۔ اس کے دروازے پر ناقص العقل لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اگرچہ آپ اسے ایک بار منع فرما چکے ہیں کہ وہ جبری طلاق کے مسئلے کو سرِعام بیان نہ کرے مگر اس پر اب تک خلیفہ کے فرمانِ مقدس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں بذاتِ خود اس کی مجلس درس میں گیا، اتمام حجت کے طور پر بار بار مسئلہ پوچھا لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہ آیا۔ واضح الفاظ میں ہزاروں انسانوں کے سامنے چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ جبری طلاق، طلاق نہیں۔ وہ در پردہ فتنہ وفساد پھیلا رہا ہے۔ اس شخص کے فتور کی وجہ سے جبری طلاق کا مسئلہ، جبری خلافت تک پہنچ گیا ہے۔ اب مدینے کے معصوم باشندوں کی اکثریت خلافت عباسیہ کو جبری سمجھ کر تسلیم نہیں کرتی اور یہ سب کچھ اس فقیہہ کے شر انگیز بیانات کے سبب ہو رہا ہے۔ امیر المومنین اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ وہی شخص ہے جس نے آپ کے دشمن محمد نفس ذکیہ اور ابراہیم کی حمایت کی تھی۔ تائیدِ حق سے حضور والا کے دونوں دشمن ہلاک ہو گئے مگر اس فقیہہ نے ان واقعات کو ابھی تک فراموش نہیں کیا ہے اور عام مذہبی مسائل کی آڑ لے کر جانشین سفاح کو غاصب قرار دے رہا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں دیگر اہل حضرات سے بھی گفتگو کی ہے، وہ بھی میرے نظریات کی تائید کرتے ہیں۔''

جعفر بن سلیمان نے چند ضروری ہدایات کے بعد یہ خفیہ مکتوب تیز رفتار قاصد کے حوالے کیا۔ اس کارروائی سے بظاہر یہی تاثر ملتا تھا کہ جعفر کو خلیفہ منصور کے جواب کا انتظار ہے مگر یہ محض خانہ پری تھی۔ اس نے اپنے دل میں کچھ اور ہی ٹھانی تھی۔ قاصد نے ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا ہوگا کہ جعفر نے سپاہیوں کے ذریعے اس مردِ درویش کو اپنے دربار میں طلب کر لیا۔

''جبری طلاق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرو۔'' جعفر نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ اس بار وہ اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کر رہا تھا۔ ماتھے کی ایک ایک شکن سے تکبر کی نمائش ہو رہی تھی۔

''عاملِ مدینہ میری رائے سے اچھی طرح باخبر ہے۔'' فقیہہ عرب نے جواب دینے سے گریز کیا۔ اَب اس پر تمام صورت حال واضح ہو چکی تھی۔

''میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔'' جعفر بن سلیمان بضد تھا۔

''میں بار بار جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔'' درویشِ خدا مست کی بے نیازی اور غیرتِ نفس ابھر آئی تھی۔ اب اس کا لہجہ نرم و شیریں ہونے کے بجائے تند و تیز تھا۔

''خلیفہ منصور کی بیعت کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟'' آہستہ آہستہ جعفر کے خوفناک ارادے ظاہر ہو رہے تھے۔

''یہ بات بھی منصور کو اچھی طرح معلوم ہے۔'' مرد بزرگ کا ردیہ لحظہ بہ لحظہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔

''میرے سامنے خلافتِ عباسیہ کی حمایت کا اعلان کرو۔'' جعفر بن سلیمان کی گفتگو کا انداز جارحانہ تھا۔ ''کہو کہ منصور خلیفہ برحق ہے۔''

''اگر میں اقرار کر لوں تو جبری طلاق کا مسئلہ دوسری شکل میں ابھر کر سامنے آ جائے گا۔'' فقیہہ عرب نے سب کچھ کہہ دیا مگر جعفر بن سلیمان، خلافتِ عباسیہ کے بارے میں صاف صاف سننا چاہتا تھا۔

''کیا تمہارے نزدیک امیر المومنین کا یہ منصب ناجائز ہے؟'' اس نے دوسرے انداز سے گرفت کرنا چاہی۔

''مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا۔'' مرد بزرگ کے چہرے سے اب کیفیتِ جلال ظاہر ہونے لگی تھی ''اگر منصور کو میرے اقرار کی ضرورت ہے تو خود چل کر میرے پاس آئے۔''

''امیر المومنین نے مجھے اختیار دیا ہے کہ میں ان کے نام پر اہلِ مدینہ سے بیعت لوں۔'' جعفر بن سلیمان بھی حالت غضب میں بول رہا تھا۔

''میں ان اختیارات کو تسلیم نہیں کرتا۔'' درویش کی بے نیازی کا وہی عالم تھا ''جب عاملِ مدینہ میری زبان سمجھنا ہی نہیں چاہتا تو مجھ پر لازم ہے کہ خاموشی اختیار کر لوں۔'' اتنا کہہ کر فقیہہ عرب چپ ہو گیا۔ جعفر بن سلیمان نے اس کے بعد بے شمار سوالات کیے، گستاخی اور بے ادبی کے نئے نئے حربے آزمائے لیکن وہاں سب باتوں کے جواب میں صرف خاموشی تھی، مکمل خاموشی۔



آخر عاملِ مدینہ کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس نے قوی الجثہ جلادوں کو بلا کر اپنی طاقت کا ایک اور بھرپور مظاہر کیا مگر اس مردِ بزرگ نے جلادوں کی موجودگی کو اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے وہ بہت لاغر اور نحیف انسان ہوں۔ یہ شانِ بے نیازی دیکھ کر جعفر کے دل و دماغ سلگ اٹھے۔

''اس کے جسم پر تازیانوں کی بارش کرو...... پھر اسے اندازہ ہو گا کہ خلیفۂ وقت کی نافرمانی پر کیسا عذاب نازل ہوتا ہے۔'' جعفر کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہونے کی دیر تھی کہ کوڑوں کی بھیانک آواز سے پورا دربار گونجنے لگا۔ فقیہہ عرب کا سرخ و سفید جسم مزید تابناک ہو گیا۔ اب نرم و نازک جلد کی رنگت میں بہنے والے خون کی آمیزش ہو گئی تھی۔ جعفر کا خیال تھا کہ آرام دہ بستر پر بیٹھ کر شاگردوں کو تعلیم دینے والا یہ سختیاں برداشت نہیں کر سکے گا لیکن اس وقت عاملِ مدینہ حیران رہ گیا۔ جب فقیہہ عرب کے پاؤں کانپے اور نہ منہ سے کوئی چیخ بلند ہوئی۔ جعفر نے جلادوں کو دوسرا اشارہ کیا۔ تشدد کی لے تیز ہو گئی۔ یہاں تک کہ پوری قوت کے ساتھ ستر کوڑے برسائے گئے۔ جسم خون میں نہا گیا مگر زبان کی لغزش نہیں ہوئی۔ نہ رحم کی بھیک مانگی، نہ ماتمی لہجے میں فریاد کی۔ شدتِ کرب کے آثار چہرے پر ابھرا بھر کر مٹتے رہے۔ جعفر بن سلیمان کو اپنے منصوبے کے ابتدائی مرحلے میں شکست فاش ہو گئی۔ اگر وہ عذاب کسی فیلِ مست پر نازل ہو جاتا تو اس کی چیخوں سے سارا جنگل گونج اٹھتا لیکن

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

جب اس مردِ فقیہہ نے جبر و تشدد کے سامنے اپنی رائے تبدیل نہیں کی تو جعفر بن سلیمان نے اپنے منصوبے کے دوسرے حصے کو عملی جامہ پہنایا۔ رستے ہوئے زخموں کو صاف کیا گیا تاکہ اہل مدینہ کو یہ گمان نہ ہو کہ اس مرد بزرگ کو خلافت کے جور و ستم کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اہل دربار سمجھ رہے تھے کہ اب فقیہہ عرب کو آزمائش سے نجات مل گئی ہے مگر جعفر اسے ایک اور امتحان سے گزارنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ آخر اس کے خوفناک منصوبے کا دوسرا رخ سامنے آیا۔ عاملِ مدینہ نے ایک بار پھر خلیفہ منصور کی بیعت کا ذکر چھیڑا۔ یہ محض ایک چال تھی۔ فقیہہ عرب بدستور خاموش رہا۔ جعفر نے خود ہی سوال کیا اور اتمام حجت کے لیے خود ہی جواب دے ڈالا۔

''تمہاری خاموشی کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ تم خلافتِ عباسیہ کو جبری خلافت سمجھتے ہو؟'' جعفر بن سلیمان نے عیاریوں کی انتہا کو چھو لیا تھا۔ ''تمہارے نزدیک خلیفہ منصور غاصب ہے؟'' تہمت اپنی

آخری حد کو پہنچ گئی۔ وہ مرد بزرگ ساکت کھڑا رہا۔ اس کے زخمی جسم کو ہلکی سی بھی جنبش نہیں ہوئی۔ بس خاموش نگاہوں سے اہل دربار کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں کئی سوال تھے مگر ان سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ عہدے اور امارت نے لوگوں کو خوفِ خدا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک سکوت طاری رہا پھر جعفر بن سلیمان نے طاقتور جلادوں کے نئے دستے کو طلب کیا۔

اب نیا ستم ایجاد ہونے والا تھا۔ مردِ فقیہہ کی وہی کیفیت تھی۔ نہ اس کی آنکھوں کی پتلیاں کانپیں اور نہ پائے استقامت میں لغزش آئی۔ جلاد وحشیانہ انداز میں آگے بڑھے۔ طاقت کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ فقیہہ عرب کے دونوں ہاتھ کھینچے گئے۔ بڑی اذیت ناک سزا تھی۔ ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ مرد بزرگ کے چہرے کا رنگ بدل بدل گیا مگر نہ کوئی چیخ ابھری اور نہ رحم طلبی کا کوئی کلمہ زبان تک آیا۔ جلادوں کا ہولناک عمل مسلسل جاری رہا۔ ہڈیوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ یہاں تک فقیہہ عرب کے دونوں ہاتھ مونڈھوں سے اتر گئے۔ یہ ایسا دردناک منظر تھا کہ ایک لمحے کے لیے ظلم کے بانی بھی لرز اٹھے مگر پھر فوراً ہی دلوں پر نفرت وقہر کا غبار چھا گیا۔

''اب اس کے چہرے پر سیاہی مل دو۔'' جعفر بن سلیمان نے نیا حکم جاری کیا۔ جلاد اس حکم کی تعمیل میں پرجوش نظر آئے۔ دوسرے ہی لمحے سرخ وسفید چہرے والے انسان کا منہ کالا کر دیا گیا۔ تمام درباری حیرت زدہ تھے۔ کسی پر جعفر بن سلیمان کے دل کا معاملہ نہیں کھلتا تھا کہ وہ آئندہ کیا کرنے والا ہے؟

''اب اسے خچر پر بٹھا کر مدینے کے اطراف میں گھماؤ۔'' جعفر کا نیا فرمان جاری ہوا ''یہی سواری اس کے شایانِ شان ہے۔ اسے اس کے مقام سے آشنا کراؤ۔'' جعفر اب مکمل طور پر بے نقاب ہو چکا تھا۔ درباریوں کے چہرے پر خوف ودہشت کی علامت ابھری۔ ''وہ خلافت کے نافرمانوں کا حشر دیکھ چکے تھے۔ اب ایک اور سرکش کو سزا دی جا رہی تھی۔ تمام سرکاری خادموں اور مصاحبوں نے اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجالی تھیں کہ جعفر بن سلیمان ان کی تائید سے خوش ہو کر وفاداری کی سند عطا کر دے۔ انہیں ایک مظلوم انسان کو دی جانے والی سزا پر ذرہ بھر بھی افسوس نہیں تھا۔ ان کے پیشِ نظر صرف اپنے انجام تھے۔ فقیہہ عرب کا چہرہ سیاہ کیا گیا تھا مگر خلافتِ عباسیہ کے وفاداروں کے دل کالے ہو گئے تھے۔ کہیں سے روشنی کی کوئی کرن نہیں پھوٹ رہی تھی۔

آخر اس مرد بزرگ کو مسندِ درس سے اٹھا کر خچر جیسی حقیر سواری پر بٹھا دیا گیا۔ تذلیل کا ایک اور باب مکمل ہو چکا تھا۔ ''اس جگہ بیٹھ کر اپنی حیثیت کا اندازہ کر!'' جعفر بن سلیمان نے ادب شائستگی کی تمام



روایتیں پامال کر ڈالی تھیں اور آج وہ گستاخیوں کی ساری حدوں کو عبور کر گیا تھا۔ ''خدا کی زمین پر فساد پھیلانے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔'' جعفر حالت غضب میں مسلسل بول رہا تھا مگر فقیہہ عرب کے پاس ان سارے الزامات کے جواب میں صرف ایک خاموشی تھی۔ جس کا مفہوم اہلِ ستم کی عقل سے بالاتر تھا۔ اربابِ اختیار سمجھ رہے تھے کہ طاقت کے مظاہرے نے معلمِ اخلاق کو دہشت زدہ کر دیا ہے اور اس کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ ہونٹوں پر لگی ہوئی مہرِ سکوت اگر کسی خوف کا نتیجہ ہوتی تو وہ اس مقام تک پہنچنے کے بجائے خلیفہ منصور کے محل میں بیٹھ کر دنیا کی رنگینیوں سے کھیل رہا ہوتا۔ سیاہی ان کے چہروں پر ملی جاتی ہے جن کے دل آئینہ ہوتے ہیں اور خچر کی پشت پر وہی بیٹھتے ہیں جو امارت وشاہی کے پہلو میں انکار کر دیتے ہیں۔ مملکتِ اسلامیہ کے خزانوں میں وقت کی نادر ونایاب اشیاء جمع تھیں مگر جبری خلافت کا اس جیسا منکر کوئی دوسرا موجود نہیں تھا۔

جعفر بن سلیمان نے پھر اس امید پر فقیہہ عرب کی طرف دیکھا کہ شاید وہ بصدِ سامانِ رسوائی مدینے کا طواف نہ کر سکے اور اس کی آنکھوں میں التجا کا کوئی عکس نظر آ جائے مگر وہ بدستور کسی کوہِ گراں کی طرح ساکت تھا۔ احساسِ شکست نے جعفر کے جسم پر لرزہ طاری کر دیا۔ عامل مدینہ چیخنے لگا۔ ''یہ اپنی محفل میں مشک وعنبر کی خوشبوئیں سونگھنے کا عادی ہے۔ اس کے کپڑوں پر غلاظت ڈالو کہ یہ اسی کا مستحق ہے۔'' تحقیر کا آخری باب بھی رقم کر دیا گیا تھا۔ جعفر اپنی راحت کدے میں جانے کے لیے آگے بڑھا لیکن پھر اچانک پلٹ آیا ''اسے بتا دو کہ قصرِ منصور کے علاوہ ہر راستہ کوئے ملامت کی طرف جاتا ہے۔'' یہ اقتدار کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ الفاظ کی بازگشت ختم ہونے سے پہلے جعفر سرخ پتھر کی بنی ہوئی عمارت میں روپوش ہو گیا اور ذلت ورسوائی کی دھوپ میں جلنے کے لیے وہ شخص تنہا رہ گیا جس کے جوتوں سے لپٹی ہوئی خاک بھی جعفر بن سلیمان سے زیادہ محترم تھی۔

خلافتِ عباسیہ کے نمک خوار سپاہی اس مردِ خدا کو کھینچتے ہوئے لے گئے۔ راستہ چلنے والوں نے رک کر اس شخص کو دیکھا جس کے چہرے کے خدوخال کو حکومتِ وقت کی سیاہی نے چھپا دیا تھا۔ راہ گیروں کا خیال تھا کہ سپاہی انہیں اس مقام پر جمع نہیں ہونے دیں گے لیکن سپاہیوں کی تو عین خواہش تھی کہ ''معتوب'' کے گرد مخلوق خدا کی بھیڑ لگ جائے اور پھر وہ ایک ناپسندیدہ جانور کی پشت سے اپنی مسند امامت کا نظارہ کر سکے۔ کچھ لوگوں کے جمع ہوتے ہی فقیہہ عرب کے لباس پر گندگی ڈالی گئی۔ ہوا کے جھونکوں نے غلاظت کو اپنے اندر جذب کر کے چاروں طرف منتشر کر دیا۔ قریب کھڑے ہوئے لوگ

سپاہیوں کی اس حرکت سے بدحواس ہو گئے اور انہوں نے سر پر بندھے ہوئے رومالوں سے اپنے چہرے چھپا لیے۔ فقیہہ عرب نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عکسِ ملال ابھر آیا۔ یہ ایک خاموش شکایت تھی جو بندے نے کی اور آقا نے سنی۔ اہلِ دنیا کو پتا بھی نہ چل سکا کہ کہنے والے نے کیا کہا اور سننے والے نے کیا سنا۔

قافلۂ رسوائی آگے بڑھا۔ اس کاروانِ ذلت میں صرف ایک ہی مسافر تھا، باقی تو سب تماشائی تھے۔ یہ قافلہ جدھر سے بھی گزرتا لوگ اس کے پیچھے پیچھے ہو جاتے۔ شور بڑھا تو مکیں اپنے مکانوں سے نکل آئے۔ اہلِ مدینہ نے اتنا دلچسپ تماشہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جعفر بن سلیمان کے سپاہیوں نے تماشے کو مزید دلچسپ بنانے کے لیے ایک بار فقیہہ عرب کے جسم پر غلاظت کا ایک اور ڈھیر پھینکا۔ مرد بزرگ گندگی میں نہا گیا۔ غلاظت و کثافت کے بے شمار ذرات عمامے سے لے کر ریشِ مبارک تک پہنچے۔ فقیہہ عرب کے چہرے پر شدید کرب کی علامت ابھری۔ وہ اپنی دستار اور داڑھی سے گندگی کے ذرات صاف کرنا چاہتا تھا مگر اس کے دونوں ہاتھ کاندھوں سے اتار دیے گئے۔ مرد بزرگ نے اپنے مفلوک ہاتھوں کو دیکھا، فقیہہ بردوش سپاہیوں پر نظر ڈالی اور سر جھکا لیا۔

اب دور تک لوگوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔ جعفر کی وحشیانہ خواہش کی تکمیل ہو چکی تھی۔ وہ یہی تو چاہتا تھا کہ اہلِ مدینہ، فقیہہ عرب کی رسوائی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ دیارِ رسولؐ کے سادہ دل باشندے حیران و پریشان تھے۔ اس مقامِ مقدس کی حدود میں داخل ہونے والا مجرم بھی معزز ہو جاتا تھا مگر یہ مظلوم کون تھا جسے رسوا کرنے کے لیے سپاہی، شہرِ حبیبؐ تک کھینچ کر لائے تھے۔ اہلِ مدینہ نے اپنی زندگی میں پہلی بار اس قدر ذلت آمیز منظر دیکھا تھا۔ تماشے کی خبر عام ہوتی چلی گئی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر اس شاہراہ پر جمع ہونے لگے۔ جہاں سے وہ سیاہ فام شخص گزر رہا تھا۔ ظاہری حلیے کو دیکھ کر تماشائی یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ حکومتِ وقت کا معتوب ہے اور اس سے کوئی سنگین جرم سرزد ہوا ہے۔ ''مگر وہ کون ہے؟'' اس سوال کا جواب صرف جعفر بن سلیمان کے سپاہی جانتے تھے۔ چہرے کی سیاہی نے اس کے نقش و نگار کو دھندلا کر رکھ دیا تھا۔ اس لیے بہت قریب سے جاننے والے بھی اسے نہ پہچان سکے۔ ہجوم بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ ہر طرف آدم زادوں کے سر ہی سر نظر آنے لگے۔

سپاہیوں نے خچر کو کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ فقیہہ عرب کو مدینہ کی ہر گلی، ہر کوچے سے گزارنا چاہتے تھے۔ اچانک اس مرد بزرگ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''ٹھہر جاؤ۔ تم کب تک میرے ساتھ مارے



مارے پھرو گے؟ سواری کو روک لو۔ میں تمہاری مشکل آسان کر دیتا ہوں۔''

سپاہی رک گئے۔ ان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ فقیہہ عرب، مزید رسوائی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے اعترافِ جرم کر کے خلافت کی پناہ ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ سپاہیوں کے خیال میں جعفر بن سلیمان کا منصوبہ کامیاب ہو چکا تھا۔

''تم اپنے گناہ سے تائب ہوتے ہو؟'' ایک سپاہی نے مرد بزرگ سے پوچھا۔ اس نے سپاہی کی بات سنی بھی نہیں، وہ تو گردن بلند کیے ہوئے مجمع عام کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اگر تم ایک بار توبہ کر کے ہمیشہ کے لیے اپنی زبان بند کر لو تو تمہارے لیے قصرِ خلافت کے دروازے کھل سکتے ہیں۔'' دوسرے سپاہی نے عنایاتِ شاہی کا ذکر اس طرح کیا۔ جیسے الفاظ کی گونج ختم ہوتے ہی وہ مرد بزرگ بھیک کے لیے اپنا دامن پھیلا دے گا۔ فقیہہ عرب نے دوسرے سپاہی کی گفتگو بھی نہیں سنی۔ وہ مسلسل انسانی ہجوم کا جائزہ لے رہا تھا۔ نہایت وقار اور صبر و سکون کے ساتھ۔ جیسے کوئی سپہ سالار اپنی افواج کی صف بندی دیکھ رہا ہو۔ یا پھر کوئی عظیم خطیب تقریر شروع کرنے سے پہلے ہجوم کی نفسیات کا اندازہ کر رہا ہو۔ وقت کی رفتار کچھ دیر کے لیے ٹھہری گئی۔ حکومت بھی خاموش تھی اور عوام بھی ساکت تھے۔ آخر الفاظ اور زبان کے فاصلے ختم ہوئے۔ فقیہہ عرب کی ہیبت و جلال میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ کئی دن کی طویل خاموشی کے بعد آج وہ پہلی بار بول رہا تھا۔

''اے شہرِ مقدس کے رہنے والو! میری طرف دیکھو۔ تم میں سے جو لوگ مجھے جانتے ہیں، سو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے، وہ جان لیں کہ مالک بن انسؓ ہوں۔ کسی نے کیا فتویٰ دیا ہے، مجھے اس سے غرض نہیں۔ ہر شخص خدا کے سامنے اپنے عمل کا جواب دہ ہے۔ میں کل بھی سرِ عام کہتا تھا اور آج بھی علی الاعلان کہتا ہوں کہ جبری طلاق، طلاق نہیں......'' آواز کیا تھی، ایک زلزلہ تھا۔ ساعتوں میں شگاف پڑ گئے اور جذبات کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ لوگ چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ ان کا امام سرِ بازار رسوا ہو رہا تھا۔

☆☆☆

حضرت امام مالکؒ کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ مدینۂ رسولؐ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت میں اختلاف ہے مگر خود حضرت امامؒ کا یہ قول ہے کہ میں 93ھ میں پیدا ہوا۔ بیشتر مورخین نے بھی اسی کو آپ کا سالِ پیدائش قرار دیا ہے۔ حضرت امام مالکؒ کے مورثِ اعلیٰ کا تعلق یمن کے قبیلے ذواصبح سے تھا۔ آپ

والد اور والدہ کی طرف سے عربی النسل تھے۔ آپ کے پردادا حضرت ابو عامرؓ یمن سے مدینہ تشریف لائے۔ مشہور ہے کہ ابو عامرؓ ایک جلیل القدر صحابی تھے اور غزوۂ بدر کے علاوہ رسالت مآبؐ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوئے تھے۔ بعض مورخین نے اس واقعے کی صحت سے انکار کیا ہے۔ اس گروہ کی تحقیق کے مطابق حضرت ابو عامرؓ سرور کونینؐ کے وصال کے بعد مدینے کی حدود میں داخل ہوئے تھے۔ اس لیے صحابی ہونے کے گراں بہار اعزاز سے محروم رہے۔ اس بحث سے قطع نظر ابو عامرؓ کا شمار بڑے تابعین میں ہوتا ہے اور اس بات پر تمام صاحبانِ نظر متفق ہیں۔ آپ کے والد محترم حضرت انسؓ مشہور خادم رسولؐ ہیں اور اسی نسبت سے حضرت امام مالکؒ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ چاروں فقہائے کرام میں صرف آپ کا سلسلہ نسب ایک صحابی تک پہنچتا ہے۔

حضرت امام مالکؒ کے بارے میں یہ عجیب و غریب روایت شہرت پا گئی کہ آپ دو یا تین سال تک شکم مادر میں رہے۔ خود حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جیسے بزرگ نے بھی اسی روایت کو پورے یقین کے ساتھ بیان کیا ہے اور جہاں تک فقہ مالکی کے ماننے والوں کا سوال ہے تو ان میں سے بیشتر افراد آج بھی اس واقعے کو بطور فخر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”ہمارا امامؒ تو وہ ہے جس کا ہر انداز دوسروں سے جداگانہ ہے۔ یہاں تک اس کی دنیا میں آمد بھی ایک انفرادیت رکھتی ہے۔“ حضرت مالک بن انسؒ کے عقیدت مندوں کے خیال میں ان کا امامؒ اپنی پیدائش کے ساتھ ہی ایک روشن نشانی لے کر آیا تھا اور یہ نشانی شکم مادر میں تین سالہ قیام تھا۔

حضرت امام مالکؒ کی پیدائش کے سلسلے میں یہ روایت سینہ بہ سینہ اور کتاب در کتاب صدیوں تک سفر کرتی رہی۔ ماضی میں شاید کسی تحقیق کرنے والے نے اعتراض نہیں اٹھایا کہ یہ روایت عقل کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی لیکن جب دور حاضر میں چاروں طرف سائنس کی حیران کن ترقی کا شور بلند ہوا تو لوگ اس روایت کو بھی عقل کے پیمانے پر ناپنے لگے۔ مشہور محقق پروفیسر ابوزہرہ مصری نے اپنی کتاب ”امام مالکؒ“ میں پیدائش کی اس روایت کو خلافِ عقل قرار دیا ہے۔ پروفیسر ابوزہرہ عہد جدید کی ایک عالم و فاضل شخصیت ہیں لیکن محض سائنس کی بنیاد پر ان کے دعوے کو صحیح قرار دیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں طبی نقطہ نظر کچھ بھی ہو لیکن ہمارے نزدیک سارے انسانی علوم قدرتِ خداوندی کے تابع ہیں۔ خالقِ کائنات جب چاہے ان اصولوں کو تبدیل کر سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔ اس پیغمبر جلیل کی پیدائشِ مبارک کو پروفیسر ابوزہرہ مصری طب و سائنس کے اصولوں کے تحت جانچنے کی کوشش



کریں گے۔ اگر انہیں جدید علوم کی کتابوں سے اس سوال کا جواب نہیں ملے گا تو کیا وہ ابن مریمؑ کے تقدس سے انکار کر دیں گے؟ عیسائیوں نے بھی قدرت کی اسی کرشمہ سازی کا سہارا لے کر حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا اور جب ان لوگوں نے اپنی گمراہی کو مذہب کی اساس بنا لیا تو پیغمبرِ اسلام پر وحی نازل ہوئی۔ ”یہ بے عقل انسان آخر کس بات پر جھگڑ رہے ہیں؟ عیسیٰؑ، مریم کے بیٹے ہیں مگر آدمؑ کو تو ہم نے ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا کیا اور تمہارا رب ایسی ہی قدرت والا ہے۔“ اب اہلِ دانش، تخلیقِ آدمؑ پر کس سائنسی قانون کا اطلاق کریں گے؟ آج بھی بڑے محیر العقول انداز میں بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر ان پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ بہر حال حضرت آدمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے زندہ واقعات کی موجودگی میں ہمارے نزدیک پروفیسر ابوزہرہ مصری کا دعویٰ مجہول ہے اور یہ بات عین قرین قیاس ہے کہ امام مالکؒ تین سال تک شکم مادر میں رہے ہوں۔ اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ قدرت نے مالک بن انسؒ کی شکل میں اہل زمین پر اپنی نشانی ظاہر کی ہو۔ اس بحث سے قطع نظر اگر ہم امام مالکؒ کو پیدائش کے اعتبار سے ایک عام بچہ تسلیم کر لیں تب بھی اس مردِ پاکباز کی عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت امامؒ اپنے عقیدت مندوں اور جدید دانشوروں کے تصورات سے بھی زیادہ بلند تھے۔

حاسدین کی ایک جماعت نے امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کو غلام زادہ کہہ کر ان کی شخصیت کو ہلکا کرنے کی کوشش کی تھی۔ بالکل اسی طرح امام مالکؒ پر بھی مخالفین نے یہی حربہ استعمال کیا تھا۔ آپ کے مورث اعلیٰ کے بارے میں مشہور کیا گیا کہ وہ ایک آزاد کردہ غلام تھے مگر تحقیق کرنے والوں نے ثابت کر دیا کہ یہ محض الزام تراشی تھی۔ امام مالکؒ کی والدہ محترمہ حضرت عالیہؒ کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ آپ ایک شخص ابوعبیداللہ بن معمر کی آزاد کردہ کنیز تھیں لیکن یہ الزام بھی بے بنیاد ثابت ہوا۔ امام مالکؒ حسب و نسب دونوں کے اعتبار سے ایک معزز عرب تھے اور آپ کے خاندان پر کبھی غلامی کا تاریک سایہ نہیں پڑا۔ آپ کے پردادا ابو عامرؓ خود بھی بڑے عالم تھے، اس لیے گھر میں تعلیم و تربیت کا چرچا عام تھا۔ حضرت امامؒ کی مادرِ گرامی نہایت ذوق و شوق سے آپ کو تعلیم کی رغبت دلائی تھی۔ اس وقت مشہور محدث حضرت ربیعہ بن عبدالرحمٰنؒ علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ حضرت ربیعہؒ کے درس میں امام حسن بصریؒ، امام شعبہؒ، امام اوزاعیؒ اور یحییٰ انصاریؒ جیسے بزرگ شریک ہوتے تھے۔ امام مالکؒ کی والدہ محترمہ حضرت ربیعہؒ کی شخصیت سے متاثر تھیں۔ اس لیے ان کی شدید خواہش تھی کہ صحابی رسولؐ کا بیٹا ان

ہی کے زیرِ سایہ تربیت حاصل کرے۔ نتیجتاً جب امام مالکؒ نے حفظِ قرآن کی دولتِ لازوال سے مالا مال ہو گئے تو ایک دن حضرت عالیہؒ نے اپنے خوبصورت فرزند کو بڑی محبت سے عمدہ لباس پہنایا اور سر پر عمامہ باندھنے کے بعد کہا "ربیعہؒ کے پاس جاؤ اور ان سے علم حاصل کرو۔"

حضرت ربیعہ بن عبدالرحمٰنؒ مسجد نبویؐ میں درس دیا کرتے تھے۔ امام مالکؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت ربیعہؒ نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا کہ ان کی درس گاہ میں آنے والا بچہ کون ہے۔ امامؒ کی بچپن ہی سے یہ عادت تھی کہ حفظ کرنے کے سلسلے میں بہت زیادہ حریص تھے۔ حضرت ربیعہؒ جو کچھ لکھواتے، امام مالکؒ اسی روز حرف بہ حرف یاد کر لیتے۔ آپ کے شوق کا یہ عالم تھا کہ سبق لینے کے بعد مسجد نبویؐ سے اٹھ کر درختوں کے سائے میں چلے جاتے اور ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اس وقت تک پڑھتے رہتے جب تک کاغذ پر لکھا ہوا ایک ایک لفظ آپ کے ذہن میں منتقل نہ ہو جاتا۔ حضرت امامؒ بڑی جانفشانی سے علم حاصل کر رہے تھے۔ وقت ملتا تو دوسرے بزرگوں کے حلقۂ درس میں بھی جاتے تھے۔ آپ کی شدتِ طلب کا یہ حال تھا کہ مختصر سی مدت میں ساری دنیا کا علم سیکھ لینا چاہتے تھے۔ ان ہی دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا جس نے امامؒ کی دنیا ہی بدل ڈالی۔

امام مالکؒ اپنے والدِ محترم اور بھائی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک حضرت انسؒ نے اپنے دونوں بیٹوں سے ایک سوال پوچھا۔ امام مالکؒ نے بہت سوچ کر جواب دیا مگر وہ غلط تھا، اس کے برعکس آپ کے بھائی نے صحیح جواب دیا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر حضرت انسؒ نے امام مالکؒ سے کہا "یہ سب کچھ بے قراری کے سبب ہوا ہے۔ تم لوگوں کے پاس مارے مارے پھرتے ہو۔ اسی لیے عاجز رہے۔ اگر کسی ایک کے ہو جاتے تو صحیح جواب دیتے۔" امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ سن کر غصہ آ گیا۔ میں گھر سے نکلا اور سیدھا ابن ہرمزؒ کے پاس چلا گیا۔

ابن ہرمزؒ اپنے وقت کے بہت بڑے امام تھے۔ انہیں حضرت مالک بن انسؒ سے ایک خاص انسیت تھی۔ آپ بڑی شفقت فرماتے تھے اور نہایت توجہ کے ساتھ امامؒ کو علم حدیث کے رموز و نکات سمجھاتے تھے۔ یہ امام مالکؒ کے بچپن کا زمانہ تھا۔ حضرتِ امامؒ اس دور کی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں درختوں کی آڑ میں چھپ جاتا تھا اور ابنِ ہرمزؒ کے بچوں سے ملتا تھا۔ اس واقعے کے پس منظر میں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت امامؒ کی عمر کیا ہوگی۔ ایک بار ابنِ ہرمزؒ سے درس لینے کے لیے ان کے مکان پر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ ابنِ ہرمزؒ نے اپنی باندی سے فرمایا "دیکھو مالکؒ ہوگا۔" یہ



بات بڑے یقین کے ساتھ کہی گئی تھی۔

باندی نے دروازے پر آ کر باہر جھانکا اور الٹے قدموں لوٹ گئی، واپس آ کر ابنِ ہرمزؒ سے کہا "جی ہاں وہی سرخ رنگت والا لڑکا ہے۔"

ابنِ ہرمزؒ نے باندی کی طرف دیکھ کر فرمایا "وہ لوگوں میں بڑا عالم ہے۔" اہلِ نظر امام مالکؒ کی عمر دیکھیں اور ابن ہرمزؒ کی اس پیش گوئی کا اندازہ کریں۔

امام مالکؒ کو اپنے استاد سے اس قدر عقیدت تھی کہ جب تک ابن ہرمزؒ زندہ رہے آپ نے علم کی کسی درس گاہ کا رخ نہیں کیا۔ فرماتے تھے کہ ابن ہرمزؒ کا آستانہ چھوڑ کر کسی کے دروازے پر نہیں جا سکتا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ امامؒ نے تیرہ سال تک ابن ہرمزؒ کی اس طرح خدمت کی کہ دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ اس محبت کے جواب میں ابن ہرمزؒ نے بھی امام مالکؒ پر اپنا سارا علم لٹا دیا اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو امام مالک بن انسؒ ان کے علم کے سب سے بڑے وارث تھے۔

ابن ہرمزؒ کی موت نے امام مالکؒ کو اس قدر متاثر کیا کہ آپ بہت دن تک اداس رہے۔ ہر وقت یہ محسوس کرتے تھے جیسے آپؒ کی کوئی قیمتی شے کھو گئی ہے۔ آخر جب یہ صدمہ آہستہ آہستہ کم ہوا تو آپ دوبارہ حصولِ علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب حضرت نافعؒ، امام مالکؒ کے مرکزِ نظر تھے۔ حضرت نافعؒ، عبداللہ بن عمرؓ کے غلام تھے مگر اس غلامی نے انہیں ایسا تاجِ شاہی پہنایا ہے کہ جسے قیامت تک اندیشہ زوال نہیں ہوگا۔ حضرت نافعؒ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے بھی علمِ حدیث سیکھا۔ حضرت نافعؒ تابعین میں سب سے زیادہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کے فتووں کے متعلق جاننے والے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے انہیں فقہ سکھائی تھی۔ حضرت نافعؒ نے طویل عمر پائی۔ وہ آخر عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے تھے۔ امام مالکؒ کے دورِ تدریس میں آپؒ بہت معمر تھے۔ آپ شدید گرمی میں حضرت نافعؒ کے گھر جاتے تھے۔ ان کے مکان کے قریب کوئی سایہ نہیں تھا۔ امامؒ گھنٹوں سخت دھوپ میں کھڑے رہتے۔ یہاں تک کہ حضرت نافعؒ ظہر کی نماز کے لیے باہر تشریف لاتے اور امامؒ ادب سے سلام کر کے پیچھے پیچھے ہو لیتے۔ یہ سب کچھ احتیاط کے پیشِ نظر تھا۔ حضرت امامؒ ڈرتے تھے کہ کہیں حضرت نافعؒ قبل از وقت گھر سے نکل کر نہ چلے جائیں اور پھر آپ درس سے محروم ہو جائیں۔ یہ سخت کوشی اس لیے بھی تھی کہ حضرت نافعؒ آپ کے شوقِ علم کو دیکھیں اور پھر ایک طالب کے حال پر نظرِ کرم فرمائیں۔ استاد کے ادب کی یہ کیفیت تھی کہ امامؒ، حضرت نافعؒ کے

پیچھے اس طرح چلتے جیسے کوئی غلام جارہا ہو۔ حضرت نافعؒ مسجد نبوی پہنچ کر نماز ادا کرتے۔ جب پسینہ خشک ہو جاتا اور طبیعت پر سکون نظر آنے لگتی تو امام مالکؒ بڑے ادب سے حدیث وفقہ کے مسائل دریافت کرتے۔ امامؒ نے اس سلسلے میں کبھی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آپ پہلے حضرت نافعؒ کے چہرے کا رنگ دیکھتے، مزاجی کیفیت کا اندازہ کرتے پھر بہت آہستہ لہجے میں اپنا مدعا بیان کرتے۔ حضرت نافعؒ یا تو فطرتاً ایک غصہ ور انسان تھے یا پھر بڑھاپے نے انہیں چڑچڑا بنا دیا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ بات بات پر بگڑ جاتے۔ امام مالکؒ نے ان کا غصہ بھی مسلسل برداشت کیا۔ حرفِ شکایت تو بہت بڑی بات ہے، کسی نے آپ کے چہرے پر ناگواری کا عکس بھی نہیں دیکھا۔ اکثر اس بات پر فخر کرتے تھے کہ میں علم کے راستے میں غصہ برداشت کر رہا ہوں اور استاد مجھے ڈانٹ رہا ہے۔

حضرت نافعؒ کے بعد امام مالکؒ نے حضرت ابن شہاب الزہریؒ کی شاگردی اختیار کی۔ حضرت ابن شہابؒ حضور اکرم ﷺ کے نانا کے سلسلے سے قریشی ہیں۔ آپ حدیث کے زبردست عالم تھے۔ مصر کے مشہور فقیہہ اللیث ابن سعدؒ کہتے تھے "میں نے ساری دنیا میں ان سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا"
حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ حضرت ابن شہابؒ کا سب سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ آپ کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ اپنے دورِ خلافت میں اعلان کرا دیا تھا کہ سب لوگوں پر ابنِ شہابؒ کا اتباع فرض ہے۔ عمر و بن عبدالعزیزؒ فرماتے تھے کہ ابن شہابؒ سے زیادہ سنت کا جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ بڑے بڑے دفتر بھی ابن شہابؒ کے علم کی وسعتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہ تو اس نابغۂ روزگار شخص کا ایک نا تمام سا تعارف ہے جس نے اپنے علم کا خزانہ بھی امام مالکؒ پر لٹایا اور اس نوجوان کی تربیت کی جو تیز دھوپ میں گھنٹوں کھڑا رہتا تھا۔ امام مالکؒ، حضرت ابن شہابؒ کے دروازے پر بھی اسی طرح پہنچے جیسے آپ حضرت نافعؒ کے درِ دولت پر حاضر ہوتے تھے۔ مکان کے دروازے پر بہت دیر تک کھڑے انتظار کرتے رہتے کہ کب حضرت ابن شہابؒ آپ کو شرفِ باریابی بخشیں۔ مجلس میں روبرو بیٹھنے کے بعد بھی مناسب موقع کی تلاش میں رہتے۔ یہاں تک کہ جب مزاجِ شیخ کو خوشگوار پاتے تو بڑے ادب سے حدیث فقہ کے مسائل معلوم کرتے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ امام مالکؒ کے استاد ربیعہؒ بھی ابن شہابؒ کی مجلس درس میں شریک تھے۔
حضرت ابنِ شہابؒ نے اس نشست میں چالیس احادیث بیان فرمائیں۔ حضرت ربیعہؒ اور امام مالکؒ درس ختم ہونے کے بعد اٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دوسرے دن دونوں حضرات پھر ابن



شہابؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابن شہابؒ نے حضرت ربیعہؒ اور امام مالکؒ کو مخاطب کر کے فرمایا "کتاب دیکھو تاکہ میں احادیث بیان کروں اور جو کچھ میں نے کل بیان کر دیا تھا وہ تم نے دیکھ لیا؟"
حضرت ربیعہؒ نے جواباً عرض کیا "یہاں ایک ایسا شخص موجود ہے جو آپ کے فرمودات کو حرف بہ حرف زبانی سنا دے گا۔"
"وہ کون ہے؟" حضرت ابن شہابؒ نے حیرت سے پوچھا۔
"مالک بن انسؒ۔" حضرت ربیعہؒ نے جواباً کہا۔
حضرت ابن شہابؒ نے امام مالکؒ کی طرف دیکھ کر تعجب کا اظہار کیا۔ انہیں ایک نوعمر طالبِ علم کی اس غیر معمولی صلاحیت پر شدید حیرت تھی۔ تاہم ابنِ شہابؒ نے امام مالکؒ سے کہا "سناؤ"۔
امام مالکؒ نے تمام احادیث مبارکہ اس قدر روانی کے ساتھ سنا دیں کہ کسی ایک مقام پر بھی آپ کی زبان نے لغزش نہیں کھائی۔ حضرت ابنِ شہابؒ نے حیرت سے سب کچھ سنا اور پھر فرمایا "میں سمجھتا تھا، میرے سوا یہ احادیث کسی کو حفظ نہیں۔"
یہ واقعہ خود امام مالکؒ نے بیان فرمایا ہے کہ ایک بار عید آئی۔ میں نے نماز ادا کی اور جب اپنے گھر کی طرف آنے لگا تو مجھے خیال آیا کہ آج عید کا دن ہے۔ اس وقت حضرت ابن شہابؒ فرصت سے ہوں گے۔ دیگر ملاقاتی نماز اور طعام سے فارغ ہو کر ملنے جائیں گے۔ اس لیے موقع غنیمت جان کر حضرت ابن شہابؒ کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ میری خوش قسمتی سے حضرت شیخ موجود تھے۔ میں خاموشی سے دروازے پر بیٹھ گیا۔ اس خیال سے کہ جب کوئی باہر نکلے گا تو حضرت ابن شہابؒ کو میری آمد سے مطلع کر دے گا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سنا۔ حضرت شیخ اپنی باندی سے فرما رہے تھے "دیکھو دروازے پر کون آیا ہے؟"
باندی، حضرت شیخ کا حکم سنتے ہی باہر آئی اور مجھے بیٹھا ہوا دیکھ کر واپس چلی گئی۔ میں نے سنا۔ باندی، حضرت ابن شہابؒ سے کہہ رہی تھی "آپ کا تابعدار سرخ رنگت والا مالک ہے۔"
حضرت شیخ نے جواباً فرمایا "اسے بلالو۔"
میں اجازتِ شیخ پا کر اندر داخل ہوا۔ حضرت ابن شہابؒ نے پوچھا "پھر کیا ارادے ہیں؟"
میں نے عرض کیا "حدیث بیان فرمائیے۔"
حضرت شیخ نے میری درخواست قبول کر لی اور پھر چالیس احادیث بیان فرماتے ہوئے کہا "اگر تم

انہیں یاد کرلو گے تو تمہارا اشمار حفاظ میں ہوگا۔"

کچھ دیر بعد میں نے حضرت شہابؒ سے عرض کیا کہ تمام احادیث یاد کرلیں۔ حضرت شیخ نے تعجب سے دیکھا اور تختیاں میرے ہاتھ سے لے لیں پھر فرمایا "سناؤ۔" میں نے حرف بہ حرف اپنا سبق دہرا دیا۔ حضرت ابن شہابؒ بہت خوش ہوئے اور پر جوش لہجے میں کہا "جاؤ آج سے تم زبردست فقیہہ ہو۔"

اس واقعے کے بعد ابنِ شہابؒ نے امام مالکؒ پر مزید عنایت فرمائیں۔ اپنا سینہ کھول کر رکھ دیا۔ علم کی امانت جو برسوں سے ان کے پاس تھی، محفوظ ہاتھوں میں پہنچا دی۔ انتہا یہ ہے کہ ابنِ شہابؒ نے صرف امامؒ کی خاطر چھٹی کے دن بھی درس جاری رکھا۔ یہ ابنِ شہابؒ ہی تھے جن کے دروازے، امام مالکؒ کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ کیسا ہی ناخوشگوار موسم ہو مگر علم کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ یہ ابنِ شہابؒ ہی کی ذات گرامی تھی کہ جس نے قدم قدم پر امام مالکؒ کی حوصلہ افزائی کی اور نوعمری کے باوجود آپ کو علم کا محافظ کہہ کر پکارا۔

امام مالکؒ نے حضرت یحییٰ بن سعید انصاریؒ سے بھی علم حاصل کیا۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن کے درس میں امام اوزاعیؒ، سفیان بن عنینہؒ اور سفیان ثوریؒ جیسے اہلِ کمال شریک ہوتے تھے۔ یحییٰ بن سعید انصاریؒ کے بارے میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ وہ سب سے زیادہ غصے والے تھے مگر امام مالکؒ نے ان کا غصہ بھی برداشت کیا اور یہ سب کچھ علم کے راستے میں تھا۔

امام مالکؒ، حضرت ربیعہؒ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ استاد کے ادب کی وجہ سے مجلس میں خاموش بیٹھے رہتے۔ اگر کوئی سوال کیا جاتا تو بہت دھیمی آواز میں رک رک کر جواب دیتے۔ کبھی عاملِ مدینہ طلب کرتا تو حضرت ربیعہؒ کی مرضی کے بغیر دربار میں بھی نہیں جاتے۔ مسند درس پر بھی اس وقت تک نہیں بیٹھتے جب تک حضرت ربیعہؒ نے اجازت نہیں دے دی۔ ایک بار ایک نشست میں حضرت ابنِ شہابؒ، حضرت ربیعہ بن عبدالرحمٰنؒ اور حضرت امام مالکؒ موجود تھے۔ حضرت ابنِ شہابؒ نے ایک مسئلہ پوچھا۔ "حضرت ربیعہؒ نے جواب دیا۔ ابنِ شہابؒ نے امام مالکؒ سے پوچھا "اس سلسلے میں تمہارا کیا جواب ہے؟"

امام مالکؒ نے کہا "استاد محترم جواب دے چکے ہیں، وہی کافی ہے۔"

ابنِ شہابؒ اس بات سے مطمئن نہیں ہوئے۔ انہوں نے زور دے کر کہا "میں بھی تمہارا استاد ہوں۔ جب تک تم جواب نہیں دو گے، اس وقت تک محفل سے نہیں اٹھوں گا۔"



بڑی نازک صورت حال تھی۔ امام مالکؒ نے حضرت ربیعہؒ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ آنکھوں میں یہ التجا پوشیدہ تھی کہ اس مشکل مرحلے سے نجات دلائی جائے۔ حضرت ربیعہؒ نے بڑی فرخدالی کے ساتھ کہا "مالکؒ! جواب دو۔"

امام کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے پھر اس طرح جواب دیا کہ آنکھیں زمین پر گڑی جا رہی تھیں۔ امام کا جواب حضرت ربیعہؒ کے خلاف تھا مگر آپ نے احترامِ استاد اور اظہارِ رائے کا حق ادا کر دیا تھا۔ اب حضرت ربیعہؒ کی باری تھی۔ وہ بہر حال ایک اعلیٰ ظرف انسان تھے۔ شاگرد کا جواب سنا اور پھر بے اختیار ہو کر ابنِ شہاب سے بولے "میرے قول کو چھوڑ کر مالکؒ کا قول اختیار کر لو۔"

یہاں تک کہ ابنِ شہابؒ بھی امام مالکؒ کی رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دیتے تھے۔

مگر وہ کیسا عجیب لمحہ تھا جب امام مالکؒ حضرت ربیعہؒ سے بچھڑ گئے۔ جس نے شفیق استاد کے سامنے خلیفۂ وقت کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ فرطِ ادب سے جس کی آنکھ بھی حضرت ربیعہؒ کے سامنے نہیں اٹھتی تھی۔ وہ ایک دن حلقۂ درس کو چھوڑ کر چلا گیا۔ واقعہ یوں تھا کہ حضرت ربیعہؒ اسلاف کے بعض فتاوی سے اختلاف کرتے تھے۔ امام مالکؒ کو یہ بات پسند نہ تھی۔ آپ نے کچھ دیر تک انتظار کیا کہ شاید حضرت ربیعہؒ اس راستے پر چلنا چھوڑ دیں مگر جب انھوں نے اپنی روش نہیں بدلی تو امام مالکؒ درس سے اٹھ کر چلے گئے لیکن تمام عمر استاد کا احترام کیا۔ اُدھر حضرت ربیعہؒ کا یہ حال تھا کہ اس اختلاف کے باوجود اپنے جلیل القدر شاگرد پر فخر کرتے رہے۔ عجیب استاد تھے اور عجیب شاگرد کہ صرف خدا کے لیے ملتے تھے اور خدا کے لیے جدا ہو جاتے تھے۔

یہ ذوقِ علم ہی تھا جس کی خاطر امام مالکؒ نے وقت کی ہر ضرورت اور ہر تقاضے کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اگر آپ حالات اور موسم کو دیکھتے تو آبائی پیشہ اختیار کر کے پہلے اپنی دُنیا سنوارتے اور پھر کسی دُوسری شے کی طرف متوجہ ہوتے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے علم کے سوا کسی چیز کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ امامؒ کے والد محترم حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ جنگی ہتھیار بنایا کرتے تھے۔ خاص طور پر انھیں تیر بنانے میں مہارت حاصل تھی اور یہی تیر سازی اُن کا پیشہ قرار پایا تھا۔ اگر امام امالکؒ باپ کے نقش قدم پر چلتے تو سامان حرب بنا کر زمانے کی رسم ادا کرتے لیکن کسی حوالے سے بھی یہ سراغ نہیں ملتا کہ آپ نے تیر سازی کا فن سیکھا ہو یا اسے اپنا ذریعہ معاش بنایا ہو۔ حضرت امامؒ کو خدا نے صرف علم کے لیے پیدا کیا تھا۔ نتیجتاً آپ کی نظر میں مادی وسائل کو کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آپ لباس اور غذا کے عام تصورات سے یکسر

بے نیاز تھے۔

جب تک حضرت امامؒ کی والدہ محترمہ حیات رہیں اس وقت تک آپ نے دنیا کی طرف ایک لمحے کے لیے بھی مُڑ کر نہیں دیکھا اور روز و شب کا ایک ایک لمحہ کوچہ علم میں گزارا مگر جب مادرِ مہربان کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو زندگی کے اس نازک موڑ پر حضرت امامؒ کے آگے بڑھتے ہوئے قدم کچھ دیر کے لیے رُک گئے۔ آپ اب تک گھر کے انتظامی امور سے نا آشنا رہے تھے۔ مجبوراً معاشی مسائل کے بارے میں سوچنا پڑا۔ اس وقت حضرت امامؒ کا موروثی سرمایہ چار سو دینار تک محدود تھا۔ آپ نے رشتے کے ایک بھائی کی شرکت میں کپڑے کی تجارت کا آغاز کیا۔ کاروبار شروع کرتے ہوئے حضرتؒ نے اپنے بھائی سے کہا "مجھے اس تجارت سے بس اتنا منافع درکار ہے جس سے میری زندگی کا نظم و ضبط بحال رہے۔ میں اتنی روٹی چاہتا ہوں جو زندہ رکھ سکے اور مجھے اتنے کپڑے کی ضرورت ہے جس سے اپنا بدن چھپا سکوں۔" یہ تھا امامؒ کا نظریہ تجارت۔

کپڑے کی خرید و فروخت کا سلسلہ کچھ دن تک جاری رہا مگر حضرت امامؒ تحصیلِ علم کے باعث کاروبار کی نزاکتوں کو نہ سمجھ سکے۔ یہاں تک کہ یہ مختصر سی تجارت عدم توجہی کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اس دوران آپ کے بھائی نے متعدد بار تنبیہ کرتے ہوئے خراب نتائج کی پیش گوئی کی مگر حضرت امامؒ یہی فرماتے رہے "میں دنیا کو اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا" آخر دنیا آپ سے خفا ہو گئی۔

یہ حضرت امامؒ کی زندگی کے سنگین لمحات تھے۔ تمام سرمایہ ختم ہو چکا تھا اور آپ کو اپنا علم جاری رکھنے کے لیے ایک کتاب کی شدید ضرورت تھی۔ اگر یہ کتاب اس وقت حاصل نہ کی جاتی تو امامؒ کے خیال میں علم نامکمل رہ جاتا۔ اپنی اس مجبوری پر آپ آبدیدہ ہو گئے۔ قرض مانگنے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے انتظار کرتے رہے کہ شاید کوئی بندۂ خدا آئے اور دستِ سوال دراز لیے بغیر آپ کی ضرورت پُوری کر دے مگر کوئی نہیں آیا۔ کتاب کی طلب اور شدید ہو گئی تھی۔ آسمان کی طرف دیکھا پھر نظر واپس آئی تو مکان کی چھت پر پڑی۔ اب یہی ایک حل باقی تھا۔ حضرت امامؒ نے سائبان کو ہٹا دیا۔ چھت کی کڑیاں بیچ کر کتاب خرید لی گئی۔ اس وقت ایک طالب علم کے چہرے کی آسودگی یقیناً قابلِ دید ہوگی۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس واقعے کے بعد امامؒ نے کئی موسم تیز دھوپ اور بارش میں گزار دیے ہوں گے مگر یہ سب کچھ اسی فرمانِ مقدس کے مطابق تھا کہ گہوارے سے لے کر قبر تک علم حاصل کرو۔

ایسے پُرآشوب حالات میں بھی امامؒ کے شوقِ طلب کا یہ معیار تھا کہ حدیثِ رسولؐ سننے کے لیے



بے اختیار گھر سے نکل جاتے تھے مگر جیسے ہی حلقۂ درس میں پہنچتے تو اپنی دلی کیفیات پر قابو پانے کی کوشش کرتے۔ آپ کی بچپن ہی سے یہ عادت تھی کہ کھڑے کھڑے حدیث نہیں سنتے تھے۔ اگر کبھی کوئی ذہنی پریشانی لاحق ہوتی تو محفلِ درس سے اٹھ کر چلے آتے اور اس وقت فرمودات رسولؐ کی سماعت کرتے جب طبیعت پُرسکون ہوتی۔ آپ کے خیال میں کلامِ نبوت سننے کے لیے دل و دماغ کی یکسوئی ضروری تھی۔ کسی شخص نے ایک دن امامؒ سے پوچھا کیا آپ نے کبھی عمرو بن دینارؒ سے بھی کوئی حدیث حاصل کی؟" جواب میں امامؒ نے فرمایا "ایک دن وہ حدیث بیان فرما رہے تھے اور لوگ کھڑے ہوئے لکھ رہے تھے۔ علم کی ضرورت نے مجھے بے چین کر دیا مگر دل نے گوارا نہیں کیا کہ اپنے آقا کے ارشادات کھڑے کھڑے لکھوں۔"

ایک مرتبہ حضرت امام مالکؒ کا ابی حازمؒ کی درس گاہ کی طرف سے گزر ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ ابی حازمؒ بیان کر رہے ہیں۔ امامؒ خاموشی سے گزرتے چلے گئے۔ ابی حازمؒ نے بھی آپ کو جاتے ہوئے دیکھ لیا پھر ایک دن ان کی ملاقات امام مالکؒ سے ہوئی تو کہنے لگے "تمہارے شوق کو دیکھتے ہوئے میرا خیال تھا کہ تم درس میں ضرور شامل ہو جاؤ گے مگر ایسا نہ ہوا آخر اس عدم دلچسپی کا کیا سبب تھا؟"

امام مالکؒ نے بہت آہستہ لہجے میں جواب دیا "اس وقت آپ کی محفل میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ مجھے اس بات سے شرم آئی کہ کھڑے کھڑے ارشادِ رسولؐ سنوں۔" یہ تھا حدیث کا وہ طالب علم اور یہ تھا اس کا اندازِ طلب۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ لوگوں نے علم کی طلب میں دور دراز مقامات کے سفر کیے ہیں اس کے برعکس امام مالکؒ شاید تنہا انسان ہیں کہ موقع حاصل ہونے کے باوجود حجازِ مقدس سے باہر نہیں گئے۔ آپ زیادہ سے زیادہ مکہ معظمہ تک جاتے اور پھر اپنے مستقل مرکز کی طرف لوٹ آتے۔ خلفائے بنو عباس نے کئی بار حضرت امامؒ کو سفرِ بغداد کی دعوت دی مگر آپ نے ہر مرتبہ حدیث رسولؐ کی دلیل پیش کر کے معذرت کر لی۔

سرورِ کونینؐ کا ارشادِ مقدس ہے "مدینہ ان کے لیے بہتر ہے اگر وہ اس بات کو سمجھیں۔"

یہ حدیثِ پاک تو اور بھی علمائے کرام نے پڑھی تھی مگر امام مالکؒ نے اس مفہوم کو اپنی زندگی کا مقدس خاص بنا لیا تھا۔ آپ حج کے موقع کے سوا کبھی مدینہ رسولؐ سے باہر نہیں گئے۔ امام مالکؒ کا شوق علم ساری دنیا پر عیاں ہے مگر اس خواہش کی تکمیل کے لیے آپ نے مدینہ چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ اگر ہم

منطقی اعتبار سے امامؒ کی اس روش کو دیکھیں تو پھر ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایسے شخص کا علم بھی محدود رہنا چاہیے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ امام مالکؒ ایک گوشے میں رہ کر بھی لامحدود ہو گئے تھے۔ یہ عشقِ رسولؐ کا معجزہ تھا کہ اس کی خاطر امامؒ نے دنیا چھوڑ دی۔ اسلام میں سارا دارومدار انسانی نیت پر ہے۔ خدا نے امامؒ کے حسنِ نیت کو دیکھا اور پھر آپ پر گھر بیٹھے علم کے دروازے کھول دیے۔ ہر سال ہزاروں اہلِ کمال حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے مکہ معظمہ میں جمع ہوتے تھے۔ حضرت امامؒ بھی حج کے لیے جاتے اور تمام علمائے کرام سے ملاقاتیں کرتے۔ کئی کئی دن تک مجلسیں آراستہ رہتیں۔ امامؒ کو جہاں اپنی تشنگی کا احساس ہوتا، وہاں کسی چشمۂ علم سے سیراب ہو جاتے۔ حج سے فراغت پانے کے بعد اہلِ علم حضرات، روضہ رسولؐ کریم پر درود و سلام پیش کرنے کے لیے مدینہ منورہ حاضر ہوتے تھے اور دورانِ قیام حضرت امام مالکؒ کی مجلسِ درس میں بھی تشریف لاتے تھے۔ یہاں تک کہ اہلِ علم کے زبردست اجتماعات ہوتے، بڑے بڑے مسائل ابھر کر سامنے آتے اور ان پر سیر حاصل بحث ہوتی۔ جسے جو کچھ سیکھنا ہوتا، سیکھ لیتا۔ حضرت امامؒ بھی اپنے اندر جو کمی پاتے، اسے استادانِ وقت کے تعاون سے دور کر لیتے ہیں۔ ان تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ جب امامؒ نے حدیثِ رسولؐ کے احترام میں مدینہ نہیں چھوڑا تو علم خود چل کر آپ کے دروازے تک آیا۔

’’ہم اپنی راہ میں کوشش کرنے والوں کو ایسی ہی نشانیاں دکھاتے ہیں۔‘‘ یہ فرمانِ حق تھا جو زمین پر نازل ہو کر رہا۔ امام مالکؒ کو یقین تھا کہ مدینہ ان کے لیے مقامِ عافیت ہے اور پھر اسی شہرِ مقدس کے ایک گوشے میں بیٹھ کر امامؒ نے بے شمار انسانوں کے دل و دماغ پر حکومت کی۔ بڑے سے بڑا صاحبِ کمال ایک نامعلوم کشش کے زیرِ اثر امامؒ کی درس گاہ تک پہنچا تھا۔ کیسے کیسے باجبروت خلیفہ، ایک صحابی کی فرزندگی کی بارگاہ میں سر کے بل آئے۔

ولایت، بادشاہی، علم، اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

پھر وہ وقت بھی آیا جب حضرت امام مالکؒ مسندِ درس پر جلوہ افروز ہوئے۔ بیشتر عقیدت مندوں کا خیال ہے کہ امام نے اٹھارہ سال کی عمر میں فتویٰ دینا شروع کیا مگر تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے پچیس اور تیس سال کے درمیان یہ اہم ترین ذمہ داری قبول کی۔ امامؒ فرماتے ہیں کہ جب تک ستر مشاہیر محدثین اور علما نے میرے متعلق اس امر کی گواہی نہ دے دی کہ میں فتویٰ دینے کا اہل ہوں، اس وقت



تک میں نے اس منصب کو قبول نہیں کیا۔‘‘ یہ مذہبی علوم کے سلسلے میں احتیاط کی عجیب و غریب مثال ہے۔

امامؒ نے اپنی مجلسِ درس کے لیے مسجد نبویؐ کا انتخاب کیا۔ یہ بھی حسنِ عقیدت کی روشن دلیل ہے۔ بعض کتابوں میں درج ہے کہ آپ مسجد نبویؐ میں اس جگہ بیٹھتے تھے جہاں جناب رسالت مآب ﷺ تشریف فرما ہوتے تھے اور یہی وہ مقام مقدس ہے جہاں حضرت عمر فاروقؓ مجلس شوریٰ قائم کرتے تھے۔ ملک و ملت کے مسائل سنتے تھے اور فیصلے دیا کرتے تھے۔ اگر ہم امام مالکؒ کے اس طرزِ عمل کا بغور جائزہ لیں تو یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ آپ نے ذہن و دل کا مرکز صرف رسولؐ کی ذات تھی۔ امامؒ ان باتوں میں بھی پیغمبر اسلامؐ کی تقلید کرتے تھے جن پر بعد میں آنے والوں کو نظر بھی نہیں جا سکی۔ مسجد نبویؐ میں درس دینے کا ایک ہی مقصد تھا کہ اس در سے امامؒ نے ہدایت کی روشنی حاصل کی تھی اور اسی در کے خاک سے روشنی کے سفر کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔

رسالت مآبؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کا عمل آپ کے لیے حجت کا درجہ رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے امامؒ نے فقہ کے مسائل بیان کرنے کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا۔ جہاں حضرت عمرؓ تشریف رکھتے تھے اور یہی حال مکان کے سلسلے میں تھا۔ امام جس گھر میں رہا کرتے تھے وہ مشہور صحابی عبداللہ بن مسعودؓ کا تھا۔ یہ عشق کی ایک عجیب و غریب منزل ہے کہ اپنی پسندیدہ شخصیت کے ایک ایک حوالے، ایک ایک تعلق اور ایک ایک چیز سے محبت کرے۔ حضرت امام مالکؒ کی بھی یہی کیفیت تھی کہ آپ اس خطۂ زمین کو بھی متبرک سمجھتے تھے جہاں محبوب کے نقش و قدم نظر آتے تھے۔ اپنے والد کے علاوہ جب کسی دوسرے صحابی سے شرفِ ملاقات نہ ہو سکا تو اس مکان میں رہنا شروع کر دیا جس کے در و دیوار سے صحبتِ رسولؐ کی خوشبو آتی تھی۔ یہی وہ حسنِ عقیدت تھا جس نے امامؒ کی روحانی تربیت کی اور پھر آپ نے وہ فیضِ باطنی پایا کہ جس کو ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

اب امامؒ اسی فیض کو بندگانِ خدا میں تقسیم کرنے کے لیے مسندِ درس پر بیٹھے تھے۔ یہاں مالک بن انسؒ کا کسی دوسرے امام سے تقابلی مطالعہ منظور نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کے درس کا انداز تمام محدثین کرام سے مختلف تھا۔ جب امامؒ درس حدیث دیتے تو آپ کے لیے ایک چوکی بچھائی جاتی پھر امامؒ غسل کرتے، عمدہ کپڑے پہنتے، خوشبو لگاتے اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ حجرے سے باہر تشریف لاتے جب تک حدیث پاک کا بیان جاری رہتا، خوشبوئیں سلگتی رہتیں اور لوگ اس طرح ہاتھ باندھے

بیٹھے رہتے جیسے ان کی سانسیں رک گئی ہوں۔

درس سے پہلے امامؒ کا ایک خادم باہر آ کر حاضرین کا جائزہ لیتا اور خاص خاص لوگوں کو محفل میں جانے کی اجازت دیتا۔ یہ مخصوص لوگ علما کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان حضرات کے بعد عام لوگوں کو حلقۂ درس میں جانے کی اجازت ہوتی۔ امام کے ایک شاگرد حضرت مطرفؒ بیان کرتے ہیں کہ جب لوگوں کی بھیڑ زیادہ ہوتی تو ایک باندی باہر آ کر پوچھتی۔ ''امام صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ آپ حضرات حدیث رسولؐ کے لیے آئے ہیں یا فقہ کے مسائل معلوم کرنے؟'' اگر لوگ کہتے کہ فقہ کے مسائل معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں تو حضرت امامؒ اسی حالت میں تشریف لے آتے اور اگر حاضرین، درسِ حدیث کی درخواست کرتے تو پھر امامؒ پورے اہتمام کے ساتھ درس میں آتے۔

ابن حبیبؒ کو امام مالکؒ سے ایک خاص تعلق تھا۔ وہ اپنے روز وشب کے بیشتر لمحات امامؒ کی صحبت میں گزراتے تھے۔ بن حبیبؒ مجلسِ حدیث کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ''امام مالکؒ، حدیثِ رسولؐ کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ دوسرے لوگ ادب کا مظاہرہ کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ درسِ حدیث شروع ہونے سے پہلے آپ جس طرح بیٹھ جاتے پھر اسی انداز سے آخر تک بیٹھے رہتے۔ درس کتنی بھی طوالت اختیار کر لیتا مگر امامؒ اپنی جگہ سے جنبش نہ کرتے۔ اگر صبح سے ظہر کا وقت بھی آ جاتا تو پہلو نہ بدلتے۔ نشست کا طریقہ ایسا ہوتا جیسے کوئی غلام کسی جلیل القدر شہنشاہ کے سامنے مؤدب بیٹھا ہو۔''

امام جب حدیث بیان کرتے تو سرورِ کونینؐ کے مزارِ اقدس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ''صاحبِؐ قبر نے ارشاد فرمایا ہے کہ......''

مشہور بزرگ مصعب بن عبداللہؒ کا بیان ہے کہ جب امامؒ نبی اکرمﷺ کا ذکر فرماتے تو آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدل جاتا اور تعظیماً اس قدر جھک جاتے کہ اہلِ محفل واضح طور پر اس تبدیلی کو محسوس کرنے لگتے۔ جب آپ سے اس کیفیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو امامؒ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا۔ ''اگر تم اسے دیکھ لیتے جسے میں نے دیکھا ہے تو پھر مجھ سے یہ سوال ہی نہ کرتے۔''

اگر کوئی آدابِ محفل سے ناآشنا شخص درست حدیث کے وقت اونچے لہجے میں بات کرتا تو امام مالکؒ اسے حکم دیتے کہ اپنی آواز پست کر لو، صرف سانسوں کو جاری رکھو اور پھر قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت کرتے ''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کریمﷺ کی آواز سے بلند نہ کرو ورنہ تمہیں خبر نہ ہو گی اور تمہارے اعمالِ صالحہ برباد ہو جائیں گے۔''

☆☆☆



حضرت امامؒ کا دورِ طالب علمی بھی عجیب تھا اور زمانہ درس بھی عجیب۔ جس طرح آپ نے سخت ترین آزمائشوں سے گزرنے کے بعد علم کی دولت حاصل کی، اسی طرح اس لازوال خزانے کو ضرورت مندوں میں تقسیم کیا۔ جب حضرت امام مالکؒ نے اپنی مجلسِ درس آراستہ کی تو آپ اس وقت بھی شدید غربت وافلاس کی زندگی گزار رہے تھے۔ تحصیلِ علم کے وقت آپ تنہا تھے اور آپ نے مکان کی کڑیاں فروخت کر کے علم کی شمع کو بجھنے سے بچالیا تھا مگر اب کے ایسی آندھیاں چل رہی تھیں کہ چراغ تو چراغ سورج کے بھی بجھ جانے کا اندیشہ تھا۔ اہلِ ثروت نے پیش کش کی کہ مدینہ چھوڑ کر بغداد چلے آئیں۔ سارے اقتصادی مسائل حل ہو جائیں گے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ضرورتوں کا بوجھ دراز قامت امامؒ کے جسم میں کسی قدر جھکاؤ پیدا کر دے گا لیکن جواب میں آپ نے اپنے آقاؐ کی یہ حدیث بیان کر دی ''مدینہ ان کے حق میں بہتر ہے، اگر وہ اسے سمجھیں۔''

جو لوگ امامؒ کے دستِ طلب کو دراز دیکھنا چاہتے تھے وہ مایوس ہو گئے تھے۔ اسے آزمائش کہیں یا گردشِ وقت، صورتِ حال دم بہ دم بگڑتی چلی گئی مگر ایسی نازک ساعتوں میں بھی حضرت امام مالکؒ کا درس جاری رہا۔

پھر وہ سنگین لمحات بھی آئے جب زوجہ محترمہ نے اطلاع دی کہ گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

حضرت امامؒ نے فرمایا ''بچی کے ساتھ اپنی غذا کا خیال رکھو، میری فکر چھوڑ دو۔'' یہ کہہ کر آپ مسجد نبویؐ میں تشریف لے آئے۔ علم کے بھوکے اور پیاسے لوگ آپ کے منتظر تھے۔ امامؒ نے اس طرح ان کے دلوں کی پیاس بجھائی کہ وہ سیراب ہو گئے اور ان کے ذہنوں کو ایسی مقوی غذا فراہم کی کہ انسانی دماغ کے بعید ترین گوشے بھی روشن ہو گئے۔ لفظوں کے طلسم اور جوشِ تقریر میں کسی کو یہ سوچنے کی بھی مہلت نہ مل سکی کہ ان کا امام بھوکا ہے۔

دوسرے دن آپ نے اپنی تین سالہ بچی کو روٹی مانگتے اور شریک حیات کو خاموشی اختیار کیے دیکھا۔ امامؒ دنیا کی ہر تلخی کی لذت سے آشنا تھے لیکن گردشِ حالات کا یہ زاویہ بڑا مہیب تھا۔ ''بے شک مال اور اولاد انسان کے لیے فتنہ ہیں۔'' آج پہلی بار امامؒ نے اس آیتِ قرآنی کی عملی تفسیر دیکھی تھی۔ بچی نے دوبارہ اپنی ماں سے کچھ کھانے کے لیے مانگا۔ ماں نے بیٹی کو براہِ راست جواب دینے کے بجائے شوہر کی طرف دیکھا۔ جو بچی کی بھوک کو نظر انداز کر کے اپنی مجلسِ درس میں جانے کے لیے بے قرار تھا۔

امامؒ نے شریک حیات کی خاموش نگاہوں کا مفہوم سمجھا پھر اسی باوقار لہجے میں فرمایا، جس کا فطری انداز نزولِ مصائب کے وقت بھی برقرار رہتا تھا۔

"جو اپنی تمام مخلوق کا کفیل ہے، وہی مالک بن انسؒ کے بیوی بچوں کا بھی دستگیر ہے۔"

زوجہ محترمہ جو خود بھی صبر واستقامت کا مجسمہ تھیں، شوہر کے جواب سے مطمئن نہ ہوسکیں۔ بچی کی بھوک ان کے خیالات پر غالب آ گئی تھی۔ اداس آنکھوں میں دوسرا سوال ابھرا مگر ہونٹوں تک نہیں آیا۔

"مسجد نبویؐ میں بے شمار بھوکے میرا انتظار کر رہے ہیں ہوں گے، میں اپنی بچی کی بھوک کو ان کی بھوک پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ اگر فاقہ کشی کی تاب نہ لا کر میری بچی مرگئی تو ایک گھر تاریک ہوگا اور منتظرین کی اس جماعت نے غذا نہ ملنے پر دم توڑ دیا تو ساری دنیا میں اندھیرا اچھیل جائے گا۔"

زوجہ محترمہ نے ضبطِ نفس کا بہترین مظاہرہ کیا مگر چہرہ اندرونی کرب کا غماز تھا۔ اسی دوران بچی کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور بھوک کی شدت سے رونے لگی۔ اولاد کی محبت سے پیدا ہونے والا فتنہ اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ابھر آیا تھا۔ امامؒ نے اپنے رب کی پناہ مانگی اور پھر شریکِ حیات کو حکم دیا "وقت کی ہر ساعت گزرنے کے لیے ہے۔ یہ سنگین لمحات بھی گزر جائیں گے۔ تم چکی چلانے کا عمل جاری رکھو۔ اس کی پرشور آواز یقیناً بچی کی چیخوں کو چھپا لے گی اور وہ راز گھر کی چار دیواری میں دفن ہو جائے گا جسے میں دنیا والوں کے سامنے کہنا نہیں چاہتا۔ مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ ہمسائے میری غربت کا حال جان کر میرے اہل خانہ پر ترس کھائیں۔" یہ کہہ کر امامؒ اپنے حلقۂ درس میں تشریف لے گئے اور فقہ کے مسائل پر اس طرح بولے کہ علم کے سمندر ابل پڑے۔ حاضرین میں سے کسی کو احساس تک نہیں ہوا کہ ان کا امامؒ کئی وقت کے فاقے سے ہے اور وہ اپنی معصوم بچی کو روتا چھوڑ کر ان کے علم کی بھوک مٹانے آیا ہے۔

علم کے بھوکے اپنے دماغ اور رُوح کو غذا فراہم کرتے رہے۔ مالک بن انسؒ کا درس جاری رہا۔ لفظوں کا وہی جلال، لہجے کی وہی تڑپ، تقریر کا وہی جوش کسی کو خبر بھی نہ ہوسکی کہ امامؒ کی کم سن بچی بھوک کی شدت سے بلک رہی ہے اور خود ان کا امامؒ بھی کئی وقت کے فاقے سے ہے۔

یہ کوئی عارضی لمحہ نہیں تھا کہ گزر گیا تو پلٹ کر نہیں آیا۔ حضرت امامؒ کی آزمائش کا یہ زمانہ کئی سالوں پر محیط تھا۔ فاقہ کشی کے کئی موسم آئے اور چلے گئے۔ اس تلخی ایام کا کسی کے پاس کوئی حساب نہیں۔ تذکرہ نویس ظاہری حالات میں الجھ گئے۔ کسی کو یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ افلاس کی خزاں علم ومعرفت کے چمن پر



کب تک سایہ فگن رہی۔ کوئی اور درخت ہوتا تو کبھی کا جھلس گیا ہوتا۔ مگر اس پر تو رسالت کے آسمان سے بارشِ کرم ہو رہی تھی۔ اس لیے گرم ہواؤں میں بھی سرسبز وشاداب رہا۔

رفتہ رفتہ یہ بات مشہور ہوتی جارہی تھی کہ مسندِ علم پر سرخ چہرے والا وہ نوجوان جلوہ افروز ہے جس کے آگے کسی کی آنکھ نہیں اٹھتی اور فقہ میں جس کے فیصلے پڑے بے باک ہوتے ہیں۔ جہاں دیدہ اور عمر رسیدہ افراد کو اس خبر پر یقین نہیں آتا تھا کہ ایک نوعمر فقیہہ بھی انسانی مسائل کا حل پیش کرسکتا ہے؟ عقل کی بنیاد پر ان کی یہ دلیل بہت مضبوط تھی مگر وہ خدا کے اندازِ تقسیم کو بھلا بیٹھے تھے۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شیر خواری کی حالت میں نبوت کی کھلی نشانی عطا کرسکتا ہے، اسے یہ قدرت بھی حاصل تھی کہ وہ حضرت امام مالکؒ کو نوعمری میں سند درس پر بٹھا کر سارے عالم کو ان کے سامنے خم کردے۔

آخر ایک دن قدرت کی وہی کرشمہ سازی ظاہر ہوئی۔ شہر رسول میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا تھا جسے سن کر لوگ حیران رہ گئے تھے اور آپس میں مسلسل سرگوشیاں کر رہے تھے۔ بات کچھ اس طرح تھی کہ مدینہ منورہ میں ایک عورت کا انتقال ہوگیا۔ جب پیشہ ور غسالہ مرنے والی کو نہلا رہی تھی تو اچانک اس نے قریب کھڑی ہوئی خواتین سے کہا کہ مرحومہ ایک بدکار عورت تھی۔ ابھی غسالہ کے الفاظ کی گونج ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اس کا ہاتھ مردہ عورت کے جسم سے چپک کر رہ گیا۔ چند لمحوں تک مرحومہ کی رشتے دار خواتین اس راز کو سمجھ نہ سکیں مگر جب انتہائی کوشش کے بعد بھی غسالہ کا ہاتھ بدن سے علیحدہ نہ ہوسکا تو پھر ہر طرف ایک ہلچل سی مچ گئی۔ حاضرین نے اپنی آنکھوں سے بڑے بڑے حیرت ناک مناظر دیکھے تھے مگر یہ واقعہ ان سب سے جدا تھا۔ لوگ جنازے کو بھول کر غسالہ کی جانب دیکھنے لگے جس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس ذیل میں علمائے کرام سے رجوع کیا گیا مگر کوئی ایک شخص بھی اس عجیب وغریب مسئلے کا حل نہ پیش کرسکا۔ وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا اور میت کی تدفین میں لحظہ بہ لحظہ تاخیر ہوتی جارہی تھی۔ غسالہ کے ساتھ مرحومہ کے عزیز واقارب بھی سخت پریشان تھے۔ سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا۔ کہ اگر غسالہ کا ہاتھ الگ نہ ہوسکا تو پھر جنازے کو کس طرح دفن کیا جاسکے گا۔ تمام چہرے استغفار کی ایک علامت بن کر رہ گئے تھے مگر وہاں ان کے سوالوں کا جواب دینے والا کوئی موجود نہ تھا۔ یہ منظر دیکھ کر بعض لوگوں کے ذہن اس قدر منتشر ہوگئے کہ وہ غسالہ کا ہاتھ کاٹنے کی تجویز پیش کرنے لگے۔ اب اسی طرح میت کی تدفین ممکن تھی۔ متعلقہ افراد کے حلقے میں یہ تجویز زیر بحث آئی تو اپنے لرزہ خیز انجام کو قریب دیکھ کر غسالہ زار وقطار رونے لگی۔

جب صورتِ حال پر کسی طرح بھی قابو نہ پایا جاسکا تو انسانی ہجوم سے ایک آواز ابھری۔ ''کیا تم لوگوں نے اس سلسلے میں امام مالک بن انسؒ سے رجوع کرلیا؟''

''جن کی عمریں فقہ کے مسائل حل کرتے گزر گئیں وہ بھی کوئی جواب نہ دے سکے تو پھر ایک نوجوان کے ذہن کی آزمائش کیا معنی رکھتی ہے؟''

کہنے والے نے دوبارہ کہا۔ ''عقل، عمر کے پیمانے سے معتبر نہیں ہوتی۔ کیا عجب ہے کہ وہ نوجوان فقیہہ تمہاری ساری الجھنوں کو دور کردے۔''

مجمع خاموش ہوگیا۔ اس شخص کی بات تسلیم کرلی گئی۔ پھر کچھ معززینِ شہر، حضرت امامؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اپنا عجیب و غریب مسئلہ بیان کیا اور جواب کا انتظار کرنے لگے۔

حضرت امام مالکؒ بہت دیر تک غور و فکر کرتے رہے، پھر فرمایا۔ ''غسالہ نے مرنے والی عورت کو یقیناً کوئی ایسا آزار پہنچایا ہے جسے خدا پسند نہیں کرتا۔ دریافت کرو کہ مرحومہ کے ساتھ اس کا سلوک کیسا تھا؟ یہ وہ عذاب ہے جسے قدرت دنیا میں ظاہر کرنا چاہتی ہے۔''

لوگ اٹھ کر چلے گئے اور جب انھوں نے غسالہ کو یہ بات بتائی تو وہ چیخ کر رونے لگی۔ پھر فوراً ہی اعتراف کرلیا کہ اس نے مرحومہ پر بدکاری کی تہمت لگائی تھی۔ حضرت امام مالکؒ سے دوبارہ رجوع کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ ''مرنے والی ایک پارسا خاتون تھی خدا کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اہلِ دنیا کی نظر میں اس کی پاکبازی داغدار ہوجائے۔ اسی لیے غسالہ کو تماشہ بنادیا گیا ہے تاکہ لوگ عبرت حاصل کرسکیں۔ اب اس تہمت طراز عورت کے جسم پر سو درے لگاؤ! ہاتھ الگ ہوجائے گا۔''

پھر ایسا ہی کیا گیا۔ شرعی حکم کے مطابق غسالہ کے سو درے لگائے گئے۔ جیسے ہی سزا کی تکمیل ہوئی اس کا ہاتھ مرحوم خاتون کے جسم سے علیحدہ ہوگیا۔

حضرت امام مالکؒ کے اس فتوے پر بڑے بڑے اہلِ دانش سربگریباں تھے اور اس کے ساتھ ہی تمام اہلِ عرب کو اندازہ ہوگیا تھا کہ آنے والا زمانہ اسی نوجوان کے فضل و کمال سے تعبیر ہوگا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا حضرت امام مالکؒ سے جبری طلاق کا مسئلہ پوچھا گیا۔ آپ نے پوری دیانت اور بے باکی سے فرمایا۔ ''میرے نزدیک جبری طلاق، طلاق نہیں ہے۔'' لوگوں نے دوسرے اماموں کا حوالہ پیش کیا جن کے نزدیک جبری طلاق بہرحال طلاق تھی۔ حضرت امامؒ نے کسی فقیہہ کے فیصلے پر نکتہ چینی نہیں کی۔ سب کا احترام پیشِ نظر رکھا مگر اپنا مسلک تبدیل نہیں کیا۔ تنگ نظر اور دنیا پرست مخالفین



نے حضرت امامؒ کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کو سیاسی لباس پہنا کر خلافتِ عباسیہ کے دربار میں پیش کردیا۔ آمرِ وقت کے ماتھے پر شکن ابھر آئی پھر علم کی رسوائیوں کے سامان کیے جانے لگے۔ ایک فتوے نے حضرت امام مالکؒ کو شہرت بخشی تھی مگر دوسرا فتویٰ آپ کے لیے عذابِ جاں بن گیا۔

جن لوگوں نے امام مالکؒ کے بحرِ علم کے چند قطرے پی کر اپنی روحوں کی پیاس بجھانے کی کوشش کی تھی اب وہ غلاظت کے چشمے پر منہ رکھے ہوئے کثیف پانی پی رہے تھے۔ یہ ایک رات میں کیسا انقلاب آگیا تھا! جو لوگ مہینوں اور سالوں حضرت امامؒ کی مجلسِ نور میں دست بستہ بیٹھے رہے تھے، اب وہی اقتدار کے ظلمت کدے میں خلیفہ منصور کے قدموں سے لپٹے ہوئے فریاد کررہے تھے۔

''امیر المومنین! یہ شخص مالک بن انسؒ مذہب کی آڑ میں فتنوں کی پرورش کررہا ہے۔ اگر اس کی زبان بند نہ کی گئی تو پوری مملکتِ اسلامیہ ہولناک فساد کی لپیٹ میں آجائے گی۔'' یہ اہلِ علم کا ایک گروہ تھا جو ظلم و جہل کے ہاتھوں علم کی آبرو فروخت کررہا تھا۔ خلیفہ منصور گہری سوچ میں ڈوب گیا اور اسے اپنے مضطرب ذہن کے پردے پر ماضی کے کئی واقعات متحرک نظر آنے لگے۔

یہ وہی خلیفہ منصور تھا جو ایک بار امام مالکؒ کی مجلسِ درس میں حاضر ہوا تھا۔ امامؒ نے منصور کی نشست کے لیے کوئی اہتمام نہیں کیا تھا، نہ آپ مسندِ درس سے اٹھ کر تعظیماً کھڑے ہوئے تھے اور نہ آپ نے خلیفہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا تھا۔ اس دور کی یہی رسم تھی مگر امامؒ نے تمام رسموں کو پامال کرڈالا تھا۔ منصور آیا اور حاضرین کے درمیان ادب سے بیٹھ کر درسِ حدیث سنتا رہا۔ جب فقہ کے مسائل پر گفتگو کا آغاز ہوا تو منصور نے بھی ایک عجیب و غریب سوال پوچھا اور امامؒ سے فتویٰ طلب کیا۔

''اگر کسی کے لباس پر ایک مچھر کا خون لگ جائے تو وہ کپڑے ناپاک ہوجائیں گے یا ان کی پاکی برقرار رہے گی؟''

امامؒ نے حیرت سے منصور کی طرف دیکھا، پھر چند لمحوں تک کچھ سوچتے رہے۔ حاضرینِ مجلس پر سکتہ طاری تھا اور وہ اپنے امامؒ کی لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی کیفیات کو بغور دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ امامؒ کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہوگیا۔

''جس کا لباس بے شمار بندگانِ خدا کے لہو سے سرخ ہو، وہ مجھ سے مچھر کے خون پر فتویٰ لینے آیا ہے؟'' امامؒ کی باوقار آواز گونجی اور مجلس کے در و دیوار لرز کر رہ گئے۔ منصور کے چہرے پر شرم و ندامت کی جھلک تھی جسے چھپانے کی وہ ناکام کوشش کررہا تھا۔

منصور کے لیے حضرت امامؒ کا یہ اندازِ گفتگو کوئی نیا نہیں تھا۔ آپ ہمیشہ سے اسی طرزِ کلام کے عادی تھے۔ روایت ہے کہ منصور آپ کا ہم مکتب تھا۔ بچپن ہی سے اس کے دل و دماغ پر حضرت امامؒ کی حق گوئی اور بلند کرداری کے اثرات مرتب ہو چکے تھے۔ وہ آپ کا بے حد احترام کرتا تھا مگر حرصِ اقتدار نے اس کے نام سے ایسے شرمناک افسانے منسوب کر دیے کہ قیامت تک ہونے والی بارش بھی تاریخ کی اس سیاہی کو نہیں دھو سکتی۔

"جبری طلاق کا مسئلہ" آخر "جبری خلافت" کے وقار کا مسئلہ بن گیا۔ جب تک حضرت امام مالکؒ حکومت کے سلسلے میں خاموش رہے اس وقت تک منصور آپ کو محترم سمجھتا رہا لیکن جس روز آپ نے آلِ فاطمہ کے نامور فرزند حضرت نفسِ زکیہؒ کی حمایت میں چند کلمات ادا کیے اسی دن سے یہ جلیل القدر امامؒ، خلیفہ منصور کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ پھر یہ بدگمانی اتنی بڑھی کہ جعفر بن سلیمان نے امام مالکؒ کے کوڑے لگوائے اور آپ کا چہرہ سیاہ کر کے اطراف مدینہ میں پھرایا۔ کچھ کتابوں میں امامؒ کو صرف خچر پر بٹھانے کی روایات ملتی ہیں۔ کچھ اہلِ قلم حضرت امامؒ کے درے لگوانے اور تشدد کے ذریعے دونوں ہاتھ اتار دینے کا ذکر کرتے ہیں، کچھ تحقیق کرنے والوں نے امامؒ کے رخ روشن پر سیاہی پھیرنے کے ذلت آمیز سلوک کا حوالہ بھی دیا ہے، کچھ حضرات یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت امامؒ کا چہرہ کالا نہیں کیا گیا تھا۔ اگر ہم اس تحقیق کو درست تسلیم کر لیں تو پھر امامؒ نے انسانی ہجوم کے سامنے یہ الفاظ بار بار کیوں دہرائے تھے۔

"جو مجھے جانتے ہیں سو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ جان لیں کہ میں مالک بن انسؒ ہوں۔" تاریخ کے صفحات میں ان الفاظ کی موجودگی ثابت کر رہی ہے کہ اس وقت حضرت امامؒ کو اصلی شکل میں اہل مدینہ کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے شہرِ رسولؐ کے رہنے والے اپنے امامؒ کو پہچاننے میں دشواری محسوس کر رہے تھے۔ بالآخر حضرت امامؒ نے بڑے باوقار طریقے سے مجمع عام میں اپنی شناخت کرائی۔ اس المناک واقعے کا یہ پہلو دیکھ کر یقین کیا جا سکتا ہے کہ امام مالکؒ کے چہرے پر جعفر بن سلیمان کے ہاتھ کی ملی ہوئی سیاہی موجود تھی۔

بعض تاریخ نویس بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ حضرت امامؒ کو یہ دردناک سزا منصور کے اشارے پر دی گئی تھی۔ کچھ تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ منصور اس معاملے میں بالکل بے قصور تھا اور جعفر نے محض خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ نازیبا حرکت کی تھی بہر حال اس ناخوشگوار واقعے کی سیاسی پس



منظر یہ ہے کہ امام مالکؒ درس کے دوران اپنا یہ مسلک واشگاف الفاظ میں بیان فرمایا کرتے تھے۔

"جبری طلاق، طلاق نہیں ہے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب خلیفہ خاندانِ بنو امیہ کو عبرتناک سزائیں دینے کے بعد خاندانِ سادات پر مظالم ڈھا رہا تھا۔ اسی ہنگامہ خیزی کے دور میں جب منصور کو امام مالکؒ کی پروقار آواز سنائی دی تو اس نے ایک تیز رفتار قاصد مدینے کی طرف بھیجا جس کے ذریعے امامؒ کو حکم دیا گیا کہ وہ لوگوں کے درمیان اس مسئلے کو بیان نہ کریں، امامؒ نے سیاسی صوت حال کو سمجھے بغیر نہایت بے باکی سے جواب دیا میں "قرآن و سنت کے کسی حکم کو اللہ کے بندوں سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔"

منصور کو امامؒ کے اس جواب سے فوراً ہی مطلع کر دیا گیا۔ وہ حضرت مالکؒ کی فطری بے باکی اور صفتِ حق گوئی سے واقف تھا۔ اس لئے خاموش ہو گیا اتفاق سے اسی دوران خاندانِ سادات کے ایک معزز فرد حضرت محمد نفس زکیہؒ نے منصور کے جبر و تشدد سے تنگ آ کر حق کا پرچم بلند کر دیا۔ آل فاطمہؓ کا یہ بلند حوصلہ فرزند میدانِ کارزار میں بڑی شجاعت کے ساتھ لڑا مگر فنونِ جنگ سے ناواقفیت کے سبب شکست خوردہ حالت میں مارا گیا۔ کچھ تاریخ نویسوں کا خیال ہے کہ جبری طلاق کے مسئلے میں امام مالکؒ کا مسلک نفس زکیہؒ کی شہادت کا سبب بنا۔ مشہور مورخ طبری کا بیان ہے۔ لوگ امامؒ سے خلافتِ عباسیہ کا شکوہ کرتے ہوئے کہتے تھے کہ ہمارے گلے میں منصور کی بیعت کا طوق ہے۔ جواباً امامؒ نے فرمایا کہ تم سے جبراً بیعت لی گئی ہے اور بیعت جبراً نہیں ہوتی۔ امامؒ کے اس فتوے پر لوگوں نے حضرت محمد بن عبداللہ (نفس زکیہؒ) سے بیعت کر لی اور امامؒ گھر میں بیٹھے رہے۔ طبری اور دوسرے مورخین نے جبری طلاق کے مسئلے سے یہ سمجھا کہ امام مالکؒ نے جبری بیعت کے خلاف فتویٰ دے دیا ہے۔ اگرچہ واقعہ صرف اتنا تھا کہ آپ خلوصِ نیت سے ساتھ اپنا مسلک بیان کرتے تھے۔ منصور مذہب کی نگاہ میں بنیادی طور پر مجرم تھا اس لئے اس کی خواہش تھی کہ امامؒ اپنے ہونٹوں پر مہرِ خاموشی لگا لیں۔

امامؒ فطرتاً مردِ حق پرست تھے۔ آپ نے منصور کے منع کرنے کے باوجود خاموشی اختیار نہیں کی اور پھر اسی مقام سے آپ کے خلاف بھیانک سازش کا آغاز ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ منصور نے اپنے چچا زاد بھائی جعفر بن سلیمان کو مدینے کا حاکم بنا کر بھیجا تھا مگر درپردہ اس کی حیثیت ایک جاسوس کی تھی۔ پہلے وہ امامؒ کے حلقہ درس میں پہنچا پھر خود ہی جبری طلاق کا مسئلہ چھیڑا۔ بالآخر جب حاکمِ مدینہ یقین آ گیا تو اس نے امامؒ پر سزا جاری کر دی۔ اس سلسلے میں ایک معتبر روایت یہ بھی ہے کہ مدینے کے بعض شر پسند امامؒ کی

چغلیاں کھا کر جعفر کے کان بھرا کرتے تھے۔

بعض تنگ نظروں کا ایک گروہ علمِ حدیث وفقہ میں امام مالکؒ پر سبقت نہ لے جا سکا تو پھر یہ جماعت سازشوں پر اتر آئی۔ سیاسی فتنے پہلے ہی قدم قدم پر سر اٹھا رہے تھے۔ امامؒ کے مخالف علماء نے فساد کے شعلوں کو اور بھڑکایا۔ عام انسانوں کے سامنے جبری طلاق کا مفہوم اس طرح بیان کیا کہ لوگوں کے ذہن الجھنے لگے خدا کے سادہ دل بندوں کو بتایا گیا کہ امام مالکؒ جبری طلاق کی آڑ میں خلافتِ عباسیہ کا انکار کر رہے ہیں پہلے پہلے لوگوں میں سرگوشیاں ہوئیں اور پھر یہ مسئلہ ایک زبان سے دوسری زبان تک منتقل ہونے لگا۔ خلیفہ منصور کے جاسوس مدینے کی ایک ایک گلی میں گھوم رہے تھے۔ کسی جاسوس نے عاملِ مدینہ جعفر بن سلیمان کو بتایا کہ امام مالکؒ اس طرح کہتے ہیں۔ اس نے اپنی تحقیق وجستجو کا دائرہ بڑھا دیا اور پھر ایسے علما کو اپنے دربار میں طلب کیا جو امام مالکؒ کی عزت وشہرت سے حسد رکھتے تھے۔ ان حضرات نے خوفِ خدا سے بے نیاز ہو کر امام مالکؒ کی برائیاں کیں کہ ان کے بیانات کے سبب اہلِ مدینہ منصور کی خلافت کو جبری سمجھ رہے ہیں۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔ کیسا اذیت ناک مذاق تھا کہ جو علماء امام مالکؒ کی مجلس درس میں بیٹھ کر اکتسابِ علم کیا کرتے تھے وہی جعفر بن سلیمان کے درمیان میں جا کر امامؒ کو مفسد قرار دیتے تھے۔ آخر اہلِ علم کی اس منافقت نے امامؒ کے چاروں طرف سازش کا مضبوط حصار کھینچ دیا اور پھر وہ دردناک واقعہ پیش آیا جس پر اہلِ دل آج بھی خون کے آنسو روتے ہیں عام تحقیق یہی ہے کہ جعفر بن سلیمان نے خلیفہ منصور کے علم میں لائے بغیر امام مالکؒ کو سخت ترین سزا دے ڈالی۔ اس طرح وہ حکومت کے ایک بڑے مخالف کو جسمانی آزار پہنچا کر خلیفہ کی نظروں میں سرخرو ہونا چاہتا تھا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ امام مالکؒ کے ساتھ یہ ذلت آمیز سلوک خلیفہ منصور کی مرضی سے کیا گیا تھا۔ جو لوگ منصور کو اس واقعے سے بے خبر سمجھتے ہیں انہیں مزاجِ شہریاری کا اندازہ ہی نہیں۔ منصور وہ ذہین ترین حکمران تھا جو اپنے دشمنوں کی ایک ایک حرکت پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اس کے جاسوس مختلف لباس میں شہر در شہر گھومتے رہتے تھے۔ اب رہے امام مالکؒ تو منصور اس راز سے بھی واقف تھا کہ آپ اپنی بھوکی بچی کی چیخوں کو پڑوسیوں سے چھپانے کے لئے چکی چلانے کا حکم دیتے تھے۔ جس کی نظر امامؒ کے گھر کے اندرونی گوشوں پر بھی جمی ہو وہ اتنے بڑے واقعے سے کس طرح بے خبر رہ سکتا ہے۔ دراصل منصور کو بے گناہ اور معصوم سمجھنے والے سیاست کے اس اصول سے ناواقف ہیں کہ جب حکمران کو اپنا



دامن پاک رکھنا ہوتا ہے تو وہ حکومت کے چھوٹے کارندوں کو اپنا آلہ کار بنا لیتے ہیں، قتل وہ خود کراتے ہیں الزام کسی اور پر آتا ہے، حضرت امام مالکؒ کے سلسلے میں اسی حکمتِ عملی سے کام لیا گیا۔ منصور فقیہہ عرب کی زبان بندی چاہتا تھا اس لئے اس نے بہت دور سے اشارہ کیا۔ ایسا اشارہ جسے جعفر بن سلیمان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں سمجھ سکتا تھا۔

بہر حال، اس المناک واقعے کے بعد جب آپؒ کے زخم بھر گئے تو آپ نے اسی شان سے دوبارہ درس دینا شروع کر دیا۔ آپ برسرِ منبر فرمایا کرتے تھے ”لوگو! میں فتنہ وفساد پھیلانے کے لئے پیدا نہیں ہوا ہوں۔ میرا منصب یہ ہے کہ میں خدا اور رسولؐ کے احکام لوگوں میں پہنچا دوں۔ میں حق کو چھپا نہیں سکتا چاہے اس کش مکش میں جان تک چلی جائے میری تقریروں میں شاعرانہ تشبیہات واستعارات نہیں ہوتے۔ میں مذہبی امور کی تشریح میں کنایات کو جائز نہیں سمجھتا۔ اس پر بھی اگر کچھ لوگ میری باتوں سے غلط مفہوم اخذ کریں تو میں ان کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں، خدا انہیں ہدایت دے اور میرے ناتواں قدموں کو استقامت بخشے۔“ امام کی یہ تقریر اس بات کا کھلا ہوا ثبوت تھی کہ آپ کو سیاست کی ہنگامہ خیزیوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے حکام پر یہ بات بھی عیاں کر دی تھی کہ اگر حقیقت بیان کرنے کی وجہ سے یہ سزا دی گئی تھی تو امامؒ بار بار اس جرم کا اعادہ کریں گے جاسوسوں نے یہ خبر بھی خلیفہ منصور تک پہنچا دی۔ امامؒ اپنی اسی روش پر قائم تھے مگر آپ کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ منصور مطمئن ہو گیا اور اسے امامؒ جیسی برگزیدہ ہستی کے ساتھ اس نازیبا سلوک پر ندامت ہونے لگی۔

اسی سال خلیفہ منصور حج کے لیے آیا تو اس نے اپنے ایک مصاحبِ خاص کو امام مالکؒ کے پاس معذرت کے لئے بھیجا۔ مصاحب نے امامؒ کو بتایا کہ امیر المومنین اس تکلیف دہ واقعے پر سخت شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ وہ آپ کے روبرو اپنی معذرت کا اظہار کریں۔ خلیفہ کی آرزوئے ملاقات کی تکمیل کے لئے حضرت امامؒ مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ منصور نہایت احترام کے ساتھ پیش آیا۔ اپنے برابر بیٹھا کر مزاج پرسی کی اور پھر ان الفاظ میں اپنی معذرت کا اظہار کیا۔

”خدا کی قسم! آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا، میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا، میں نے اس بات سے بھی بے خبر ہوں کہ یہ سب کچھ کیونکر ہوا۔ مجھے اہل حرم میں آپ کا سب سے زیادہ لحاظ ہے، آپ ہی کی وجہ سے میں نے ان لوگوں کو کوئی سزا نہیں دی۔ یہ آپ ہی کی ذات تھی کہ جس کے باعث وہ مصائب سے

محفوظ رہے۔ یہ لوگ بہت جلد فتنے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ خدا کی قسم! میں نے جعفر بن سلیمان کے لئے حکم جاری کر دیا ہے کہ اسے عراق تک گدھے پر لایا جائے۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اسے سخت ذلت کے ساتھ قید خانے میں بند رکھا جائے۔ جعفر نے جس قدر تکلیف آپ کو دی ہے میں اس سے دگنی سزا اسے دوں گا۔"

امام مالکؒ نے خلیفہ منصور کی معذرت کو غور سے سنا اور پھر آپ کی شرافتِ نفسی، جذبہ انتقام پر غالب آگئی۔ آپ نے باوقار انداز میں منصور سے فرمایا۔ "امیر المومنین! میں نے اس واقعے کو فراموش کر دیا ہے۔ اگر آپ جسمانی تکلیف سے متاثر ہوئے ہیں تو خدا آپ کو عافیت میں رکھے اور مقام بلند عطا فرمائے، میں نے جعفر بن سلیمان کو بھی رسول ﷺ کے خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث معاف کر دیا۔ خدا آپ کو بھی معاف کرے۔"

امامؒ کے یہ الفاظ آپ کی شانِ جلالت پر روشن دلیل ہیں۔ یہاں بھی عشقِ رسولؐ نے آپ کی رہنمائی کی اور جعفر جیسے سنگ دل انسان کو صرف اس لئے معاف کر دیا کہ وہ خاندانِ رسالتؐ سے دور کا ہی سہی تعلق رکھتا تھا۔

امامؒ کی اعلیٰ ظرفی اور بلند کرداری تو ساری دنیا پر ظاہر تھی لیکن منصور کے بارے میں کہنے والے کہتے ہیں کہ اس نے مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ اور معذرت میں احتیاط نہیں برتی۔ جس طرح منصور نے اس سنگین واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے وہ ایک سیاسی بیان سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس نے اپنی مختصر سی گفتگو میں دو بار خدا کی قسم کھائی مگر کسی نے ایک بار بھی نہیں دیکھا کہ منصور نے جعفر بن سلیمان کو ہلکی سی بھی سرزنش کی ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منصور نے امامؒ کے سامنے جھوٹ بول کر اپنا دامن بچانے کی کوشش کی تھی۔

اس سے قطع نظر کہ خلیفہ منصور اس اندوہناک واقعے میں ملوث تھا یا نہیں امام کی عظمت و بزرگی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جو کوڑے مالک بن انسؒ کے پشت پر برسے تھے، درحقیقت وہ عبرت کے تازیانے تھے جن کے گہرے نشانات آج بھی خلافتِ عباسیہ کی پیٹھ پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ منصور نے امامؒ کے سامنے کتنی بھی عیاری سے کام لیا ہو مگر وہ دورانِ گفتگو اس مردِ جلیل کی ہیبت اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا۔ ایک عام نظر رکھنے والا بھی منصور کا معذرت نامہ سن کر اندازہ کر سکتا ہے کہ منصور کے الفاظ خوشامدانہ تھے۔ وہ امام کی شانِ جلالی سے اس قدر مرعوب تھا کہ بار بار قسمیں کھا کر اپنے احساسِ ندامت کو چھپا رہا تھا۔



یہی امامؒ کی فتح تھی کہ آپ کے روبرو خلافت کی بے لگام زبان بھی لڑکھڑانے لگتی تھی۔

بالآخر حاسدین رسوا ہوئے اور امامؒ کی آزمائش کا زمانہ سلامتی سے گزر گیا۔ اس عرصے میں آپ نے غربت و افلاس سے بھی جنگ کی اور آمرِ وقت سے بھی برسرِ پیکار رہے پھر خدا نے آپ کو دونوں محاذوں پر فتح عظیم عطا کی۔ زندگی کے راستے کشادہ ہو گئے اب نہ امامؒ کوئی کتاب خریدنے کے لئے مکان کی کڑیاں فروخت کرتے تھے اور نہ مکان سے چکی کا شور بلند ہوتا تھا۔ جسم کو آسودگی حاصل ہو گئی تھی مگر علم کے لئے روح کی بے قراری کا وہی عالم تھا۔

☆☆☆

حضرت امام فرمایا کرتے تھے۔ "میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی جاہل یا کم عقل انسان کی صحبت اختیار نہیں کی۔" یہ ایک ایسا شرف ہے جس میں آپ کا کوئی ہمسر نہیں۔ حضرت امامؒ نے اپنے دورِ طالب علمی میں بڑی اذیتیں برداشت کیں لیکن جب خود مسند درس پر بیٹھے تو اہل طلب کے لئے اپنے دروازے کھلے چھوڑ دیے۔ اس ذیل میں حضرت امام شافعیؒ کا واقعہ اتنا عجیب ہے کہ پوری تاریخ انسانی ایسی چند مثالیں بھی مشکل سے پیش کر سکے گی۔

حضرت امام شافعیؒ کے مالی حالات بہت خراب تھے مگر اس کے باوجود آپ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ امام شافعیؒ نے تحصیلِ حدیث کے لئے حضرت امام مالکؒ کا انتخاب کیا تھا لیکن امامؒ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی جرات نہیں پاتے تھے، مجبوراً آپ والیٔ مکہ کے پاس تشریف لے گئے اور تمام صورتحال بیان کر دی۔ والیٔ مکہ امام شافعیؒ کے طرزِ گفتگو اور شوقِ علم سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے حضرت امام مالکؒ اور والیٔ مدینہ کے نام سفارشی خطوط لکھے پھر امام شافعیؒ کو یقین دلاتے ہوئے کہا کہ اب ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ امام مالکؒ اس خط کو دیکھ کر اپنی آمادگی ظاہر کر دیں گے، امام شافعیؒ نہایت شادمانی کے عالم میں ان سفارش ناموں کو لے کر مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اب انہیں اپنی ایک ناآسودہ خواہش کی تکمیل بہت قریب نظر آ رہی تھی۔ امام شافعیؒ نے بڑے پرجوش انداز میں والیٔ مدینہ کو وہ خط پیش کر دیا مگر جیسے جیسے حاکمِ مکہ کی تحریر پڑھی جاتی رہی والیٔ مدینہ کا چہرہ اداس ہوتا چلا گیا۔ پھر اس نے بڑے افسردہ لہجے میں امام شافعیؒ سے کہا۔ "نوجوان مدینے سے مکے تک گھسٹتے ہوئے جانا میرے لئے آسان ہے مگر امام مالکؒ کا مکان میری پہنچ سے بہت دور ہے۔"

امام شافعیؒ والیٔ مدینہ کے جواب پر حیران رہ گئے بولے "آپ کی اقامت گاہ سے امام مالکؒ کا

مکان چند قدم کے فاصلے پر ہے پھر یہ مجبوری؟" امام شافعیؒ سر سے پاؤں تک ایک سوال بن گئے تھے۔

"فرزند! تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔" والیٔ مدینہ کے لہجے کی افسردگی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ "اس میں میری ذلت نہیں کہ میں ان کے دروازے پر کھڑا رہوں۔" والیٔ مدینہ نے امام شافعیؒ کا شک دور کرتے ہوئے کہا "اگر دن بھر انتظار کرنے کے بعد بھی وہ مجھے شرفِ باریابی بخش دیں تو میرے لئے یہی اعزاز کافی ہے۔"

"خدا آپ کو جزائے خیر دے۔" امام شافعیؒ نے اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ ان کی طرف توجہ کریں تو وہ خود یہاں آسکتے ہیں۔"

والیٔ مدینہ نے بڑی حسرت سے کہا۔ "افسوس! یہ کہاں ممکن ہے؟"

امام شافعیؒ کو والیٔ مدینہ کے جواب پر شدید حیرت تھی لیکن وہ مزید کچھ نہ کہہ سکے۔ بالآخر عصر کے وقت والیٔ مدینہ، امام شافعیؒ اور ان کا ایک دوست امام مالکؒ کے مکان کی طرف روانہ ہوئے جب یہ تینوں حضرات امامؒ کی آرام گاہ کے دروازے پر پہنچ گئے تو امام شافعیؒ کے دوست نے دستک دی، امام مالکؒ کی سیاہ فام باندی باہر نکلی اور آنے کا سبب دریافت کیا۔

والیٔ مدینہ نے کہا "اپنے آقا سے کہو کہ میں شرفِ باریابی چاہتا ہوں۔"

باندی فوراً ہی اندر چلی گئی اور کچھ دیر بعد واپس آ کر بولی۔ "میرے مالک آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہے تو پرچہ لکھ دیجئے جواب آپ تک پہنچ جائے گا اور اگر حدیث کی سماعت کرنا ہے تو مجلس کا دن معلوم کر کے تشریف لے جایئے۔"

والیٔ مدینہ امام کی باندی سے گفتگو کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ تاہم اس نے بڑی ہمت کر کے کہا۔

"اپنے آقا سے کہو کہ میرے پاس والیٔ مکہ کا خط ہے اور اس میں آپ کے لئے ایک ضروری پیغام ہے۔"

باندی دوبارہ مکان کے اندر چلی گئی اور پھر واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کرسی تھی۔ والیٔ مدینہ ڈرتے ڈرتے کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد امام مالکؒ تشریف لائے تو والیٔ مدینہ گھبرا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اس کا جسم لرز رہا تھا۔ امام شافعیؒ نے حضرت مالکؒ کو دیکھا وہ ایک دراز قد بزرگ تھے اور اپنے بدن پر چادر لپیٹے ہوئے تھے۔ امام مالکؒ فرش پر بیٹھ گئے۔ والیٔ مدینہ بدستور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ کھڑا رہا اور بمشکل تمام اس نے امام مالکؒ کو والیٔ مکہ کا خط پیش کیا۔ حضرت امامؒ خط پڑھتے رہے اور جب ان سطروں تک پہنچے کہ اس شخص (امام شافعیؒ) کے اقتصادی حالات خراب ہیں آپ اسے تعلیم دیجئے اور



حدیث بیان کیجئے تو نہایت بیزاری کے سے والیٔ مکہ کا خط زمین پر پھینک دیا اور شدید ناگواری کے عالم میں فرمایا۔ "معاذ اللہ! کیا رسول ﷺ کا علم بھی ایسا ہے کہ اب سفارش سے حاصل کیا جائے گا۔"

امام کا طرزِ عمل دیکھ کر والیٔ مدینہ کے جسم کی لرزش اور بڑھ گئی، وہ اس دوران ایک لفظ بھی اپنی زبان سے ادا نہ کر سکا۔

اب امام شافعیؒ اس جملے کا مفہوم سمجھ گئے تھے جو والیٔ مدینہ نے کہا تھا "امام مالکؒ کا مکان میری پہنچ سے بہت دور ہے۔"

اس صورتِ حال کو دیکھ کر امام شافعیؒ خود آگے بڑھے اور دست بستہ عرض کیا۔ "میں خاندان مطلب کا ایک فرد ہوں، دنیا کے تمام وسائل سے محروم علم کا شوق مجھے آپ کے درِ اقدس تک کھینچ لایا ہے۔ اگر معرفت کا سمندر مجھے اس بات کی اجازت دے گا کہ میں چند قطروں سے سیراب ہو جاؤں تو اپنی اس خوش بختی پر ہمیشہ نازاں رہوں گا ورنہ ایک تشنہ لب جس طرح یہاں تک آیا ہے اسی طرح پیاسا واپس لوٹ جائے گا۔" امام شافعیؒ کا لہجہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ امام مالکؒ کچھ دیر تک ان کے چہرے کو غور سے دیکھتے رہے پھر فرمایا۔ "لڑکے! تمہارا کیا نام ہے؟" امام شافعیؒ نے جواباً کہا۔ "محمد بن ادریس۔"

حضرت امام مالکؒ نے ایک بار پھر ان کی طرف غور سے دیکھا۔ امام شافعیؒ حسرت و یاس کے درمیان کھڑے تھے علم کا دروازہ کھلنے والا تھا یا پھر وہ ناکام لوٹ جانے والے تھے۔ اچانک حضرت امام مالکؒ اپنی جگہ سے اٹھے اور والہانہ انداز میں امام شافعیؒ کو گلے سے لگالیا۔ آپ بار بار ان کے سر پر دستِ محبت پھیرتے ہوئے فرماتے تھے "اے محمد! اللہ سے ڈرو" پھر آپ نے امام شافعیؒ کو اپنے شاگردوں کے حلقۂ خاص میں شامل کر لیا اور اس طرح اپنے علم کی دولت لٹائی کہ قریش کا یہ تہی دست نوجوان ایک دن خود حدیث و فقہ کا امیر بن گیا۔

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد حضرت امام شافعیؒ واپس چلے گئے اور جب دوبارہ کسی کام سے مدینہ منورہ تشریف لائے تو امام مالکؒ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے، آپ نے انہیں دیکھ کر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا، اس وقت درس جاری تھا جب آپ تمام ضروری کاموں سے فارغ ہو گئے تو امام شافعیؒ سے ان کی خیریت دریافت کی پھر اہلِ مکہ کا ذکر چھیڑ گیا۔ آپ امام شافعیؒ سے شہرِ مقدس کے رہنے کے والوں کے تفصیلی حالات پوچھتے رہے اور جب رات زیادہ ہو گئی تو یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ مسافر کو آرام کرنا چاہئے۔ امام شافعیؒ بیان کرتے ہوئے ہیں کہ میں زیادہ تھکا ہوا تھا اس لئے لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔

شب کے آخری حصے میں مجھے محسوس ہوا کہ جیسے دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔

میری آنکھ کھل گئی۔ حضرت امام مالکؒ بڑے شیریں لہجے میں پکار رہے تھے۔ ''محمد! خدا کی رحمت ہو تم پر ......نماز'' میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور دروازہ کھول کر باہر آیا تو امام مالکؒ ہاتھ میں پانی کا برتن لئے ہوئے کھڑے تھے۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی مگر امامؒ فرمانے لگے۔ ''محمد! کچھ خیال نہ کرو' مہمان کی خدمت فرض ہے۔'' امام شافعیؒ کی یہ عزت' یہ تواضع علم دوستی کے سبب تھی ورنہ امام مالکؒ نے کبھی کسی خلیفہ کا بھی اس قدر احترام نہیں کیا۔

اسی طرح جب امامِ اعظم ابوحنیفہؒ مجلس میں داخل ہوتے تھے تو آپ بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کرتے تھے یہاں تک کہ مسندِ علم سے اٹھ کر خود دروازے تک تشریف لے جاتے اور امامِ اعظم کو لاکر اپنے قریب بٹھاتے پھر جب وہ رخصت ہوجاتے تو ان کی شان میں ایسے تعریفی کلمات ادا فرماتے جنہیں سن کر آپ کے شاگردوں کو گمان ہونے لگتا کہ ابوحنیفہؒ امام مالکؒ سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔

حضرت امام مالکؒ نے ''حصولِ علم'' اور ''تقسیمِ علم'' جو انداز اختیار کیا تھا' اس کی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہاں مالک بن انسؒ کا کسی دوسری مقتدر شخصیت سے موازنہ منظور نہیں مگر امامؒ پھر امامؒ تھے۔ آپ سے خلیفہ مہدی اور ہارون رشید کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ خود کو امام مالکؒ کا شاگرد کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے۔ ہارون رشید کی یہ دلی خواہش تھی کہ امام مالکؒ کی عظیم و جلیل کتاب ''موطا'' خانہ کعبہ میں آویزاں ہو اور تمام مسلمانوں کو احکام فقیہ میں اس کی پیروی پر مجبور کیا جائے۔ دنیا میں عزت وشرف کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہوسکتا تھا مگر امام مالکؒ نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ صحابہ کرام مختلف ممالک میں پھیل چکے تھے اور ان میں سے ہر شخص راہِ راست پر تھا۔ لوگوں کو جہاں سے توفیق ملے گی' نور ہدایت حاصل کرلیں گے۔

علم کے ساتھ اس سے بڑھ کر اور کیا انصاف ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی جستجو کرے تو اسے تاریخِ اسلام میں ایسی بے شمار مثالیں مل جائیں گی کہ اکابر علما بھی اپنے نظریات پر مسلسل اصرار اور دوسروں کے خیالات سے پیہم انکار کرتے رہتے تھے۔ مگر یہ امام مالک ہی کی شان تھی کہ مکمل اختیارات حاصل ہونے کے باوجود آپ نے اپنی علمی تحقیق کو دوسروں پر مسلط نہیں ہونے دیا۔

اس ذیل میں خلیفہ منصور تو حد سے گزر گیا تھا۔ ایک بار اس نے حج کے موقع پر حضرت امام مالکؒ سے کہا تھا۔ ''میرا ارادہ ہے کہ آپ کی کتاب ''موطا'' کی نقل کرا کے مملکتِ اسلامیہ کے مرکزی شہروں



میں اس حکم کے ساتھ بھیج دوں کہ تمام لوگ اس پر عمل کریں اور کسی دوسری کتاب سے کوئی واسطہ نہ رکھیں جس قدر نو ایجاد علم ہے اس سے قطع نظر کرلیں کیونکہ میرے نزدیک اہلِ مدینہ کا علم حقیقی ہے۔''

جواب میں حضرت امام مالکؒ نے فرمایا تھا ''امیر المومنین ایسا نہ کیجئے لوگوں کے پاس بکثرت اقوال پہنچ چکے ہیں۔ وہ بہت سی حدیثیں سن چکے ہیں اور بہت سی روایتیں حفظ کرچکے ہیں۔ اب انہیں ان کے عمل سے لوٹانا بہت مشکل ہے لوگوں کو ان کے پسندیدہ راستے پر چلنے دیجئے۔''

حضرت امام مالکؒ کا جواب سن کر خلفیہ منصور نے بڑے پرجوش لہجے میں کہا تھا۔ ''خدا کی قسم! اگر آپ مجھ سے متفق ہوتے تو میں اپنے ارادے پر ضرور عمل کرتا۔''

یہ تھی اختیار کی وہ منزل جہاں سے حضرت امامؒ سلامت روی کے ساتھ گزرے۔ بے شک امامِ مدینہؒ نے علم کا حق ادا کردیا۔

حضرت امامؒ سب کچھ برداشت کرسکتے تھے مگر کسی طرح بھی آپ کو علم کی رسوائی گوارا نہ تھی۔ یہ ممکن تھا دو عالم اپنے محور سے سرک جائیں مگر امامؒ کے آدابِ درس میں تغیر ممکن نہ تھا۔ وہ امیرِ وقت ہو یا مفلسِ زمانہ' ابرِ کرم سب پر یکساں برسا۔ امامؒ کا علم سورج کی روشنی کی طرح آزاد تھا۔ نہ اس پر کوئی مصلحت اثر انداز ہوتی نہ اس نے موسم کے تیور دیکھ کر اپنی رفتار بدلی۔ وہ چمکا تو گلشن و صحرا پر برابر چمکا۔

خلیفہ ہارون رشید کو حضرت امامؒ سے بے حد عقیدت تھی' اس نے ایک بار امامؒ سے درخواست کی تھی کہ بغداد تشریف لاکر درسِ حدیث دیں مگر آپ نے انکار کردیا تھا۔ بالآخر ہارون رشید نے بغداد سے مدینے تک مسلسل سفر کیا اور اپنے دونوں لڑکوں کو لے کر امامؒ کی درس گاہ میں حاضر ہوا۔ حضرت امامؒ نے خلیفہ کی تعظیم کی اور مسند پر بٹھایا۔ پھر ہارون رشید نے گزارش کی کہ آپ خود حدیث کی قرات فرمائیں۔ امامؒ نے جواباً کہا کہ میں نے کبھی کسی طالب حدیث کے سامنے قرات نہیں کی۔ دستورِ مجلس یہی ہے کہ شاگرد قرات کرتے ہیں آپ بھی سماعت فرمائیں۔

دوسری درخواست مسترد ہوجانے کے بعد ہارون رشید نے عرض کیا۔ ''آپ مجھے تنہائی میں درسِ حدیث دیں۔''

خلیفہ کی اس خواہش پر امامؒ نے فرمایا۔ ''یہ تنگ نظری ہے کہ ایک شخص سورج کی روشنی سے تنہا فائدہ حاصل کرے اور مخلوقِ خدا کو دھوپ سے محروم کردے۔''

ہارون رشید لاجواب ہوگیا۔ اور پھر اس نے دیگر حاضرین کے ساتھ ہی سماعتِ حدیث کی۔ جیسے

ہی معن بن عیسیٰؒ قرات کے لئے تیار ہوئے حضرت امامؒ نے خلیفہ سے فرمایا۔''اس شہرِ مقدس میں اہلِ علم کا دستور ہے کہ وہ علم کی تواضع کرتے ہیں۔'' ہارون رشید آپ کی بات کا مفہوم سمجھ گیا اور مسند سے نیچے اتر کر عالم آدمیوں کے ساتھ بیٹھ گیا' یہاں تک کہ مجلسِ حدیث ختم ہوئی اور پھر وہ اٹھ کر چلا گیا۔حاضرین نے ہارون رشید جیسے باجبروت خلیفہ کو اس طرح جاتے ہوئے دیکھا کہ وہ بہت خوش وخرم تھا اور اس ماتھے پر شکن تک نہ تھی۔

حضرت امامؒ کی بزمِ نور کا حال کون لکھ سکتا ہے؟ آپ کی مجلسِ علم بڑی عجیب تھی' ایسی مجلس کسی نے دوبارہ دیکھی اور نہ اس کے بارے میں کسی سے سنا۔حضرت امامؒ اس مجلس کے خود ہی بانی تھے اور خود ہی خاتم۔اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔اس مجلس میں منصور' مہدی اور ہارون رشید کا ذکر ہی کیا خود صاحب مجلس بھی اس طرح بیٹھتا تھا کہ اس کے بعد کسی دوسری محفل میں نشست کے ایسے آداب نظر نہیں آئے۔کہنے کو علم وادب کی ہزاروں مجالس آراستہ کی گئیں مگر خدا گواہ ہے کہ وہ مجلس ہی اور تھی۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جنہیں ''حدیث کا امیر المومنین'' کہا جاتا ہے' ایک بار امامؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔اس وقت حضرت مالکؒ درسِ حدیث دے رہے تھے' ابنِ مبارکؒ نے دیکھا کہ اچانک امامؒ کے چہرے کا رنگ غیر معمولی طور پر سرخ ہو گیا ہے۔قدرتی طور پر بھی آپ کا رنگ سرخ تھا۔اب اس میں مزید سرخی شامل ہو گئی تھی۔چند لمحوں بعد عبداللہ بن مبارکؒ نے دوبارہ دیکھا کہ امامؒ کے چہرے کا رنگ زردی مائل ہو گیا ہے۔یہ ایک غیر معمولی بات تھی لیکن امامؒ کا درسِ حدیث جاری تھا۔اس لئے ابن مبارکؒ نے آپ کی بدلتی ہوئی کیفیت پر زیادہ دھیان نہیں دیا مگر جب کچھ ساعتوں کے فرق سے امامؒ کے چہرے پر نیلاہٹ سی نظر آنے لگی تو عبداللہ بن مبارکؒ فکر مند ہو گئے۔کئی بار ان کے دل میں آیا کہ امامؒ سے اس تغیر کا سبب دریافت کریں لیکن آدابِ مجلس کے پیشِ نظر درس کے دوران کوئی سوال نہ کر سکے۔بالآخر جب درس ختم ہو گیا اور لوگ اٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔تو ابن مبارکؒ نے آپ سے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کے متعلق پوچھا۔

حضرت امامؒ نے عبداللہ بن مبارکؒ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔خاموشی سے اٹھے اور گھر کے اندر تشریف لے گئے۔آپ نے پیرہن اتارا تو زوجہ محترمہ نے دیکھا کہ کپڑوں میں ایک بچھو موجود ہے جب آپ کے جسم کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہو کہ بچھو نے سولہ مقامات پر نیش زنی کی تھی' بعض کتابوں میں تحریر ہے کہ امامؒ کے سرخ وسفید بدن پر دس جگہ نیلے نشانات موجود تھے۔تھوڑی دیر بعد حضرت امامؒ



باہر آئے اور عبداللہ بن مبارکؒ کو صورت حال سے اس طرح آگاہ کیا جیسے یہ کوئی عام سا واقعہ تھا۔

عبداللہ بن مبارکؒ یہ سن کر سناٹے میں آ گئے' پھر بڑے اثر انگیز لہجے میں کہنے لگے۔''امامؒ! خدا آپ کی عمر دراز کرے۔کوئی دوسرا انسان اس صبر وسکون کے ساتھ یہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔''

حضرت امامؒ نے جواباً فرمایا۔''میرا صبر وسکون صرف حدیث رسولﷺ کی تعظیم کے سبب تھا۔آقاؐ کی غلامی کے شرف نے مجھے ہمت عطا فرمائی۔ورنہ عقرب کی نیش زنی کون برداشت کر سکتا ہے۔''

یہ واقعہ احترام حدیث کے سلسلے میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا تھا۔امامؒ کے جسم میں بچھو کا تکلیف دہ زہر اترتا رہا مگر آپ اپنی جگہ سے اس لئے جنبش نہ کر سکے کہ سرورِ کونین کا فرمانِ مقدس سنایا جا رہا تھا۔

☆☆☆

جو لوگ حضرت امام مالک بن انسؒ کی عظیم الشان شخصیت کو سمجھنا چاہتے ہیں انہیں یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ امام مدینہؒ کی علمیت اور روحانیت کی بنیاد اول وآخر عشقِ رسولﷺ کی تھی۔علما اور دانش وروں نے عشق کے کئی مدراج بیان کیے ہیں۔اس کی افزائش اور ارتقاء کے کئی محرکات بتائے ہیں مگر امامؒ کے عشق کو دنیا کے مقرر کردہ پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔عشقِ رسولﷺ تو امامؒ کی فطرت میں شامل تھا' لوگ کسی ذات کو دیکھ کر عشق کرتے ہیں یا اس کی صفات سن کر جذباتی وابستگی قائم کر لیتے ہیں لیکن امامؒ دنیا کے وضع کردہ اصولوں سے یکسر بے نیاز تھے۔آپ تو بچپن کی بے خبری کے اس زمانے میں بھی اپنے دل کے اندر ایک مخصوص گداز اور تڑپ رکھتے تھے' جب بچوں کو کھیلنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا۔امامؒ ایک بار رسالت پناہﷺ کے دربار میں گئے تو پھر اس در کی گدائی کرتے ہوئے ساری عمر گزار دی۔علامہ اقبال کے بقول

ے عشق اگر ترا نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

جاننے والے جانتے ہیں کہ مالک بن انسؒ کے ''سجود وقیام'' کبھی حجاب کی منزل میں نہیں رہے۔ اس لئے کہ عشقِ مصطفیٰ' ان کی نماز کا امام تھا۔نگاہِ عشق ومستی میں وہی اول وہی آخر' یہی وہ جذبہ بے اختیار تھا جس نے حضرت امامؒ کو ساری دنیا سے بے نیاز کر دیا تھا۔ہم مالک بن انسؒ کے عشق کو صدیقِ اکبرؓ فاروق اعظمؓ علی کرم اللہ وجہہ' بلال حبشیؓ' خبیبؓ اور اویس قرنیؒ کے عشق کے مماثل تو قرار نہیں دے سکتے مگر

وہ جاں نثاروں کی اس جماعت کے بارے میں ایک ممتاز فرد ضرور تھے۔ حضرت امامؒ کا عشق اس قدر مثالی تھا کہ صحابہ اکرامؓ کے بعد ماضی وحال میں دور تک آپ کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔
بے شمار لوگوں نے ''ذات'' سے عشق کیا ہے مگر دنیا میں کچھ ایسے وارفتہ شوق بھی نظر آتے ہیں جو ذات کے ایک ایک حوالے سے عشق کرتے رہے حضرت امامؒ شہرِ رسولؐ کے ایک گوشے میں اس حدیث کو سینے سے لگائے ہوئے بیٹھے رہے جس میں آقاؐ نے غلاموں سے فرمایا تھا:'' مدینہ ان کے حق میں بہتر ہے اگر وہ سمجھیں'' زبانِ رسالت سے ادا ہونے والے یہی چند الفاظ حضرت امامؒ کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھے۔ وہ سنگین لمحات جن میں آپ کے اہل خانہ فاقہ کشی کا شکار ہوئے تھے اس وقت بھی کچھ اہل ثروت اشارہ کیا کرتے تھے کہ مدینہ چھوڑ کر چلے آؤ۔ سارے اقتصادی مسائل حل ہو جائیں گے' ترک وطن میں امامؒ کی توہین نہیں تھی۔ اگر آپ گھر سے باہر قدم نکالتے تو عقیدت مندوں کا ہجوم پائے اقدس پر سر رکھ دیتا لیکن جس کے لئے مدینہ ہی سب کچھ ہو' وہ چند طلائی اور نقرئی سکے تو کیا' دنیا کی بادشاہی بھی قبول نہ کرتا۔

حضرت امامؒ کو رسول کریمؐ کی ایک ایک نسبت سے والہانہ عشق تھا۔ اگرچہ خلیفہ منصور کی سیاسی فتنہ انگیزیوں میں امامؒ پر قیامت ٹوٹ گئی لیکن آپ نے حضرت محمد نفس زکیہؒ کا اس لئے ساتھ دیا تھا کہ وہ خاندان سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ امامؒ کو جہاں بھی رسالت کا نقشِ قدم نظر آجاتا۔ وہاں آپ کی جبین شوق جھک جاتی۔ امام اکثر دعا مانگا کرتے تھے ''اے اللہ! تو نے مجھے خاک مدینہ سے اٹھایا اور اسی خاک میں ملا دے۔''

علامہ ابنِ خلکان نے تحریر کیا ہے کہ امام مالکؒ تمام عمر مدینہ منورہ میں کبھی اونٹ پر سوار نہیں ہوئے۔ انتہائی ضعف اور کمزوری کے باوجود بھی آپ نے اس عمل کا ارتکاب نہیں کیا۔ امامؒ کی ناتوانی کو دیکھ کر کوئی غم گسار شاگرد اصرار کرتا تو آپ بڑے رقت انگیز لہجے میں فرماتے۔ ''مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں اپنی سواری کے کھروں سے اس جگہ کو پامال کروں جس مقدس سرزمین پر میرے آقا سرورِ دوجہاں محوِ خواب ہوں۔'' عمر کے آخری حصے میں مدینے سے باہر بھی تشریف نہ لے جاتے اس خوف سے کہ کہیں دوسرے مقام پر موت نہ آجائے اور پھر اس دیارِ پاک میں دفن نہ ہوسکیں۔
شہرِ رسولؐ سے امامؒ کی محبت کا یہ حال تھا کہ خود بھی خاکِ مدینہ کو اپنے سر پر سجاتے اور دوسروں کو بھی اس ارضِ مقدس سے والہانہ عشق کرنے کی تلقین فرماتے۔ یہ مٹی کا وہ کافرانہ فلسفہ نہیں تھا کہ جس کے تحت



زمین انسان کی ماں ہے۔ امامؒ جس مٹی کی بات کرتے تھے وہ ہر طاغوتی زہر کے لیے تریاق کا درجہ رکھتی تھی۔ اس مٹی پر مالک بن انسؒ نے خدا کے سب سے بڑے پیغمبر احمد مجتبیٰؐ اور سب سے مقرب فرشتے جبرئیل امینؑ کے قدموں کے نشانات محسوس کیے تھے۔ یہاں اڑنے والی گرد کہکشاں سے زیادہ تابناک تھی' اسی مٹی پر رہنے والے ایک شخص نے عہد جاہلیت کی تقسیم کردہ تمام مٹیوں کو ہم رنگ بنا دیا تھا اور شکستہ زمین کے بکھرے ہوئے سارے ٹکڑوں کو ان کی اکائی سے جوڑ دیا تھا۔ یہاں تک کہ زمین کے سیاہ و سفید بیٹے' اعلیٰ نسب اور حقیر نسل فرزند ایک ہی صف میں دوش بدوش کھڑے ہوگئے تھے اور پھر یہی مٹی بیمار انسانیت کے لئے اکسیر بن گئی تھی' حضرت امامؒ اسی لئے خاک مدینہ کے ثناخواں تھے۔
منصور کا بیٹا خلیفہ مہدی' حضرت امام مالکؒ سے بہت زیادہ عقیدت رکھنا چاہتا تھا۔ ایک بار مہدی' مدینہ منورہ آیا تو امامؒ اس سے ملاقات کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ مہدی بہت احترام سے پیش آیا۔ خوب خاطر و مدارات کی اور جب امام رخصت ہونے لگے تو اس نے نصیحت کی خواہش ظاہر کی۔

جواباً امامؒ نے فرمایا۔ ''میں تجھے خدا سے روزِ محشر سے اور پرسش اعمال سے ڈراتا ہوں جسے خوفِ خدا نہیں وہ ہلاکت کے بہت قریب کھڑا ہے میری دوسری نصیحت یہ ہے کہ دنیا میں جو شخص حضور اکرامؐ کے پڑوسیوں سے مہربانی کے ساتھ پیش آئے گا وہ آخرت میں معزز و محترم ٹھہرے گا۔ مجھ تک یہ معتبر روایت پہنچی ہے کہ رسول مقبولؐ فرمایا کرتے تھے کہ مدینہ میری ہجرت کی جگہ ہے' یہیں میری قبر بنے گی اور یہیں سے مجھے قیامت کے دن اٹھایا جائے گا' اس کے باشندے میرے پڑوسی ہیں میری امت پر یہ حق ہے کہ وہ میرے پڑوسیوں کی حفاظت کرے' میں ان کا شفیع بھی ہوں اور گواہ بھی۔''
حضرت امام مالکؒ کی نصیحت سن کر مہدی آبدیدہ ہوگیا۔ پھر اس نے اہل مدینہ پر لطف و کرم کی ایسی بارش کی کہ مہدی کا یہ عمل ایک تاریخی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کے بعد عباسی خلیفہ نے اظہارِ عقیدت کے لئے اس شہرِ مقدس کا طواف کیا۔ دورانِ طواف وہ بہ آواز بلند کہتا جاتا تھا ''خدا کی قسم! اگر امامؒ مجھ پر شفقت نہ فرماتے تو میں زندگی کی بڑی سعادت سے محروم رہ جاتا۔ اب میں ہمیشہ رسالت مآبؐ کے پڑوسیوں کا خیال رکھوں گا۔''
اسی خلیفہ مہدی نے ایک بار اپنے مصاحب خاص ربیع کے ہاتھ امام مالکؒ کو تین ہزار اشرفیاں ارسال کیں' آپ نے مہدی کی یہ نذر قبول کر لی۔ ربیع کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے پھر بڑے ادب

سے عرض کیا۔ ''امیر المومنین اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ آپ ان کے ہمراہ بغداد تشریف لے چلیں۔''

حضرت امامؒ نے ایک لمحہ توقف کئے بغیر ربیع سے فرمایا ''تم نے میرے آقا کا فرمانِ مقدس سنا ہے؟''

ربیع کوئی عالمِ حدیث نہیں تھے اس لئے اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے بولے ''میرے علم میں اضافہ فرمایئے۔''

حضرت امامؒ نے ربیع کے سامنے وہ حدیث مبارک بیان کردی جس کا مفہوم یہ ہے۔ ''مدینہ ان کا حق میں بہتر ہے اگر وہ اس بات کو سمجھیں۔'' حضرت امامؒ کی گفتگو کا مفہوم سمجھ گئے تھے مگر احتراماً سر جھکائے بیٹھے رہے' پھر آپؒ نے فرمایا۔ ''اگر ایک دن بھی آقاؐ کا روضہ اقدس نظر نہ آئے تو غلام کی جان پر بن جائے۔'' امام کے الفاظ میں وہ جلال تھا کہ ربیع کانپنے لگے۔

انہوں نے اس عاشقِ رسول کی بہت سی باتیں سنی تھیں مگر آج اپنی آنکھوں سے امامؒ کے عشق کا انداز دیکھ رہے تھے۔ ''میں نور کے اس حصار سے نکل کر کہاں جاسکتا ہوں' میری تو دنیا ہی تاریک ہوجائے گی۔'' امامؒ کے لہجے میں بڑا سوز تھا۔ ''میں تو پہچانا ہی اسی ذات کے حوالے سے جاتا ہوں۔ اگر اس کا دامن چھوٹا تو مالک بے نشان ہوجائے گا۔'' یہ کہہ کر امامؒ نے خلیفہ مہدی کی دی ہوئی اشرفیوں کی تھیلی اٹھائی اور ربیع کے سامنے رکھ دی۔ ''امیر المومنین سے کہنا کا مالک بن انسؒ خاکِ مدینہ کے ایک ذرے کے بدلے ساری دنیا کی دولت بھی قبول نہیں کرے گا۔''

ربیع' امامؒ کا یہ بے باک طرزِ عمل دیکھ کر گھبرا گئے ''نہیں' امیر المومنین کا یہ مقصد ہرگز نہیں۔'' امامؒ کے سامنے گفتگو کرتے ہوئے ربیع کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ''وہ تو بس ایک خواہش تھی کہ اس طرح آپ کی موجودگی اہلِ بغداد کے لئے باعثِ برکت ہوگی' آپ کہیں بھی رہیں امیر المومنین کے حق میں دعائے خیر فرماتے رہیں۔''

''خدا امیر کو ان کے حسنِ نیت کا صلہ دے۔'' امامؒ نے خلیفہ مہدی کے لئے چند دعائیہ کلمات کہے اور ربیع آپ کے مکان سے اس طرح اٹھ کر گئے کہ ان کے قدموں کی لرزش نمایاں تھی۔

خاکِ مدینہ سے امامؒ کی والہانہ محبت' عشق رسولؐ ہی کا نتیجہ تھی' اور عشقِ رسولؐ تو وہ تھا جس نے گداؤں کو شہنشاہ اور کم نظروں کو روشن ضمیر بنا دیا گیا۔ حضرت امامؒ بھی چونکہ اسی در کے مانگنے والے تھے اس لئے قدرت نے آپ کو بھی اعلیٰ ظرفی اور بے باکی کے ساتھ فراستِ نظر جیسی غیر معمولی صفات بخشی



تھیں

☆☆☆

امام مالکؒ کی فراست کا یہ حال تھا کہ آپ خاموشی کی زبان بھی سمجھ لیا کرتے تھے۔ اگر کوئی اہل زبان آپ کو لفظوں کے پیچ وخم میں الجھانے کی کوشش کرتا تو امامؒ کی روشن نظریں اس کے دل کی گہرائی تک اتر کر بات کا صحیح مفہوم اخذ کرلیتی تھیں۔ کچھ لوگوں نے امامؒ کی اس صفت کو مستقبل بینی کی صفت سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت امامؒ کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے ''میں نے اپنے استاد ابنِ ہرمزؒ سے ظاہری علوم کے علاوہ بھی کچھ سیکھا ہے میں لوگوں کے سامنے وہی باتیں دہراتا ہوں جو ان کے حق میں مفید ہیں۔ اگر میں اپنے دوسرے علم کا مظاہرہ کروں تو انسانی عقل الجھ جائے گی۔''

حضرت امامؒ کا یہ مخصوص علم کیا تھا اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا مگر پھر بھی تاریخ کی مستند کتابوں میں کچھ ایسے واقعات نظر آجاتے تھے جن سے امامؒ کی فراست نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ آپ کی اس صفت کو الہامی کیفیت کا نام دیتے ہیں' بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ امامؒ کی عارفانہ نگاہ بہت دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

حضرت امام شافعیؒ جب پہلی بار آپ کی درس گاہ میں تشریف لے گئے تھے تو آپ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا تھا ''اے محمد! گناہوں کے بچو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک تمہارا درجہ بہت بلند ہوگا۔'' اور پھر ایسا ہی ہوا۔ خدا نے محمد بن ادریس شافعیؒ کو ایک جلیل القدر امام کی حیثیت سے شہرتِ دوام بخشی۔ اسے اہل دنیا امام مالکؒ کی پیش گوئی کہیں یا فراستِ نظر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسی آنکھ عطا فرمائی تھی جو پس دیوار بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور ایسا کیوں نہ ہو کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا۔

اسی طرح ایک اور عجیب واقعہ ہے جو امام مالکؒ کی فراستِ نظر پر روشن دلیل ہے۔ مشہور بزرگ یحییٰ بن خلفؒ فرماتے ہیں ''میں ایک دن حضرت امام مالکؒ بن انسؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ درسِ حدیث ختم ہوچکا تھا اور اب مجلسِ فقہ آراستہ تھی لوگ مختلف شرعی مسائل دریافت کررہے تھے اور امامؒ بڑی محبت سے انسانی ذہن کی الجھنوں کو دور فرما رہے تھے' اچانک ایک شخص لوگوں کے درمیان اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر کہنے لگا ''امام! قرآن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے' وہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟''

حضرت امامؒ بڑے تحمل مزاج تھے مگر اس شخص کا سوال سن کر خلافِ عادت غضبناک ہوگئے پھر نہایت تند وتیز لہجے میں فرمایا ''اس زندیق کو قتل کرڈالو۔ خدا کی قسم! اس کے کلام سے بڑے فتنے پیدا

ہوں گے۔''

وہ شخص آپ کا جواب سن کر چلا گیا' اور حاضرین بھی اس وقت امامؒ کے قہر و نفرت میں ڈوبے ہوئے الفاظ کی اہمیت کو نہ سمجھ سکے۔ حضرت امامؒ کی وفات کے اڑتیس سال بعد خلیفہ ہارون رشید کے آخری دور میں فتنۂ خلق قران نے سر اٹھایا۔ جب معتصم کے زمانۂ خلافت میں متزلہ کی یہ تحریک اپنے عروج کو پہنچ گئی اہل سنت کی ایک بڑی جماعت مغضوب ہوئی اور امام احمد بن حنبلؒ نے سخت اذیتیں برداشت کیں' اس وقت ماضی کے جو لوگ زندہ تھے انہیں امام مالکؒ بہت یاد آئے' اس مرد روشن ضمیر نے جو کچھ کہا تھا حرف بحرف پورا ہو کر رہا' یہی امامؒ کی وہ فراستِ نظر تھی جو آپ کو اللہ کی طرف سے بطورِ خاص عطا کی گئی تھی۔

☆☆☆

حضرت امامؒ بڑے اعلیٰ ظرف انسان تھے۔ اعترافِ حقیقت میں آپ کو کبھی کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن مشہور عالم عبدالرحمٰن بن قاسمؒ آپ کی خدمت میں حاضر تھے۔ فقہ کے مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک موقع پر ابنِ قاسمؒ نے حضرت امامؒ سے عرض کیا۔ ''میں نے اہلِ مصر سے بڑھ کر ''مسائل بعیع'' کا ماہر کسی کو نہیں دیکھا۔''

''وہ کس طرح؟'' حضرت امامؒ نے ابنِ قاسم کے دعوے کی وجہ پوچھی۔

وہ اس سلسلے میں آپ کی پیروی کرتے ہیں۔' ابنِ قاسم نے وضاحت کی۔

حضرت امامؒ نے فرمایا۔ ''میں تو خود مسائل بعیع سے ناواقف ہوں پھر میری پیروی کر کے اہل مصر ماہر کیسے ہو گئے؟''

حضرت امامؒ کا جواب سن کر ابنِ قاسمؒ حیران رہ گئے۔

حقیقت کا یہ کیسا اعتراف تھا؟ تاریخ تو انہیں بھی عالم قرار دیتی ہے جو اپنا علم مسلط کرنے کیلئے دوسروں کے علم کی نفی کرتے تھے۔ پھر اہلِ دنیا امامؒ کے اس انداز کو کس نام سے پکاریں گے؟ اگر یہ اعترافِ حقیقت ہے تو پھر لوگوں کو بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے کہ امامؒ بلاشبہ اعلیٰ ظرفوں کی فہرست میں نمایاں ترین فرد تھے۔

مشہور محدث عبدالرحمٰن بن مہدیؒ فرماتے ہیں۔ ایک دن امام مالکؒ کی مجلسِ درس آراستہ تھی۔ ہم لوگوں نے ایک شخص کو اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا' وہ اپنے نقش و نگار اور شکل و صورت سے کسی دوسرے ملک کا باشندہ نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر تھکن اور پریشانی کے آثار صاف نظر آتے تھے



اجنبی نے اپنی رسم کے مطابق امامؒ کو سلام کیا اور پھر اس طرح عرضِ حال کرنے لگا۔ امامؒ! میں اہلِ مغرب میں سے ہوں اور چھ ماہ کی کڑی منزلیں طے کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ میری قوم نے ایک مسئلہ معلوم کرنے کے لئے مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ حضرت امام مالکؒ اجنبی کی باتوں کو بغور سنتے رہے۔

پھر آپ نے بڑی بے باکی کے ساتھ فرمایا۔ ''یہ مسئلہ ہماری قوم میں کبھی پیش نہیں آیا اس لئے میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا بزرگوں سے بھی کوئی روایت نہیں سنی مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔''

امامؒ کا جواب سن کر اجنبی سکتے میں آ گیا اس قدر طویل مسافت کے بعد وہ اپنی ناکامی کے بارے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر وحشت برسنے لگی' پھر وہ بڑے افسردہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''امامؒ! میں اپنی قوم کو کیا جواب دوں گا؟''

امامؒ نے بڑے صبر و سکون سے فرمایا۔ ''تم اپنی قوم کے لوگوں سے کہہ دینا کہ مالک بن انسؒ تمہارے سوال کا جواب نہیں جانتا۔''

یہ سن کر وہ شخص بڑے کرب کے عالم میں اٹھا اور درس گاہ سے نکل کر چلا گیا۔

دوسرے دن وہ اجنبی اس حالت میں دوبارہ آ گیا کہ اس کا سامان خچر پر لدا ہوا تھا اور وہ اسے کھینچ رہا تھا' حضرت امام مالکؒ نے اسے دیکھ کر فرمایا۔ ''مہمان مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں تمہاری خدمت نہیں کر سکا۔'' اجنبی نے بڑے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''امام! مجھ سے کہا گیا تھا کہ روئے زمین پر آپ سے بڑا عالم کوئی نہیں ہے۔ میں اپنی قوم کے سامنے اس ناکام واپسی کا کیا جواز پیش کروں گا؟''

حضرت امامؒ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا۔ ''اپنی قوم سے کہہ دینا کہ مالک بن انسؒ کا علم زیادہ نہیں ہے۔''

حضرت امامؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''ہمارے فتوے گمان ہی گمان ہیں ہمیں یقین حاصل نہیں۔''

معن بن عیسیٰؒ کا بیان ہے ''امام مالک کہا کرتے تھے کہ میں تماری طرح ایک انسان ہوں۔ ٹھیک بھی کہتا ہوں اور غلطی بھی کر جاتا ہوں میرے قول کو اچھی طرح پرکھا کرو۔ اگر کتاب و سنت کے مطابق پاؤ تو قبول کر لو اور خلاف ہو تو اسے چھوڑ دو۔''

اسی اعلیٰ ظرفی اور اعترافِ حقیقت نے امامؒ کو صحیح علم کے دروازے تک پہنچایا۔

☆☆☆

اعلیٰ ظرفی ایک ایسا جوہر ہے جس سے کئی جوہر پھوٹتے ہیں۔اور پھر انسانی کردار ایک تناور درخت کی طرح زمین پر پھیل جاتا ہے۔حضرت امام مالکؒ کی اعلیٰ ظرفی نے آپ کو اس قدر بے باک بنا دیا تھا کہ شاعرانہ تشبیہات و استعارات کا سہارا لیے بغیر دل کی بات صاف صاف کہہ دیا کرتے تھے۔امامؒ تلخ گفتار نہیں تھے۔شیریں سخنی تو آپ کی عادتِ ثانیہ تھی مگر اظہارِ حق کے سلسلے میں آپ آمرانِ وقت کی بھی پروا نہیں کرتے تھے،امامؒ کے کسی شاگرد نے ایک دن کہا ''لوگ حاکموں سے آپ کی ملاقاتوں پر اعتراض کرتے ہیں۔''

حضرت امامؒ نے فرمایا''اگر میں ان سے نہیں ملوں گا تو پھر کون ملے گا؟ کیا لوگ چاہتے ہیں کہ میں گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر حکمرانوں کے اعمال سے چشم پوشی کرلوں؟ پھر تو وہ اور بے لگام ہو جائیں گے۔مجھ پر یہ فرض ہے کہ میں خلیفہ اور دوسرے عاملین سے ملاقات کروں اور انہیں اپنی حد تک خلافِ شرع باتوں سے روکنے کی کوشش کروں۔''

ایک بار خلیفہ ہارون رشید حضرت امامؒ سے ملنے کے لئے مدینہ منورہ آیا۔جب وہ رخصت ہونے لگا تو امامؒ نے اس سے فرمایا۔''مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ اپنی فضیلت اور بزرگی کی باوجود کم حیثیت لوگوں کی ہانڈیوں کے نیچے پھونکیں مار کر آگ جلایا کرتے تھے۔یہاں تک کہ ان کی داڑھی اور آنکھوں میں دھواں بھر جاتا تھا۔مگر تم سے اس دھویں کے بغیر بھی لوگ راضی ہیں۔''

اس سے زیادہ صاف گوئی اور کیا ہو سکتی ہے؟ امامؒ کی گفتگو سن کر ہارون رشید نے ندامت سے سر جھکا لیا تھا۔

ایک بار کسی شہر کا حاکم امام مالکؒ کی مجلس درس میں بیٹھا تھا۔حاضرین میں سے ایک شخص نے حاکم کی تعریف شروع کر دی امامؒ اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکے اور آپ نے اپنی عادت کے خلاف اس شخص کی بات درمیان ہی سے کاٹ دی۔پھر ناگوار لہجے میں میں حاکم سے مخاطب ہوئے''کہیں ایسا نہ ہو کہ تم جھوٹی تعریف کرنے والوں کے فریب میں آ جاؤ۔جس شخص نے تمہاری تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ تم میں بھلائی ہے تو سمجھ لو کہ تم میں بھلائی نہیں ہے۔کہیں شرارت سے تو وہ بات نہیں کہی جارہی ہے جو تم میں موجود نہیں ہے اس لئے اللہ سے ڈرو اور اپنے تزکیہ نفس کے لئے دعا مانگو۔یا اس بات سے خوش ہو جاؤ جو وہ تمہارے منہ سے کہتا ہے۔تم ان لوگوں سے زیادہ اپنی حقیقت کو جانتے ہو۔''



عشقِ رسولؐ نے امامؒ کو دنیا کے ہر خوف سے بیگانہ کیا۔اور پھر اس بیگانگی نے آپ کو بے باک بنایا اور بے باکی نے اہلِ دنیا کے دلوں میں اس طرح آپ کی ہیبت ڈال دی کہ بقول شاعر

اٹھتی نہیں ہے آنکھ مگر اس کے روبرو
نادیدہ اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں

☆☆☆

تاریخ میں خلیفہ منصور کی سنگدلی اور بے راہ روی کے بے شمار افسانے مشہور ہیں مگر وہ بھی امام مالکؒ کے ہیبت و جلال سے محفوظ نہیں تھا۔ایک بار حضرت امامؒ، منصور کی خلوتِ خاص میں تشریف فرما تھے۔وہاں کوئی تیسرا فرد موجود نہیں تھا۔اچانک ایک لڑکا کمرے میں آیا اور پھر فوراً ہی واپس لوٹ گیا۔امامؒ نے اس کی آمدورفت پر کوئی دھیان نہیں دیا۔کچھ دیر بعد وہ لڑکا دوبارہ آیا اور اسی طرح واپس چلا گیا۔لڑکے کی اس حرکت کو دیکھ کر خلیفہ منصور نے امام مالکؒ سے عرض کیا۔''آپ اس لڑکے کو پہچانتے ہیں؟''

امامؒ نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا اس لئے نفی میں جواب دیا۔اس پر منصور نے لڑکے کا تعارف کراتے ہوئے کہا''یہ میرا بیٹا مہدی ہے مگر آپ کی بزرگی سے ڈرتا ہے۔''

پھر یہی مہدی جوان ہو کر منصبِ خلافت تک پہنچا اور امامؒ کی بڑی قدر و منزلت کی ایک بار مہدی حکومت کے کسی ضروری کام سے مدینہ منورہ آیا۔دورانِ قیام وہ شہرِ رسولؐ کے باشندوں سے مل کر ان کے مسائل بھی معلوم کرنا چاہتا تھا۔نتیجتاً خلیفہ کی طرف سے ایک تقریبِ خاص کا اہتمام کیا گیا۔اس تقریب میں معززینِ شہر کو دعوت نامے ارسال کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کو بھی شرکت کی اجازت دی گئی تھی بظاہر یہ ایک غیر سیاسی تقریب تھی جس میں حکومت کا اپنا کوئی مفاد شامل نہیں تھا۔مگر امامؒ کے مخالفین نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی جو لوگ مالک بن انسؒ کی عظمت و شہرت سے جلتے تھے انہوں نے ایک عجیب سا منصوبہ تیار کیا۔حاسدین کی اس جماعت کے تمام افراد وقت سے پہلے تقریب گاہ میں جمع ہوئے اور اس طرح اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے کہ خلیفہ مہدی تک پہنچنے کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔پھر لوگ آتے گئے اور خالی نشستیں بھرتی چلی گئیں۔آخر میں امامؒ کے بدخواہوں نے دیکھا کہ دروازے پر بھی انسانی ہجوم نظر آ رہا تھا منصوبے کی تکمیل ہو چکی تھی اب تماشہ دیکھنے والے اس بات کی منتظر تھے کہ امام مالکؒ دروازے میں کھڑے رہیں یا سب سے پچھلی صف میں عام لوگوں کے

ساتھ زمین پر بیٹھ جائیں۔ وقت گزرتا گیا پھر امام مدینہؒ تقریب گاہ کے دروازے میں نمودار ہوئے آپ نے ایک ایک گوشے پر نظر ڈالی مگر خلیفہ کی مسند تک جانے والی تمام راہیں بند کر دیں گئی تھیں۔ امامؒ کو اس طرح کھڑے دیکھ کر حاسدین کے ناآسودہ جذبے تسکین پانے لگے ان کے لیے اس منظر میں بڑی دلچسپیاں تھیں کہ مسلمانوں کا جلیل القدر امامؒ اپنی مخصوص نشست سے محروم ہو چکا تھا۔

حضرت امامؒ کچھ دیر تک صورت حال کا جائزہ لیتے رہے آپ کو اس بات کا انتظار تھا کہ شاید بیٹھے ہوئے لوگ خلیفہ تک پہنچنے کے لیے راستہ بنا دیں مگر جب کسی نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کی تو امامؒ کے ذہنِ رسا پر حاضرین کی نیتیں بے نقاب ہو گئیں۔ لوگ اس راز سے باخبر تھے کہ امامؒ اپنی ساری زندگی میں کسی امیر کے سامنے نہیں بیٹھے ہمیشہ خلیفہ کے برابر نشست حاصل کی اور اس طرح تشریف فرما ہوئے کہ جیسے آپ خود بھی کسی سلطنت کے حکمراں ہوں۔ آج کچھ لوگ امامؒ کی اسی رسم کو سازش کے ذریعے بدل دینا چاہتے تھے مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ عشقِ خوددار کی رسمیں بدلی نہیں جاتیں۔ اچانک حاضرین کی سماعتوں میں شگاف پڑ گئے۔

امامؒ کی باوقار آواز پوری محفل میں گونج رہی تھی۔ ”امیر المومنین! آپ کا استاد مالک کہاں بیٹھے؟“

خلیفہ مہدی نے نظر اٹھا کر دیکھا اور نہایت عقیدت کے ساتھ جواب دیا۔ ”ابوعبداللہ! آپ کی نشست یہاں ہے آپ میرے پاس آکر بیٹھئے۔“

مہدی کی آواز سنتے ہی لوگ اس طرح ہٹ گئے جیسے میدان سے بھاگنے والی فوجیں منتشر ہو جاتی ہیں۔ امامؒ شانِ جلالی کے ساتھ آگے بڑھے اور پھر آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے خلیفہ کے قریب جا پہنچے۔ مہدی نے اپنا دایاں پاؤں کھڑا کیا اور امامؒ کو اپنے برابر میں بٹھا لیا۔

بے شک! امام ایسے ہی صاحبِ جلال تھے ایسے ہی غیور اور بے باک تھے مگر شخصیت کا یہ جلال لہجے کی یہ بے باکی اور نفس کی یہ غیرت عشقِ رسول کے بغیر نہ تھی۔ اور عشقِ رسول کیا ہے؟ عشقِ رسولؐ حسنِ طلب کا نام ہے کہ شب کے سناٹے میں مانگنے والے نے اپنے خدا سے مانگا؟ عشقِ رسولؐ عقرب کی نیش زنی کو برداشت کرنے کا نام ہے کہ برداشت کرنے والے نے احترامِ حدیث میں جنبش تک نہ کی۔ عشقِ رسول بہتے ہوئے لہو کا نام ہے کہ زخم کھانے والے نے نسبتِ رسولؐ کے باعث ایک جابر و سفاک کو بھی معاف کر دیا۔ عشقِ رسولؐ اس اعلان کا نام ہے کہ چہرے کی سیاہی کے باوجود سرِ بازار لوگوں کو اپنی شناخت کرائی اور.......... عشقِ رسولؐ اس شوقِ دید کا نام ہے کہ گنبدِ خضرا کی ایک جھلک کے لیے



دنیا کی ساری دولت' سارے اعزاز ٹھکرا دیئے اور یہ کہہ کر خاکِ مدینہ کو اپنے بدن پر مل لیا کہ یہی میرا مشک ہے یہی میرا عنبر ہے۔ اس کا عشق ایسا تھا کہ وہ اپنے آقاؐ کا نام لیتے ہی جھک جایا کرتے تھا۔ اور پھر خدا نے اس کے سامنے تمام عالم کو جھکا دیا۔

امام مالکؒ ابو حنیفہؒ سے عمر میں تیرہ سال چھوٹے تھے مگر امام اعظمؒ آپ کے سامنے اس طرح باادب بیٹھا کرتے تھے کہ کوئی شاگرد بھی اس احترام کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔

حضرت سفیان ثوریؒ ایک دن امام مالکؒ کی مجلس میں تشریف لائے تو در و دیوار پر آپ کی ہیبت اس طرح طاری تھی کہ لوگ نظریں جھکائے ساکت بیٹھے تھے حضرت سفیانؒ نے امامؒ کی شانِ جلالی کو دیکھا اور پھر آپ کی تعریف میں یہ اشعار کہے۔

”اگر امامؒ جواب دینا چھوڑ دیں تو تمام سائل اپنے سر نیچے کیے بیٹھے رہیں اور آپ کی ہیبت سے دوبارہ پوچھنے کی جرات نہ کر سکیں۔ وقار آپ کا ادب کرتا تھا اور آپ پرہیزگاری کی بادشاہت پر عزت کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔“

امام شافعیؒ نے فرمایا۔ ”مجھ پر سوائے مالک بن انسؒ کے کسی کا رعب طاری نہیں ہوا۔“

ابنِ دہب کہتے ہیں ”میں ایک بار مدینے آیا۔ مقامی باشندوں نے میرے سامنے ایک مسئلہ بیان کیا اور پھر کہا کہ اس مسئلے کا جواب امام مالکؒ سے دریافت کر لوں۔ مجھے ان کے طرزِ عمل پر حیرت ہو رہی تھی۔ آخر میں نے ان سے کہا کہ تم خود کیوں نہیں معلوم کر لیتے؟ ان لوگوں کا جواب میرے لئے بڑا حیران کن تھا۔ وہ سب کے سب بیک زبان کہہ رہے تھے ”یہی تو مجبوری ہے کہ ہم امامؒ سے اپنے دل کا حال بیان نہیں کر سکتے۔ بہت کوششیں کیں مگر امامؒ کے روبرو ہماری زبانیں ہمارا ساتھ نہیں دیتیں۔“ میں نے لوگوں کی اس مجبوری کو ان کی کم علمی سے تعبیر کیا۔ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا تھے اسی لئے امام مالکؒ کے سامنے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

یہ سوچ کر میں نے وعدہ کر لیا کہ ان کے تمام مسائل امامؒ کے گوش گزار کر دوں گا اور پھر وہ جو بھی جواب دیں گے اس سے انہیں آگاہ کر دیا جائے گا۔ پھر میں امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کی مجلس کا حال عجیب تھا حاضرین اس طرح سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے مالک بن انسؓ حدیث و فقہ کے امام نہ تھے کوئی باجبروت شہنشاہ تھے جس کے خوف سے لوگ آزادانہ سانسیں بھی نہیں لے سکتے تھے۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ لوگوں کی زبانیں ان کا ساتھ کیوں نہیں دیتی تھیں' پھر بھی میں نے اپنی قوتِ ارادی کو مجتمع کیا

اور حرفِ مدعا بیان کرنے کی کوشش کی لیکن ایک حرف بھی ہونٹوں کی قید سے آزاد نہ ہو سکا۔ امامؒ کی محفل میں میری تقریر کی ساری صلاحیتیں سلب ہو گئی تھیں اور تمام سرمایۂ گویائی اس طرح لٹ گیا تھا کہ کلام کی کوئی علامت باقی نہیں رہی تھی۔ امامؒ کی مجلسِ گفتگو دیر تک آراستہ رہی۔ مگر میں اپنے لبوں کو جنبش بھی نہ دے سکا پھر امامؒ کا درس ختم ہوا تو میں اٹھ کر چلا آیا اور ان لوگوں سے ملا جو میرے ذریعے اپنے سوالوں کے جواب چاہتے تھے۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ امامؒ کی مجلس میں تمہاری طرح میری زبان نے بھی میرا ساتھ نہیں دیا۔"

بے شک مالک بن انسؒ کا حلقۂ درس ایسا ہی تھا۔ امامؒ کے سامنے ابنِ وہب کی کیفیت جگر مراد آبادی کے اس شعر سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔

گئے تھے ہم بھی جگر جلوہ گاہِ جاناں میں
وہ پوچھتے ہی رہے ہم سے بات بھی نہ ہوئی

سعید اندلسی کا بیان ہے کہ مجھ پر عبدالرحمٰن بن معاویہ (عبدالرحمٰن الداخل) سے زیادہ کسی کا رعب طاری نہیں ہوا...... پھر میں مدینے آ کر امام مالک بن انسؒ سے ملا مجھ پر ان کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ ابنِ معاویہ کے رعبِ جلال کی کوئی حیثیت ہی باقی نہ رہی۔

☆☆☆

حضرت امام مالکؒ ظاہری اعتبار سے بھی ایک جاذبِ نظر شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کا قد دراز تھا اور رنگ نہایت سرخ و سفید، لمبے ہاتھ، اونچی پیشانی، بلند ناک، کشادہ سینہ، آنکھیں بڑی اور مسحور کن ہزروں انسانوں کی محفل میں بھی یگانہ نظر آتے تھے۔ ایک بار بھی جو شخص ملاقات کر لیتا اس کے دل و دماغ پر برسوں آپ کی دل کش شخصیت کا تاثر قائم رہتا۔ کسی بزرگ نے آپ کی ذات گرامی پر جامع تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے امام مالکؒ کو جسم اور علم دونوں میں کشادگی عطا فرمائی تھی۔ مزاج میں حد سے زیادہ نفاست پسندی تھی۔ اس لئے بہترین لباس زیبِ تن فرماتے تھے اور مشک و عنبر جیسی قیمتی خوشبوئیں استعمال کرتے تھے۔ غذا میں گوشت بہت زیادہ مرغوب تھا۔ گھر کی آرائش کا بھی خیال فرماتے تھے چاندی کی انگوٹھی پہنتے تھے جس میں سیاہ رنگ کا نگینہ جڑا ہوا تھا اور پر اس آیت "حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل" کندہ تھی۔ آپ کے شاگرد مطرفؒ نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا۔ "قرآن کریم میں اللہ، اہل ایمان سے فرماتا ہے۔" کہو کہ تمہارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بڑا کارساز ہے۔"، میرا دل چاہتا ہے کہ اس آیت



کا مضمون ہر وقت پیشِ نظر رہے۔ یہاں تک کہ یہ آیت مقدسہ میرے دل پر نقش ہو کر رہ جائے۔"

آپ خلیفۂ وقت کے تحائف اور نذرات قبول فرمالیا کرتے تھے۔ حضرت امامؒ نے کبھی کسی کم ظرف کا کوئی تحفہ یا نذر قبول نہیں کی۔ آپ اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ جب کوئی تنگ نظر آپ کی آسودہ حال زندگی پر اعتراض کرتا تو فرماتے تھے کہ میں کسی انسان کے لیے یہ پسند نہیں کرتا کہ آپ اللہ نے اسے اپنی نعمتیں بخشی ہوں اور پھر اس کی زندگی میں ان چیزوں کا اثر ظاہر نہ ہو۔ طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ صاف لباس استعمال کرے۔

حضرت امامؒ پر وہ نازک گھڑیاں بھی گزری ہیں جب آپ کو اپنی معصوم بچی کے لیے روٹی تک میسر نہ تھی مگر ان سنگین لمحات میں بھی نہ آپ نے کسی سے اپنی دل کا حال کہا اور نہ مدد کی درخواست کی۔ پھر جب اللہ نے آپ پر کشائش کے دروازے کھولے تو نہ چہرے پر عکس نمایاں ہوا، نہ دل میں احساسِ فخر پیدا ہوا۔ جس قدر نقد رقم آتی تھی، اسے دریا دلی سے خرچ کر دیا کرتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ اپنے شاگرد امام شافعیؒ کو ہر سال گیارہ ہزار دینار پابندی سے بھیجتے تھے۔ خود بھی اللہ کی نعمتوں سے فیضیاب ہوتے اور ضرورت مندوں کی بھی حاجت روائی کرتے۔ جب لوگوں نے امامؒ کی ظاہری شان کو ہدفِ تنقید بنایا ہے، انھوں نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ امامؒ کبھی مالِ دنیا کے پیچھے نہیں بھاگے، کسی خلیفہ کی تعریف نہیں کی، حاکم کے سامنے دستِ طلب دراز نہیں کیا، غربت کا موسم بھی اس طرح گزارا کہ بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جائیں، آسودگی کی فضا میں بھی اس طرح سانس لی کہ غبارِ حرص کو دل تک نہ آنے دیا۔ دنیائے ہوس کے کوچہ گرد کچھ بھی کہیں، ظاہر پرست کوئی بھی الزام تراشیں مگر امامؒ پھر امامؒ تھے۔

امام مالکؒ کی آسودہ حالی پر یہ اعتراض، زمانے کی کوئی انوکھی رسم نہ تھی۔ آپ جب تک غربت و افلاس کی زندگی بسر کرتے رہے، اس وقت تک یہ اعتراض برقرار رہا کہ کسی سے کچھ طلب کیوں نہیں کرتے؟ اور جب اللہ نے مادی وسائل میں کشادگی عطا فرمادی، تو امامؒ کے خوش حال طرزِ معاشرت پر تنقید کی جانے لگی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اہلِ دنیا کو کسی پہلو قرار نہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے کسی امیر کی نذر قبول نہیں کی تو معاذ اللہ انہیں بد دماغ کہا جانے لگا۔ امام مالکؒ پر کی جانے والی تنقید میں بھی یہی فطرتِ انسانی کارفرما تھی۔ لوگ امامؒ کی جس آسودہ حالی پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اس کی حقیقت امام شافعیؒ نے اپنے سفرنامے میں اس طرح بیان کی ہے۔

"اس وقت مجھے نجران میں تین سال ہو چکے تھے اسی دوران کچھ لوگ حج کی سعادت حاصل کر کے اپنے وطن لوٹ رہے تھے میں ان سے امام مالکؒ اور اپنے وطن کے حالات معلوم کرنے کے لئے چلا راستے میں مجھے ایک نوجوان نظر آیا۔ وہ اونٹ پر قبے میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسے اشارے سے سلام کیا نوجوان نے ساربان کو اونٹ روکنے کا حکم دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں نے امام مالکؒ اور اہلِ حجاز کے بارے میں معلوم کیا۔ اس نے جواباً بتایا کہ سب ٹھیک ہے۔ میں نے امام مالکؒ کے بارے میں دوبارہ سوال کیا تو کہنے لگا کہ تفصیل سے بتاؤں یا مختصر جواب دوں؟ میں نے کہا کہ اختصار ہی میں بلاغت ہوتی ہے۔ پھر نوجوان نے مجھے بتایا کہ امام مالکؒ تندرست ہیں اور بہت دولت مند ہو گئے ہیں۔ اس ہی کی زبانی تمام صورتِ حال معلوم کر کے مجھے شوق ہوا کہ امامؒ کو فراغت و آسودگی کے زمانے میں بھی دیکھوں۔ فقر و فاقے میں تو پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں نجران سے روانہ ہوا۔ آخر ستائیسویں دن عصر کے بعد حضور اکرمؐ کے شہرِ مقدس میں داخل ہوا سیدھا مسجد میں چلا گیا۔ نماز پڑھ کر دیکھا تو لوہے کی ایک کرسی مسجد میں رکھی ہوئی تھی اور کرسی پر مصر کا بنایا ہوا ایک قیمتی تکیہ موجود تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تکیے پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تحریر تھا۔ میں ابھی اس منظر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ امام مالکؒ باب النبی ﷺ سے نکلتے ہوئے دکھائی دیے پوری مسجد عطر سے مہک اٹھی۔ امامؒ کے ساتھ چار سو یا اس سے زیادہ مجمع تھا چار آدمی ان کے جبے کے دامن کو اٹھائے ہوئے چل رہے تھے۔ امامؒ اپنی مجلس میں پہنچے تو تمام بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے۔ درس کے بعد جب میں امامؒ کے نزدیک پہنچا تو انہوں نے جوشِ محبت میں مجھے گلے سے لگا لیا۔ اب سورج ڈوب چکا تھا ہم نے مغرب کی نماز پڑھی اور پھر امام مالکؒ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پرانے کھنڈر کی جگہ نئی عمارت کھڑی تھی۔ میں بے اختیار رونے لگا میرے آنسو دیکھ کر امام مالکؒ نے کہا۔ "محمد! تم روتے کیوں ہو؟ کہیں یہ تو نہیں سمجھ رہے ہو کہ میں نے دنیا کے بدلے آخرت فروخت کر دی ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "جی ہاں! میرے دل میں اسی قسم کا اندیشہ پیدا ہوا تھا۔"

امامؒ کہنے لگے۔ "تمہارا دل مطمئن رہے تمہاری آنکھیں ٹھنڈک حاصل کریں یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو سب ہدیہ ہے۔ خراسان سے، مصر سے دنیا کے دور دراز گوشوں سے تحائف پر تحائف چلے آ رہے ہیں۔ نبی کریمؐ ہدیہ قبول فرما لیتے تھے اور صدقہ رد کر دیتے تھے میرے پاس اس وقت خراسان اور مصر کے بہترین کپڑے کے تین سو خلعت موجود ہیں۔ غلام بھی اتنے ہی ہیں اور یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔



اب یہ سب کچھ میری طرف سے تمہارے لئے ہدیہ ہے۔ صندوقوں میں پانچ ہزار دینار رکھے ہیں اسی سے سالانہ زکوٰۃ نکالتا ہوں اس میں سے بھی آدھی رقم تمہاری ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ کے وارث موجود ہیں اور میرے وارث بھی زندہ ہیں۔ آپ نے جو کچھ دینے کا وعدہ کیا ہے اسے ضابطۂ تحریر میں آجانا چاہئے۔ اس طرح میری ملکیت مسلم ہو جائے گی اگر میں مر گیا تو اس مال و متاع کو آپ کے وارث نہ لے سکیں گے۔ اسی طرح خدانخواستہ آپ وفات پا گئے تب بھی یہ سب کچھ میرا ہو جائے گا اور آپ کے وارث کسی قسم کا دعویٰ نہ کر سکیں گے۔"

یہ سن کر امام مالکؒ مسکرائے اور پھر مجھ سے فرمایا۔ "یہاں بھی علم سے کام لیتے ہو۔"

میں نے جواب دیا۔ "علم کے استعمال کا اس سے بہتر موقع اور کونسا ہو سکتا ہے؟"

میری اس خواہش کے اظہار کے بعد رات ہی میں امام مالکؒ نے وہ قانونی دستاویز مکمل کر دی۔ اب زبانی نہیں بلکہ تحریری طور پر تمام چیزیں میری ملکیت تھیں۔

صبح میں نے باجماعت نماز ادا کی اور مسجد سے اس طرح لوٹا کہ امام مالکؒ کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا۔ اچانک میری نظر امام مالکؒ کے دروازے پر گئی جہاں خراسانی گھوڑے اور مصری خچر کھڑے تھے گھوڑوں کی کونچوں کے بارے میں کیا بتاؤں کہ وہ کس قدر حسین تھیں؟ بے اختیار میری زبان سے نکل گیا۔ "ایسے خوبصورت پاؤں تو میں نے کبھی دیکھے ہی نہیں۔"

امام مالکؒ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں فوراً جواب دیا۔ "محمد یہ تمام سواریاں تمہاری نذر ہیں۔"

میں نے عرض کیا۔ "کم سے کم ایک جانور تو اپنے لئے رہنے دیجئے۔"

امام مالکؒ نے فرمایا۔ "مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میرا گھوڑا اپنے سموں سے اس زمین کو پامال کرے جس کے نیچے سرورِ کونینؐ آرام فرما رہے ہیں۔"

یہ سن کر مجھے یقین آ گیا کہ دولت کی کثرت کے باوجود امام مالکؒ کا تقویٰ برقرار ہے۔

تین دن تک امام مالکؒ کے گھر میرا قیام رہا۔ پھر میں اس حال میں مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوا کہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتیں میرے آگے آگے تھیں اپنے مکان تک پہنچتے پہنچتے میں نے سب کچھ لٹا دیا۔ اب میرے پاس ایک خچر اور پچاس دینار کے سوا کچھ نہ تھا۔ میری اس سخاوت کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ امام مالکؒ نے بھی یہ واقعہ سنا۔ جواباً میری ہمت افزائی کی اور ایک آدمی کے ہاتھ کہلا بھیجا "محمد! تم ذرا بھی فکر نہ کرو۔ میں تمہیں جتنا دے چکا ہوں اتنا ہی ہر سال بھیجتا رہوں گا۔" امامؒ کی محبت نے مجھے حوصلہ دیا

میں ہر شے سے بے نیاز ہو کر اللہ کی دی ہوئی دولت اسی کے بندوں پر خرچ کرتا رہا۔ کچھ دن بھی گزرنے نہ پاتے تھے کہ میں مقروض ہو جاتا تھا لیکن امام مالکؒ مجھے وہ سب کچھ بھیج دیتے تھے جو انہوں نے مدینے میں دیا تھا یہ سلسلہ گیارہ سال تک جاری تھا۔ پھر امام مالکؒ کا انتقال ہو گیا تو حجاز کی سرزمین مجھ پر تنگ ہو گئی۔"

یہ ہے اس مردِ جلیل کا بیان جو اسلامی فقہ کا تیسرا بڑا امام ہے اس واقعے کی تفصیلات پڑھ کر ایک عام نظر رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ مالک ابن انسؒ نے اپنی آسودہ حال زندگی کس طرح بسر کی۔

جس کا ذکر پیدائش سے سو سال پہلے حدیث رسولؐ میں آیا۔ "عنقریب لوگ علم کی طلب میں سفر کر کے اونٹوں کے جگر پگھلا دیں گے پھر بھی انہیں عالمِ مدینہ سے بہتر کوئی عالم نہ مل سکے گا۔"

اسی حدیث مبارک کو دوسرے انداز سے بھی روایت کیا گیا ہے "علم ختم ہو جائے گا کوئی عالم باقی نہ رہے گا مگر ایک عالمِ مدینہ سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی دوسرا نہیں ہو گا۔" (یہ حدیث امام ترمذیؒ نے بیان کی ہے) حضرت سفیان بن عیینہؒ اور حضرت عبدالرزاق فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک عالم مدینہ سے مراد امام مالکؒ ہیں۔

جن کے بارے میں امامِ اعظم ابو حنیفہؒ نے فرمایا۔ "مدینے میں علم بکھرا پڑا ہے اگر کوئی اسے سمیٹ سکتا ہے تو یہی شخص (امام مالکؒ) سمیٹ لے گا۔" پھر فرمایا "میں نے امام مالکؒ سے زیادہ جلد صحیح جواب دینے والا کوئی اور نہیں دیکھا۔"

جس کی عظمت پر سفیان بن عیینہؒ نے اس طرح گواہی دی۔ "ہماری امام امالکؒ کے سامنے کیا حقیقت ہے، ہم لوگ تو ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔"

جس کے تقدس کو امام احمد بن حنبلؒ نے یوں ظاہر کیا۔ "جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ امام مالکؒ سے بغض رکھتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ بدعتی ہے۔"

جس کی جلالتِ علمی کو امام شافعیؒ نے اس انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اگر امام مالکؒ اور سفیان بن عیینہؒ نہ ہوتے تو علمِ حجازی باقی نہ رہتا۔"

جس کی بارگاہ میں حماد بن سلمہؒ اس طرح قصیدہ خواں ہیں "اگر مجھ سے کہا جائے تو امتِ محمد ﷺ سے میں حصولِ علم کے لئے کسی شخص کا انتخاب کر لوں تو میں اس کام کے لئے امام مالکؒ سے زیادہ موزوں کسی دوسرے کو نہیں سمجھتا۔"



جس کی شان میں عبدالرحمٰن بن مہدیؒ اس طرح رطب اللسان ہوئے "سفیان ثوریؒ امامِ حدیث تھے اور امام اوزاعیؒ امامِ سنت مگر امام مالکؒ دونوں کے امام تھے۔" پھر فرمایا "روئے زمین پر امام مالکؒ سے زیادہ حدیثِ نبویؐ کا کوئی امانت دار نہیں۔"

جس کے علم و فضل پر امام بخاریؒ نے اس طرح شہادت دی "سب سے زیادہ صحیح سند مالک بن انسؒ کی ہے۔"

جسے ابن شہاب الزہریؒ نے "علم کا محافظ" کہہ کر صدا دی۔
جسے حافظ ذہبیؒ نے "امام العلم" اور "سید الحافظ" کہہ کر پکارا
جسے عبیداللہ بن عمرؒ نے "مسائل کا مشکل کشا" کہا۔

جو ماضی و حال میں سب کے نزدیک "امام الکبیر" ٹھہرا۔ اس پر اعتراض کرتے ہو کہ:
وہ قیمتی لباس کیوں پہنتا تھا، عمدہ خوشبوئیں کیوں استعمال کرتا تھا؟ خلیفۂ وقت کے تحفے کیوں قبول کرتا تھا؟ تم اس کا مقام جانتے ہو کہ وہ کون تھا؟

یہ وہ مرد بزرگ ہے جس کی ایک رات بھی ایسی نہیں گزری کہ جب اس نے سرورِ کائنات حضور اکرم ﷺ کو خواب میں نہ دیکھا ہو۔ کیا یہ شرف اس کی قبولیت پر آخری دلیل نہیں؟ پھر بھی زبان دراز یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ خود ان خوابوں کا بیان کرنے والا تھا۔ معاذ اللہ! اگر کسی کو اس کی باتوں پر یقین نہیں تو پھر غور سے دیکھو کہ اس کی مجلسِ نور میں کون داخل ہو رہا ہے۔

حضرت مصعبؒ کے والد بیان کرتے ہیں "میں مسجد نبویؐ میں امام مالکؒ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص داخل ہوا اس نے آتے ہی سوال کیا۔ "تم میں مالکؒ کون ہے" حاضرین نے امامؒ کی طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ شخص امامؒ کی طرف بڑھا ادب سے سلام کیا، عقیدت سے ہاتھ ملایا، پیشانی کو بوسہ دیا اور دیوانہ وار گلے سے لپٹ گیا بہت دیر تک امامؒ کی پیشانی اور سینے کو چومتا رہا، کبھی ہاتھوں کو بوسہ دیتا کبھی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتا۔ اجنبی کی حرکتوں پر دیوانگی کا گمان ہوتا تھا حاضرینِ مسجد اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے ہوئے تھے جب اس شخص کا جوش کچھ کم ہوا تو وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "خدا کی قسم میں نے گزشتہ رات خواب میں رسول کریمؐ کی زیارت کی ہے...... سرورِ کونینؐ اِس جگہ تشریف فرما ہیں۔ رسالت مآبؐ نے حاضرین سے فرمایا۔

"مالک کو بلاؤ" یہ حکم سنتے ہی مالک کو بلایا گیا، پھر سرورِ دو جہاںؐ نے فرمایا۔ "مالک بیٹھ جا۔" آپ آقا کے سامنے بیٹھے گئے پھر سرکارؐ نے فرمایا "مالک اپنی آغوش کھول۔" آپ نے حکم کی تعمیل میں اپنی آغوش وا کر دی۔ پھر احمد مختارؐ نے آپ کی آغوش کو مشک سے بھر دیا پھر حضورؐ نے حکم فرمایا "مالک اسے

اپنے بدن پر مل لے اور میری امت کو معطر کردے۔''

یہ خواب سن کر حضرت امام مالکؒ بہت دیر تک روتے رہے پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''خواب عمدہ ہے مگر دھوکے میں نہ پڑو۔ خدا اور رسولؐ کے احکام پر سختی سے عمل کرتے رہو'' اس کے بعد آپ اجنبی شخص سے مخاطب ہوئے۔ ''اگر تو نے اپنا خواب صحیح صحیح بیان کیا ہے تو یہ علم کی بشارت ہے جسے اللہ نے میرے پاس بطور امانت رکھا ہے۔''

مشہور عابد و زاہد بزرگ سہل ابن مزاحمؒ کا بیان ہے کہ جب میں حالِ خواب میں رسالت مآبؐ کے دیدار سے مشرف ہوا تو میں نے عرض کیا'' یا رسول اللہ! آپؐ کا خیر و برکت والا زمانہ تو گزر چکا ہے اگر ہمارے دل میں مذہبی امور کے تعلق کوئی شک و شبہ پیدا ہو تو کس شخص سے تحقیق کریں؟''

رسالت مآبؐ نے فرمایا۔ ''اگر تمہیں دین کے کاموں میں کوئی مشکل پیش آئے تو اسے مالک بن انسؒ سے دریافت کرو۔''

ایک دوسرے بزرگ ابو عبداللہؒ نے خواب میں پیغمبرِ اسلامؐ کو دیکھا کہ مسجد نبویؐ میں تشریف فرما ہیں اور آپ کے گرد انسانوں کا ایک حلقہ بندھا ہوا ہے، حضرت امام مالکؒ نبی آخرالزماں کے سامنے کھڑے ہیں اور آنحضرتؐ کے روبرو مشک کا ایک ڈھیر ہے۔ حضورؐ اس مشک کے انبار میں سے ہاتھ بھر بھر کر امام مالکؒ کو دے رہے ہیں اور امامؒ قریب کھڑے ہوئے جاں نثاروں پر مشک چھڑک رہے ہیں۔

جس کو دربارِ رسالتؐ میں یہ مقام حاصل ہو تم اس کی ظاہری... شان پر اعتراض کرتے ہو وہ کہ اس نے قیمتی پوشاک کیوں پہنی اور عمدہ غذا کیوں کھائی؟ حالانکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ اس کا کھانا بھی اللہ کیلئے تھا اور لباس بھی اللہ کے لئے۔ اگر تم صرف دنیاداری کی باتیں کرتے ہو تو وہ یمن کے خاندانِ شاہی قبیلہ حمیری کی شاخ اصبح سے تعلق رکھتا تھا قبولِ اسلام سے پہلے بھی خدا نے اس کے بزرگوں کو دینوی جاہ و حشم سے نوازا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد بھی خدا نے اسے دولت لازوال سے سرفراز کیا۔ یہ تو خدا کا اندازِ تقسیم ہے جسے جو چاہے عطا کرے۔ لوگ دربارِ خلافت کے چند تحائف اور طلائی سکوں کی بات کرتے ہیں۔

امامؒ کی مقدس زبان سے ادا ہونے والا ایک لفظ دنیا کے تمام خزانوں پر بھاری ہے۔

خلیفہ منصور مہدی اور ہارون رشید کے لیے یہی شرف کافی ہے کہ امامؒ نے ان کی نذر قبول کر لی۔ شاید وہ اپنے اسی ایک عمل سے بخشے جائیں ورنہ میدان حشر میں ان کا خدا حافظ ہے۔

☆☆☆



جس کی جلالتِ علمی پر رسالتؐ نے گواہی دی ہو' افسوس وہ بھی زمانے کی نکتہ چینیوں اور سازشوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اہلِ دنیا اپنے ترکشِ ستم میں جتنے بھی تیر رکھتے تھے سب کے سب امامؒ کے کشادہ سینے پر آزمائے گئے، امامؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مختصر ترین دورِ خلافت دیکھا تھا۔ اس وقت آپؒ کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی اس کم سنی میں امامؒ ابن عبدالعزیزؒ اور دوسرے خلفائے بنو اُمیّہ کا موازنہ تو نہیں کر سکتے تھے لیکن پھر بھی وہ خلیفۂ راشدؒ آپ کے معصوم ذہن پر گہرا اثر چھوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد خاندان بنو امیہ کے حکمرانوں نے زمین پر قیامت ڈھادی۔ جب وقت بدلا اور بنو عباس کا دور آیا تو لوگوں کو امید ہو چلی تھی کہ یہ انقلاب عوام کے لئے پرسکون زندگی کا پیغام لے کر آئے گا، مگر سفاح و منصور نقیبِ اجل تھے منصور کے عہد میں تو خود امامؒ کو بھی پُرآشوب صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ سینۂ حساس پر پہلے ہی زخموں کی گلکاریاں کیا کم تھیں کہ ابوحمزہ خارجی نے قلبِ امامؒ پر ایک اور نشتر چلایا جس کی تکلیف سے آپؒ رو پڑے۔ ابوحمزہ عہد شکنی کر کے مدینے میں داخل ہوا اور اس نے اہلِ قریش کا قتلِ عام کیا۔ یہاں تک کہ بے شمار عورتیں بھی ذبح کر دی گئیں۔ امامؒ نے اس مقدس سرزمین پر فتنہ و فساد کا بازار گرم دیکھا جہاں آپ کبھی اونٹ پر سوار نہیں ہوئے تھے۔ پھر اہلِ مدینہ کو خون میں نہائے ہوئے دیکھا جو نبی کریمؐ کے علم کے وارث تھے۔ ان تمام ہولناک مناظر نے امام مالکؒ کو بہت زیادہ متاثر کیا اور آپ تمام سیاسی تحریکوں سے کنارہ کش ہو گئے۔

امامؒ فطرتاً ایک صلح پسند انسان تھے اس لئے اصلاح کے طریقے کو پسند کرتے تھے۔ آپؒ نے نہ کسی کی حمایت کی اور نہ مخالفت کر کے لوگوں کو بھڑکایا۔ آپؒ عوام کی تعلیم و تربیت پر نظر رکھتے تھے کہ شاید اس طرح ہدایت یافتہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت تیار ہو جائے اور پھر وہ صحیح اسلامی انقلاب برپا ہو جس کی ایک لمحاتی جھلک عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ خلافت میں نظر آئی تھی۔ امامؒ نے اپنے طویل دورِ حیات میں بڑے صبر و تحمل سے کام کیا۔ بارہا لوگوں نے آپؒ کو بھی ان فتنوں میں کھینچنا چاہا مگر امامؒ آخر تک اپنا دامن بچاتے رہے۔ مفسدین کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ امامؒ بے شمار لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں اس لئے آپؒ کی ایک تقریر بھی وقت کے سیاست کدے میں آگ لگا سکتی تھی اور ایک مخصوص گروہ کو اس سے بڑا فائدہ ہو سکتا تھا۔ مگر امامؒ کے نزدیک اس عمل کا آخری نتیجہ خونریزی کے سوا کچھ نہ تھا۔ دونوں طرف سے مسلمانوں کا لہو بہتا جو پہلے ہی بہت ارزاں تھا۔ اس لئے امامؒ نے عصری سیاست میں ملوث ہونے سے گریز کیا اور اپنی درس گاہ کے ایک گوشے میں بیٹھ کر انسانی دل و دماغ پر چھائے ہوئے رنگ کو

دور کرنے لگے۔

کسی نے سیاسی فتنہ خیزیوں کے بارے میں حضرت امامؒ سے سوال کیا۔ ''کیا ان لوگوں سے جنگ کرنا جائز ہے؟''

امامؒ نے جواب فرمایا۔ ''اگر ان لوگوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے شخص کے خلاف بغاوت کی ہو۔''

سوال کرنے والے نے دوبارہ پوچھا۔ ''اگر ابن عبدالعزیزؒ جیسا حکمراں نہ ہو؟''

''تو پھر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔'' حضرت امامؒ نے جواب دیا۔ ''اللہ ظالم کے ذریعے ظالم سے بدلہ لیتا ہے پھر دونوں سے بدلہ لیتا ہے۔''

حضرت امامؒ کے جواب کی وضاحت یہ ہے کہ اگر کوئی حکمراں عمر بن عبدالعزیزؒ جیسا پرہیز گار منصب مزاج اور قانونِ شرع کا جاری کرنے والا ہو تو اس کی حمایت میں لڑنا چاہیئے ورنہ ان لوگوں کو چھوڑ دینا چاہیئے تا کہ وہ اپنی نافرمانیوں میں بھٹکتے رہیں۔

یہی وہ اندازِ فکر تھا جس نے امامؒ کو وقت کے تمام فتنوں سے دور رکھا۔ پھر بھی کچھ شقی القلب حکمرانوں اور تنگ نظر عالموں نے امامؒ کے چاروں طرف سازش کا حصار کھینچ دیا تھا۔ نتیجتاً آپؒ کی شدید جسمانی اور روحانی اذیتیں پہنچائی گئیں لیکن امامؒ نے بڑے حوصلے سے ان آفات ومصائب پر صبر کیا۔

یہ امامؒ کے صبر وتحمل ہی کا اثر تھا کہ منصور جیسے جابر حکمراں نے آپ سے معذرت طلب کی اور ایک موقع پر اس انداز کا خط لکھا۔

''عاملِ مکہ یا عاملِ مدینہ کے متعلق آپ کی رائے بے حد ضروری ہے اس طرح میں حجاز کے حاکموں کے بارے میں بھی آپ کی رائے کا احترام کروں گا۔ اگر کوئی حاکم آپ کو یا رعایا میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائے تو مجھے لکھیے۔ میں اس کے ساتھ وہی سلوک کروں کا جس کا وہ مستحق ہوگا۔''

جو لوگ تاریخ کے عمل کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ ضرور اس بات کا اعتراف کریں گے کہ امام مالکؒ کی موجودگی نے منصور کی بے راہ روی کی محدود کر دیا تھا۔ اگر امامؒ نہ ہوتے تو عین ممکن تھا کہ منصور قبائے انسانیت چاک کر کے لباسِ آدم سے بے نیاز ہو جاتا اور پھر ہمیں وحشت و بربریت کی شدت بیان کرنے کے لئے چنگیز اور ہلاکو کے حوالے پیش نہ کرنا پڑتے۔ یہ امام مالکؒ کا انسانیت پر احسانِ عظیم ہے کہ آپ نے بے پناہ اذیتیں برداشت کر کے ظلم کو اس کے خول میں محصور رکھا۔ پھر مہدی اور ہارون



رشید کا دور آیا تو امامؒ نے اپنے علم و کردار سے ان دونوں کے دل و دماغ کو پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ امامؒ کا اہلِ زمین پر دوسرا احسان ہے۔ دنیا کو مہدی اور...... ہارون رشید کے کرداروں میں جس قدر بھی شرافت و دیانت نظر آتی ہے وہ امامؒ ہی کا فیضان نظر تھا...... اگر اس کرۂ ارضی پر امامؒ کی شانِ جلالی کا پرتو نہ پڑتا تو مہدی و ہارون بھی خلفائے سابقین کی قبریں کھود کر ان کی ہڈیاں جلا رہے ہوتے۔ یہ امامؒ ہی کا عکس ذات تھا کہ جس نے مہدی و ہارون کی تربیت کی۔ ورنہ خلافتِ عباسیہ کے بانیوں نے اپنے وارثوں کے لئے کوئی ضابطۂ اخلاق نہیں چھوڑا تھا۔

☆☆☆

اپنی ان ہی عظیم الشان قربانیوں کے باعث امام مالک بن انسؒ محبوب خلائق ہو گئے تھے اور لوگ قطار در قطار آپ کی مجلسِ درس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ مشہور روایت ہے کہ آپ کے دروازے سے زیادہ کسی دروازے پر علم حاصل کرنے والوں کا ہجوم نہیں ہوتا تھا۔ حج کے زمانے میں تو انسانوں کی تعداد کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بادشاہوں کی طرف آپ کے دروازے پر بھی سنتری موجود رہتے تھے۔ جن کا ایک ہی کام ہوتا تھا کہ وہ اس مجمع عظیم کو قابو میں رکھ سکیں اور کسی طرح کا انتشار نہ پھیلنے پائے۔ شاگردوں کی ایک جماعت بھی نظم ونسق سنبھالنے کے کام پر مامور رہتی تھی۔ بعض کتابوں میں درج ہے کہ امام مالکؒ کے یہاں ایک قید خانہ بھی تھا۔ جو شخص بے اصول ہوتا اسے قید کر لیا جاتا۔ اگر کسی کے بارے میں کہا جاتا کہ اس نے غلط حدیث بیان کی ہے تو اسے قید کر لیا جاتا۔ جب حضرت امامؒ سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا جاتا تو آپؒ فرماتے۔ ''اس نے جو کچھ کہا ہے اس کی تصحیح کر لے پھر چلا جائے۔'' حج کے زمانے میں درس کے آداب بھی بدل جاتے تھے۔ امامؒ دربان کو حکم دیتے کہ پہلے اہل مدینہ کو آنے دیں کہ یہ لوگ ہر موسم میں شریک درس رہتے ہیں۔ اس کے بعد عام لوگوں کو اندر آنے کی اجازت ہوتی۔

پھر اچانک نظامِ درس میں ایک بڑا انقلاب آ گیا لوگوں نے دیکھا کہ ان کے امامؒ نے مسجد میں آنا چھوڑ دیا ہے۔ عقیدت مندوں کے ہجوم میں شدید اضطراب پھیل گیا۔ اس سلسلے میں کسی نے امامؒ سے سوال کیا تو فرمایا ''اب بوڑھا ہو چکا ہوں' جسمانی نقاہت گھر سے نکلنے نہیں دیتی''۔ اس فطری مجبوری کے باوجود درس کا سلسلہ جاری رہا۔ تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھانے کے لئے امامؒ کے گھر پر حاضر ہوتے۔ اگر چہ آفتاب میں وہ اگلی سی حدت باقی نہیں رہی تھی لیکن روشنی کا سفر پھر بھی جاری تھا۔ اس طرح امامؒ نے کئی سال

تک لوگوں میں دولتِ علم تقسیم کی۔صرف جمعے کے روز مسجد نبویؐ میں تشریف لے جاتے۔انسانی ہجوم امامؒ کے گرد سمٹ آتا۔آپ حاضرین کو چند نصیحتیں کرتے اور گھر واپس چلے آتے۔حسد کرنے والوں کو اب بھی قرار نہیں تھا کہنے والے کہتے ''ایسی بھی کیا ناتوانی کہ آدمی مسجد نبویؐ چھوڑ کر گھر پر بیٹھ رہے۔'' دل آزاری کی یہ باتیں امامؒ کے کانوں تک بھی پہنچیں مگر آپؒ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتے ''لوگوں کو کیا معلوم کہ ہر شخص اپنی مجبوریاں بیان کرنے پر قادر نہیں ہے۔'' امامؒ کا یہ طرزِ گفتگو بڑا معنی خیز تھا مگر کوئی بھی آپؒ کے الفاظ میں چھپے ہوئے کرب کو نہ پہچان سکا۔مخالفین کے اعتراضات کا یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔لیکن امامؒ نے اپنی ذات سے متعلق کسی بات کا جواب نہیں دیا۔

یہاں تک کہ ناتوانی آپ کی مسند درس سے اٹھا کر بسترِ علالت پر لے گئی۔شاگردوں اور عقیدت مندوں نے تیمارداری کا حق ادا کر دیا مگر بیماری مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔انجام کار طبیبوں نے جواب دے دیا اور چارہ گر مایوس ہو گئے۔امامؒ کی علالت کو اکیس دن گزر چکے تھے۔اس دوران علالت کی خبر دور دور تک پھیل گئی تھی۔مدینہ اور دوسرے شہروں کے بڑے بڑے علماء آخری لمحات میں امام مالکؒ کو دیکھنے کے لئے بے چین تھے مشہور بزرگ یحییٰ بن یحییٰؒ کا بیان ہے۔''اس وقت امامؒ کے گرد ایک سو تین فقیہہ اور عالم اداس کھڑے تھے۔میں بار بار امامؒ کے سامنے جاتا اور سلام عرض کرتا' میری خواہش تھی کہ الوداعی ساعتوں میں کس طرح امامؒ مجھے ایک نظر دیکھ لیں اور پھر یہی نگاہِ کرم آخرت میں میرے لئے وسیلہ بن جائے۔''

اچانک امامؒ نے آنکھیں کھولیں اور تمام عزیز و اقارب اور شاگردانِ خاص کو اپنے قریب طلب کیا۔لوگوں کا خیال تھا کہ امامؒ کوئی وصیت کرنا چاہتے ہیں حاضرین گوش بر آواز ہو گئے ہر شخص امامِ مدینہؒ کے آخری الفاظ کے لئے بے قرار تھا' در و دیوار ساکت تھے اور لوگوں کو محسوس ہو رہا تھا جیسے نبضِ کائنات تھم گئی ہو۔

امامؒ نے اپنے اطراف میں جمع ہونے والے غمخواروں کو دیکھا اور پھر نحیف مگر باوقار آواز میں فرمایا ''اللہ کا شکر ہے کہ جس نے مجھے کبھی ہنسایا اور کبھی رلایا میں اسی کے حکم سے زندہ رہا اور اسی کی مرضی سے جان دے رہا ہوں۔مجھے یقین ہے کہ میں آج تم لوگوں سے رخصت ہو کر اپنے رب کے حضور چلا جاؤں گا۔اگر میرا آخری وقت نہ آتا تو میں ہرگز تم پر اپنا یہ راز ظاہر نہ کرتا کہ میں کئی سال سے پیشاب نکل جانے کے مرض میں مبتلا ہوں مجھے کسی طرح بھی گوارا نہ تھا کہ وضو کے بغیر اپنے آقا کی مسجد میں قدم



رکھوں۔اور مجھے اس بات سے بھی شرم آتی تھی کہ لوگوں کو بیماری کا حال بتا کر اپنے اللہ کی شکایت کروں''

یہ کہہ کر امامؒ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر ہونٹ پھر بھی لرز رہے تھے۔آپ کے شاگرد مطرفؒ نے کان لگا کر سنا۔امامؒ بہت آہستہ آواز میں کہہ رہے تھے۔

''اے جہانوں کے پالنے والے! تیرا احسانِ عظیم ہے کہ تو نے اپنے گناہگار بندے مالک بن انسؒ کو خاکِ مدینہ سے اٹھایا اور خاکِ مدینہ میں ملا دیا۔'' پھر لبِ مقدس کی جنبش ختم ہو گئی علم اور تقوے کا سورج اُس سمندر میں اتر گیا جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

صبرِ ایوبؑ بھی عشق تھا صبر حسینؓ بھی عشق تھا۔اور صبر مالکؒ بھی عشق تھا مگر حسبِ مراتب عشق کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔امامؒ ساری زندگی اہلِ دنیا کی الزام تراشیوں پر صبر کرتے رہے اور جب آپؒ نے آخری لمحات میں اپنی مجبوریاں بیان کیں تو دشمن بھی رو پڑے۔اہلِ دل کی تو حالت ہی غیر تھی۔اتنا روئے کہ دامن بھیگ گئے اور اشکوں کا رنگ پیازی ہو گیا۔

پھر کسی نے امامؒ کے جنازے پر قولِ رسولؐ کی تلاوت کی ''عنقریب لوگ علم کی طلب میں سفر کر کے اونٹوں کے جگر پگھلا دیں گے' پھر بھی انہیں عالمِ مدینہ سے بہتر کوئی عالم نہ مل سکے گا۔''

حدیثِ رسولؐ سن کر اماموں کے سر جھک گئے' فقیہوں کی گردنیں خم ہو گئیں اور عالموں نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔بے شک امامِ مدینہ ایسے ہی تھے۔

انتقال کے وقت امامؒ کی عمر چھیاسی سال تھی۔آپ کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

صاحبِ موطا کو موت آ گئی مگر موطا کا ایک ایک حرف قیامت تک زندہ رہے گا۔یہ حدیث کی وہ عظیم و جلیل کتاب ہے جسے قرآن کریم کے بعد دوسرا درجہ حاصل ہے۔جب امامؒ نے موطا کی تصنیف کا کام شروع کیا تو دوسرے علماء نے بھی آپؒ کی تقلید کی۔بعض احباب نے اس طرح اشارہ کرتے ہوئے امامؒ سے کہا۔''اس طرز کی اور بھی کتابیں لکھی جا رہی ہیں پھر آپ کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں؟''

امامؒ نے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ''بہت جلد لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ کس کا کام محض اللہ کے لئے ہے۔''

آخر کئی سال کی شدید محنت کے بعد امامؒ موطا کی تصنیف سے فارغ ہوئے۔پھر آپؒ نے اپنا خلوص ثابت کرنے کے لئے مسعودے کے تمام اوراق پانی میں ڈال دیے اور فرمایا ''اگر ان اوراق میں سے ایک بھی نم ہو جائے تو مجھے اس کی حاجت نہیں۔''

یہ قدرت کی طرف سے امامؒ کے خلوص نیت کا صلہ تھا کہ پانی میں ڈالنے کے باوجود ایک بھی ورق نہیں بھیگا اور ساری دنیا پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ امامؒ کا ذہن اور قلم محض اللہ ہی کے لئے ہیں۔

تمام محدثین میں تنہا امام مالکؒ کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپؒ نے صرف بلند پایہ علماء سے احادیث روایت کی ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا احتیاط ہوگی کہ خادم رسولؐ ہوتے ہوئے بھی امامؒ نے اپنے والد محترم حضرت انسؒ کی کسی روایت کو موطا میں جگہ نہیں دی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے اگر اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

☆☆☆



# سفیرِ رسول

## امام شافعیؒ

### مکہ۔ ۱۵۰ھ

وہ دن اہلِ بغداد کی زندگی میں ایک ناقابلِ فراموش دن تھا۔ لوگ اپنے روزانہ کے معمولات میں حسبِ سابق الجھے ہوئے تھے۔ بظاہر کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا تھا جو عوام الناس کے دل و دماغ پر ناخوشگوار اثر چھوڑ جاتا۔ لیکن پھر بھی اکثر لوگ اداس نظر آ رہے تھے۔ کوئی ان سے اس کی وجہ پوچھتا تو وہ بیان کرنے سے عاجز رہتے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ کسی اور کا تو ذکر ہی کیا، خود بغداد کے مشہور مفسرِ قرآن حضرت مقاتل بن سلیمانؒ بھی صبح سے بہت اداس تھے۔ نمازِ فجر کے بعد شاگردوں کی ایک کثیر تعداد حصولِ علم کے لیے درس گاہ میں حاضر ہوئی مگر آپ نے ان تمام لوگوں سے یہ کہہ کر معذرت طلب کر لی کہ آج اس طرف طبیعت راغب نہیں ہے۔ شاگردوں کو استاد کے طرزِ عمل پر شدید حیرت تھی لیکن طلباء کی یہ جماعت چپ چاپ اپنے گھروں کو چلی گئی اور حضرت مقاتلؒ آرام کرنے کے لیے اپنی خواب گاہ میں تشریف لے گئے۔ زوجہ محترمہ نے مزاج پرسی کی تو حضرت مقاتلؒ نے فرمایا۔ "آج کسی کام

میں دل نہیں لگتا۔'' شریکِ حیات آپ کے اس جواب سے یوں مطمئن ہو گئیں کہ سخت محنت و ریاضت کے بعد ان کے شوہر کو آرام کی ضرورت تھی۔ مگر جو لوگ حضرت مقاتلؒ کے مزاج آشنا تھے وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ نے ناسازیٔ طبع کے باوجود آج تک درس کا سلسلہ منقطع نہیں کیا تھا۔ پھر ایک مفسرِ قرآن کی یہ گوشہ نشینی کیوں تھی؟ زوجہ محترمہ سے لے کر شاگردوں اور دوستوں تک کوئی بھی اس تغیر کا سبب نہیں جانتا تھا۔ انتہا یہ کہ خود حضرت مقاتل بن سلیمانؒ بھی اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

دن اپنی رفتار کے مطابق گزرتا رہا۔ پھر ظہر کا وقت آ گیا۔ حضرت مقاتلؒ نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں چلے گئے۔ موذن نے اہلِ زمین کو صدا دی۔ ''آؤ بھلائی کی طرف۔'' جو فلاح و خیر کے طالب تھے وہ اپنے کاروبارِ حیات کو معطل کر کے خدا کے گھر میں داخل ہو گئے۔ حضرت مقاتلؒ نے آنے والوں کو غور سے دیکھا۔ آج لوگوں کے چہروں پر وہ رونق نہیں تھی جسے زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بیشتر افراد پریشان سے نظر آ رہے تھے۔ نماز کے بعد کچھ اہلِ علم حضرات نے موسم کی ناخوشگواری اور دن کی گرانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''آج کی ساعتیں ناگوار اور لمحات بوجھل ہیں۔''

حضرت مقاتل بن سلیمانؒ یہ سن کر خاموش نہ رہ سکے۔ آپ نے وقت کی شکایت کرنے والوں سے فرمایا۔ ''کوئی ساعت گراں اور کوئی لمحہ ناخوشگوار نہیں ہوتا۔ یہ صرف انسانی محسوسات ہیں۔ وقت خدا کا پیدا کیا ہوا ہے اس لیے وقت کا شکوہ کرنے والے ناخوشگواری کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔''

حضرت مقاتلؒ ایک عالم دین تھے۔ آپ نے مذہب کی روشنی میں وقت کی توجیہہ کی اور اہلِ ایمان کو مادہ پرستوں کی طرح بے سروپا باتیں کرنے سے باز رکھا۔ لوگ حضرت مقاتلؒ کی تاویل سن کر خاموش تو ہو گئے تھے مگر ان کی قلبی کیفیات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہی نامعلوم اداسی، وہی انجان سوگواری۔ کیفیات، زبان کی گرفت سے آزاد۔ اور جذبے، الفاظ کا لباس پہننے سے محروم۔ لوگ آتے رہے اور اپنے خالق کے حضور رسمِ بندگی ادا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ عصر اور مغرب کی نمازیں بھی ختم ہو گئیں لیکن دلوں کی وہی افسردگی، ذہنوں کی وہی گراں باری اپنی جگہ قائم تھی۔

پھر سورج چھپا تو کائنات پر اندھیرے مسلط ہو گئے۔ اہلِ بغداد کے لیے شب کی تاریکی اور بھی ہولناک تھی۔ اگر عام لوگ اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کی قدرت رکھتے تو وہ برملا کہہ دیتے کہ ان کے دل ڈوبتے جا رہے ہیں۔ بندگانِ خدا ایک عجیب کیفیت سے دوچار تھے مگر ان کے پاس ذریعۂ اظہار نہیں تھا کہ وہ دوسروں کے روبرو اپنی شدتِ احساس کو بیان کر سکتے اور جو اہلِ نظر تھے انہیں صاف محسوس ہو رہا تھا



کہ جیسے آسمان سے اداسیوں کی بارش ہو رہی ہے، پوری کائنات سوگوار ہے اور ہر شے نے ماتمی لباس پہن لیا ہے ایک بزرگ نے کہا۔ ''مجھے تو پتھر، درخت، جانور سبھی فریاد کرتے نظر آتے ہیں۔ خود میرا دل بھی چاہتا ہے کہ مسلسل روتا رہوں۔ یہاں تک کہ دامن بھیگ جائے اور ذہن و دل کا سارا غبار دھل جائے۔''

دوسرے بزرگ نے اپنے محسوسات کو اس طرح بیان کیا تھا۔ ''یہ اداسی بے سبب نہیں ہے۔ پردہ غیب سے کچھ نہ کچھ ظاہر ہونے والا ہے۔ خدا کی رحمت ہم پر سایہ فگن رہے۔''

ان بزرگ کی باتوں پر کسی مخالف نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب توہم پرستی ہے۔ دل کو اداسی اور ذہن کی پریشانی کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے۔ ہمارے دل قبل از وقت کسی حادثے کا احساس نہیں کر سکتے اور آنکھیں نادیدہ مناظر پر گواہی نہیں دے سکتیں۔''

بزرگ نے جواباً فرمایا تھا۔ ''جب حیوان تک نزولِ آفات کا ادراک کر لیتے ہیں تو پورا انسانی شعور و احساسات کی حدیں کون متعین کر سکتا ہے؟''

غرض وہ عجیب رات تھی۔ اہلِ بغداد مضطرب تھے مگر انہیں اپنے اضطراب کا سبب معلوم نہیں تھا۔

حضرت مقاتل بن سلیمانؒ نے نمازِ عشاء ادا کی اور کچھ دیر تک اوراد و وظائف میں مشغول رہے۔ پھر آپ سونے کے لیے اپنے بستر پر چلے گئے۔ ابھی نیند کے عالم میں حضرت مقاتلؒ نے چند ساعتیں ہی گزاری ہوں گی کہ شدتِ خوف سے آپ کی آنکھ کھل گئی۔ بیداری کا سبب وہ پرہول خواب تھا جسے دیکھنے کے بعد حضرت مقاتلؒ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکتے تھے۔ وہ ایک دہشت ناک منظر تھا جس کے اثر سے کچھ دیر کے لیے آپ کی قوتِ گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر نیند کا خمار کچھ کم ہوا اور اعصاب کسی قدر بحال ہوئے تو ذہن کی سطح پر وہ جانگداز منظر دوبارہ ابھرنے لگا۔ حضرت مقاتل بن سلیمانؒ اپنا خواب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''میں نے دیکھا کہ میں ایک مقام پر تنہا کھڑا ہوں اور میری نظروں کے سامنے بغداد کی بلند ترین عمارت ہے۔ ناگہاں آسمان پر اتنی تیز روشنی ہوئی کہ میں چونک اٹھا۔ وہ ایک بکھری ہوئی روشنی تھی۔ جو نظر کی آخری حد تک آسمان پر محیط تھی۔ پھر وہ روشنی آہستہ آہستہ سمٹنا شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک نورانی پیکر میں تبدیل ہو گئی۔ اب وہ نورانی پیکر آسمانی بلندیوں سے زمین کی طرف آ رہا تھا۔ بظاہر یوں لگتا تھا جیسے کوئی ستارہ ٹوٹ کر نیچے گر رہا ہو مگر جب فاصلے کم ہوئے تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ بزمِ فلک سے جدا ہونے والا

کوئی ستارہ نہیں تھا، ایک نورانی ہیولی تھا جو درمیانی رفتار سے زمین کی جانب سفر کر رہا تھا۔ آج تک میری آنکھیں ایسے کسی منظر سے ناآشنا رہی تھیں اس لیے میں حیرت و استعجاب میں ڈوبا ہوا روشنی کے سفر کو دیکھتا رہا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ بالآخر یہ روشنی زمین کے قریب آ گئی۔ وہ چمک جو آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی اچانک ختم ہو گئی اور مجھ پر ایک خوف سا طاری ہونے لگا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ سفید لباس پہنے ہوئے ایک دراز قامت انسان تھا جو آسمان سے زمین تک کا طویل سفر کر کے عمارت کے مینار پر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اجنبی شخص کے نقش و نگار دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر اس کے چہرے پر ہیبت و جلال نے ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ میری نگاہ عاجز ہو کر خود بخود جھک جاتی تھی۔ میں نے اس سفید پوش انسان کو اچٹتی نظر سے دیکھا۔ وہ چند لمحوں تک مینارے پر ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے بغداد کے اطراف پر اس طرح نظر ڈالی جیسے وہ شہر کی آبادی کا جائزہ لے رہا ہو۔ عجیب سناٹے کا عالم تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر شے زندگی کی حرارت سے محروم ہو گئی ہو۔ ناگہاں سفید پوش کے جسم کو حرکت ہوئی اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ ''اہل زمین ہلاک ہو گئے۔،، سفید پوشوں کی آواز ابھری۔ آواز کیا تھی۔ صور اسرافیل کا گمان ہوتا تھا۔ میری روح لرزنے لگی اور پھر یوں لگا جیسے میرے جسم کے ساتھ بغداد کے در و دیوار بھی کانپ رہے ہوں۔ سفید پوش کے ہونٹوں کو دوبارہ جنبش ہوئی ''اہل زمین ہلاک ہو گئے۔،، لفظوں کی گونج بہت دیر تک باقی رہی مگر اس کا نورانی جسم تیزی سے بلند ہوا اور فلک کی لامحدود وسعتوں میں گم ہو گیا''۔ یہ تھا وہ عجیب غریب خواب جس کی دہشت سے حضرت مقاتلؒ کو آنکھ کھل گئی تھی۔

نیند سے بیدار ہونے کے بعد حضرت مقاتل بن سلیمانؒ رات بھر نہیں سو سکے۔ آپ بار بار اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے تھے۔ ''اہل زمین کی ہلاکت کی خبر دینے والا فرشتہ تھا یا کوئی مردِ غیب؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے اسی کے پاس زمین آسمان کی کنجیاں ہیں۔ مجھے خواب کی تعبیر کا علم نہیں مگر میری وحشت پتہ دیتی ہے کہ عنقریب مخلوق خدا کسی سانحہ عظیم سے دوچار ہونے والی ہے۔ کوئی زلزلہ آئے گا یا طوفان باد و باراں انسانی سروں سے گزرے گا، کسی کو کچھ خبر نہیں''۔

حضرت مقاتلؒ کے ذہن پر خواب کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ آپ تمام شب اپنے خدا کے حضور گریہ وزاری کرتے رہے۔ اپنے لیے، گھر والوں کے لیے، اہلِ شہر کے لیے اور ملتِ اسلامیہ کے لیے بڑے دردناک لہجے میں دعائیں مانگتے رہے۔ یہاں تک کہ قریب کی مسجد سے موذن کی آواز سنائی



دی۔ ''آؤ بھلائی کی طرف۔ نماز، نیند سے بہتر ہے۔،، حضرت مقاتلؒ مصلے سے اٹھے اور نمازِ فجر ادا کرنے کے لیے مسجد چلے گئے۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت مقاتلؒ بن سلیمان نے حاضرین کے سامنے اپنا خواب بیان فرمایا اور پھر اس بات کا اندیشہ ظاہر کیا کہ اہلِ بغداد کسی سخت آزمائش سے گزرنے والے ہیں یا مملکتِ اسلامیہ کسی صدمے سے دوچار ہونے والی ہے۔ حضرت مقاتلؒ ایک صاحبِ کردار عالم تھے اس لیے آپ کے خواب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حاضرین پریشان سے نظر آنے لگے۔ حضرت مقاتلؒ نے لوگوں کی اضطرابی کیفیت دیکھ کر فرمایا۔ ''خواب بیان کرنے سے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ میں تمھاری پرسکون زندگی کو انتشار میں مبتلا کر دوں۔ یہ ایک خبر ہے جو بندگان خدا تک پہنچائی جا رہی ہے تاکہ لوگ طوفان آنے سے پہلے اپنے رب کی پناہ مانگیں۔ نزول عذاب کے وقت توبہ کارگر نہیں ہوتی۔ اس سے پہلے کہ زمین پر آسمانی بلائیں ٹوٹ پڑیں، لوگوں کو چاہیے کہ وہ خدا کے آگے سجدہ ریز ہو جائیں اور اس سے مغفرت طلب کریں۔ اگر ''وقتِ معلوم،، سروں پر آ پہنچا تو پھر کوئی پناہ گاہ باقی نہیں رہے گی''۔ حضرت مقاتلؒ بہت دیر تک حاضرین کو استغفار کی تلقین کرتے رہے اور پھر مسجد سے اٹھ کر گھر تشریف لے آئے۔

سورج نکل آیا تھا مگر اہلِ دل کے لیے آج کی صبح، اندھیری رات سے بھی زیادہ تاریک تھی۔ اچانک بغداد میں کہرام برپا ہو گیا۔ لوگ چیختے ہوئے گھروں سے نکل آئے تھے اور شہر کی بڑی شاہراہوں پر جمع ہو رہے تھے۔ جابرِ وقت نے انسانیت کی شہ رگ کاٹ دی تھی۔ اسلام میں شورِ گریہ وزاری حرام ہے لیکن آج لوگوں کو اپنے جذبوں پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ وہ کوچہ در کوچہ اس طرح چیختے پھر رہے تھے جیسے ان کا سرمایۂ حیات لٹ گیا ہو۔ انسانی شور سن کر حضرت مقاتل بن سلیمانؒ بھی مکان سے باہر تشریف لے آئے۔

کسی نے پکار کر کہا۔ ''رات امام اعظم ابوحنیفہؒ انتقال کر گئے''۔

یہ جان گداز خبر سن کر حضرت مقاتلؒ کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر امامؒ کی عظیم و جلیل شخصیت یاد آئی تو آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ سننے والوں نے سنا۔ آپ بار بار فرماتے تھے۔ ''بے شک اہلِ زمین ہلاک ہو گئے''۔

حضرت مقاتل بن سلیمانؒ نے گزشتہ رات جو خواب دیکھا تھا۔ اس کی المناک تعبیر یہی تھی۔ ایک حضرت مقاتلؒ ہی نہیں، کچھ اور اہل دل بھی اس رات کی سنگینی کو محسوس کر رہے تھے۔ بعض بزرگوں کا بیان ہے کہ

وہ رات عام راتوں سے اتنی مختلف تھی کہ انھیں قبل از وقت کسی بڑے حادثے کا یقین ہو گیا تھا۔ کچھ برگزیدہ ہستیوں کو خواب کے ذریعے امامؒ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کی خبر دی گئی تھی اور کچھ صاحبانِ نظر بیداری کی حالت میں کرۂ ارضی پر نازل ہوتی ہوئی اداسیوں کو دیکھ رہے تھے۔

جس رات خلیفہ منصور نے حضرت ابو حنیفہؒ کو زہر دیا تھا۔ وہ رات تاریخ کے دل پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک بزرگ جو اس واقعے کے بعد برسوں تک زندہ رہے، اکثر فرمایا کرتے تھے۔ ''اے ماہِ رجب کی سیاہ رات تو مجھے آخری سانس تک یاد رہے گی جب ہم سے ہمارا امامؒ بچھڑ گیا اور ظلم و جہل نے اہلِ طلب پر علم کا دروازہ بند کر دیا۔''

امامِ اعظم کے لیے لکھے ہوئے اہلِ دل کے مرثیے، شدتِ غم میں ڈوبے ہوئے یہ بیانات، آتشِ فراق میں جلتے ہوئے یہ جذبات اپنی جگہ درست۔ مگر شاید انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ جس رات کے آغاز میں حضرت ابو حنیفہؒ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے، اسی سیاہ ذات کے آخری حصے میں بغداد سے بہت دور، بیت المقدس سے قریب، خاندانِ قریش کے ایک محترم گھرانے میں ایک خوبصورت بچے کی پیدائش ہوئی تھی۔ ماہِ رجب کی اس رات کا ایک حصہ سیاہ تھا اور دوسرا روشن۔ یہی نظامِ قدرت ہے۔ علم کا ایک دروازہ بند ہوا تھا اور دوسرا کھول دیا گیا تھا۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اصولِ فطرت کے مطابق اس بچے کو بہت پہلے پیدا ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ اس وقت تک دنیا میں نہیں آیا جب تک امامِ اعظمؒ رخصت نہیں ہو گئے۔ کون جانے کہ یہ راز کیا تھا؟

پھر وہی بچہ تیرہ سال کی عمر میں، محرابِ حرم کے نیچے کھڑا ہوا لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ ''اے شام والو! اے عراق والو! جو کچھ مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو، پوچھ لو۔'' بڑی سحر انگیز آواز تھی۔ اہلِ علم کے چلتے ہوئے قافلے رک گئے۔ دیکھنے والوں نے اس بچے کی طرف بہت غور سے دیکھا۔ کیا عمر تھی اور کیا دعویٰ تھا؟ لوگوں کو کم سنی کے اس دعوے پر یقین نہیں آیا۔ جن کے بازو علم کے سمندر میں شناوری کرتے کرتے شل ہو گئے تھے اور جن کے پاؤں تحقیق کے کوچے میں چلتے چلتے آبلوں سے بھر گئے تھے، وہ اہلِ کمال یہ آواز سن کر ٹھہر گئے۔ پھر اس بچے پر سوالات کی بارش کر دی گئی مگر وہ بڑے اعتماد سے جواب دیتا رہا۔ عقل سربہ گریباں تھی اور بڑے بڑے جہاندیدہ، آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ ''کیا یہ بھی ممکن ہے؟'' جو صاف باطن تھے وہ بچے کو درازیٔ عمر کی دعائیں دے کر چلے گئے تھے۔ مگر جن کے سینوں میں حسد کا غبار تھا ان کے دل پہلے سے زیادہ کثیف ہو گئے تھے۔ وسوسوں نے ان کے دماغوں



کو گھیر لیا تھا اور اندیشے مسلسل پریشان کر رہے تھے۔ ان کی نام نہاد ''اماموں'' کا مستقبل اس ذہین بچے کے علمی کمالات کی زد میں تھا، اس لیے وہ اس کے نسب نامے پر اعتراض کرنے لگے۔ جب وہ لفظوں کی کرشمہ سازیوں اور بات کی گہرائیوں کا جواب نہ دے سکے تو پھر اسے غلام زادہ کہہ کر پکارنے لگے۔ یہ جذبات کی تسکین کا کیسا انداز تھا کہ لوگ تہمتیں تراشتے ہوئے خدا سے نہیں ڈرتے تھے۔ علم کے میدان میں شکست کھائی تو نسلی غرور کا سہارا لیا۔ مگر وہ بچہ ان تمام باتوں سے بے نیاز تھا۔ لوگوں کی تنقید بے جا نے اسے مزید استقامت بخشی۔ یہ تو ہجوم کو دیکھ کر ڈر جانے کی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں تو بچوں کی زبان سے الفاظ بھی ادا نہیں ہوتے لیکن اس کے اعتماد میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ آواز پہلے سے زیادہ دل نشین اور بلند ہو گئی تھی۔

وہ اسی مسحور کن لہجے میں بول رہا تھا۔ ''اے شام والو! اے عراق والو! جو کچھ مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو، پوچھ لو۔''

پھر ایک دن اس بچے کی تقریر سننے کے لیے فقیہوں اور محدثوں کے قلندر حضرت سفیان ثوریؒ بھی تشریف لائے۔ اس مردِ آزاد کو آتا دیکھ کر ہجوم میں ہلچل سی مچ گئی۔ لوگوں نے امامؒ کے لیے راستہ بنا دیا۔ حضرت سفیان ثوریؒ آگے بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ آپ اس جگہ پہنچ کر ٹھہر گئے جہاں قریش کا وہ عظیم بچہ علم کے منبر پر کھڑا ہوا تقریر کر رہا تھا۔ حاضرین نے اپنی نشستیں چھوڑ دیں کہ امامؒ بیٹھ جائیں مگر حضرت سفیانؒ علم کے احترام میں کھڑا رہے۔ فرزندِ قریش کی زبان سے فصاحت و بلاغت کا آبشار جاری تھا لہجے کے گداز سے لوگوں کے دل پگھلے جاتے تھے۔

آخر امام سفیان ثوریؒ نے بے قرار ہو کر فرمایا۔ ''خدا کی قسم! اگر انسانی عقل کا وزن کیا جائے تو نصف دنیا کی عقل پر اس بچے کی عقل بھاری ہو گی۔'' مردِ قلندر نے فرزندِ قریش کی فضیلت پر اس طرح گواہی دی کہ لوگوں کی گردنیں خم ہو گئیں۔

یہ نابغۂ روزگار بچہ حضرت امام شافعیؒ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟

حضرت امام شافعیؒ ماہ رجب ۱۵۰ھ کی اس رات کے آخری حصے میں پیدا ہوئے جس رات کی ابتدائی ساعتوں میں امامِ اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کا وصال ہوا تھا۔ عام لوگوں کے لیے کسی کی پیدائش اہم ہے نہ موت۔ وہ تو زندگی کا صرف ایک ہی مفہوم سمجھتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے۔ مگر اہلِ نظر دنیا کو سرسری انداز سے دیکھتے ہوئے نہیں گزرتے، وہ ہر شے کا بغور مشاہدہ کرتے

ہیں۔ایسے ہی اہل نظر کے لیے اس رات میں بڑی نشانیاں تھیں۔جب فقہ کا سب سے بڑا امامؒ دنیا سے رخصت ہو رہا تھا اور دوسرا بڑا امامؒ کائناتِ ارضی میں سانس لے رہا تھا۔اس ایک رات میں دو بڑے واقعات کی یکجائی بے سبب نہیں تھی۔جو لوگ اس راز کو نہیں سمجھتے وہ دراصل قادرِ مطلق کی صفتِ خلاقی سے ناواقف ہیں۔حضرت امام شافعیؒ کو امام اعظمؒ سے ایک نسبت خاص ہے۔مسلمانوں کے ان دونوں اماموں کا شمار دنیا کے ذہین ترین افراد میں ہوتا ہے اور یہ اعزاز اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک اس زمین پر قیامت نازل نہیں ہو جاتی۔بعض عارفوں نے امامِ اعظمؒ کی رخصت اور امام شافعیؒ کی آمد پر اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے۔

''خدائے کریم، عقل و فراست کے باب کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔جب کاتبِ ازل نے ابوحنیفہؒ کے نام پر خطِ تنسیخ پھیرا تو دوسرے ورق پر امام شافعیؒ کا اسمِ گرامی تحریر کر دیا گیا۔یہی وجہ ہے کہ ماہِ رجب کی ایک ہی رات میں تاریخِ اسلام کے دو بڑے واقعات رونما ہوئے۔''

برصغیر پاک و ہند کے مشہور بزرگ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ ایک دن اپنے مریدوں کو درس دے رہے تھے۔اس دوران آپ نے علمِ معرفت کے طالبوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔''دنیا میں جتنے علماء اور دانش ور گزرے ہیں، کون جانتا ہے، کہاں گزرے ہیں اور کس طرح گزرے ہیں؟ اگر کچھ باقی رہ جاتا ہے تو وہ حسنِ معاملہ ہے۔وہی حیاتِ معنوی ہے جسے آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔لوگوں کو کیا معلوم کہ جس رات کے اول حصے میں امام اعظمؒ نے وفات پائی، اسی شب کے آخری حصے میں امام شافعیؒ پیدا ہوئے۔'' یہ کہہ کر حضرت نظام الدین اولیاؒ نے مشہور فارسی شاعر خاقانی کا یہ شعر پڑھا جس میں اس واقعے کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔

بوحنیفہ اول شب سل کرو
شافعیؒ آخر شب از مادر بزار

(حضرت ابوحنیفہؒ نے ابتدائے شب میں انتقال فرمایا اور آخرِ شب میں حضرت شافعیؒ کو ان کی مادرِ گرامی نے جنم دیا)

یہ ہے ماہِ رجب کی اس مخصوص رات کا مختصر سا تذکرہ جسے بیشتر علمائے کرام نے بڑی اہمیت دی ہے۔

بعض اہلِ تحقیق نے یہاں تک تحریر کیا ہے کہ اصولِ پیدائش کے اعتبار سے حضرت امام شافعیؒ کو بہت پہلے دنیا میں آ جانا چاہیے تھا مگر قدرت نے زمین پر جو کچھ ظاہر کیا وہ عام اندازوں سے بالکل مختلف



تھا۔ابوحنیفہؒ کے عقیدت مند یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کو امامِ اعظمؒ کا احترام منظور تھا۔اس لیے ان کی موجودگی میں دوسرا فقیہہ پیدا نہیں کیا گیا۔یہ حسنِ ظن ہے یا حقیقت؟ ان تمام باتوں سے قطع نظر وہ رات بڑی عجیب رات تھی۔

امام شافعیؒ کا خاندانی نام محمد اور والد کا نام ادریس بن عباس تھا۔شافع، آپ کے پردادا تھے اس لیے شافعی کہلاتے ہیں۔شافع، وہ شخص ہیں کہ جنگ بدر کے موقع پر قبیلہ بنو ہاشم کا جھنڈا ان کے ہاتھ میں تھا۔جب کفارانِ قریش کو شکستِ فاش ہوئی تو شافع قیدی بنا لیے گئے بعد میں فدیہ دے کر خود کو آزاد کرا لیا اور پھر مسلمان ہو گئے۔ایک روایت یہ ہے کہ شافع نے عالمِ جوانی میں آنحضرت ﷺ سے ملاقات کی اور آپ کے دستِ حق پرست پر ایمان لے آئے۔حضرت امامؒ کو یہ شرف حاصل ہے کہ عبدِ مناف تک پہنچ کر آپ کا سلسلہ نسب پیغمبرِ اسلامؐ سے مل جاتا ہے۔آپ کی پیدائش کے سلسلے میں تین مختلف روایات مشہور ہیں۔کچھ تاریخ نویسوں کا بیان ہے کہ آپ عسقلان میں پیدا ہوئے۔خود حضرت امامؒ کا قول ہے۔''میری پیدائش، غزہ میں ہوئی۔'' غزہ شام کا علاقہ ہے۔کچھ لوگوں کی تحقیق کے مطابق آپ کی ولادت یمن میں ہوئی لیکن معتبر یہی ہے کہ حضرت امام شافعیؒ، غزہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔

کچھ لوگوں نے حضرت امامؒ کے نسب نامے پر شک کا اظہار کیا ہے اور آپ کے مورثِ اعلیٰ شافع کو ابولہب کا غلام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ ایک کارِ عبث کے سوا کچھ نہیں۔امامؒ بلاشبہ قریش کے معزز ترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔تاریخ اپنی تمام تر مصلحتوں کے باوجود اس بات پر گواہ ہے کہ آپ کی اعلیٰ نسبی کے سورج کو کبھی گہن نہیں لگا۔ہاں اتنا ضرور ہے کہ امامؒ کے والد ادریس بن عباس ایک مفلس و تہی دست انسان تھے۔کبھی کبھی غربت و افلاس کی دھول، شرافتِ خاندانی کو چھپا لیتی ہے لیکن یہ کوئی آفاقی اصول نہیں ہے۔شاید امامؒ کی ان ہی فطری مجبوریوں کے سبب مخالفین نے الزام تراشیاں کی تھیں۔اور اس وقت یہ شور زیادہ بلند ہوا۔جب امامؒ کے والد انتقال کر گئے۔یہ امامؒ کی شیر خواری کا زمانہ تھا۔

آپ کی والدہ فاطمہ بنتِ عبداللہ ایک مثالی خاتون تھیں۔ان کے عزم و ہمت کو لفظوں میں بیان کرنا آسان نہیں۔ناداری کی حالت میں کئی سال بسر کرنا پھر بھی شوہر کی جاں نثار رہنا، یہ اس عظیم شریک حیات کی زندگی کا ایک ورق ہے جس کی آغوشِ محبت میں امام شافعیؒ پرورش پا رہے تھے۔عین عالمِ شباب میں بیوگی کا لباس پہن کر ثابت قدم رہنا اور اولاد کی خاطر ذاتی مسرتوں کو قربان کر دینا اس کی کتابِ

زیست کا دوسرا زریں ورق ہے۔ فاقہ کشی اور بے چارگی کا تسلسل، انسان سے اس کے ہوش وحواس چھین لیتا ہے۔ مگر فاطمہ بنت عبداللہ، مصائب کی یلغار میں بھی اپنے فرزند کی طرف سے غافل نہیں ہوئیں۔ انہیں ہر لحظہ امامؒ کی تعلیم وتربیت کا خیال رہتا تھا۔ شوہر کی قربت وغم گساری سے محروم ہونے کے بعد وہ بیٹے کو لے کر مکہ معظمہ چلی گئیں۔ اس سفر کی کیفیات کو خود امام شافعیؒ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''میری ولادت غزہ میں ہوئی۔ پھر والدہ کو میرے بگڑ جانے کا اندیشہ پیدا ہوا۔ اس لیے انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ اگر تو یہاں رہے گا تو ان ہی لوگوں کی طرح ہو جائے گا جن میں تیری پرورش ہو رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس طرح تیری نسبی شرافت خاک میں نہ مل جائے۔ چانچہ وہ مجھے لے کر مکہ معظمہ چلی گئیں۔'' جب حضرت امام شافعیؒ نے اس سرزمین پر قدم رکھا تو اس وقت آپ کی عمر دو سال تھی۔

مکہ معظمہ پہنچ کر فاطمہ بنت عبداللہ نے اپنے فرزند کی پرورش کے لیے انتہائی سخت اصول ترتیب دیے۔ آپ ایک لمحے کے لیے بھی امام شافعیؒ کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھیں۔ بچپن آخر بچپن ہوتا ہے لیکن مادرِ گرامی نے امامؒ کو عام بچوں کی روش پر چلنے کی اجازت نہیں دی۔ یہاں تک کہ اس نوعمری میں بھی انھوں نے اپنے بیٹے کو انسانی فطرت کے خلاف جنگ کرنے کا عادی بنایا۔ فاطمہ بنت عبداللہ ایک غیرت مند خاتون تھیں۔ اگر چہ غربت وافلاس کے مہیب سائے در ودیوار پر سایہ فگن تھے لیکن کسی نے آپ کی زبان سے حرفِ شکایت نہیں سنا تھا۔ اس لیے جب امام شافعیؒ تین سال کے ہوئے تو ایک غیور ماں نے بیٹے کو پہلا سبق دیا۔

''خدا ایک ہے اور وہ سب کا کارساز ہے۔ کوئی شے اس کے دائرۂ اختیار سے باہر نہیں، دنیا کا ہر شاہ وگدا، خدا کا محتاج ہے۔ انسان کے لیے اس سے بڑی کوئی ذلت نہیں کہ وہ خدا کو چھوڑ کر اپنے ہم جنس کے آگے ہاتھ پھیلائے۔''

پھر فاطمہ بنت عبداللہ نے یہ سبق اتنی بار دہرایا کہ امامؒ نے اپنی آنکھوں سے غیرت کو مجسم ہوتے دیکھا۔ روز وشب یہی ایک لفظ آپ کے تعاقب میں رہتا۔ جہاں بھی جاتے اسی ایک لفظ کی بازگشت سنائی دیتی۔ ''غیرت'' کی تکرار صرف اس لیے تھی کہ امامؒ کے معصوم ذہن کو احساسِ کمتری کا آزار متاثر نہ کر سکے۔

جب فرزندِ قریش نے اپنی زندگی کے چار سال مکمل کر لیے تو مادرِ گرامی نے دوسرا سبق دیا۔ ''محمد! علم



حاصل کرو۔ علم کے بغیر انسان اور حیوان میں زیادہ فرق باقی نہیں رہتا۔''

فاطمہ بنت عبداللہ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ شعر وادب کا بھی شعور رکھتی تھیں، اس لیے آپ نے اپنے بیٹے کے سامنے علم کی فضیلت دلنشین پیرائے میں بیان کی۔ اب امامؒ کی سماعت صرف دو لفظوں سے آشنا تھی، علم اور غیرت پھر یہی دو لفظ امام شافعیؒ کی زندگی بن گئے۔

یہ والدہ محترمہ کی تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ امامؒ نے سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا۔ اہل خاندان جو مسلسل امامؒ کو نظر انداز کر رہے تھے، انھیں اس بات پر شدید حیرت تھی۔ پھر یہ خبر عام ہو گئی۔ اس وقت کے مشہور حفاظ نے امتحان کی غرض سے پورا کلام پاک سنا جب امامؒ نے آخری آیت تلاوت کی تو سننے والے حیران رہ گئے۔ قرات کے اس طویل سفر میں ایک جگہ بھی امامؒ کی زبان نہیں لڑکھڑائی تھی۔ جن کے دل غبارِ حسد سے آلودہ نہیں تھے وہ امامؒ کو درازیٔ عمر کی دعائیں دے کر چلے گئے۔ ان کی آنکھیں سات سالہ بچے کی شکل میں مستقبل کے تاریخ ساز انسان کو دیکھ رہی تھیں اور جن کے سینوں میں نفاق کی آگ روشن تھی ان کے چہرے دھواں دینے لگے۔ اہلِ مکہ نے ایسی بے مثال قوتِ حافظہ نہیں دیکھی تھی۔

اسی زمانے میں ایک عجیب سا واقعہ پیش آیا۔ امام شافعیؒ کی والدہ محترمہ فاطمہ بنت عبداللہ نہایت پارسا اور ایماندار خاتون تھیں۔ اسی بزرگی کے باعث مکہ معظمہ کے لوگ آپ کے پاس اپنی امانتیں رکھوا دیا کرتے تھے۔ ایک بار دو آدمی ایک وزنی صندوق لے کر آئے اور آپ سے درخواست کرنے لگے کہ اسے کچھ دن کے لیے رکھ لیا جائے۔

''اس میں کیا ہے؟'' فاطمہ بنت عبداللہ نے نو واردوں سے پوچھا۔

''صندوق میں کپڑوں کے ساتھ استعمال کی کچھ دیگر اشیاء ہیں۔'' نو واردوں نے مختصر جواب دیا۔

''اسے میرے سامنے کھول کر تمام چیزیں شمار کرو۔'' فاطمہ بنت عبداللہ نے کہا۔ وہ دونوں قطعاً اجنبی تھے، اس لیے آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔

جب نو وارد اپنے سامان کا شمار کر چکے تو امامؒ کی مادرِ گرامی نے کہا کہ اب اس میں تالا ڈال دو۔ تمام احتیاطی تدابیر مکمل ہو چکیں تو آپ نے وہ صندوق اٹھا کر اپنے مکان کے سب سے زیادہ محفوظ کمرے میں رکھ دیا۔

وقت گزرتا رہا۔ پھر ایک دن ان میں سے ایک شخص آیا اور اپنی امانت طلب کرنے لگا۔ فاطمہ بنت عبداللہ نے سوچے سمجھے بغیر صندوق اس شخص کے حوالے کر دیا۔ کچھ دن بعد اس کا دوسرا ساتھی آیا اور اپنا

سامان مانگنے لگا۔ فاطمہ بنت عبداللہ پہلے ہی اس شخص کی آمد پر حیران ہو رہی تھیں، جب اس نے اپنی امانت کی بازیابی کا سوال کیا تو آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور انتہائی ناگوار لہجے میں اجنبی سے کہنے لگیں۔ ''یہ کیسی بدمعاملگی ہے کہ جب میں ایک بار تمھاری امانت تمھیں واپس کر چکی تو تم دوبارہ بوڑھی عورت سے مذاق کرنے آئے ہو؟''

''آپ نے وہ صندوق میرے حوالے تو نہیں کیا؟'' اجنبی کی باتوں سے بھی تلخی ظاہر ہونے لگی تھی۔

''میں تمھارے دوسرے ساتھی کو سارا سامان دے چکی ہوں۔'' فاطمہ بنت عبداللہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''امانتوں کی واپسی کا یہ طریقہ غلط ہے۔'' اجنبی شخص کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ ''جو چیز دو آدمیوں کی موجودگی میں جمع کی گئی تھی، اسے ایک شخص کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔''

''وہ تمھارا ساتھی تھا اور میں اسے پہچانتی تھی اس لیے صندوق اس کے سپرد کر دیا گیا۔'' فاطمہ بنت عبداللہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اس لیے آپ بگڑی ہوئی بات کو خوش اسلوبی سے ختم کرنا چاہتی تھیں۔

''میں آپ کی اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتا۔'' اجنبی کی آواز بتدریج بلند ہوتی جا رہی تھی۔ ''میں اس وقت تک واپس نہیں جاؤں گا جب تک آپ میرا سامان واپس نہیں کریں گی۔''

فاطمہ بنت عبداللہ نے اجنبی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ صورت حال لحظہ بہ لحظہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ امامؒ کی مادرِ گرامی کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ قبیلہ قریش کی ایک معزز و محترمہ خاتون کے دروازے پر ایک اجنبی شخص کھڑا ہے اور چیخ چیخ کر اپنی امانت کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔

احساسِ ندامت سے فاطمہ بنت عبداللہ کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ آپ کا پورا جسم پسینے میں ڈوب چکا تھا۔ 'کہیں یہ شخص میری غربت کی وجہ سے مجھے بددیانت تو نہیں سمجھ رہا ہے؟' یہ خیال آتے ہی فاطمہ بنت عبداللہ رو پڑیں۔ 'کیا یہ شخص، مکے کی گلیوں میں اس واقعے کو دہراتا پھرے گا؟ اور کیا اہلِ مکہ اس کی باتوں پر یقین کر کے میری دیانت کی نفی کر دیں گے؟' ذہن ایک بار پریشان ہوا تو پھر منتشر ہوتا ہی چلا گیا۔ خیالات کی ایک یلغار تھی جو کسی طرح بھی رکنے میں نہیں آتی تھی۔ احساسِ ندامت بڑھتے بڑھتے احساسِ رسوائی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اشکوں کی روانی بھی تیز ہو گئی تھی مگر یہ بہتے ہوئے آنسو اس شخص کی مطالبے کا جواب نہیں تھے۔ آج فاطمہ بنت عبداللہ شدید عالمِ تنہائی سے دوچار تھیں۔



ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بیوگی کا روزِ اول اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آ گیا ہو۔

ابھی اس اذیت ناک کیفیت سے نجات کی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ امام شافعیؒ مکتب سے گھر تشریف لے آئے۔ ایک اجنبی کو اپنے مکان کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر آپ نے اس سے حالات دریافت کیے۔ اجنبی نے تمام واقعہ اس طرح دہرایا کہ اس کی آواز سے سخت غصے اور نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ امامؒ تیزی سے اندر چلے گئے۔ والدہ محترمہ کی زبانی صورت حال کی حقیقت کو سمجھا اور پھر باہر آ کر اجنبی سے مخاطب ہوئے۔ ''تم مادرِ گرامی کو قصوروار ٹھہراتے ہو جب کہ بنیادی طور پر غلطی تمھاری ہے۔''

امامؒ باوقار لہجے میں بول رہے تھے اور آپ کے چہرے پر خوف و ہراس کی ہلکی سی علامت بھی نہیں تھی۔

''لڑکے! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' اجنبی غصے سے بھڑک اٹھا ''میں اپنے سامان سے بھی محروم ہو گیا اور تمھاری نظروں میں مجرم بھی ٹھہرا۔ بس اب مجھ میں مزید کچھ سننے کی طاقت نہیں۔ میرا صندوق واپس کر دو۔ آئندہ میں ادھر کا رخ بھی نہیں کروں گا۔'' اجنبی کی آواز بہت بلند ہو گئی تھی اور وہ امام کی تحقیر پر اتر آیا تھا۔

''بزرگ! آہستہ بولیے، شرفا اس طرح گفتگو نہیں کرتے۔'' کربناک کیفیت سے دوچار ہوتے ہوئے بھی امامؒ کے لہجے کی شائستگی برقرار تھی۔ ''مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ جب دو افراد نے مل کر میری والدہ کے پاس اپنی امانت رکھوائی تھی تو پھر ایک شخص کو اس کے مطالبے کا حق کس طرح حاصل ہو گیا؟ اپنے دوسرے ساتھی کو لے آؤ۔ پھر تمھاری امانت تمھارے حوالے کر دی جائے گی۔'' امامؒ کی بات سن کر وہ شخص حیران رہ گیا۔ کچھ دیر کھڑا ہوا بے چارگی کے عالم میں کفِ افسوس ملتا رہا اور پھر سر جھکائے ہوئے واپس چلا گیا۔ سات سال کی عمر میں امام شافعیؒ کی غیر معمولی ذہانت نے ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ شخص کو اس طرح شکست دی تھی کہ وہ دوبارہ اپنے دفاع میں ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

کچھ تاریخ نویسوں نے یہ واقعہ قلمبند کرتے ہوئے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ ایک سازش بھی تھی جس کے ذریعے امامؒ کے مخالفین، امامؒ کے معزز گھرانے کو بدنام کرنا چاہتے تھے۔ بدخواہوں کا منصوبہ یہ تھا کہ جب فاطمہ بنت عبداللہ اس شخص کی امانت واپس کرنے میں ناکام رہیں گی تو پھر یہ بات سارے شہر میں مشہور ہو جائے گی اور لوگ غربت و افلاس کے باعث امام شافعیؒ کی والدہ پر شک کرنے لگیں گے۔ منصوبہ اپنی جگہ مکمل تھا لیکن امامؒ کے ذہنِ رسا نے مخالفین کی بساط الٹ کر رکھ دی اور ایک شاطر کو اسی کی چال میں الجھا کر اس طرح مات دی کہ اہلِ مکہ کے کانوں میں دوبارہ حضرت سفیان ثوریؒ

کے الفاظ گونجنے لگے۔

”خدا کی قسم! اگر انسانی عقل کا وزن کیا جائے تو اس بچے کی عقل نصف دنیا کی عقل پر بھاری رہے گی۔“

جب اس ناخوشگوار واقعے کے اثرات زائل ہو گئے تو ایک دن والدہ محترمہ نے حضرت امام شافعیؒ سے فرمایا۔ ”فرزند! انسانی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ آندھیوں کے رخ پر رکھا ہوا چراغ کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔ یہ زبان اپنے خدا کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہے کہ اس نے تمھیں میری زندگی میں حفظِ قرآن کی لازوال نعمت سے سرفراز کیا۔ اب تم اپنا آخری سبق غور سے سنو۔ ایک ایک لفظ ذہن نشین کر لو کہ اس کے بغیر دنیا اور آخرت میں نجات ممکن نہیں۔ اے ادریس کے بیٹے! تمھیں محمد مصطفیٰ ﷺ سے دوہری نسبت ہے۔ تمھارا نسبی رشتہ اسی محترم خاندان سے ہے جس کا تعلق رسالت مآب ﷺ سے ہے۔ دوسرا رشتہ اس رشتے سے بھی معتبر ہے کہ تم خدا کے آخری پیغمبرؐ کی امت میں شامل ہو۔ غلاموں پر فرض ہے کہ وہ آقا کی سنت کو زندہ کریں۔“ والدہ کی نصیحت اس قدر اثر انگیز تھی کہ امامؒ کے دل میں عشق کی لے پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ پھر امامؒ کے دل و دماغ کا یہ حال ہو گیا کہ ہمہ وقت حدیثِ رسولؐ کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے۔ مختلف بزرگوں کی مجلسِ درس میں جاتے اور جو حدیث بھی سنتے اسے ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ امامؒ کی قوتِ حافظہ بے پناہ تھی مگر پھر احتیاطاً قولِ رسولؐ کو کسی کپڑے یا کھال پر لکھ دیتے۔ اگر یہ دونوں چیزیں بھی میسر نہ ہوتیں تو ہڈیوں کو استعمال میں لاتے۔

امامؒ یتیم بھی تھے اور مفلس و نادار بھی۔ مگر کبھی آپ نے اپنی ان مجبوریوں کا کسی سے شکوہ نہیں کیا۔ اس قدر غیرت مند تھے کہ کسی آنکھ نے آپ کے دستِ طلب کو دراز ہوتے نہیں دیکھا۔ امامؒ علم کی خاطر آسودہ حال لوگوں سے تعاون کی درخواست کر سکتے تھے مگر آپ کی عزتِ نفس کو یہ بھی گوارہ نہ تھا۔ جس طالبِ علم کو اپنا سبق تحریر کرنے کے لیے کاغذ تک میسر نہ ہو اس کے ذوق و شوق کا زندہ رہنا کتنا دشوار نظر آتا ہے لیکن امامؒ کو وسائل کی کمی ایک لمحے کے لیے بھی متاثر نہ کر سکی۔ ہر لحظہ وہی تڑپ تھی، ہر ساعت وہی جوش۔ حدیثِ رسولؐ سننا اور پھر اسے ذہن کے راستے کاشانۂ دل میں اتار لینا، امامؒ کو دنیا میں بس یہی ایک کام تھا۔ امامؒ کے ساتھ مجلسِ درس میں شریک ہونے والے کچھ طالب علم ذی حیثیت خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا لباس بھی قیمتی ہوتا تھا اور سامانِ تحریر بھی۔ یہ مختلف صورتِ حال ایک نوخیز ذہن کو منقلب کر سکتی تھی مگر امامؒ دولت مند ساتھیوں کے درمیان بیٹھ کر بھی احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہوئے۔



آپ سستے کپڑوں اور ارزاں کھالوں پر حدیث رسولؐ تحریر کرتے۔ جب ان چیزوں کا استعمال بھی مقدور میں نہ ہوتا تو پھر یہ کہہ کر ہڈیوں پر لکھنا شروع کر لیتے۔ ”یہی میرا قرطاس ہے، یہی میرا دفتر ہے۔“

جب کسی اہلِ دل نے امامؒ کے گھر کا جائزہ لیا تو پورا مکان ہڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پھر دیکھنے والا بے اختیار رو پڑا۔ ”یہ کیسا دل ہے اور اور کیسی طلب؟“ اہلِ دنیا نے کوئی بھی رائے زنی کی، وقت نے کسی بھی لہجے میں تبصرہ کیا موسم کسی طرح بھی اثر انداز ہوا مگر امامؒ کے سینے میں شرارِ علم سلگتا ہی رہا یہاں تک کہ اس نے شعلگی کی قبا پہن لی۔

امامؒ فطری طور پر شعر و ادب سے لگاؤ رکھتے تھے۔ اس لیے سماعتِ حدیث کے ساتھ زبان و ادب پر بھی آپ کی توجہ مرکوز تھی۔ اہلِ عرب ہمیشہ سے اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز کرتے تھے اور زبان و بیان کے کمالات ظاہر کرنے کے لیے شعر سے بڑھ کر کوئی دوسرا ذریعہ ممکن نہ تھا۔ لوگ قریہ قریہ، محفل محفل، عرب سخنوروں کے اشعار بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ حضرت امام شافعیؒ بھی اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہاں تک کہ آپ نے باقاعدہ شعر، لغت اور تاریخ عرب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ پھر امامؒ کی بے چین فطرت مکہ معظمہ میں سکون نہ پا سکی تو اس شہرِ مقدس سے نکل کر بادیہ پہنچ گئے۔ وہاں آپ نے قبیلۂ ہزیل سے وابستگی اختیار کر لی۔ امامؒ اپنے اس فکری انقلاب کے بارے میں خود تحریر فرماتے ہیں۔

”میں مکے سے نکل کر بادیہ پہنچا اور پھر قبیلۂ ہذیل کے درمیان چلا گیا۔ میں نے ان لوگوں کا طرزِ کلام سیکھا اور مزاج و عادات سے واقفیت حاصل کی۔ یہ قبیلہ اپنی زبان دانی کے اعتبار سے عرب میں سب سے زیادہ فصیح تھا۔ میں اس قبیلے کے ساتھ کوچ کرتا، جہاں وہ ٹھہرتا میں بھی اتر جاتا۔ پھر جب میں مکے آیا تو فنِ شعر میں کامل ہو چکا تھا۔“

اس وقت امامؒ کی عمر مشکل سے گیارہ بارہ سال ہو گی۔ بادیہ میں طویل قیام اور قبیلہ ہذیل کے لوگوں سے مسلسل ربط و ضبط نے امامؒ کے ذوقِ شعری میں حیرت انگیز اضافہ کر دیا تھا۔ اب آپ زبان و بیان کے نئے نئے زاویے تراشنے لگے تھے۔ شعر و ادب سے رغبت کا یہ حال تھا کہ گھنٹوں نامور شعرا کا کلام پڑھتے تھے۔ اس ذہنی تبدیلی کا نمایاں اثر یہ ہوا کہ امامؒ کے شوقِ حدیث میں کمی آ گئی اور آپ کا بیشتر وقت شاعری اور لسانیات کے رموز و نکات سمجھنے میں صرف ہونے لگا۔ یہ امامؒ کی زندگی کے بڑے قیمتی لمحات تھے جو رائیگاں گزرتے محسوس ہو رہے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ تاریخ آدم کا یہ ذہین ترین نوجوان، کوچہ شعر و ادب میں گم ہو جائے گا اور محفلِ حدیث و فقہ کی طرف دوبارہ لوٹ کر نہ آ سکے گا۔ ابھی یہ قیاس

آرائیاں جاری تھیں کہ اچانک قدرت نے امامؒ کی دستگیری کی اور آپ کے مضطرب قدموں کو فردوس گم شدہ کی جانب موڑ دیا۔

ایک دن حضرت امامؒ بڑے والہانہ انداز میں عرب کے مشہور شاعر لبید کا کلام پڑھ رہے تھے۔ ایک تو اثر انگیز اشعار، دوسرے امام شافعیؒ کی دل نشیں آواز، فضاؤں پر سحر سا طاری تھا۔ جو بھی سنتا اپنے گرد و پیش کو بھول کر وہیں ٹھہر جاتا۔ امامؒ کے اشعار پڑھنے کا یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ اسی دوران ایک گمنام سا شخص ادھر سے گزرا، امامؒ کی آواز نے اسے بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ اجنبی چند لمحوں تک بڑے انہماک سے لبید کے اشعار سنتا رہا۔ جس قدر بھی لوگ وہاں موجود تھے، سب کے سب حسن کلام میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اچانک وہ شخص جسے کوئی بھی نہیں جانتا تھا، درمیان میں بول پڑا۔ اس کا یہ عمل آدابِ مجلس کے خلاف تھا۔ حاضرین کو اجنبی کی یہ ادا سخت گراں گزری مگر وہ لوگوں کی قلبی کیفیات سے یکسر بے نیاز تھا۔ اس نے حضرت امام شافعیؒ کی طرف بہت غور سے دیکھا اور پھر نہایت بے باکی کے ساتھ مخاطب ہوا۔ ''فرزند! اگر تجھے ساری دنیا کے اشعار بھی حفظ ہو جائیں اور تیری یہ سحر انگیز صدا چلتے ہوئے دریاؤں کو بھی روک دے، تو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ افسوس! یہ کیسے فصیح و بلیغ لوگ تھے مگر اپنے پیچھے مخلوقِ خدا کے لیے چند لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں چھوڑ گئے۔ ایسے لفظ جنھیں پڑھ کر انسانی ذہن پریشان خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ ہائے ان بے خبروں نے علم کو کس طرح برباد کر دیا۔ اے قریش کے لائق بیٹے! کیا تو بھی علم کی تباہی کا سبب بنے گا؟ کیا بعد میں آنے والی نسلیں تجھ پر بھی بے خبری کا الزام عائد کریں گی؟ میرے معصوم بچے! ہرزہ سرائی کی اس محفل سے اٹھ جا کہ زبان و بیان کے بت تجھے ہلاک کر ڈالیں گے۔ مجلسِ حدیث و فقہ کب سے تیری منتظر ہے؟'' یہ کہہ کر وہ اجنبی چلا گیا اور لبید کے اشعار پر سر دھننے والے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔

خود حضرت امام شافعیؒ اس واقعے کے بارے میں بیان فرماتے ہیں۔ ''مجھے اجنبی کی باتوں نے اس قدر متاثر کیا کہ میں بزمِ شعر و ادب سے نکل کر حضرت سفیان بن عیینہؒ کی بارگاہ میں داخل ہو گیا۔''

تاریخِ عالم میں اکثر ایسے واقعات نظر آتے ہیں کہ کسی ایک واقعے یا ایک لفظ نے کچھ لوگوں کی پوری زندگی بدل ڈالی ہے۔ بقول شاعر، کسی نے آنکھ بدلی تھی کہ ہم دنیا بدل آئے۔ بے شک امامؒ نے اس اجنبی کی باتوں کا گہرا تاثر قبول کیا مگر آپ بدلے ہرگز نہیں تھے۔ بدلنا تو اسے کہتے ہیں کہ کوئی شخص فسق و فجور سے طاعت و زہد کی طرف پلٹا ہو یا جہل سے علم کی جانب مڑ گیا ہو۔ امامؒ فطرتاً قرآن و حدیث



کے اسیر تھے۔ اگر وہ دائرے سے نکلنا بھی چاہتے تو نکل نہیں سکتے تھے۔ بس ایک عارضی لمحہ تھا کہ جس میں امامؒ نے شعر و ادب پر ہلکی سی نظر ڈالی تھی اور پھر خود ہی اپنے مرکز کی طرف پلٹ آئے تھے۔ اگر ہم کسی طرح اس تغیر کو امامؒ کی طبیعت کا انقلاب سمجھ لیں تو پھر یہ انقلاب بھی مبارک ثابت ہوا اور بعد میں ملتِ اسلامیہ کے بہت کام آیا۔

حدیث و فقہ کی طرف متوجہ ہونے کے سلسلے میں یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایک دن حضرت امام شافعیؒ منیٰ میں موجود تھے۔ یکا یک آپ نے اپنی پشت کی جانب سے ایک آواز سنی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ''تمہیں علم فقہ حاصل کرنا چاہیے۔'' امامؒ نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں قریب میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو براہِ راست آپ سے مخاطب ہو سکتا تھا۔ پہلے ایک اجنبی نے آپ کو شعر و ادب کے مشغلے سے دور رہنے کی نصیحت کی تھی اور اب دوسری بار کسی نامعلوم شخص کی آواز نے آپ کو چونکا دیا تھا۔ حضرت امامؒ سمجھ گئے کہ یہ اشارہ غیبی ہے۔ نتیجتاً آپ مفتی مکہ مسلم بن خالد زنجی کی درس گاہ میں پہنچے اور اس کے ساتھ ہی مشہور محدث سفیان بن عیینہؒ کی خدمت میں بھی حاضری دیتے رہے۔ امامؒ نے اپنی غیر معمولی قوتِ حافظہ کے سہارے علم کا یہ سفر اتنی تیزی سے طے کیا کہ استادانِ گرامی حیران رہ گئے۔ ابھی آپ کی عمر صرف تیرہ سال تھی کہ حضرت مسلم بن خالد زنجی نے فرمایا۔ ''محمد! اب تم فتویٰ دے سکتے ہو۔ یہ ذمے داری تمہیں زیب دیتی ہے۔''

امامؒ اس کم سنی میں مسندِ فقہ پر جلوہ افروز ہوئے کہ لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا۔ پھر آپ نے بعض پیچیدہ مسائل میں اس قدر ذہانت سے فتوے دیے کہ اہلِ علم سوچتے ہی رہ گئے۔ یہ عمر! یہ حافظہ! یہ ادراک! یہ رسائی! یہ ذوقِ شعر! فصاحت و بلاغت! بلاشبہ امامؒ ان صفات میں اپنی مثال آپ تھے۔

قریش کے مفلوک الحال فرزند نے ہوش و خرد کی بلند ترین چوٹی کو سر کر لیا تھا۔ مگر ابھی اس کا دل مطمئن نہیں تھا۔ امام مالکؒ کے فضل و کمال کے تذکرے اسے اکثر بے قرار رکھتے تھے۔ نصف شب کے سناٹے میں شہرِ رسولؐ سے آنے والی ہوائیں اس سے سرگوشیاں کرتی تھیں۔

''عنقریب لوگ علم کی طلب میں سفر کر کے اونٹوں کے جگر پگھلا دیں گے مگر پھر بھی انہیں عالمِ مدینہ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں ملے گا۔''

امام شافعیؒ کو یہ آوازیں مسلسل سنائی دیتی رہیں۔ یہاں تک کہ آپ غیر محسوس طور پر امام مالکؒ کی نادیدہ شخصیت کے زیرِ اثر آ گئے۔ پھر ایک دن آپ نے کسی شخص کے ہاتھوں میں موطا کا نسخہ دیکھا۔ امام

شافعیؒ، حدیث کی اس عظیم وجلیل کتاب کو دیکھ کر بے قرار ہو گئے۔ امامؒ نے فاقہ کشی کی حالت میں بھی کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا تھا مگر علم کی خاطر آپ نے غیرت وخود پسندی کی ان روایتوں کو بھی توڑ ڈالا جن کے ذریعے آلِ عبدالمطلب سارے عرب میں پہچانی جاتی تھی۔ حضرت امام شافعیؒ نے اس شخص سے نہایت عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''بزرگ! میں محمد بن ادریس ہوں، حدیث وفقہ کا ایک طالب علم۔ مجھ میں کسی کتاب کے خریدنے کی استطاعت نہیں۔ اگر آپ موطا کا یہ نسخہ کچھ دنوں کے لیے مستعار دے دیں تو شافعی کی جان پر یہ احسانِ عظیم ہوگا۔ آپ پسند کریں تو اس کتاب کے بدلے میں مجھ سے کوئی بھی مشقت لے لیں۔ یا پھر بلا معاوضہ ایک تشنۂ علم کو پیاس بجھانے دیں۔'' امامؒ کے لہجے میں طلب کے باوجود بڑا وقار تھا۔ وہ شخص انکار نہ کر سکا اور اس نے مالک بن انسؓ کی لازوال کتاب عارضی طور پر امام شافعیؒ کی نذر کر دی۔ پھر آپ نے اپنے شب وروز کی تمام مصروفیات ترک کر کے موطا کا مطالعہ شروع کیا۔ حضرت شافعیؒ نے ابھی پہلا ہی باب پڑھا تھا کہ آپ کے دل پر امام مالکؒ کی ہیبت چھا گئی۔ ''وہ محدث وفقیہہ جو اپنی تحریروں میں اس قدر باجبروت نظر آتا ہے، اس کی ظاہری شخصیت کیا ہوگی؟'' امامؒ، مطالعے کے دوران ہر قدم پر یہی سوچتے رہے۔

امام شافعیؒ غائبانہ طور پر تو بہت پہلے ہی امام مالکؒ سے متاثر ہو چکے تھے۔ مگر جب ''موطا'' پڑھنے کا شرف حاصل ہوا تو پھر مکمل طور پر امامِ مدینہ کی شخصیت کے دائرے میں محصور ہو گئے۔ اب ایک ہی جزبہ سینۂ سوزاں میں باقی رہ گیا تھا کہ کسی طرح مالک بن انسؓ کے حضور پہنچ کر دماغ وروح کی تشنگی کو سیراب کریں۔

امام شافعیؒ نے اپنے استاد حضرت سفیان عیینہؒ سے امام مالکؒ کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا
''مالک بن انسؓ کے سامنے ہماری حیثیت ہی کیا ہے؟ ہم تو ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں۔''
امام شافعیؒ کے دل پر مزید ہیبت چھا گئی۔ مگر اس کے ساتھ ہی شوقِ دید میں بھی اضافہ ہو گیا۔ پھر بتانے والوں نے بتایا۔ ''امام مالکؒ علم ومعرفت کے شہنشاہ ہیں۔ کس کی جرات ہے کہ ان کے سامنے لب کشائی کر سکے؟'' عقیدت انتہا کو پہنچ گئی۔ امام شافعیؒ، مدینے سے بہت دور تھے مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مالک بن انسؓ کا عکسِ جلال براہِ راست آپ کے دل پر پڑ رہا ہو۔ کئی راتیں اسی کشمکش میں گزر گئیں کہ شرفِ باریابی یا ناکام ونامراد واپسی؟ پھر امامؒ نے اپنی تمام تر مجبوریوں کے باوجود دربارِ مالکؒ میں حاضر ہونے کا فیصلہ کر لیا۔



زندگی نئے انقلاب سے دوچار ہونے والی تھی کہ امامؒ نے ایک غیبی آواز سنی۔ کوئی آپ سے کہہ رہا تھا۔ ''محمد! دنیا کا اصول ہے کہ جب کوئی شخص کسی شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہوتا ہے تو رسمِ زمانہ کے مطابق نذر پیش کرتا ہے۔ مالکؒ بھی اقلیم حدیث وفقہ کے تاجدار ہیں۔ تم ان کے حضور کیا نذر پیش کرو گے؟'' آواز سن کر امام شافعیؒ چونک پڑے۔ آپ کو اپنی تہی دستی کا احساس ہوا، خالی دامن کی طرف دیکھا پھر اداس ہو گئے۔ دربارِ مالکؒ میں نذر پیش کرنے کے لیے آپ کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر کئی راتیں جاگتے ہوئے گزر گئیں۔ امام مالکؒ کے در پر گدائی کیسے بغیر علم حدیث کی گہرائیوں کو سمجھنا ممکن نہیں تھا۔ امام شافعیؒ مسلسل کئی دن تک اس صورت حال پر غور کرتے رہے۔ پھر امامؒ کے ذہن نے عجیب راہ نکالی۔ دوبارہ جب وہ غیبی آواز سنائی دی تو امامؒ نے فرمایا۔

''اگر وہ شہریارِ علم مجھ سے سوال کرے گا کہ شافعیؒ! تو ہماری نذر کو کیا لایا، تو میں عرض کروں گا۔ شاہا! میں تیری بارگاہ میں تیری ہی روایات لے کر حاضر ہوا ہوں۔''

دراصل وہ امامؒ کے اپنے دل کی آواز تھی۔ آپ دربارِ مالکؒ میں خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے تھے۔ اس لیے آپ نے ایک انوکھی تدبیر سوچی اور پھر شب وروز کا ایک ایک لمحہ خرچ کر کے موطا کو مکمل حفظ کر لیا۔ امام شافعیؒ کی نظر میں یہ بہترین نذرانۂ عقیدت تھا جسے آپ مالک بن انسؓ کے حضور پیش کرنا چاہتے تھے۔

اور جب امامؒ کی زندگی کی سب سے قیمتی ساعت طلوع ہوئی تو کچھ تنگ نظر لوگوں نے آپ کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے کہا۔ ''امام مالکؒ کے حلقۂ درس میں کسی عام انسان کا داخلہ ممکن نہیں۔'' یہ شرارت اس وقت کی گئی جب امام شافعیؒ سفرِ مدینہ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ پہلی بار آپ کو اپنی غربت ومحتاجی کا احساس ہوا۔ پہلی بار آپ نے اپنے قلبِ نازک پر مادی وسائل کی ضربِ شدید محسوس کی اور پہلی بار آپ کو اندازہ ہوا کہ زمانے کے گریبان پر اہلِ سرمایہ کی گرفت کتنی مضبوط ہے؟ امامؒ اپنی بے چارگی پر رو پڑے۔ پھر کسی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر والئ مکہ امام مالکؒ کے نام سفارشی خط تحریر کر دے تو پھر تم پر علم کے دروازے کھل جائیں گے۔''

امید کی ہلکی سی کرن نمودار ہوئی تھی مگر یقین کا سورج ابھی گھرے بادلوں میں روپوش تھا۔ امامؒ نے مشورہ دینے والے سے سوال کیا۔ ''آستانۂ مالکؒ تو ابھی بہت دور ہے۔ پہلے والئ مکہ کی طرف میری رہنمائی کرو۔ مجھے بتاؤ کہ اس کے قصرِ امارت کا دروازہ کس طرح کھلے گا؟'' سفارشی خط کے حصول کی

تجویز پیش کرنے والا، امامؒ کے سوال کا جواب دینے سے قاصر رہا۔ پھر امامؒ نے اپنا یہی سوال کئی بااثر لوگوں کے سامنے دہرایا مگر وہاں بھی خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر دور میں سفارش کی جاتی رہی ہے لیکن اس کے کچھ اپنے اصول و آداب ہوتے ہیں۔ امام شافعیؒ کی سفارش کرنے سے کسی کو کیا حاصل ہوتا؟ اگر کسی کو اس عملِ نیک کی توفیق ہوتی تو امامؒ جیسا ذہین ترین طالب علم کاغذ کے بجائے ہڈیوں پر کیوں لکھتا؟ امامؒ نے حجت تمام کردی۔ کئی دن تک اپنے بوسیدہ لباس میں تماشائے اہلِ کرم دیکھتے رہے۔ جب حلقۂ امیراں سے کوئی شخص نہیں اٹھا تو امامؒ خود ہی آگے بڑھے اور پوری قوت سے والئ مکہ کی زنجیرِ در ہلا دی۔

قصرِ امارت میں ہلچل سی مچ گئی۔ آج تک کوئی آنے والا اس طرح نہیں آیا تھا۔ والئ مکہ نے دربانوں سے آنے والے کے بارے میں پوچھا۔ محافظوں نے اسے بتایا۔ ''وہ ایک شکستہ حال لڑکا ہے، کہتا ہے کہ اس کے پاس کوئی سفارش نہیں پھر بھی والئ مکہ سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔''

''اسے میری مصروفیت کا بہانہ کر کے واپس لوٹا دو۔ ایسے کتنے ہی نادار لوگ یہاں آتے ہیں، میں کس کس کی حاجت روائی کروں گا؟'' والئ مکہ نے اپنے دروازے پر کھڑے ہوئے امامؒ کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

''ہم آپ کے حکم سے پہلے، انکار کے تمام حربے آزما چکے ہیں۔'' پہرے داروں نے بیک زبان کہا۔'' وہ کسی طرح بھی ناکام و نامراد لوٹ جانے پر آمادہ نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر اس وقت ملاقات ممکن نہ ہوئی تو کون جانے کیا کیا تباہ ہو جائے گا۔''

والئ مکہ نے ایک اجنبی لڑکے کی شدتِ اصرار کو محسوس کیا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ چند لمحوں بعد پہرے دار، امام شافعیؒ کو والئ مکہ کے روبرو لے کر حاضر ہوئے۔ والئ مکہ نے گہری نظروں سے اس نوجوان کا جائزہ لیا جس کی عمر مشکل سے چودہ سال ہوگی۔ پھر اس نے امامؒ کے لباس کو دیکھا جو بظاہر صاف تھا لیکن غربت و افلاس کا آئینہ دار تھا۔ والئ مکہ نے قیاس کر لیا کہ نوجوان پہلے اپنی بدحالی کا ذکر کرے گا۔ بعد میں سرکاری ملازمت یا کسی دوسرے ذریعے سے امداد کا طالب ہوگا مگر نوجوان کے چہرے پر نظر آنے والی ایک علامت ایسی تھی جو والئ مکہ کی تمام قیاس آرائیوں کو غلط ثابت کر رہی تھی اور وہ علامت تھی، امامؒ کا ذاتی وقار اور اندازِ رفتار۔ امامؒ جس انداز سے والئ مکہ کے دربار میں داخل ہوئے تھے، وہ خلافتِ عباسیہ کے مزاج سے ذرا بھی ہم آہنگی نہیں رکھتا تھا۔ بعض امرائے وقت جو



اپنی نشستوں پر موجود تھے، انہیں امامؒ کا یہ انداز پسند نہیں آیا تھا۔ خلعتِ زرنگار کے پہننے والے یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ ایک نوجوان اپنے جسم پر قبائے تار تار سجا کر والئ مکہ کے دربار میں داخل ہوگا اور اس طرح ان کے سامنے سے بے نیازانہ گزرتا ہوا چلا جائے گا۔ انہیں یقین تھا کہ قصرِ حکومت کی صناعیاں، بام و در کی رفعتیں، اقتدار کی زینت و نمائش اور والئ مکہ کا جلال اس کے قدموں میں لرزش پیدا کر دے گا۔ مگر وہ اس طرح محوِ خرام تھا، جیسے اس کی نظر میں دولت و اقتدار کے تمام مظاہر ہیچ ہوں۔

ابھی اہلِ دربار اپنے خیالات میں الجھے ہوئے تھے کہ امامؒ، والئ مکہ کی نشست کے سامنے جا کر رک گئے۔ آپ نے اسلامی طریقے سے تمام حاضرین کو سلام کیا اور پھر والئ مکہ سے اس طرح مخاطب ہوئے۔

''میں محمد بن ادریس، بن عباس، بن عثمانؒ بن شافعؒ بن سائب، بن جنید، بن عبد یزید، بن ہاشم، بن عبدالمطلب، بن عبد مناف ہوں۔ یہی میرا حوالہ ہے اور یہی میری شناخت ہے۔''

والئ مکہ کے درباریوں نے کچھ دیر پہلے امامؒ کا اندازِ رفتار دیکھا تھا اور اب ان کی سماعتیں طرزِ گفتار میں گم تھیں۔

''امیر! میں اس کا شکوہ نہیں کرتا آپ کے دورِ حکومت میں میرے جسم پر یہ بوسیدہ لباس کیوں ہے اور میں خشک روٹی کیوں استعمال کرتا ہوں؟'' امامؒ کی باوقار آواز گونجی اور والئ مکہ جو ابھی تک اپنی نشست پر پاؤں پھیلائے ہوئے بیٹھا تھا اچانک سنبھل گیا۔ بعض خوشامدی مصاحبوں کی پیشانی پر بل پڑ گئے کہ ان کے آقا کا نظامِ عدل ایک مفلس نوجوان کی تنقید کا ہدف بن گیا تھا۔ ''مجھے شکایت یہ ہے کہ آپ کے عہدِ اقتدار میں علم کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ میں کئی دن تک صرف اس لیے بھٹکتا رہا کہ مجھے آپ کے دروازے تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ کسی نے میری رہنمائی نہیں کی اور کوئی اس قابل نہیں تھا کہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے آپ کے روبرو کھڑا کر دے۔ لوگوں کے اعلیٰ مراتب انہیں اس بات سے روکتے ہیں کہ والئ مکہ کے حضور ایک نادار طالبِ علم کی سفارش کر سکیں۔'' امامؒ، اس لہجے میں بول رہے تھے، جس کے آگے بڑے بڑے خطیبوں کا زورِ کلام بے حقیقت نظر آنے لگا تھا۔

والئ مکہ نے اس نوعمر میں ایسی اثر انگیز تقریر کرنے والے کسی دوسرے شخص کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ چند لمحوں تک حیرت زدہ سا امام شافعیؒ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بڑی نرم آواز میں بولا۔ ''نوجوان! اب تمہیں کسی سفارش کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے دل کی بات کہنے کے لیے بالکل آزاد ہو۔''

"امیر! میں دربارِ خلافت سے کلاہ و منصب نہیں چاہتا۔ میری درخواست ہے کہ آپ حضرت امام مالکؒ کے نام ایک خط تحریر کر دیں۔ میں نے سنا ہے کہ امامؒ کی درس گاہ میں آسانی سے داخلہ نہیں ملتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا سفارش نامہ دیکھ کر امامؒ انکار نہیں کریں گے میں آپ کے سامنے صرف چند لفظوں کا سوال کرتا ہوں۔ ایسے لفظ جو مالک بن انسؒ کو میری طرف متوجہ کر دیں۔"

والیٔ مکہ امامؒ کی خواہش سن کر حیران رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک مفلس نوجوان کا ذوقِ طلب عام انسانی سطح سے اس قدر بلند ہوگا۔ امامؒ نے اپنے طرزِ گفتگو سے اسے مسخر کر لیا تھا۔ "نوجوان! تمہاری سفارش کر کے مجھے خوشی محسوس ہوگی۔" وہ بہت زیادہ پر جوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے سارے ضروری کاموں کو پسِ پشت ڈال کر فوری طور پر سرکاری محرّر کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ حضرت امام مالکؒ اور عاملِ مدینہ کے نام علیحدہ علیحدہ خط تحریر کیے جائیں۔ دونوں خطوں میں امام شافعیؒ کے بے پناہ شوقِ علم کا ذکر کیا گیا تھا۔ والیٔ مکہ کے تاثرات کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ وہ امامؒ کی خاطر عاملِ مدینہ سے درخواست کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ.... اس نوجوان محمد بن ادریس کو اپنے ہمراہ لے کر خود امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوں۔

ایک روایت کے مطابق والیٔ مکہ، امام شافعیؒ کو کچھ نقد رقم بھی دینا چاہتا تھا مگر آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا۔ "میرے لیے امیر کی یہی عنایت کافی ہے۔" جب امامؒ، والیٔ مکہ کے خطوط لے کر واپس جا رہے تھے تو وقت نے دیکھا کہ حاضرینِ دربار کے چہرے اتر گئے تھے۔ آج تک قصرِ امارات کے دروازے پر ایسا کوئی سائل نہیں آیا تھا کہ جس نے آسائشِ دنیا کو ٹھکرا کر علم کا سوال کیا ہو۔

آخر وہ تاریخی وقت آ پہنچا جب قریش کا یہ عظیم فرزند، تلاشِ علم میں مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت امام شافعیؒ کی عمر چودہ سال تھی اور چہرے پر ابھی داڑھی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ زادِ سفر اتنا مختصر تھا کہ دو یمنی چادروں کے سوا کوئی تیسری چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ جب امامؒ، ذی طویٰ کے مقام پر پہنچے تو آپ کو ایک پڑاؤ دکھائی دیا۔ امامؒ نے دور سے ان لوگوں کو سلام کیا۔ ادھر سے بھی گرم جوشی کے ساتھ جواب دیا گیا۔ اچانک امامؒ نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ امامؒ اسے دیکھ کر ٹھہر گئے۔

وہ بزرگ قریب آئے اور بڑے عاجزانہ لہجے میں امامؒ سے کہنے لگے۔ "ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ کھانے میں شرکت کرو۔" امامؒ گریز کر رہے تھے۔ آپ نے زبان سے تو انکار نہیں کیا لیکن



آپ کے چہرے سے عدم شرکت کے جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ بوڑھا دوبارہ جذباتی انداز میں بولا۔ "کھانا نکل چکا ہے۔ تمہیں خدا کی قسم! تم ہمارے ساتھ ضرور شریک ہو۔" بوڑھے کے لہجے سے اس کی دلی محبت کا اظہار ہو رہا تھا۔ امامؒ مجبور ہو گئے اور پھر ان لوگوں کے ساتھ دسترخوان پر چلے گئے۔ وہ لوگ پانچوں انگلیاں سالن میں ڈبو کر کھانا کھاتے تھے۔ حضرت امامؒ نے بھی ان کی تقلید کی تاکہ میزبان کو کسی قسم کی کراہیت محسوس نہ ہو۔ کھانے کے بعد امامؒ نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا۔

"تم مکی ہو؟" اچانک بوڑھے نے امامؒ سے ایک عجیب سوال کر ڈالا۔ آپ نے اثبات میں جواب دیا۔ بوڑھے نے دوبارہ پوچھا۔ "قریشی ہو؟" امامؒ نے اقرار میں اپنے سر کو جنبش دی لیکن آپ کو بوڑھے کی قیافہ شناسی پر شدید حیرت ہو رہی تھی۔

امامؒ چند لمحوں تک خاموش رہے، پھر آپ بوڑھے سے پوچھ ہی بیٹھے۔ "بزرگ! بے شک میں مکی بھی ہوں اور قریشی بھی مگر آپ کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی؟"

بوڑھے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "شہری ہونا تو تمہارے لباس سے ظاہر ہے۔ عرب کے دیگر شہروں کے مقابلے میں مکے کا اپنا ایک الگ انداز ہے اور تمہارے لباس میں انفرادیت نظر آ رہی ہے۔ قریشی ہونے کی علامت تمہارے کھانے کے طریقے سے ظاہر ہوتی ہے جو دوسروں کا کھانا بے تکلفی کے ساتھ کھاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ خواہش بھی رکھتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی دسترخوان پر اس سے بے تکلفی کا مظاہرہ کریں۔ یہ عادت صرف اہلِ قریش کی ہوتی ہے، تم اپنی اسی خصلت کی وجہ سے پہچانے گئے۔"

حضرت امام شافعیؒ، بوڑھے شخص کی دوربین اور تجربہ کار نگاہوں سے بہت متاثر ہوئے پھر آپ نے اس سے ایک سوال کیا۔ "بزرگ! آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

"رسول اللہ ﷺ کا شہر یثرب (مدینہ) میرا وطن ہے۔" بوڑھے نے بہت آہستہ سے کہا۔ مدینے کا نام لیتے ہی اس کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا تھا۔

امام شافعیؒ بھی بوڑھے کی اس کیفیت کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ "مدینے میں کتاب اللہ کا علم اور سنتِ رسولؐ کے مطابق فتویٰ دینے والا کون ہے؟" امام شافعیؒ نے بوڑھے شخص سے دوسرا سوال کیا۔

"حضرت مالک بن انسؒ۔" بوڑھے نے نہایت ادب سے امام مالکؒ کا نام لیا۔

امام مدینہؒ کا نام سنتے ہی امام شافعیؒ نے ایک سرد آہ کھینچی اور خاموش ہو گئے۔

بوڑھا آپ کی اس کیفیت کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ جب امامؒ کچھ دیر تک ایک لفظ بھی نہ بولے تو بوڑھے کو پریشان سی لاحق ہوگئی۔

"آہ! تمہیں کیا معلوم کہ مجھے امام مالکؒ سے ملنے کا کتنا شوق ہے؟" امام شافعیؒ نے بڑی حسرت سے کہا۔

"نوجوان! خوش ہو جاؤ کہ خدا نے تمہاری آرزو پوری کردی۔" بوڑھا پرجوش لہجے میں بولا۔ "اس بھورے اونٹ کی طرف دیکھو، یہ ہمارا سب سے اچھا اونٹ ہے۔ تم اسی پر سوار ہو کر مدینے جاؤ گے۔ ہم بھی اسی طرف جا رہے ہیں، راستے بھر تمہاری خاطر کریں گے۔ کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دیں گے اور پھر تمہیں امام مالکؒ کے پاس پہنچا دیں گے۔" بوڑھے نے نہایت شفقت سے کہا۔ مدینے کا ذکر سن کر امام شافعیؒ پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ آپ نے بوڑھے کی مہمان نوازیوں کا دوبارہ شکریہ ادا کیا اور اس طرح خیالات میں کھو گئے کہ آپ کی نظریں دور افق پر جمی ہوئی تھیں۔ لوگ سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔ امام شافعیؒ اپنے خیالات کے سہارے ان سے بہت پہلے مدینے پہنچ گئے تھے۔ پھر بوڑھے کی آواز نے آپ کو چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا "اٹھو فرزند! ہم لوگ دیارِ رسولؐ کی جانب روانہ ہونے والے ہیں۔"

امامؒ خیالات کے حصار سے باہر نکل آئے اور وہ خواب ٹوٹ گئے جنھیں آپ بیداری کے عالم میں کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

مخلص اور سادہ دل انسانوں کا یہ قافلہ تیزی سے مدینے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بوڑھے نے حسبِ وعدہ امامؒ کو اسی بھورے اونٹ پر بٹھایا تھا۔ لوگ آپس میں گفتگو کرتے ہوئے راستے کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لیکن امام شافعیؒ کے ہونٹوں پر مہر خاموشی تھی۔ آپ بظاہر اہلِ کارواں کے ساتھ تھے مگر ذہنی طور پر کہیں اور سفر کر رہے تھے۔ امامؒ نے فاصلوں کو ختم کرنے کے لیے تصورات کی ایک عجیب و غریب دنیا آباد کی تھی۔ پھر ان ہی خیالوں کے دوش پر چلتے ہوئے حدیث وفقہ کے دربار میں داخل ہوگئے۔ جہاں ہر طرف نور ہی نور بکھرا ہوا تھا اور علم کے بے شمار پیاسے ایک شخص کے سامنے غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے بیٹھے تھے۔ امامؒ نے مسند پر جلوہ افروز ہونے والے بزرگ کا پیکر تراشنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پھر کسی آواز نے آپ کے خیالات کا طلسم توڑ دیا......

"مدینہ ابھی کتنی دور ہے؟" امام شافعیؒ نے بوڑھے اجنبی سے پوچھا۔

"فرزند! ابھی تو ہم روانہ ہوئے ہیں۔" بوڑھے نے حیرت سے جواب دیا۔ "یہ سفر کم سے کم ایک ہفتے میں تمام ہوگا۔ کیا تم اونٹ پر کسی قسم کی تکلیف محسوس کر رہے ہو؟" بوڑھے کا لہجہ ہمدردانہ تھا۔



"نہیں۔ میں بہت آرام سے ہوں۔" امام شافعیؒ نے اپنے دل کی بات چھپاتے ہوئے کہا۔ "بس یوں ہی دریافت کر رہا تھا۔ سفر آخر سفر ہے۔ جب تک انسان منزل پر نہ پہنچ جائے اس وقت تک بے چینی تو رہتی ہے۔" امامؒ اپنے شوقِ دید کی کیفیت کس کو بتاتے پر اور جذبات کی وارفتگی کو کون سمجھتا؟ اس لیے اپنے ساتھیوں سے دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔

منزل دور تھی اور امامؒ اپنی زندگی کا پہلا طویل سفر کر رہے تھے۔ راستے کی ناہمواریوں نے جلد ہی طبیعت میں بے کیفی کا رنگ پیدا کر دیا۔ جب کچھ تھکن سی محسوس ہونے لگی تو امامؒ نے قرآن حکیم کی تلاوت شروع کردی۔ بہت دیر تک کلامِ الٰہی کی زیرِ لب پڑھتے رہے تھے۔ پھر غیر ارادی طور پر آہستہ آواز میں قرات کرنے لگے۔ بوڑھا جو امامؒ کے قریب ہی چل رہا تھا، سحر انگیز آواز سن کر چونک پڑا۔ اس نے اپنے اونٹ کو آگے بڑھایا اور امامؒ کے بالکل نزدیک آکر بولا۔ "فرزند! تم بہت اچھی تلاوت کرتے ہو۔ اگر اپنی آواز کو بلند کرلو تو ہمارے دوسرے ساتھی بھی اس نعمتِ لازوال سے فیض یاب ہو جائیں گے۔"

امامؒ اپنے کاموں میں نمائش کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے لیکن آپ نے ہم سفروں کی دل جوئی کے لیے بلند آواز میں قرات شروع کردی۔ خدا نے امامؒ کو فطری طور پر خوش الحان بنایا تھا۔ جیسے ہی آپ کی آواز بلند ہوئی، صحرا پر وجد سا طاری ہوگیا۔ قرآنی کلمات کے جلال نے پوری فضا کو مسحور کر دیا۔ ہر شے اپنی جگہ ساکت نظر آنے لگی۔ یہاں تک کہ چلتے ہوئے اونٹ بھی رک گئے۔ آپ دوبارہ زیرِ لب پڑھنے لگے۔ اونٹوں نے حسبِ معمول چلنا شروع کر دیا۔ پھر آٹھ دن تک یہی عمل جاری رہا۔ امامؒ جب بھی بلند آواز میں قرات کرتے، آگے بڑھتے ہوئے اونٹ اچانک ٹھہر جاتے۔ یہ قرآن حکیم کی لافانی تاثیر تھی۔ جس نے مسافروں کو راہ کی تمام دشواریوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔ لوگوں کو احساس ہی نہ ہو سکا کہ وہ ذی طویٰ سے کب چلے تھے۔ اور شہر رسولؐ تک کب پہنچے؟ اس طویل سفر کے دوران حضرت امام شافعیؒ کا یہ معمول رہا کہ آپ قرآن شریف ایک ختم دن میں کرتے تھے اور ایک رات میں۔ اس طرح تمام اہلِ قافلہ نے امامؒ کے توسط سے سولہ بار ختمِ قرآن کی سعادت حاصل کی۔

آٹھویں دن نمازِ عصر کے بعد امامؒ دیگر لوگوں کے ہمراہ مدینہ منورہ پہنچے۔ وقت تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اس لیے فوری طور پر مسجد نبویؐ میں نماز ادا کی گئی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی بوڑھے شخص نے امامؒ سے کہا۔ "فرزند! خدا کا شکر ہے کہ تم اپنی منزل تک پہنچ گئے۔" یہ کہہ کر اس نے مسجد نبویؐ کے ایک گوشے کی

طرف اشارہ کیا، جہاں انسانی ہجوم نظر آ رہا تھا۔ ''یہ امام مالکؒ کا حلقہ درس ہے۔ اب چاہو تو ان سے ملاقات کر سکتے ہو۔''

ناقابلِ بیان خوشی کے احساس سے امامؒ کا چہرہ روشن ہو گیا۔ ''بزرگ! خدا آپ کو اجرِ عظیم دے۔'' امام نے بڑے جذباتی لہجے میں بوڑھے شخص کا شکریہ ادا کیا اور جب وہ اجنبی محسن رخصت ہو گیا تو آپ لرزتے قدموں سے روضہ رسولؐ کی طرف بڑھے۔ امامؒ جس کے اقوالِ قدسیہ کا علم حاصل کرنا چاہتے تھے، وہی ذاتِ گرامی آپ کی نظروں کے سامنے محو خواب تھی۔ امام شافعیؒ اس طرح روضہ رسولؐ کی جانب بڑھ رہے تھے جیسے کوئی لاغر و نحیف انسان بستر سے اٹھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔ جلالِ رسالتؐ سے امامؒ کے جسم کی ساری توانائی سلب ہو چکی تھی۔ آپ نے زیرِ لب اپنے خدا کو پکارا۔ ہمت واستقامت کی دعا مانگی۔ پھر آہستہ آہستہ سرورِ کونینؐ کے پائے اقدس کی طرف بڑھے۔ جذبہ، امامؒ کا دستگیر تھا اور شوق، مشکل کشا۔ چند لمحوں کا فاصلہ صدیوں میں تبدیل ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ امامؒ نے اپنی غلامی کا حوالہ پیش کیا اور اس کے ساتھ ہی نہایت پُرسوز آواز میں رحمتہ اللعالمینؐ کے حضور سلامِ عقیدت پیش کیا۔ یہاں تک کہ آپ کی آنکھیں بھیگ گئیں اور شدید عالمِ اضطراب میں دعا کے لیے دونوں ہاتھ بلند ہو گئے۔

''میں کہ تیرا نقشِ کفِ پا، میں کہ تیرے راستے کا غبار، میں کہ تیری بارگاہِ کرم کا گدائے ازلی۔'' امامؒ شہہ عرب و عجمؐ کے دربارِ ابدی میں گریہ وزاری کر رہے تھے۔ ''اگر تمام کائنات مل کر بھی مدح و ثنا کا اہتمام کرے تو حشر تک تیری سیرت کا بیان ختم نہ ہو۔ زبانیں عاجز رہ جائیں اور لفظوں کا ذخیرہ اپنی تنگ دامانی پر شرمسار ہو جائے۔ اے مولائے کلؐ، اے ختم الرسلؐ ہماری کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرما کہ ہم تو حضورِ شاہ، حالِ دل کہنے کا بھی سلیقہ نہیں رکھتے۔ اے صحراؤں پر برسنے والے ابرِ کرم! شافعیؒ کے رہگزار قلب پر بھی آگہی کی چند بوندیں، عشق جاں سوز کے چند قطرے۔'' امامؒ درود و سلام کے بعد دیر تک دعا کرتے رہے۔ پھر جب آپ کے بے قرار دل کو سکون حاصل ہو گیا تو اس مجلسِ نور کی طرف بڑھے جہاں امام مالکؒ تشنگانِ علم کو حدیثِ رسولؐ کا درس دے رہے تھے۔

امام شافعیؒ اپنی اس پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''مسجدِ نبویؐ میں لوگوں کے درمیان مجھے امام مالکؒ دکھائی دیے۔ آپ کا حلیہ مبارک یہ تھا کہ ایک چادر کا تہبند باندھے ہوئے تھے اور دوسری چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ میں اس مردِ جلیل کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ امام مالکؒ بلند آواز میں حدیث



بیان فرما رہے تھے۔ 'مجھ سے نافعؒ نے ابنِ عمرؓ کے واسطے سے اس قبر کے مکینؐ کی یہ حدیث روایت کی ہے۔' یہ کہہ کر امام مالکؒ نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا اور روضہ رسولؐ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل پر امام مالکؒ کی ہیبت چھا گئی۔ دوسرے لوگ بھی اس طرح بیٹھے تھے کہ ان کی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔''

کچھ دیر بعد امامؒ کا درس ختم ہو گیا۔ امام شافعیؒ نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح امام مدینہؒ کے روبرو حاضر ہو کر اپنی دلی خواہش کا اظہار کریں مگر مالک بن انسؒ کے رعب و جلال کے باعث آپ اپنے قدموں کو جنبش بھی نہ دے سکے۔ یہاں تک کہ انسانی ہجوم آہستہ آہستہ منتشر ہو گیا۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ امام مالکؒ مسجد نبویؐ میں تشریف لے گئے۔ پھر اذان ہوئی۔ امام شافعیؒ نے بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر امام مالکؒ اپنے گھر تشریف لے جانے لگے۔ اس وقت بھی امامِ مدینہ کچھ لوگوں کے درمیان چل رہے تھے۔ ایک بار پھر امام شافعیؒ کی حسرت ناآسودہ ہونٹوں تک آتے آتے رہ گئی۔ آپ نے چاہا کہ امام مالکؒ کو آواز دے کر روک لیں مگر زبان نے ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ زبان جو فصاحت و بلاغت کا آبشار تھی، امام مالکؒ کے سامنے گنگ ہو کر رہ گئی۔ پھر آپ نے چاہا کہ امام مالکؒ کے پیچھے پیچھے چلے جائیں۔ کوئی تو مقام ایسا آتا کہ جہاں ٹھہر کر امامِ مدینہ فرزندِ قریش سے پوچھتے۔ 'اے نوجوان! تجھے کس چیز کی طلب ہے؟' مگر یہ بھی محض ایک خواب تھا۔ امام شافعیؒ خاموش کھڑے دیکھتے رہے، یہاں تک کہ امام مالکؒ آپ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ بڑا عجیب وقت تھا۔ نہ دستِ شوق، دامنِ محبوب تک جا سکا اور نہ پیشِ یار، حرفِ آرزو کی تشریح ہو سکی۔ بس ایک ساعتِ فراق تھی جو کائنات پر مسلط ہو کر رہ گئی۔

حضرت امام مالکؒ کے جانے کے بعد امام شافعیؒ بہت دیر تک حیران و پریشان کھڑے رہے۔ مایوسیاں دل و دماغ پر غلبہ حاصل کرتی جا رہی تھیں۔ آج آپ کو اندازہ ہوا تھا کہ امام مدینہؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہونا کس قدر دشوار کام ہے؟ امامؒ، منزل کے قریب پہنچ کر بھی خود کو ناآسودۂ منزل سمجھ رہے تھے۔ پھر اچانک آپ کو والیٔ مکہ کے خطوط یاد آئے۔ گہری تاریکیوں میں امید کی ایک تیز کرن نمودار ہوئی۔ امامؒ کا بے قرار دل ٹھہر سا گیا۔ پھر آپ نے مقامی باشندوں سے عاملِ مدینہ کا پتہ پوچھا اور اس عمارت کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں خلافتِ عباسیہ کے حکام دنیاوی جاہ و جلال کے ساتھ قیام پزیر تھے۔

رات ہو چکی تھی۔ عاملِ مدینہ نے امام شافعیؒ کو سرکاری اقامت گاہ میں ٹھہرایا اور گفتگو صبح تک کے

لیے ملتوی کر دی۔ امامؒ پر مدینے کی یہ رات گراں گزری۔ آپ کچھ دیر بھی سکون سے نہیں سو سکے۔ بار بار آنکھ کھل جاتی اور دماغ میں ایک ہی خیال گردش کرتا رہتا۔ ''شرف باریابی یا ناکامی و نامرادی۔؟'' اس تصور نے امامؒ کو رات بھر شدید ذہنی کش مکش میں مبتلا رکھا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ آپ نے نمازِ فجر ادا کی اور بے چینی سے سورج نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ امامؒ نے آج تک کسی کام کے آغاز میں ایسی بے قراری محسوس نہیں کی تھی۔ زندگی میں نازک اور سنگین لمحات بھی آئے مگر امامؒ نے نوعمری کے باوجود ہمیشہ بہترین صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا تھا۔ پھر یہ بے چینی کیوں تھی؟ شاید اس اضطراب کی وجہ وہ الفاظ ہوں جو اہلِ مکہ نے روانگی کے وقت آپ سے کہے تھے۔

''کس کی جرات ہے کہ امام مالکؒ کے سامنے لب کشائی کر سکے؟''

یہ کوئی مفروضہ نہیں تھا۔ گزشتہ روز امام شافعیؒ خود اس کیفیت سے دوچار ہو چکے تھے اور اس وقت بھی آپ پر وہی کیفیت طاری تھی۔ امام شافعیؒ اپنے پریشان خیالات میں الجھے ہوئے تھے کہ اچانک عاملِ مدینہ نے آپ کو طلب کر لیا۔ انتظار کی ساعتیں ختم ہو چکی تھیں۔ امامؒ تیز رفتاری کے ساتھ عاملِ مدینہ کی نشست گاہ میں پہنچے۔ سلام کیا اور والیٔ مکہ کا خط پیش کر دیا۔

عاملِ مدینہ بہت دیر تک اس سفارش نامے کو پڑھتا رہا۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کی علامتیں ابھر کر ڈوبتی رہیں۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ذہنی کش مکش کا شکار ہے۔ آخر عاملِ مدینہ نے والیٔ مکہ کا خط ایک طرف رکھ دیا اور پھر بڑے تھکے ہوئے لہجے میں امام شافعیؒ سے مخاطب ہوا۔ ''فرزند! میرے لئے امام مالکؒ کے دروازے پر کھڑے ہونے سے زیادہ آسان یہ ہے کہ مدینے سے مکے تک پیدل گھسٹتا ہوا چلا جاؤں۔''

عاملِ مدینہ کا جواب سن کر امامؒ کا روشن چہرہ بجھ گیا اور ساری دنیا تاریک نظر آنے لگی۔ شوقِ جستجو طویل سفر' والیٔ مکہ کا سفارش نامہ۔ امامؒ کے پاس کتنے حوالے تھے' کتنے وسیلے تھے مگر ایک بھی کام نہیں آیا مزاجِ شہریاری پر گراں تھا کہ وہ ایک طالبِ علم کی سفارش کے لئے کسی فقیہہ کے دروازے تک جائے۔

امامؒ نے بڑے کرب کے عالم میں سوچا۔ پھر سنگی فرش سے کرسیٔ اقتدار کی بلندی کا اندازہ کیا۔ اس دوران عاملِ مدینہ امامؒ کے چہرے کے تغیرات کا مسلسل جائزہ لے رہا تھا۔ امامؒ نے اپنی بکھری ہوئی قوتِ گفتار کو سمیٹا آپ امیرِ شہر سے اس کی بے نیازی پر فیصلہ کن گفتگو کرنا چاہتے تھے مگر عاملِ مدینہ اس سے پہلے ہی بول پڑا۔



''فرزند! کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ آستانہ مالکؒ پر حاضر ہونے میں میری توہین ہے؟'' عاملِ مدینہ کا لہجہ بڑا اثر انگیز تھا۔ ''یہ تو میرے لئے شرف ہے کہ میں درِ امامؒ پر کھڑا ہوں۔ یہاں تک کہ امامؒ باہر تشریف لائیں اور مجھے چشمِ التفات سے سرفراز کریں۔''

عاملِ مدینہ کا طرزِ کلام دیکھ کر امامؒ کے جسم میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ آپ کا جذبۂ طلب ہجوم یاس میں ڈوب کر دوبارہ اسی شدت سے ابھر آیا۔ ''خدا امیر کو اجرِ عظیم دے۔'' امام شافعیؒ پُر جوش انداز میں بول رہے تھے۔ ''اگر آپ ذرا سی توجہ دیں امام مالکؒ خود یہاں تشریف لا سکتے ہیں۔''

''افسوس! یہ کہاں ممکن ہے۔'' عاملِ مدینہ کے الفاظ میں ایک عجیب سی حسرت پوشیدہ تھی۔ ''فرزند! تم امام مالکؒ کو نہیں جانتے میرے لیے یہی بہت ہے کہ میں صبح سے شام تک امامؒ کے دروازے پر کھڑا رہوں اور وہ صرف ایک بار میری طرف متوجہ ہو جائیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ میں نے گھنٹوں انتظار کیا مگر ہر مرتبہ نوازش و کرم سے محروم ہی رہا۔''

اب امام شافعیؒ عاملِ مدینہ کی مجبوریوں کو سمجھ گئے تھے' آستانہ مالکؒ تک نہ جانے کی وجہ غرورِ اقتدار نہیں' خود امام مالکؒ کی امراء وقت سے بے اعتنائی تھی۔ جس نے عاملِ مدینہ کو شکستہ دل بنا دیا تھا۔ امام شافعیؒ نے حالات کے تمام پہلوؤں پر غور کیا عاملِ مدینہ سے آپ کو کوئی شکایت نہیں تھی کہ وہ درِ مالکؒ کا طواف کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ امامؒ اس حقیقت سے آشنا تھے کہ دنیا میں ہر شخص کی کچھ مجبوریاں ہیں۔ خود امامؒ بھی اپنے شوقِ علم سے مجبور تھے۔ بالآخر آپ نے دوسروں کی مجبوریوں پر اپنی مجبوری کو ترجیح دی اور بغیر کسی تکلف کے عاملِ مدینہ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

''امیر! آپ کی معذرت بجا مگر اس بے وسیلہ طالب علم کی طرف بھی دیکھئے جو طویل سفر کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔'' امامؒ کی آواز پرسوز تھی اور ایک ایک لفظ تصویرِ درد بن کر رہ گیا تھا۔ ''امامؒ آخر امامؒ ہیں۔ ان کے دروازے تک جا کر ناکام لوٹ آنا بھی کارِ ثواب ہے۔ اگر مناسب خیال کریں تو علم کی خاطر ایک کوشش اور سہی۔'' امامؒ نے اس طرح شرحِ آرزو کی تھی کہ عاملِ مدینہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''اس عمر میں تمہارا حسنِ کلام عجیب ہے۔ تمہاری گفتگو سے پختہ کار لوگوں کی رائے بھی متزلزل ہو جاتی ہے۔ میں تم سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ تم جرات مند بھی ہو اور باادب بھی۔'' عاملِ مدینہ امام شافعیؒ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''فرزند! میں تمہاری خاطر امام مالکؒ کے دروازے تک جانے کے لئے تیار ہوں مگر یہ دوڑ دھوپ' یہ قیاس آرائی یہ خوش گمانی ایک کارِ عبث کے سوا کچھ نہیں۔''

''آپ چلنے کا ارادہ تو کریں۔'' امام شافعیؒ نے عاملِ مدینہ کو آمادہ پا کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس والیٔ مکہ کا سفارش نامہ بھی موجود ہے۔''

''صد حیف! ایسے سارے خطوط امامؒ کی نگاہ میں بے اثر ہیں۔'' عاملِ مدینہ نے والیٔ مکہ کے خط کی اہمیت کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ ''امامؒ کسی حوالے کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ خلیفہ مہدی کا بہت خیال رکھتے ہیں لیکن اس کی سفارش بھی تمہارے کسی کام نہیں آسکتی۔'' یہ کہہ کر عاملِ مدینہ سرکاری امور کی طرف متوجہ ہو گیا اور امام شافعیؒ سے سہ پہر کے بعد چلنے کا وعدہ کر لیا۔

☆☆☆

پھر مسجد نبویؐ کے قریب رہنے والوں نے عاملِ مدینہ کو ایک نوجوان کے ساتھ آستانہ مالکؒ پر کھڑے دیکھا۔ ان لوگوں کے لئے یہ کوئی عجیب منظر نہیں تھا۔ امرائے وقت درِ مالکؒ پر حاضر ہوتے ہی رہتے تھے۔ عاملِ مدینہ نے کچھ دیر اس بات کا انتظار کیا کہ شاید کوئی مکان سے باہر آئے اور وہ اپنا پیغام امام مالکؒ تک پہنچا ئیں۔ مگر جب ایسا نہیں ہوا تو عاملِ مدینہ خود آگے بڑھا اور اس نے دروازے پر دستک دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک سیاہ فام باندی دروازے پر آئی۔

''اپنے آقا کی خدمت میں عرض کرو کہ امیر دروازے پر شرفِ باریابی کا منتظر ہے۔'' عاملِ مدینہ نے آہستہ سے کہا۔ امام شافعیؒ نے محسوس کیا کہ اس کی آواز میں امیروں جیسا وقار موجود نہیں تھا۔

باندی فوراً ہی اندر چلی گئی۔ عاملِ مدینہ اور امام شافعیؒ بے چینی سے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ آخر بہت دیر بعد وہ باندی دوبارہ دروازے میں نمودار ہوئی اور امیر سے مخاطب ہوئی۔ ''میرے آقا آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں اگر کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہے تو کاغذ پر لکھ دیجئے۔ اس کا جواب آپ کو مل جائے گا اگر کسی حدیثِ رسولؐ کے بارے میں کچھ معلوم کرنا ہے تو آپ کو مجلسِ حدیث کا دن یاد ہے، اس روز تشریف لے آیئے۔'' باندی کی گفتگو سن کر امام شافعیؒ سناٹے میں آگئے۔ عاملِ مدینہ کی کہی ہوئی ساری باتیں حقیقت سے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔

باندی، امام مالکؒ کا جواب پہنچا کر پلٹنے ہی والی تھی کہ عاملِ مدینہ نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔ ''اپنے آقا کی خدمت میں عرض کرو کہ امیر، والیٔ مکہ کا ایک اہم پیغام لے کر حاضر ہوا ہے۔'' یہ سن کر باندی چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی عاملِ مدینہ نے امام شافعیؒ سے پوچھا۔ والیٔ مکہ کا سفارش نامہ کہاں ہے؟ اگر امام مالکؒ نے ہمیں طلب فرمایا تو اس کی ضرورت پیش آئے گی۔'' امام شافعیؒ نے فوراً ہی اپنے



پیرہن کی جیب سے والیٔ مکہ کا خط نکال کر عاملِ مدینہ کے حوالے کر دیا۔

باندی تیسری بار باہر آئی۔ اس نے درس گاہ کا دروازہ کھول کر عاملِ مدینہ سے اندر آنے کے لئے کہا۔ اور ایک کرسی درمیان میں رکھ دی۔ چند لمحوں بعد حضرت امام مالکؒ اس طرح تشریف لائے کہ آپ کے جاہ و جلال کے سامنے کسی مملکت کے شہنشاہ کا وقار بھی ہیچ تھا۔ ایک عام سی عبا آپ کے زیبِ تن تھی (یہ امام کی تنگ دستی کا زمانہ تھا) آپ کو دیکھ کر عاملِ مدینہ اور امام شافعیؒ کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

پھر امامؒ کرسی پر جلوہ افروز ہو گئے۔ (بعض کتابوں میں درج ہے کہ امام مالکؒ نے وہ کرسی عاملِ مدینہ کے لئے بھیجی تھی اور خود فرش پر بیٹھ گئے تھے۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری نے اپنی تصنیف آثارِ امام شافعیؒ میں تحریر کیا ہے کہ امام مالکؒ خود اس کرسی پر تشریف فرما ہوئے تھے۔ یہ بات بظاہر مالک بن انسؒ جیسے بزرگ کی فطرت کے خلاف نظر آتی ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امام مالکؒ کبھی کسی خلیفہ یا امیر کے سامنے نہیں بیٹھے مگر یہاں معاملہ برعکس تھا۔ اس وقت عاملِ مدینہ ایک مہمان یا سائل کی حیثیت سے دروازے پر آیا تھا۔ نتیجتاً امام مالکؒ نے میزبانی کا حق ادا کرتے ہوئے امیر کو کرسی پیش کر دی تھی اور خود فرش پر بیٹھ گئے تھے یہ امامؒ کی کسرِ شان نہیں، جلالتِ ذات کا عظیم مظاہرہ تھا۔ بہر حال دونوں میں سے کوئی بھی صورت رہی ہو، واقعہ اپنی تمام تر تاریخی صداقتوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔)

حضرت امام مالکؒ والیٔ مکہ کا خط پڑھ رہے تھے اور عاملِ مدینہ سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس میں اتنی بھی جرات نہیں تھی کہ وہ ایک بار نظریں اٹھا کر امام مالکؒ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے سکتا۔

البتہ امام شافعیؒ بار بار امام مالک بن انسؒ کی طرف دیکھتے تھے کہ فرزندِ قریش کا تو مستقبل ہی امامِ مدینہؒ کے مزاج سے وابستہ تھا، آخر سفارش نامہ تمام ہوا والیٔ مکہ نے اختتامی سطروں پر تحریر کیا۔

''اس طالب علم کا حال سن لیجئے اس کے ساتھ محبت سے پیش آیئے اور اس کے شوق آرزو کی تکمیل کر دیجئے۔''

امام مالکؒ نے یہ عبارت پڑھتے ہی والیٔ مکہ کا خط زمین پر پھینک دیا اور انتہائی ناگوار لہجے میں فرمایا۔ ''کیا اب رسول ﷺ کا علم بھی سفارش سے حاصل کیا جائے گا۔''

امام شافعیؒ نے گھبرا کر پہلے والیٔ مکہ کے خط کو دیکھا جو درس گاہ مالکؒ کے غیر پختہ فرش پر اس طرح پڑا تھا جیسے وہ دنیا کی ناکارہ ترین شے ہو۔ امامؒ جس حوالے کو معتبر سمجھتے تھے وہ ایک ایسا کاغذ تھا جس کے

حروف اپنا مفہوم کھو چکے تھے اور جس پر نظر آنے والی مہرِ اقتدار بے حقیقت ثابت ہو چکی تھی۔ پھر آپ نے عاملِ مدینہ کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں آثارِ ندامت وشکست کے سوا کوئی دوسری علامت موجود نہیں تھی۔ امامؒ ایک بار پھر مایوسیوں کے نرغے میں تنہا رہ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ ناکامی ایک طالب علم کا مقدر بن جاتی آپ نے دوبارہ اس امید پر عاملِ مدینہ کی جانب دیکھا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی آمد کا مقصد بیان کرے گا لیکن وہ کسی بے جان مجسمے کی مانند اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکا۔ اس سلسلے میں خود امام شافعیؒ کا بیان تھا۔

''عاملِ مدینہ کے ہونٹ کانپ رہے تھے وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر دہشت کے باعث اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اب میں صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ بارگاہِ مالکؒ میں امیر کی حیثیت ایک بے زبان مفلس سے زیادہ نہیں تھی۔ آخر میں نے اپنی بکھرتی ہوئی قوت ارادی کو سمیٹا اور امام مالکؒ کے حضور عرض کرتے ہوئے کہا کہ میں خاندانِ مطلّب کا ایک فرد ہوں۔ میرا دامن ظاہری اسباب سے خالی ہے' والئ مکہ اور عاملِ مدینہ کی سفارشات اس لئے حاصل کی تھیں کہ آپ کی ذاتِ گرامی کو اپنی پہنچ سے دور پاتا تھا۔ اظہارِ حال کی زیادہ طاقت نہیں رکھتا۔ بس میرا خدا ہی علیم وخبیر ہے کہ یہاں تک کس طرح پہنچا ہوں؟ اتنے قریب آنے کے بعد بھی میں نہیں جانتا کہ ناکام لوٹا دیا جاؤں گا یا کسی گوشے میں مجھے پناہ مل جائے گی؟'' اگرچہ امام مالکؒ کے جلالِ معرفت سے امام شافعیؒ کے لہجے میں بھی لرزش پیدا ہو گئی تھی لیکن آپ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کی بات زبان تک لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ طرزِ گفتگو میں کوئی پیچ وخم نہیں تھا۔ اس لئے امامِ مدینہؒ فرزندِ قریش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' امام مالکؒ نے علم کی طلب میں سفر کرنے والے مفلس نوجوان پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''محمد بن ادریس۔'' امام شافعیؒ نے نہایت مودبانہ لہجے میں مختصر جواب دیا۔

امام مالکؒ چند لمحوں تک آپ کو گہری نظروں سے دیکھتے رہے پھر محبت بھرے انداز میں فرمایا۔ ''محمد! اللہ سے ڈرو اور گناہوں سے بچتے رہو۔ تم ایک دن ضرور انسانیت کے بلند درجے تک پہنچو گے۔'' یہ ایک سند تھی جو امام مالکؒ کی طرف سے فرزندِ قریش کو عطا کی گئی تھی۔ امامِ مدینہؒ کی زبان سے تحسین آمیز کلمات سن کر امام شافعیؒ آبدیدہ ہو گئے اور اظہارِ عقیدت کے لئے سر جھکا لیا۔

''محمد! تم کل سے درس میں شریک ہونا اور اپنے ساتھ ایک ایسے شخص کو بھی لیتے آنا جو تمہارے لئے قرآت کر سکے۔'' کچھ دیر بعد امام مالکؒ نے دوبارہ فرمایا۔ آخر امام شافعیؒ کو وہ اجازت نامہ مل گیا جس کے



حصول کے لئے والئ مکہ اور عاملِ مدینہ کی کوششیں بھی ناکام ہو چکی تھیں۔ بارِ احسان سے امامؒ کی گردن کچھ اور خم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی وہ تمام قیاس آرائیاں باطل ثابت ہو گئیں جن سے یہ تاثر ملتا تھا کہ سفارش کے بغیر امام مالکؒ کی مجلسِ درس میں داخلہ ممکن نہیں۔ امامؒ کی نظروں میں اپنی محرومی اور زمانے کی حوصلہ شکنی کے سارے گم گشتہ مناظر تازہ ہو گئے' پھر فرزندِ قریش کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں تیزی آ گئی۔ اشکوں کی یہ روانی امام مالکؒ کی کرم نوازیوں کے باعث تھی۔

امامِ مدینہ نے آپ کو روتے ہوئے دیکھا تو محبت سے سمجھایا۔ ''محمد! بس اب جاؤ' خدا نے تمہارے قلب کو اپنی نوازشات کے نور سے روشن کیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ارتکابِ گناہ سے یہ نور بجھ کر رہ جائے۔''

امام شافعیؒ اس مجلسِ علم سے جانا نہیں چاہتے تھے مگر آپ حکمِ مالکؒ آگے مجبور تھے۔ آخر بادلِ ناخواستہ عاملِ مدینہ کے ساتھ رخصت ہو گئے راستے میں امامؒ نے امیر کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر اب بھی گہری اداسیوں کا عکس نظر آ رہا تھا۔

آپ نے عاملِ مدینہ کے ذہن سے تکلیف دہ یادوں کے اثرات زائل کرنے کیلئے کہا۔ ''امیر! میں بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ کی توجہ سے میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد حاصل ہو گیا۔'' یہ الفاظ ادا کرتے وقت امام شافعیؒ کا لہجہ تشکر آمیز تھا۔

''فرزند! اس میں میری کوششوں کا کیا دخل؟'' امیر کی گفتگو میں سی ایک حسرتِ ناکام کی جھلک تھی۔ ''تم نے خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا کہ امامؒ میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے، مگر میں خوش کیوں نہ ہوں کہ تمہاری وجہ سے اتنی قربت میسر آ گئی میرے لئے یہی سعادت کافی ہے۔''

''امیر! میں تمام عمر اس واقعے کو فراموش نہ کر سکوں گا کہ آپ نے علم کی خاطر اتنی زحمت گوارہ کی۔'' امام شافعیؒ دل سے عاملِ مدینہ کے احسان مند تھے۔ مسلسل ناکام لوٹنے کے بعد یہ اسی کا حوصلہ تھا کہ وہ قریش کے ایک مفلوک الحال نوجوان کے لیے مالک بن انسؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بعد عاملِ مدینہ نے امام شافعیؒ کو ذاتی طور پر کچھ مراعات کی پیش کش کی مگر آپ کو امیرِ شہر کا کوئی مالی احسان گوارا نہیں تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن حضرت امام شافعیؒ درسِ مالکؒ میں شریک ہونے کے لئے مسجد نبویؐ پہنچے مگر وہاں پہلے ہی شائقینِ علم کا ایک بڑا ہجوم تھا۔ امام مالکؒ انتہائی پُرسوز لہجے میں حدیث روایت کر رہے تھے

اور حاضرین فرطِ ادب سے اس طرح ساکت بیٹھے تھے کہ ان کی سانسوں کی آواز تک نہیں سنائی دے رہی تھی۔ امام شافعیؒ دبے قدموں سے داخل ہوئے اور آخری صف میں جہاں جگہ ملی، وہیں بیٹھ گئے، امام مالکؒ حسبِ دستور فرما رہے تھے۔

"مجھ سے نافعؒ نے ابن عمرؓ کے واسطے سے اس قبر کی مکیں کی یہ حدیث روایت کی ہے......" یہ کہہ کر امام جھک گئے پھر سیدھے ہوئے اور ہاتھ پھیلا کر روضہ رسولؐ کی طرف اشارہ کیا۔ امام شافعیؒ دیگر مجالسِ حدیث میں بھی شریک ہوئے تھے مگر بزمِ مالکؒ کا انداز ہی عجیب تھا۔ جس طرح عالمِ جذب و کیفیت میں امام مالکؒ نے اپنے آقا کی حدیث بیان کی تھی اس منظر کو دیکھ کر امام شافعیؒ کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آپ سراسیمگی کے عالم میں فرش کی طرف دیکھنے لگے۔ وہاں زمین پر ایک تنکا موجود تھا۔ امام شافعیؒ نے گھبرا کر تنکا اٹھا لیا۔ یہ علمِ حدیث کے سلسلے میں ایک عجیب و غریب واقعہ ہے۔ امام شافعیؒ نے اپنے سفرنامے میں اس واقعے کی تفصیلات اس طرح بیان کی ہیں۔

"امام مالکؒ جب بھی کوئی حدیث سناتے، میں تنکے کو لعابِ دہن سے تر کر کے اپنی ہتھیلی پر لکھ لیتا۔ میرا خیال تھا کہ سب لوگ سماعتِ حدیث میں کھوئے ہوئے ہیں اور کوئی بھی میرے اس عمل سے باخبر نہیں ہے مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ امام مالکؒ اپنی مجلس میں شریک ہونے والے افراد کی ایک ایک حرکت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ امام مدینہؒ کی نظر سے میری ی حرکت بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔ میں بہت دیر تک بے خبری کی کیفیت میں مالک بن انسؒ کی بیان کردہ احادیث اپنے ہاتھ پر لکھتا رہا۔ آخر مجلس ختم ہو گئی لیکن اپنی محویت کے باعث مجھے کچھ پتہ ہی نہیں چل سکا۔ یہاں تک کہ میں نے امام مالکؒ کی بارعب آواز سنی، وہ مجھے اپنے قریب آنے کا حکم دے رہے تھے۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا تمام لوگ رخصت ہو چکے تھے اب میں بارگاہِ مالکؒ میں تنہا تھا۔ بمشکل تمام اپنی جگہ سے اٹھا اور لرزتے قدموں سے امام مالکؒ کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔

امام مالکؒ نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر بلند آواز میں فرمایا۔ "تم محمد بن ادریس ہو؟ میں نے ادب سے کہا "جی ہاں" امام مالکؒ نے دوبارہ سوال کیا "تم وقت پر شریکِ درس کیوں نہیں ہوئے؟ تم سے کہا گیا تھا کہ اپنے ساتھ ایک قرآت کرنے والے کو لے کر آنا مگر تم نے کسی ایک بات پر بھی عمل نہیں کیا۔ کیا علم اس طرح حاصل کیا جاتا ہے؟" امام کے ذہن میں گزشتہ روز کا ایک ایک منظر محفوظ تھا۔ میں نے اپنی مجبوری بیان کرتے ہوئے عرض کیا "میں وقت پر حاضر ہوا تھا مگر دوسرے طالبِ علم مجھ



سے پہلے حلقۂ درس میں جمع ہو چکے تھے۔ میں مجلسِ حدیث میں کسی بے ترتیبی یا بدنظمی کے جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے خاموشی سے آخری صف میں بیٹھ گیا۔ آئندہ تمام لوگوں سے پہلے آنے کی کوشش کروں گا۔ امامؒ میرا جواب سن کر چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے میں سمجھا کہ میری معذرت قبول کر لی گئی ہے مگر ایک مختصر سے وقفے کے بعد امامؒ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئے "تم نے بتایا تھا کہ حرم کے رہنے والے ہو" میں نے جواب دیا "جی ہاں! میں حرم کا باشندہ ہوں" امام مالک نے دوسرا سوال کیا۔ "تم مکی ہو؟" میں نے نہایت ادب سے کہا "میں غزہ میں پیدا ہوا تھا مگر میرے آباؤ اجداد کا وطن مکہ ہے" امام نے تیسرا سوال کیا "تم قریشی ہو؟" امام مالکؒ کے مسلسل سوالات سے مجھ پر گھبراہٹ سی طاری ہو گئی تھی لیکن پھر بھی میں نے ہمت کر کے جوب دیا "جی ہاں! میرا تعلق نسل قریش سے ہے" امامؒ نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا اور قدرے ناگوار لہجے میں فرمایا۔ "تمہارے بیان کردہ تمام اوصاف مکمل ہیں مگر اس کے ساتھ ہی تم میں ایک بے ادبی بھی موجود ہے" یہ میری ذات کے بارے میں ایک عجیب انکشاف تھا۔ میں امام مالکؒ کی بات سن کر لرز گیا اور مجھے محسوس ہونے لگا جیسے اس مجلسِ درس میں یہ میرا آخری دن ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ جب میں نگاہِ امامؒ میں بے ادب ٹھہرا تھا تو پھر دنیا میں کون میرے ادب پر گواہی دیتا؟ میں نے بڑی مشکل سے اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالا اور کانپتی ہوئی آواز میں عرض کیا۔ "امامؒ میں دنیا کی اس عظیم ادب گاہ میں ادب ہی سیکھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، پھر بھی آپ میری بے ادبی کی نشان دہی فرمائیں" میرے اس جواب سے امام مالکؒ کے چہرے پر نظر آنے والے ناگواری کے تاثرات کسی حد تک زائل ہو چکے تھے لیکن ابھی لہجے کی سختی باقی تھی۔

"تمہاری بے ادبی یہ ہے کہ تم سماعتِ حدیث کے آداب سے واقف نہیں ہو" امامؒ نے فرمایا "جب میں رسول کریم ﷺ کے کلمات سنا رہا تھا اور ساری مجلس ساکت و جامد ہو گئی تھی اس وقت تم اپنے ہاتھ پر کسی چیز سے کھیل رہے تھے"

اب میں صورتِ حال کو سمجھ چکا تھا۔ بے شک یہ عمل آدابِ مجلس کے خلاف تھا مگر امامؒ کو میری مجبوریوں کی خبر نہیں تھی میں نے بصدِ احترام اپنے اس فعل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "میرے پاس کاغذ نہیں تھا اس لیے آپ جو کچھ بیان فرما رہے تھے اسے اپنے ہاتھ پر لکھتا جا رہا تھا" امام مالکؒ کو میرے جواب پر شدید حیرت بھی، فوراً میرا ہاتھ اپنی طرف کھینچ کر دیکھا اور پھر فرمایا۔

"تمہارے ہاتھ پر تو کچھ بھی نہیں لکھا ہے!" میں نے عرض کیا "میں آپ کی بیان کردہ احادیث کو اپنے

لعاب دہن سے ایک تنکے کے ذریعے تحریر کر رہا تھا لعاب کا کوئی رنگ نہیں ہوتا اس لئے ہاتھ پر عکس باقی نہیں رہا۔ ویسے بھی مجھے تمام احادیث زبانی یاد ہو چکی ہیں۔'' میری بات سن کر امام مالکؒ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا فرمانے لگے ''سب نہیں' ایک ہی حدیث سنا دو'' میں نے فوراً کہا۔ مجھ سے مالکؒ نے نافعؒ اور ابنِ عمرؓ کے واسطے سے اس قبر کے مکیں یہ حدیث روایت کی ہے'' اور پھر امام مالکؒ ہی کی طرح میں نے بھی ہاتھ پھیلا کر روضہ رسولؐ کی طرف اشارہ کیا اس کے بعد وہ پچیس احادیث سنا دیں جو امامؒ نے آغازِ درس سے مجلس کے خاتمے تک بیان کی تھیں۔''

یہ امام شافعیؒ کی بے مثال قوتِ حافظہ کا ایک غیر معمولی مظاہرہ تھا جس سے امام مالکؒ یہاں تک متاثر ہوئے کہ آپ نے بے اختیار فرمایا۔ ''فرزند قریش! خدا تمہاری عمر دراز کرے۔''

☆☆☆

دوسرے دن امام شافعیؒ وقت سے پہلے ہی مسجد نبویؐ پہنچ گئے۔ آپ نے نمازِ ظہر ادا کی اور مجلسِ حدیث میں سب سے آگے اس طرح بیٹھے کہ امامِ مدینہ کے روبرو آپ کی نشست تھی' درس شروع ہونے سے پہلے امام مالکؒ نے محبت آمیز نظروں سے آپ کی جانب دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ''محمد! تم قرات کرنے والے کو اپنے ساتھ نہیں لائے؟''

''امام! اس دیار میں آپ کے سوا میرا کوئی شناسا نہیں ہے' میں کس کے سامنے عرضِ حال کرتا؟ آپ حکم دیں گے تو خود ہی قرات کروں گا۔'' امام شافعیؒ کو ایک بار پھر اپنی کم مائیگی کا احساس ہو چلا تھا اس لئے آپ کے لہجے میں سوزشِ دل نمایاں تھی۔

''تمہارے پاس کتاب بھی نہیں ہے' پھر کس طرح قرات کرو گے؟'' امام مالکؒ کا اشارہ ''موطا'' کی طرف تھا۔

''جب تک امامؒ کی چشمِ کرم میری جانب نگراں ہے اس وقت تک مجھے کتاب دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔''

یہ ایک ایسے طالب علم کا دعویٰ تھا جس کی عمر چودہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ مجلسِ درس میں ہلچل سی مچ گئی' بڑے بڑے پختہ کار لوگ امام شافعیؒ کو تعجب سے دیکھنے لگے خود امام مالکؒ کے چہرۂ مبارک پر بھی حیرت کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ ''مکے سے روانگی کے وقت ''موطا'' ہی میرا زادِ سفر تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ جب علم کا شہنشاہ مجھ سے سوال کرے گا کہ شافعی! تو ہماری نذر کو کیا لایا ہے تو میں امامؒ کی



بارگاہ میں امامؒ ہی کی روایات پیش کر دوں گا۔'' مجلس کے بام و در ساکت تھے اور تمام اہلِ مجلس کی نگاہیں فرزندِ قریش کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ امام شافعیؒ نے امامِ مدینہ سے اجازت طلب کی اور پھر لوگوں کی سماعتیں ایک نئی آواز سے آشنا ہوئیں۔ امام شافعیؒ پرسوز آواز میں ''موطا'' کی قرات کر رہے تھے' سرورِ کونین کے ارشاداتِ گرامی اور ایک جاں نثارِ رسالت کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز' اہلِ دل کو نبضِ کائنات رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس منظر جانفزا کی کیفیت کو خود حضرت امام شافعیؒ نے اپنے سفر نامے میں اسی طرح بیان فرمایا ہے۔

''میں قرات کے دوران حضرت امام مالکؒ کے چہرۂ مبارک کی طرف ایک نظر دیکھنے کی کوشش کرتا اور پھر میرے دل پر امامِ مدینہ کی ہیبت چھا جاتی۔ میں گھبرا کر سوچنے لگتا کہ قرات ختم کر دوں۔ اس خیال کے ساتھ ہی میری آواز بہت آہستہ ہو جاتی۔ امام مالکؒ فوراً آنکھیں کھول دیتے اور میری قرات پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے۔ فرزند! اور۔ فرزند! اور۔ قرات کا یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ اہلِ مجلس کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ کب دن تمام ہوا اور کب سورج افقِ غرب میں ڈوب گیا۔

سب لوگ اس وقت چونکے جب مدینے کی فضاؤں میں موذن کی آواز گونجی۔

میں نے امام مالکؒ کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی اور پھر واپس جانے کے لئے اجازت چاہی' امامِ مدینہؒ نے جواب میں فرمایا' محمد! میرے ہوتے ہوئے اب تم کہاں جا سکتے ہو؟' یہ کہہ کر آپ نے اپنے غلام کی جانب دیکھا اور پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا' اپنے آقا کو گھر لے جاؤ' میں ساری دنیا کی عنایتوں کو ٹھکرا سکتا تھا مگر امام مالکؒ کی نوازشات کو میں نے اس طرح قبول کر لیا جیسے یہ میری زندگی کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔ بالآخر جب میں امامِ مدینہؒ کے گھر پہنچا تو غلام مجھے ایک علیحدہ کوٹھری میں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہاں فرش پر ایک صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد غلام واپس آیا اس کے ہاتھ میں پانی کا برتن تھا کہنے لگا قبلے کا رخ یہ ہے اور وضو کے لئے برتن میں پانی موجود ہے' مجھے ضرورت کی تمام چیزوں کے متعلق سمجھا کر غلام دوبارہ چلا گیا۔ اب میں اس کوٹھری میں تنہا تھا اور امام مالکؒ کی فیاضی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے مدینے میں چند روزہ قیام کے بعد ہی امامِ مدینہؒ کی غربت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی افلاس کی جو داستان باقی رہ گئی تھی' وہ اس کوٹھری کے در و دیوار سنا رہے تھے۔ ایسی ناداری کی حالت میں کسی مہمان کو مستقل طور پر اپنے یہاں ٹھہرانا بڑی ہمت اور فراخدلی کی بات تھی' سچ تو یہ ہے کہ امام مالکؒ ہی اس کریمانہ شان کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ یہ سوچ کر میں آبدیدہ ہو گیا۔

ابھی میرے ذہن پر خیالات کی یلغار تھی کہ امام مالکؒ تشریف لے آئے۔ غلام بھی آپ کے پیچھے پیچھے داخل ہوا تھا میں احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ امامِ مدینہؒ نے آتے ہی مجھے سلام کیا۔ پھر غلام کی طرف مڑے اس کے ہاتھ سے خوان لے کر فرش پر رکھا اور میرے ہاتھ دھلانے کے لئے کہا۔ غلام پانی کا برتن لے کر آگے بڑھا مگر امامؒ نے اسے فوراً ٹوک دیا' جانتے نہیں! کھانے سے قبل...... پہلے میزبان کو ہاتھ دھونا چاہیے پھر مہمان کو اور کھانے کے بعد پہلے مہمان کو ہاتھ دھونا چاہئیں بعد میں میزبان کو۔' میں نے امامِ مدینہؒ سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا۔ 'میزبان کھانے پر مہمان کو بلاتا ہے اس لیے پہلے ہاتھ بھی میزبان ہی کو دھونا چاہییں اور کھانے کے بعد سب سے آخر میں ہاتھ دھونا اس لیے لازم ہے کہ شاید اور کوئی مہمان آ جائے تو میزبان اس کا بھی ساتھ دے سکے۔' اس وضاحت کے بعد امام مالکؒ نے خوان کھولا۔ اس میں دو برتن تھے۔ ایک میں دودھ تھا' دوسرے میں کھجوریں۔ امامؒ نے بسم اللہ کہی' میں نے بھی اللہ کے نام سے آغاز کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں کھانا ختم ہو گیا۔ امامِ مدینہؒ کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ کھانا ناکافی ہے' اس لیے آپ نے فرمانے لگے 'محمد! ایک مفلس شخص دوسرے مفلس کے لیے جو کچھ پیش سکتا تھا' وہ حاضر کر دیا۔' میں امام مالکؒ کی تواضع اور جذباتی کیفیت سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے امامؒ سے عرض کیا کہ "آپ معذرت کیوں کریں؟ آپ نے تو احسان کیا ہے۔"

کھانے کے بعد امام مالکؒ اہلِ مکہ کے حالات پوچھتے رہے۔ پھر رات زیادہ ہو گئی تو یہ کہہ کر تشریف لے جانے لگے کہ مسافر کو آرام کرنا چاہیے۔ امامؒ کی بے مثال محبت نے میرے دل سے تمام ناکامیوں کے داغ دھو دیے تھے اور اب میں اپنے آپ کو سایۂ عافیت میں محسوس کر رہا تھا۔ امامِ مدینہؒ کے جانے کے بعد میں بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ پتہ نہیں وہ کیا وقت تھا کہ کوٹھری کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سنا' امام مالکؒ مجھے محبت بھرے لہجے میں پکار رہے تھے۔ 'محمد! تم پر خدا کی رحمت ہو نماز۔' میں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ امام مالکؒ میرے سامنے پانی کا برتن لیے کھڑے تھے۔ مجھے سخت ندامت ہوئی۔ میں نے شرمسار لہجے میں کہا۔ 'آپ کیا کر رہے ہیں؟ ویسے ہی آپ کے احسانات کے بوجھ نے میری کمر کو جھکا دیا ہے۔' میری بات سن کر شفقت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ فرمانے لگے۔ 'محمد! تم کوئی خیال نہ کرو۔ مہمان کی خدمت فرض ہے۔'

میں نے وضو کیا اور نماز کے لیے تیار ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اذان ہوئی۔ پھر میں نے امام مالکؒ کے ساتھ مسجدِ نبویؐ میں نماز فجر ادا کی۔ اس وقت بہت زیادہ اندھیرا تھا۔ حاضرین میں سے کسی کی شکل پہچانی



نہیں جا رہی تھی۔ سب لوگ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے ذکرِ الٰہی میں مصروف تھے' یہاں تک کہ پہاڑیوں پر دھوپ نظر آنے لگی۔ امامِ مدینہؒ اٹھے اور پھر مجلسِ درس آراستہ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد امامؒ نے اپنی کتاب موطا "میرے ہاتھ میں دے دی۔ میں قرات کرتا رہا اور اہلِ طلب نہایت ذوق و شوق سے احادیثِ رسولؐ لکھتے رہے۔"

یہ تھی بارگاہِ مالکؒ میں حاضر ہونے کی مختصر روداد۔ اس کے بعد امام شافعیؒ مسلسل آٹھ ماہ تک امامِ مدینہؒ کے گھر میں سکونت پذیر رہے۔ اس دوران فرزندِ قریش کے ساتھ امام مالکؒ کا طرزِ عمل اس قدر مشفقانہ رہا کہ میزبان اور مہمان کا فرق ہی مٹ گیا۔ نئے آنے والے یہ اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ امام شافعیؒ کے قریب ترین عزیز ہیں یا کوئی شاگرد؟ اور یہ اس رشتہ خاص ہی کا اثر تھا کہ امامِ مدینہؒ نے فرزندِ قریش پر اپنے علم و محبت کا خزانہ لٹا دیا۔ ساری دنیا اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ تحصیلِ علمِ حدیث کے راستے میں آٹھ ماہ کی مدت کوئی حیثیت نہیں رکھتی مگر امام مالکؒ کی خصوصی توجہ نے مختصر سے عرصے میں اس دشوار مرحلے کو یوں طے کرا دیا کہ بڑے بڑے صاحبانِ عقل سوچتے ہی رہ گئے۔ بے شک قدرت اس لالۂ صحرائی کی حنابندی کر رہی تھی' بلاشبہ امام شافعیؒ کو غیر معمولی ذہن بخشا گیا تھا۔ لیکن یہ بھی مشیتِ الٰہی تھی کہ محمد بن ادریس کو نہایت تنگ دستی کے عالم میں مالک بن انسؒ کے دروازے تک پہنچایا گیا۔ اور پھر امامِ مدینہؒ کو غیب سے اشارہ ہوا کہ اس یتیم بچے کے لئے اپنی آغوشِ محبت کو وا کر دیں۔ امام مالکؒ نے ایسا ہی کیا۔ تاریخ کی کتابیں اس کیفیت کو قلم بند نہیں کر سکتیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اہلِ نظر کو رک کر غور کرنا ہی پڑے گا کہ چار دن میں برسوں کے فاصلے کس طرح طے ہو گئے؟ کیا ایسی مثالیں انسانی حافظے میں محفوظ نہیں کہ اکثر تشنگانِ علم کوچۂ معرفت میں نصف صدی سے بھی زیادہ سرگرداں رہے اور جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے ہونٹ خشک تھے اور روح پیاسی تھی۔ تحریر میں اس رمز کی وضاحت ممکن نہیں مگر یہ امام مالکؒ ہی کا فیضانِ نظر تھا کہ ایک عاشقِ رسول کے کاشانے سے برقِ جلال چمکی' چند ساعتوں میں امام شافعیؒ کے دل و دماغ کو منور کیا اور پھر حدیث و فقہ کی کائنات پر محیط ہو گئی۔

☆☆☆

اُسی زمانے میں اہلِ مصر کی ایک جماعت حج کے بعد زیارتِ روضہ رسولؐ سے مشرف ہونے اور "موطا" کی سماعت کرنے کے لئے مدینہ منورہ آئی۔ جب وہ لوگ حضرت امام مالکؒ کی خدمت میں پہنچے اور درخواست گزار ہوئے تو امامِ مدینہ نے امام شافعیؒ کو اشارہ کیا' فرزند قریش نے اجازت پاتے ہی

اپنی پرسوز آواز میں اس طرح ''موطا'' کی قرات شروع کی کہ آنکھیں بند تھی۔اور بے قرار روح دربارِ رسالت مآبؐ میں حاضر تھی۔امام شافعیؒ کی خوش الحانی اور الفاظ کی صحیح ادائیگی نے اہلِ مجلس کو اپنی جگہ ساکت کر دیا تھا۔یہاں تک کہ جب ''موطا'' اختتام کو پہنچی تو مصری سامعین ایک نوخیز طالبِ علم کی قرات اور قوتِ حافظہ پر حیران رہ گئے۔

اس کے بعد اہلِ عراق سرورِ کونین کی بارگاہ میں سلام کو حاضر ہوئے۔قبرِ مبارک اور منبر کے درمیان امام شافعیؒ کو ایک خوبصورت نوجوان نظر آیا۔نقش و نگار کی دلکشی اور لباس کی صفائی نے اس کی شخصیت کو باوقار بنا دیا تھا۔امام شافعیؒ اسے غور سے دیکھنے لگے۔

جب عراقی نوجوان نے نماز ادا کی تو اس کا طریقۂ عبادت بھی درست نظر آیا۔امام شافعیؒ کا تاثر کچھ اور بڑھ گیا۔آخر آپ نوجوان کے قریب گئے اور اس سے مختصر تعارف حاصل کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم عراق میں کس مقام کے رہنے والے ہو؟'' امام شافعیؒ کے لہجے میں بڑی شائستگی تھی۔عراقی نوجوان حیرت زدہ رہ گیا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کم عمر میں بھی کسی کا لہجہ اتنا فصیح و بلیغ ہو سکتا ہے!

''میرا قیام کوفے میں ہے۔'' عراقی نوجوان نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

''کوفے میں کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کا عالم کون ہے؟'' امام نے دوسرا سوال کیا۔

''امام ابو یوسفؒ اور امام محمد بن حسن شیبانیؒ۔'' عراقی نوجوان نے کہا ''یہ دونوں حضرات امامِ اعظم ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں۔''

امام شافعیؒ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر عراقی نوجوان سے دریافت کرنے لگے۔''تم اپنے وطن کب واپس جاؤ گے؟''

''کل صبح سویرے۔'' عراقی نوجوان کو اپنے سے کم عمر طالب علم کے سوالات پر حیرت ہو رہی تھی۔

امام شافعیؒ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سیدھے امام مالکؒ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوئے کہ آپ کے چہرے پر فکر کی علامت صاف نظر آ رہی تھی۔

''محمد! تم خاموش کیوں ہو؟'' حضرت امام مالکؒ آپ کے ہونٹوں پر مہرِ سکوت دیکھ کر بے چین ہو گئے۔

''میں علم کی طلب میں گھر سے نکلا تھا۔'' امام شافعیؒ نے جواباً عرض کیا۔''اور آج اس مقام پر کھڑا ہوں جہاں پہنچ کر زندگی تقسیم ہو جاتی ہے اب آپ ہی میری رہنمائی کیجئے کہ میں مکے کی طرف لوٹ



جاؤں یا علم کی تلاش میں کوفے کی طرف نیا سفر اختیار کروں؟ والدہ محترمہ سے آگے جانے کی اجازت بھی حاصل نہیں کی ہے۔''

امام شافعیؒ کے اظہارِ خواہش نے امام مالکؒ کو اداس کر دیا۔آپ کچھ دیر خاموش رہے، پھر افسردہ لہجے میں فرمایا۔''کوفے پہنچ کر والدہ سے اجازت حاصل کر لینا۔کوئی ذی ہوش ماں اپنے بیٹے پر علم کے دروازے بند نہیں کرے گی۔'' یہ کہہ کر امام مالکؒ چپ ہو گئے۔

''مادرِ گرامی کے ساتھ آپ کی اجازت بھی ضروری ہے۔'' امام شافعیؒ کو امام مدینہؒ کی دلی کیفیات کا احساس تھا مگر آپ اپنے شوقِ علم سے مجبور تھے۔''

''فرزند! مجھ پر تمہاری جدائی کا تصور بھی گراں ہے مگر میں تمہیں روک نہیں سکتا۔'' امام مالکؒ نے بے مثال فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔''جو شخص علم کی خاطر تمہیں وطن اور ماں کی محبت سے دور رہنے کا مشورہ دے سکتا ہے وہ خود کس طرح دہن کش ہوگا؟ محمد! تم ضرور جاؤ۔میں تمہیں اپنی دعاؤں کے سائے میں رخصت کروں گا۔انسان کے قائم کردہ فاصلے مٹ جاتے ہیں لیکن علم کے فائدے کبھی ختم نہیں ہوتے۔کیا تمہیں معلوم نہیں کہ طالبِ علم کے لئے فرشتے اپنے پر پھیلا دیتے ہیں؟'' یہ کہہ کر امام مالکؒ نے سکوت اختیار کر لیا۔امام شافعیؒ کو بھی امامِ مدینہؒ سے بچھڑنے کا غم تھا مگر علم کی جستجو میں آپ ہر شے سے بے نیاز ہو چکے تھے۔

☆☆☆

امام مالکؒ حسبِ معمول نمازِ عشاء کے بعد فرزندِ قریش سے رخصت ہوئے۔آپ کے جانے کے بعد امام شافعیؒ بہت دیر تک جاگتے رہے پھر کسی وقت آنکھ لگ گئی گہری نیند کے سبب ممکن تھا کہ امام شافعیؒ دیر سے بیدار ہوتے مگر امام مالکؒ نے آپ کو وقت سے ہی جگا دیا۔''محمد! اٹھو اور سفر کی تیاری کرو۔'' امام شافعیؒ اٹھے۔امام مدینہؒ کے ساتھ آخری نماز ادا کی اور اندھیرے میں اس طرف بڑھے جہاں اہلِ عراق جمع ہو رہے تھے۔امام مالکؒ نے راستے کا کھانا تیار کر دیا تھا۔امامِ مدینہؒ کی اس محبت پر آپ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔امام شافعیؒ امام مالکؒ کی اقتصادی حالت سے اچھی طرح باخبر تھے۔کھانے کے اہتمام کا صاف مطلب یہی تھا کہ امام مالکؒ خود بھوکے رہ کر امام شافعیؒ کی ضرورتوں کا خیال کرتے تھے۔مسلسل آٹھ ماہ سے امام مدینہؒ کا یہی وہ مشفقانہ سلوک تھا جسے دیکھ کر اکثر امام شافعیؒ کی آنکھیں بھیگتی رہی تھیں۔ آج اس احساس میں غمِ فراق بھی شامل تھا۔اس لئے امام شافعیؒ بہت زیادہ اداس نظر آ رہے تھے۔

"فرزند! منزلِ علم کے مسافر راستے کے گرد غبار سے متاثر نہیں ہوتے۔" امام مالکؒ نے اپنے عظیم شاگرد کو تسلی دی اور پھر بلند آواز میں پکار کر کہنے لگے۔ "کوفے کے لیے کون اپنا اونٹ کرائے پر دیتا ہے؟"

"یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟" امام شافعیؒ گھبرا کر بولے۔ "نہ میرے پاس کوئی دینار و درہم ہے اور نہ آپ کی مالی حالت اس قابل ہے۔"

امام شافعیؒ کی پریشانی دیکھ کر امام مالکؒ کے ہونٹوں پر تبسم ابھر آیا۔ "فرزند! خدا ہمارے تصور سے بھی زیادہ کارساز ہے۔ جب میں عشاء کی نماز کے بعد رخصت ہو کر گھر پہنچا تو عبدالرحمٰن بن قاسم دروازے پر کھڑے تھے۔ میں نے ان سے آنے کا سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ ہدیہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ پھر میری طرف تھیلی بڑھانے لگے۔ میں نے انکار کر دیا ان کا چہرہ اتر گیا۔ آخر خوشامد پر اتر آئے میں ان کی منت کو زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ آخر عبدالرحمٰن کی محبت نے مجھے مجبور کر دیا اور میں نے نذر قبول کر لی۔ تھیلی میں سو دینار تھے۔ میں نے پچاس اپنے اہل و عیال کے لئے چھوڑ دیے ہیں اور پچاس تمہارے سفر کے لئے لایا ہوں۔" امامؒ کی بات بھی جاری تھی کہ ساربان قریب پہنچ گیا، امام مالکؒ نے چار دینار میں اونٹ طے کیا اور باقی رقم امام شافعیؒ کے حوالے کر دی۔

رخصت سے پہلے امامِ مدینہؒ نے امام شافعیؒ کو گلے لگایا اور پھر بڑے رقت آمیز لہجے میں فرمانے لگے۔ "فرزند! ہمارا مرنا اور جینا، ملنا اور بچھڑنا، رونا اور ہنسنا سب کچھ خدا کے لیے ہے، آقا سے غلامی کی نسبت نے کل ہم دونوں کو ایک مقام پر جمع کیا تھا اور آج اسی غلامی کے رشتے کو مستحکم کرنے کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں، تمہارے دل پر، تمہارے دماغ پر، تمہارے روز و شب پر ہمیشہ خدا کی رحمت سایہ فگن رہے۔"

عجیب منظر تھا۔ امام شافعیؒ بھی آبدیدہ ہو گئے پھر یکایک مدینے کے فضاؤں میں صدائے جرس گونجنے لگی۔ امام شافعیؒ اونٹ پر سوار ہوئے، قافلہ آگے بڑھا۔ مسافروں اور حدی خوانوں کے شور میں بھی امام شافعیؒ نے اس آواز کو پہچان لیا۔

"خدا حافظ، فرزند!" یہ امام مالکؒ کے آخری الفاظ تھے۔

راستے سے غبار اٹھ رہا تھا مگر جب بھی امام شافعیؒ نے مڑ کر دیکھا امام مالکؒ کی روشن آنکھوں کو نگراں پایا۔ یہاں تک کہ امامِ مدینہؒ اور فرزندِ قریش کے درمیان فاصلے حائل ہو گئے۔



امامِ مدینہ کا چہرہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اور اب امام شافعیؒ اپنے ہم سفروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ اہلِ عراق کی ایک جماعت تھی جو حج بیت اللہ اور زیارتِ روضہ رسولؐ سے مشرف ہونے کے بعد اپنے وطن واپس جا رہی تھی۔ اس وقت تمام لوگ دہری خوشی کی کیفیت سے سرشار تھے۔ ایک تو بارگاہِ خداوندی میں پہنچ کر دولتِ لازوال کا حصول، دوسرے یہ کہ عزیز و اقارب سے ملاقات کا خوش گوار تصور۔ غرض اہلِ قافلہ کی وارفتگی قابلِ دید تھی۔ ہر شخص مسکرا رہا تھا۔ ہر فرد پر جوش گفتگو کر رہا تھا مگر حضرت امام شافعیؒ حسبِ عادت خاموش تھے۔ اجنبی فضا نے سکوت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ کس سے بات کرتے؟ پورے قافلے میں ایک بھی آشنا نہیں تھا۔ اگر کسی سے ضرورتاً سوال کر لیتے تو وہ مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ فرزندِ قریش نے راستے کی تمام دشواریوں کو جھٹلا دیا تھا مگر ہم سفروں کی بے رخی کے باعث تنہائی کا احساس شدت سے ابھرنے لگا تھا۔ اور مجبوری یہ تھی کہ امام شافعیؒ اہلِ قافلہ سے اس بیگانگی کا شکوہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ قافلے کے سب سے کم عمر مسافر امام مالکؒ کا عظیم و جلیل شاگرد ہے۔ وہ تو اسے اس کے لباس سے ایک عام سا نوجوان سمجھ رہے تھے جو شاید تلاش معاش میں عراق کی طرف جا رہا تھا۔ آخر یہی احساسِ تنہائی امام شافعیؒ کو ماضی کی دنیا میں لے گیا۔ امامؒ اسی کم سنی کے عالم میں آغوشِ مادر سے بچھڑ کر درس گاہ مالکؒ تک پہنچے تھے اور پھر امامِ مدینہؒ کا حلقہ محبت بھی بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ امام شافعیؒ کو اس وقت بوڑھا بھی بہت یاد آیا جس نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک نہ صرف آپ کی رہنمائی کی تھی بلکہ میزبانی کا حق بھی ادا کر دیا تھا۔ کیا اس پورے قافلے میں اس اجنبی بوڑھے کی مانند ایک شخص بھی نہیں؟ امام شافعیؒ نے تمام مسافروں کو غور سے دیکھا مگر کسی کے چہرے پر وقتی شناسائی کی بھی کوئی علامت نہیں تھی۔ ہم سفری اور ہم نشینی کا عارضی رشتہ بھی کام نہیں آ رہا تھا۔ امامؒ شریکِ کارواں ہو کر بھی کارواں سے الگ تھے۔ آپ کو قافلہ عراق سے جس تواضع کی امید تھی، وہ خواب و خیال ہو کر رہ گئی تھی۔ امام شافعیؒ ضروریاتِ سفر کے لیے کسی کے محتاج نہیں تھے۔ امام مالکؒ نے پہلے ہی اس کا انتظام فرما دیا تھا مگر پھر بھی ایک انسان دوسرے انسان سے کچھ تہذیبی اور رسمی توقعات رکھتا ہے۔ امام شافعیؒ کاروانِ عراق میں ان ہی علامات کو ڈھونڈ رہے تھے لیکن جب رفیقانِ سفر میں آپ کو یگانگت کی ایک نشانی بھی نظر نہیں آئی تو فرزندِ قریش کی فطری غیرت جاگ اٹھی۔ یہاں تک کہ امام شافعیؒ اپنے گرد و پیش سے بے نیاز ہو گئے۔

آخر حجاجِ کرام کا یہ قافلہ چوبیسویں دن کوفے پہنچا۔ تمام مسافر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے مگر

یہاں امام شافعیؒ کا کوئی گھر نہیں تھا اس لیے آپ خدا کے گھر میں یہ دعا پڑھتے ہوئے داخل ہوئے ''اے اللہ! مجھ پر اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دے۔'' پھر آپ نے نمازِ عصر ادا کی اور مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ کر آنے جانے والوں کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اہلِ عراق اپنے خالق کے حضور رسم بندگی ادا کر رہے تھے اور امام شافعیؒ ان کے طریقہ کار کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ اسی دوران ایک بہت خوب صورت نوجوان مسجد میں ارکانِ نماز ادا کرنے لگا۔ فرزندِ قریش نے عراقی نوجوان کے طرزِ عبادت کو دیکھا اور پھر چونک اٹھے۔ نوجوان کی نماز درست نہیں تھی۔ امامؒ نے نظریں پھیر لیں۔ آپ کسی انسان کی عیب جوئی سے بچنا چاہتے تھے مگر پھر فوراً ہی اس طرف متوجہ ہوگئے۔ یہ مذہب کا معاملہ تھا۔ امام شافعیؒ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکے۔ نوجوان نماز میں اسی غلطی کو دہرا رہا تھا۔ امام شافعیؒ کو تکلیف سی محسوس ہوئی۔ خود کلامی کے انداز میں زیرِلب فرمانے لگے۔ ''انسان کیسا بے خبر ہے کہ زندگی کے سب سے اہم فریضے کو بھی صحیح طور پر ادا نہیں کرسکتا۔'' اتنے میں نوجوان نے نماز ختم کرلی اور دعا کے لیے اپنے ہاتھ دراز کرلیے۔ امام شافعیؒ اسے نصیحت کرنا چاہتے تھے مگر اس خیال سے خاموش رہے کہ نوجوان اس غلطی پر شرمسار ہوجائے گا اور آپ اس کے چہرے پر رنگِ ندامت کو ابھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکیں گے۔ دوسرے ہی لمحے خیال آیا کہ اگر اس کی کوتاہیوں کی نشاندہی نہیں کی گئی تو پھر وہ ساری عمر اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا۔ میدانِ حشر میں جہاں اس سے پرستشِ اعمال ہوگی تو وہاں دیکھنے والے سے بھی سوال کیا جائے گا کہ علم رکھتے ہوئے تو اس بے راہ روی پر کیوں خاموش رہا؟ نوجوان دعا مانگ کر کھڑا ہو چکا تھا پھر جیسے ہی وہ جانے کے لیے مڑا امام شافعیؒ نے اسے آواز دی۔ نوجوان ٹھہر گیا۔ امام شافعیؒ اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کے قریب پہنچ کر فرمانے لگے۔

''میرے عزیز بھائی! میں تم سے تمہاری نماز کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' امام شافعیؒ کا لہجہ نہایت دل آویز تھا۔

عراقی نوجوان نے آپ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر تیز آواز میں بولا ''تم میری نماز کے متعلق بات کرنا چاہتے ہو!'' نوجوان کے ایک ایک لفظ سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک کم عمر اجنبی اس سے اس طرح مخاطب ہوسکتا ہے ''جو کچھ تمہیں کہنا ہے کہہ ڈالو۔'' اب عراقی نوجوان کے لہجے سے حیرت کے ساتھ ساتھ غرور بھی جھلکنے لگا تھا۔

''میرے لیے یہ بات بہت آسان تھی کہ میں تمہاری غلطی پر چشم پوشی سے کام لیتا اور اس طرح



نفرت و غضب کا نشانہ بننے سے بچ جاتا مگر میرے عزیز روزِ محشر میں خدا کی گرفت تمہارے اندازے سے بھی زیادہ سخت ہوگی۔'' امام شافعیؒ کا لہجہ بدستور نرم و شیریں تھا ''نماز پوری صحت کے ساتھ پڑھا کرو تاکہ خدا تمہارے دلکش چہرے کو دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھے۔''

عراقی نوجوان پہلے ہی امام شافعیؒ کو خشمگیں نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اب یہ تلخ نصیحت سن کر بھڑک اٹھا ''تمہیں دوسروں کے کاموں میں غلطیاں نکالنے کا حق کس نے دیا؟''

''میرے علم نے جو مجھے میرے خدا کی طرف سے بطورِ خاص بخشا گیا ہے۔'' امام شافعیؒ نے باوقار لہجے میں فرمایا مگر اس طرح کہ آپ کے چہرے یا کسی لفظ سے تکبر کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

''تمہاری عمر تمہارے دعوے کا ساتھ نہیں دیتی۔'' عراقی نوجوان کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

''دعوے کا تعلق عمر سے نہیں ہوتا۔'' امام شافعیؒ نے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے فرمایا ''جن کو اصلاحِ حال مقصود ہوتی ہے، وہ کہنے والے کا چہرہ نہیں اپنے عمل کو دیکھتے ہیں۔''

عراقی نوجوان پر حضرت امام شافعیؒ کی عالمانہ گفتگو کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ آپ کے اقوال کو عمر کے پیمانے سے ناپ رہا تھا۔ مقامی باشندے کو یہ بات سخت گراں گزری کہ ایک کم عمر اجنبی نے اس کی نماز پر اعتراض کیا تھا ''معلوم ہوتا ہے کہ تم حجازی ہو؟'' عراقی نوجوان کے غصے میں مزید شدت آ گئی تھی۔

''بے شک! میں حجازی ہوں۔'' امام شافعیؒ نے اعتراف کیا مگر آپ عراقی نوجوان کی بات کا مفہوم نہیں سمجھے تھے ''میرے حجازی ہونے سے تمہاری نماز کا کیا تعلق ہے؟ حجاز ہو یا شام، مصر ہو یا عراق، اسلام ہر جگہ اسلام ہی رہتا ہے۔''

''میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم حجازی ہو۔'' عراقی نوجوان نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا ''یہ خشکی اور سختی حجازیوں میں پائی جاتی ہے۔ بھلا ان لوگوں میں عراقیوں جیسی نرمی اور شگفتگی کہاں؟ میں پندرہ سال سے اسی مسجد میں امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے سامنے نماز پڑھ رہا ہوں۔ ان عظیم و جلیل ائمہ کو میری عبادت میں کوئی کمی نظر نہیں آئی، اب تم جیسے نااہل لڑکے مجھے نماز سکھائیں گے؟'' یہ کہہ کر عراقی نوجوان نے انتہائی غصے اور نفرت کے ساتھ امام شافعیؒ کے منہ پر اپنی چادر کی گرد جھاڑ دی اور پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔

اتفاق سے مسجد کے دروازے ہی پر اس نوجوان کو امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نظر آ گئے۔ فقہ کی ان جلیل القدر ہستیوں کو دیکھتے ہی نوجوان بے قابو ہوگیا ''آپ حضرات برسوں سے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔'' نوجوان جذباتی لہجے میں بول رہا تھا ''کبھی آپ کو میرے طریقۂ عبادت میں کوئی خامی

نظر آئی؟''

''نہیں۔'' امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے بیک زبان فرمایا ''نوجوان! ہم نے کبھی تمہیں غلط نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ مگر تم یہ سب کچھ کیوں دریافت کر رہے ہو؟ اور وہ بھی اس طرح کہ تمہارا چہرہ غصے سے سرخ اور فرطِ غضب سے زبان لڑکھڑا رہی ہے۔ آخر یہ کیا ماجرا ہے؟'' دونوں فقہا کرام، عراقی نوجوان کی ظاہری حالت دیکھ کر اپنی حیرت کا اظہار کرنے لگے۔

''جب آپ میری نماز کی صحت پر گواہی دے رہے ہیں تو پھر ایک حجازی کو یہ حق کس طرح پہنچتا ہے کہ وہ میرے طریقہ عبادت پر اعتراض کرے۔'' نوجوان اسی طرح تند و تیز لہجے میں بول رہا تھا۔ اس نے جوشِ گفتار میں دو بزرگ ہستیوں کی موجودگی کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔

''کون ہے وہ حجازی لڑکا؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' امام محمدؒ نے نوجوان کی تلخ بیانی سے چشم پوشی کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہماری مسجد میں ایک نوعمر لڑکا بیٹھا ہے اور میری نماز پر اس طرح نکتہ چینی کر رہا ہے جیسے وہ عراقی آئمہ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔'' نوجوان کی جذباتیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی ''میں نے اس حجازی لڑکے سے کہا کہ جب امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ میری نماز کو درست قرار دیتے ہیں تو پھر تیرے اعتراض کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ مگر وہ اپنی جہالت پر قائم رہا۔''

امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ بلاشبہ بڑے انسان تھے۔ آپ دونوں حضرات نے عراقی نوجوان اور حجازی لڑکے (امام شافعیؒ) کے درمیان ہونے والی گفتگو کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا بلکہ نہایت شگفتہ لہجے میں فرمایا ''تمہیں قبل از وقت اس قدر برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ پہلے اس لڑکے کا نقطہ نظر معلوم کرو پھر اس کا اندازہ ہوگا کہ کون درست ہے؟''

نوجوان کے مشتعل جذبات سرد پڑ گئے۔ جب اس کے چہرے پر نفرت و غضب کی علامت باقی نہیں رہی تو امام محمدؒ نے عراقی نوجوان سے کہا ''تم اس حجازی لڑکے سے سوال کرو کہ وہ نماز میں کس طرح داخل ہوتا ہے؟''

عراقی نوجوان تیزی سے مسجد کے اندر آیا اور حضرت امام شافعیؒ کے قریب پہنچ کر اس نے امام محمدؒ کا سوال دہرایا ''اے میری عبادت پر حرف گیری کرنے والے! مجھے بتا کہ تو نماز میں کس طرح داخل ہوتا ہے؟'' عراقی نوجوان کے لہجے سے ایک بار پھر نفرت کا اظہار ہونے لگا تھا۔



امام شافعیؒ صورتِ حال کو سمجھ چکے تھے مگر پھر بھی آپ نے متانت و سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور انتہائی صبر و سکون سے جواب دیتے ہوئے فرمایا ''میں دو فرض اور ایک سنت کے ساتھ نماز میں داخل ہوتا ہوں۔''

عراقی نوجوان، امام شافعیؒ کا جواب سن کر دوبارہ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے پاس پہنچا اور انہیں حجازی لڑکے کے جواب سے آگاہ کر دیا۔ چند لمحوں کے لیے عراق کے یہ دونوں عظیم فقیہہ خاموش ہو گئے۔ انہیں فرزندِ قریش کے جواب سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی عام لڑکا نہیں ہے۔ آخر مختصر سکوت کے بعد امام یوسفؒ نے عراقی نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''اس حجازی لڑکے سے مزید دریافت کرو کہ وہ دونوں فرض کون سے ہیں اور سنت کیا ہے؟''

عراقی نوجوان دوبارہ حضرت امام شافعیؒ کے پاس آیا اور اس نے تلخ لہجے میں پھر امام ابو یوسفؒ کا سوال دہرا دیا۔

امام شافعیؒ چند لمحوں تک خاموش رہے۔ اب صورتِ حال مزید واضح ہوتی جا رہی تھی۔ امام شافعیؒ نے اندازہ کر لیا تھا کہ عراقی نوجوان کا کسی مذہبی عالم سے رابطہ قائم ہے اور وہ ان ہی کے ذریعے سوال و جواب کے سلسلے کو طول دے رہا ہے۔ یہ بات ایک اجنبی شہر میں ایک نوعمر لڑکے کے لیے پریشان کن تھی مگر امام شافعیؒ نے نہایت اعتماد سے جواب دیتے ہوئے کہا ''میری نماز کا پہلا فرض نیت ہے، دوسرا تکبیر...... اور سنت، دونوں ہاتھوں کا اٹھانا ہے۔'' عراقی نوجوان نے فرزندِ قریش کا جواب سنا اور حسبِ معمول تیز رفتاری کے ساتھ مسجد سے نکل کر چلا گیا۔ اب امام شافعیؒ کو مذہب کے موضوع پر ایک سنجیدہ اور طویل بحث کا یقین ہو چلا تھا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ عراقی نوجوان نے امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کو فرزندِ قریش کا جواب سنایا تو وہ دونوں بزرگ مسجد میں داخل ہوئے، امام شافعیؒ پر ایک گہری نظر ڈالی اور دور جا کر صحن میں بیٹھ گئے۔ امام شافعیؒ نے اپنے سفرنامے میں اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''عراق کے ان عظیم فقہا نے میری جانب دیکھا اور میرا خیال ہے کہ ان حضرات نے مجھے حقیر ہی سمجھا ہوگا۔''

پھر امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے عراقی نوجوان کو حکم دیا ''اس قریشی لڑکے سے کہو کہ مشائخ کے روبرو حاضر ہو۔''

عراق کے جلیل القدر فقہا کا پیغام سن کر امام شافعیؒ فوراً سمجھ گئے کہ امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ ایک

لمحے کے لیے آپ نے سوچا کہ مشائخ کے سامنے چلے جائیں مگر دوسرے ہی لمحے خیال بدل دیا۔ پھر آپ نے باوقار انداز میں عراقی نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''میری دنیا کی روایت یہ ہے کہ لوگ علم کے پاس خود چل کر آتے ہیں، علم کسی کی بارگاہ میں حاضر نہیں ہوتا۔ آخر مجھے ایسی کیا ضرورت پیش آئی ہے کہ میں تمہارے مشائخ سے ملاقات کروں؟''

امام شافعیؒ کی یہ خوداعتمادی دیکھ کر عراقی نوجوان ایک بار پھر غضب ناک ہوگیا اور اسی غصے کے عالم میں واپس لوٹ گیا۔ امام شافعیؒ کی آواز بلند تھی اس لیے امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے تمام باتیں سن لی تھیں۔ اس سے پہلے کہ عراقی نوجوان کچھ کہتا، دونوں بزرگ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے ''اس نے سچ کہا۔ ہمیں خود ہی علم کے پاس جانا چاہیے تھا۔'' عراقی نوجوان مشائخ کے اس عمل پر حیران ہو رہا تھا۔

امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ مسجد کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے اور امام شافعیؒ کے نزدیک پہنچ کر سلام کیا۔ جواباً امام شافعیؒ بھی کھڑے ہوگئے اور والہانہ انداز میں آئمہ کرام کا استقبال کیا۔ ''بیٹھ جاؤ لڑکے!'' امام ابو یوسفؒ نے فرزندِ قریش کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ جب دونوں بزرگ مسجد کے فرش پر بیٹھ گئے تو امام شافعیؒ نے بھی ان کی تقلید کی۔

''کیا تم حرم کے رہنے والے ہو؟'' امام محمد بن حسنؒ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''جی ہاں۔'' امام شافعیؒ کا لہجہ بہت زیادہ مودبانہ تھا۔

''عربی ہو یا عجمی؟'' امام محمدؒ نے دوسرا سوال کیا۔

''نسل عرب سے تعلق رکھتا ہوں۔'' امام شافعیؒ نے آہستہ سے جواب دیا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ آپ کو مشائخ کا ادب بھی ملحوظ ہے۔

''سلسلۂ نسب کیا ہے؟'' امام محمدؒ نے فرزندِ قریش کا خاندانی پس منظر دریافت کیا۔

''مطّلب کی اولاد سے ہوں۔'' امام شافعیؒ نے اپنے خاندان کا تعارف کراتے ہوئے کہا ''شافعؓ میرے مورثِ اعلیٰ ہیں۔''

''تم نے حضرت امام مالکؒ کو دیکھا ہے؟'' یکایک امام محمدؒ نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

''بہت دن تک امام مدینہؒ کی زیارت سے شرف یاب ہوتا رہا ہوں۔'' امام مالکؒ کا ذکر آتے ہی امام شافعیؒ کے چہرے پر ایک خاص رنگ ابھر آیا اور آنکھوں سے گہری اداسی جھلکنے لگی۔ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ بھی فرزندِ قریش کی اس کیفیت کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔



''موطا بھی تمہاری نظروں سے گزری ہے؟'' امام محمدؒ نے پوچھا۔

''موطا کو حفظ کر چکا ہوں۔'' امام شافعیؒ نے انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔

''موطا کو حفظ کر چکے ہو!'' امام مالکؒ اور امام ابو یوسفؒ نے بیک وقت ایک ہی بات کہی۔ دونوں بزرگ امام شافعیؒ کے اس دعوے پر چونک پڑے تھے۔

''یقین نہیں آتا۔'' امام محمدؒ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر امام اعظم ابو حنیفہؒ کے شاگردِ جلیل نے فرزندِ قریش کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ امام شافعیؒ کی کم سنی اس دعوے کی تصدیق میں بڑی رکاوٹ تھی۔

''پھر آپ ہی بتائیں کہ کس طرح یقین دلاؤں؟'' امام شافعیؒ نے کسی بات کو محسوس کیے بغیر کہا۔

امام محمدؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر آپ نے اپنے غلام کے ذریعے کاغذ اور قلم منگوا کر ابوابِ فقہ کا ایک ایک مسئلہ اس طرح تحریر کیا کہ ہر دو مسائل کے درمیان کافی جگہ چھوڑ دی۔ اس کے بعد امام محمدؒ نے تمام کاغذات امام شافعیؒ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''میرے یقین کی ایک یہی صورت ہے کہ تم ان مسائل کے جوابات موطا کی روشنی میں لکھ دو۔''

امام شافعیؒ نے کاغذات لے لیے۔ ایک مسئلہ پڑھا اور اس کا جواب لکھنا شروع کر دیا۔ فرزندِ قریش کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر امام محمدؒ نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا ''پہلے تمام مسائل کو اچھی طرح پڑھ کر ذہن نشین کر لو۔''

''انشاء اللہ مجھے اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' امام شافعیؒ نے آہستہ سے کہا اور انتہائی تیزی کے ساتھ ہر مسئلے کا جواب لکھنا شروع کر دیا۔ فرزندِ قریش کا یہ اعتماد اور تحریر کی سبک رفتاری دیکھ کر امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ حیران تھے۔ امام شافعیؒ کی نظریں کاغذ پر جمی ہوئی تھیں اور ہاتھ اس طرح حرکت کر رہا تھا جیسے ایک تسلسل کے ساتھ تمام مذکورہ مسائل کے جوابات تحریر کر دیں گے پھر ایسا ہی ہوا۔ امام شافعیؒ کا قلم چند لمحوں کے لیے اس وقت ٹھہر جاتا جب آپ ایک مسئلے کا جواب مکمل کر لیتے۔ آخر امام محمدؒ اور ابو یوسفؒ کے اندازے سے بہت پہلے امام شافعیؒ نے سارے مطلوبہ مسائل کے جواب تحریر کر دیے اور نہایت ادب کے ساتھ تمام کاغذات فقیہانِ عراق کے سامنے رکھ دیے۔

امام محمد بن حسنؒ فرزندِ قریش کے تحریر کردہ ایک ایک حرف کو غور سے پڑھتے رہے۔ ابو یوسفؒ بھی بار بار امام شافعیؒ کی طرف دیکھتے تھے اور عراقی نوجوان کی حالت تو سخت قابلِ رحم تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر

یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایک نوعمر حجازی لڑکے کو مشائخ عراق اتنی اہمیت دیں گے۔ بہت دیر بعد جب امام محمدؒ امام شافعیؒ کے جوابات کا مطالعہ کر چکے تو اپنے غلام سے فرمایا جو مسجد کے اندر ہی موجود تھا۔ ’’اپنے آقا کو گھر لے جاؤ۔‘‘ اس کے بعد امام محمدؒ نے امام شافعیؒ سے کہا ’’تم غلام کے ساتھ میرے گھر جاؤ اور بے تکلفی کے ساتھ وہاں قیام کرو۔ اگر کسی قسم کی غیریت کا مظاہرہ کیا تو مجھے تمہارے اس عمل سے شدید تکلیف پہنچے گی۔ اب امام محمدؒ کے لہجے سے ایک خاص محبت کا اظہار ہونے لگا تھا۔

امام شافعیؒ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے امام محمدؒ کی پیش کش قبول کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی۔ قدرت عجیب و غریب انداز میں امام کی دستگیری کر رہی تھی۔ جب آپ امامِ مدینہؒ سے رخصت ہو کر عراق کی طرف آ رہے تو نظروں کے سامنے نہ کوئی منزل تھی اور نہ اس اجنبی دیار میں کوئی پرسانِ حال۔ امام شافعیؒ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ فقیہانِ عراق کی بارگاہِ علم کا دروازہ اتنی آسانی سے کھل جائے گا مگر خدا جس کا مشکل کشا ہو اس کی راہ کے پتھر بھی پھول بنتے چلے جاتے ہیں۔ امام شافعیؒ بھی غیب کی ان ہی کرم نوازیوں سے سرشار تھے۔ جب آپ مسجد کے دروازے پر پہنچے تو امام محمدؒ کے غلام نے دست بستہ عرض کیا ’’مجھے حکم دیا گیا ہے کہ آپ آقا کے مکان تک سواری پر تشریف لے جائیں گے۔‘‘

’’مگر سواری ہے کہاں؟‘‘ امام شافعیؒ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’آپ کو کچھ دیر انتظار کی زحمت برداشت کرنی ہوگی۔ میں ابھی خچر لے کر حاضر ہوتا ہوں۔‘‘ غلام نے اتنا کہا اور مسجد سے نکل کر تیزی کے ساتھ ایک سمت روانہ ہو گیا۔ امام شافعیؒ حیرت کے عالم میں ان بدلتے ہوئے حالات پر غور کرتے رہے، یہاں تک کہ غلام کچھ دیر بعد ایک خچر لے کر حاضر ہو گیا۔ حضرت امام شافعیؒ نے اس یادگار واقعے کو اپنے سفرنامے میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

’’میں نے غلام کے لائے ہوئے خچر پر نظر ڈالی۔ وہ ایک قیمتی جانور تھا اور اسے اچھی طرح آراستہ کیا گیا تھا۔ غلام ادب سے آگے بڑھا اور اس نے مجھ سے خچر پر سوار ہونے کے لیے کہا۔ میں اس سجی ہوئی سواری پر بیٹھ تو گیا لیکن میری ظاہری حالت بڑی شکستہ تھی۔ اپنا بوسیدہ لباس نگاہوں میں کھٹکنے لگا۔ خیال گزرا کہ اہلِ عراق مجھے اس طرح دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟ میرے حلیے اور امام محمدؒ کی پیش کردہ سواری میں کوئی مناسبت نہیں تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک نادار شخص ہوں جسے مفتی کوفہ کے حکم سے نوازا جا رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے احساس ہوا کہ کہیں اجنبیوں کی زمین پر میں تماشا نہ بن



جاؤں۔ غیرت پر ضرب سی لگی۔ دل میں آیا کہ اسی وقت خچر سے اتر کر پیدل ہی امام محمدؒ کے گھر چلا جاؤں۔ پھر سوچا کہ کہیں میرا یہ عمل بے ادبی میں شمار نہ کیا جائے۔ آخر امامؒ کی عظمت نے مجھے میرے ارادے سے باز رکھا اور میں بادل ناخواستہ سواری پر بیٹھا رہا۔ غلام خچر کی لگام پکڑے ہوئے آگے آگے چل رہا تھا۔ میری نگاہ شہر کے کشادہ راستوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ راہ چلنے والوں نے میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ مقامی لوگ کبھی پرانے کپڑوں کو دیکھتے اور کبھی اس قیمتی اور آراستہ سواری کو۔ اور کبھی اس غلام کو جو اپنی فرمانبرداری ظاہر کرنے کے لیے سر جھکائے ہوئے تھا۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں حیرت کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی نے مجھ پر طعنہ زنی تو نہیں کی مگر میں لوگوں کی نگاہوں کا مفہوم خوب سمجھتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار میری مفلسی ایک بڑے مجمع کے سامنے پیش ہوئی تھی، اس لیے احساس نے شدت اختیار کر لی۔ اہلِ عراق کی نگاہیں بدن میں تیروں کی طرح چبھنے لگیں۔ لیکن علم کی خاطر سب کچھ برداشت کرنا پڑا۔ راہ گیر عالمِ استعجاب میں مجھے دیکھتے ہوئے گزرتے رہے اور خچر آہستہ روی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ میری سواری کوفے کی گلیوں میں داخل ہو گئی۔ اب ایک نیا مرحلہ درپیش تھا۔ میری نظروں کے سامنے مکانوں کی بلند دیواریں تھیں، آسودہ حال چہرے تھے اور قیمتی عبائیں تھیں جنہیں دیکھ کر اہلِ عراق کی مطمئن زندگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ بعض دروازوں پر اتنے دلکش نقش و نگار بنائے گئے تھے کہ میری آنکھیں جم کر رہ گئیں۔ میں نے آج سے پہلے ایسی طرزِ معاشرت کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بے اختیار مجھے اہلِ حجاز کی مفلسی یاد آ گئی۔ کہاں وہ سر چھپانے کے لیے معمولی پناہ گاہیں اور کہاں یہ شاندار، منقش اور روشن عمارتیں۔ کہاں وہ معمولی کپڑوں میں لپٹے ہوئے بدن اور کہاں یہ زرنگار قباؤں میں ملبوس جسم۔ کہاں وہ شکم کی آگ بجھانے کے لیے دو روٹیوں کا انتظار اور کہاں یہ قدم قدم پر آسائشوں کے انبار۔ کہاں وہ معرکہ حیات میں انسانی لب و رخسار پر جلتی ہوئی دھوپ کے نشان اور کہاں یہ پرسکون زندگی، شاداب چہرے اور سروں پر عافیت کے سائبان۔ دونوں میں کوئی توازن نہیں تھا۔ ایک طرف مسائل کی آگ برس رہی تھی اور دوسری جانب دولت کی شبنم فشانی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان مناظر سے چشم پوشی کر لوں مگر ناکام رہا۔ دل پر ایک بار چوٹ پڑی تو سوئے ہوئے تمام جذبے بیدار ہو گئے۔ میں نے اہلِ حجاز کو بھلانا چاہا لیکن وہ مجھے پیہم یاد آتے رہے۔ پھر یادوں کی لو اتنی تیز ہو گئی کہ مجھے اپنے دل پر کوئی اختیار نہیں رہا۔ درد کی ایک شدید لہر اٹھی اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ امام محمدؒ کے غلام کو میری اس کیفیت کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں گم تھا

اور میرے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ اچانک غلام ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ یہ مکان دوسرے مکانوں سے زیادہ بلند تھا۔ اس کے در و بام پر انسانی ہاتھوں کی کاریگری اور صناعی کے زیادہ دلکش نمونے نظر آ رہے تھے۔

"نیچے تشریف لے آیئے۔" غلام نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "یہی ہے میرے آقا کا مکان۔ آپ اسی جگہ قیام فرمائیں گے۔" غلام کی بات سن کر میں کچھ دیر کے لیے حیرت زدہ رہ گیا۔ جب میں نیچے نہیں اترا تو اس نے میری طرف پلٹ کر دوبارہ کہا مگر جیسے ہی غلام نے میرے بہتے ہوئے آنسو دیکھے، وہ پریشان سا ہو گیا۔ "آپ رو رہے ہیں؟" غلام کی آواز کانپ رہی تھی اور چہرہ خوف و دہشت سے زرد ہو رہا تھا "کیا مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہو گئی؟"

میں غلام کی یہ حالت دیکھ کر فوراً نیچے اتر آیا۔ وہ میرے آنسوؤں کو اپنی کسی غلطی کا نتیجہ سمجھ رہا تھا۔

"تم ایک فرض شناس غلام ہو۔" میں نے اس کی وحشت و پریشانی دور کرنے کے لیے کہا "تم کسی کوتاہی کے مرتکب نہیں ہوئے ہو۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔"

"پھر آپ رو کیوں رہے ہیں؟" غلام کا لہجہ بڑا ہمدردانہ تھا۔

"میرے آنسوؤں کا تعلق تمہاری ذات سے نہیں ہے۔" میں نے غلام کو مطمئن کرنے کی کوشش کی "مجھے اپنے ہم وطن یاد آ رہے ہیں۔ محنت و مشقت کے پسینے میں نہائے ہوئے اہلِ مکہ۔ غربت و افلاس کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے اہلِ مدینہ۔ میں اہلِ حجاز کی حالتِ زار پر آنسو بہا رہا ہوں۔ محمد بن ادریس اشک ریزی کے سوا کر بھی کیا کر سکتا ہے؟ قریش کے ایک بے سکون بے آرام فرزند کا بس یہی سرمایہ ہے۔ میں آج اسی سرمائے کو اہلِ عراق کے درمیان لٹا رہا ہوں۔ مگر بے جان مٹی کے سوا کون اس کا طلب گار ہے؟ کوئی نہیں۔ کوفے کی خاک کے سوا کوئی نہیں۔" غلام حیرت سے میری شکل دیکھ رہا تھا۔ یہ باتیں اس کی عقل سے بالاتر تھیں اور شدتِ احساس نے مجھے اپنے گرد و پیش سے بے نیاز کر دیا تھا۔ بار بار میری نگاہیں بلند و بالا مکانوں کی جانب اٹھ جاتی تھیں پھر ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ میں نے بے اختیار ہو کر کہا۔

"اہلِ کوفہ! تم جانتے ہو کہ تمہارے دینی بھائی کس حال میں ہیں؟ مگر تمہیں کیا معلوم کہ اہلِ حجاز پر کیا گزر رہی ہے؟ لوگوں نے اس خوف سے اپنے دروازے بند کر لیے ہیں کہ دیارِ حرم سے آنے والی خبریں ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکیں۔ صد حیف! عراق والوں نے سونے اور چاندی کے گھر بنا لیے ہیں



اور حجاز کے لوگ اتنے ناآسودہ ہیں کہ گھٹیا گوشت ان کی غذا ہے اور وہ کھجوروں کی سوکھی گٹھلیاں چوس رہے ہیں۔" میں بہت دیر تک اہلِ وطن کی شکستہ حالت کو یاد کر کے روتا رہا۔

امام محمدؒ کا غلام میرے گریۂ پیہم سے بدحواس ہو گیا تھا۔ اس نے بڑے خوشامدانہ لہجے میں مجھ سے کہا "آقا! خدا کے لیے آپ اندر چلیے۔" اشک ریزی نے کسی حد تک میرے جذبوں کو سرد کر دیا تھا پھر میں خاموشی سے غلام کے پیچھے پیچھے اس کمرے میں چلا گیا جو قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ غلام مجھے غم زدہ اور مفلس سمجھ کر میری دلجوئی کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا مگر اس بے چارے کو کیا پتا کہ میرا دکھ کیا تھا اور کون سی خلش مجھے رلا رہی تھی؟ غلام کی زبان پر آنے والے حرف شیریں تھے، گفتگو میں ٹھنڈک تھی لیکن میرے دل و دماغ کی سوزش کا وہی عالم تھا۔ اور آنسو اسی انداز میں رواں تھے۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ غلام گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی مڑ کر دیکھا۔ کوفے کے سب سے بڑے مفتی امام محمد بن حسنؒ تشریف لے آئے تھے۔ میں امامؒ کے احترام میں اپنی جگہ استادہ ہو گیا۔ امام محمدؒ نہایت مسرور و مطمئن تھے مگر میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھے "بندہ خدا! تم رو رہے ہو!" امامؒ کی آواز سے حیرت نمایاں تھی "کیا تم نے یہ ساری چیزیں دیکھ کر کوئی غلط تاثر قبول کر لیا ہے؟" امام محمدؒ نے مجھ سے سوال کیا تھا مگر میں خاموش رہا پھر خود ہی فرمانے لگے "اپنے دل میں کسی برے خیال کو جگہ نہ دینا۔ یہ سب کچھ جو تم دیکھ رہے ہو، حلال کی کمائی کے ذریعے حاصل کیا گیا ہے۔ سالانہ پوری زکوٰۃ نکالتا ہوں۔ میں اپنے کسی فرض سے غافل نہیں۔ خدا کی رحمت پر یقین رکھتا ہوں۔ وہ بروزِ حشر اس سلسلے میں مجھ سے جواب طلب نہیں کرے گا۔" اتنا کہہ کر امام محمدؒ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے "بیٹھ جاؤ۔" امامؒ نے محبت سے کہا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ امام محمدؒ خود بھی بیٹھ گئے اور دوبارہ فرمانے لگے "میرے پاس جو کچھ ہے، وہ خدائے بے نیاز کا عطا کردہ ہے۔ اس نے مجھے اپنے بے مثال فضل و کرم سے اس طرح نوازا ہے کہ میری آسودگی کو دیکھ کر دوست خوش ہوتے ہیں اور دشمن جل جاتے ہیں۔"

"معاذ اللہ! نہ میں آپ کے دشمنوں میں شامل ہوں اور نہ حسد کرنے والوں میں۔" میں نے امام محمدؒ کی بات سن کر عرض کیا "میں اہلِ عراق کی آسودہ حالی سے نہیں جلتا، اہلِ حجاز کی غربت پر آنسو بہاتا ہوں، میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں، ملتِ اسلامیہ سے سوال کرتا ہوں کہ یہ عدم توازن کیوں ہے؟ دیارِ حرم کے رہنے والے تشنہ لب کیوں ہیں اور یہاں نعمتوں کے دریا کیوں جاری ہیں؟" امام محمدؒ میری

ان بے قراریوں کا مفہوم سمجھ گئے تھے مگر اس نظام پر ان کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب حضرت امام شافعیؒ کی عمر چودہ اور پندرہ سال کے درمیان تھی۔ اس کم سنی میں یہ شعور، یہ جذبہ، یہ شدتِ احساس، بڑی عجیب بات تھی۔ امام محمدؒ فرزندِ قریش کی ذہانت سے پہلے ہی متاثر ہو چکے تھے مگر جب اس قلبِ معصوم میں پورے عالمِ اسلام کا درد موجزن دیکھا تو یہ تاثر کچھ اور گہرا ہو گیا۔

امام محمدؒ بہت دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ یہ محض اس لیے تھا کہ امام شافعیؒ کے ذہن پر چھایا ہوا غبار ڈھل جائے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ امام شافعیؒ آہستہ آہستہ پُرسکون ہوتے چلے گئے۔ کچھ دیر پہلے یادوں کی جس یلغار نے آپ کے دل و دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اب وہ دھندلی ہوتی جا رہی تھی۔ امام محمدؒ کا محبت آمیز طرزِ سلوک جلتے ہوئے زخموں کے لیے ایک مرہم کی حیثیت رکھتا تھا۔ آخر امام شافعیؒ حقائق کی اس دنیا میں واپس لوٹ آئے جہاں اسلامی مساوات کے نمونے بہت کم اور معاشرتی ناہمواریوں کی مثالیں بے شمار تھیں۔

جب فرزندِ قریش کے چہرے پر تلخیوں کا کوئی عکس باقی نہ رہا تو امام محمدؒ نے فرمایا ''غسل کر لو تاکہ طویل مسافت کی تھکن دور ہو جائے۔'' اس کے ساتھ ہی امامؒ نے اپنے غلام کو پانی وغیرہ کی فراہمی کا حکم دیا۔ امام شافعیؒ واقعتاً بہت زیادہ تھک چکے تھے۔ چہرہ اور لباس راستے کے گرد و غبار سے آلودہ ہو چکے تھے، اس لیے غسل کے تصور نے آپ کو فرحت بخشی۔ فوراً ہی نہانے چلے گئے۔ غسل سے فارغ ہوئے تو امام محمدؒ نے آپ کو ایک نہایت قیمتی جوڑا پیش کیا (خود امام شافعیؒ کے بقول اس لباس کی قیمت ایک ہزار درہم تھی) فرزندِ قریش نے اس گراں بہا پوشاک کو بہت غور سے دیکھا پھر آپ نے اپنے بوسیدہ کپڑوں پر نظر ڈالی۔ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں تھی۔ امام شافعیؒ اس وقت جسم پر چادر لپیٹے ہوئے تھے۔ یہی ایک چادر آپ کا زادِ سفر تھی۔ آپ نے دوبارہ امام محمدؒ کی پیش کردہ قبا کو دیکھا جو قبائے زرنگار تو نہیں تھی لیکن قیمت میں اس سے کس طرح کم بھی نہیں تھی۔ امام شافعیؒ بار بار دونوں ملبوسات کو دیکھتے تھے۔ ایک آپ کے جسم کا حصہ تھا اور دوسرا مفتی کوفہ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ امام محمدؒ آپ کی ذہنی کشمکش کا اندازہ کر چکے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے، امام شافعیؒ نے بڑے اثر انگیز لہجے میں کہا ''امامؒ آپ کی اس عطائے خاص کا بے حد شکریہ۔ مجھے میری یہی قبائے پارینہ کافی ہے۔ دریائے فرات کا تازہ پانی اس کی کثافت دور کر دے گا اور میں اسے دوبارہ پہن لوں گا۔ جب تک میرے لباس کے تار ایک دوسرے



سے پیوستہ ہیں، اس وقت تک مجھے مزید کپڑا درکار نہیں۔ ستر پوشی، قاقم و سنجاب سے بھی ہو سکتی ہے اور ٹاٹ سے بھی۔ پھر یہ تکلف و اہتمام کیوں؟ ویسے بھی عراق میں میری آمد کا یہ مقصد نہیں ہے کہ میں کسی کو زیر کروں۔ تلاشِ علم میری منزل ہے، باقی گردِ سفر۔ نہ مجھے کچھ یاد آتا ہے اور نہ میں کسی شے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔'' امام شافعیؒ کا انداز مودبانہ ہوتے ہوئے بھی بڑا قلندرانہ تھا۔

امام محمدؒ چند ثانیوں کے لیے خاموش رہے پھر امام شافعیؒ سے ایک خاص یگانگت کے لہجے میں بولے ''فرزند! یہ لباس میری آسودہ حالی کی نمائش نہیں، یہ تو ایک نذر ہے جو میزبان کی جانب سے ذی قدر مہمان کو پیش کی جا رہی ہے۔ اگر تم انکار کر دو گے تو مجھے دلی اذیت پہنچے گی۔ میری خاطر اسے پہن لو۔ ابھی تک اس قبا کی کوئی حیثیت نہیں مگر تمہارے جسم سے مس ہونے کے بعد یہ بے بہا ہو جائے گی۔ امام محمدؒ کی گفتگو جذبۂ محبت سے سرشار تھی۔ انہیں ایک ہی ملاقات میں اندازہ ہو گیا تھا کہ مکہ معظمہ سے آنے والا یہ نوخیز طالبِ علم تہی دست ہونے کے باوجود کس قدر حساس اور غیرت مند ہے۔ اس لیے امام محمدؒ بہت محتاط لہجے میں بات کر رہے تھے۔

اپنے میزبان کا یہ انکسار اور جذبات کی وارفتگی دیکھ کر امام شافعیؒ مجبور ہو گئے۔ اور آپ نے غلام کے ہاتھ سے وہ قیمتی لباس پہن لیا۔ فرزندِ قریش نے مفتیٔ کوفہ کی نذر قبول کر لی تھی۔ اس طرح کہ امام شافعیؒ کے چہرے پر عکسِ ندامت نہ تھا اور امام محمدؒ کے رخ پر غرور کی کوئی جھلک نہ تھی۔ نذر قبول کرنے والا بھی غیور و عظیم تھا۔ اور نذر پیش کرنے والا بھی اہلِ دل اور بڑا صاحب کمال تھا۔

☆☆☆

پھر رات کے کھانے کا وقت آ گیا۔ امام محمدؒ نے امام شافعیؒ کی خاطر کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا لیکن فارغ البالی کے سبب دسترخوان پر بہترین کھانے موجود تھے۔ ایک بار پھر فرزندِ قریش کو اہلِ حجاز یاد آ گئے۔ سستے گوشت اور کھجوروں سے شکم کی آگ بجھانے والے۔ درد کی لہریں دماغ سے اٹھیں اور دل کی طرف بڑھیں مگر امام شافعیؒ جذبات کی ان سرکش ہواؤں کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ آپ کو اپنے مہمان کی فراخ دلانہ تواضع کا بہت زیادہ لحاظ تھا اس لیے چپ چاپ سر جھکائے ہوئے کھانا کھاتے رہے۔ امام شافعیؒ کے کھانے کی رفتار بہت سست تھی۔ امام محمدؒ بار بار ٹوکتے۔

''فرزند! تمہارے تکلّف سے مجھے الجھن ہو رہی ہے۔ تم اس اجنبیت کو ختم کیوں نہیں کر دیتے؟ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔'' امام محمدؒ جذبے کی صداقت اور دل کی گہرائی سے یہ بات کہہ رہے تھے۔ ان کی مہمان

نوازی میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔ جب وہ اصرار کرتے تو امام شافعیؒ کھانے میں دلچسپی لینے لگتے۔ اس طرح کہ اگر کوئی پوچھتا تو کھانے کا صحیح ذائقہ بتانے سے قاصر رہتے۔ طبیعت کی اس فطری بے رغبتی نے امامؒ کو عمری ہی میں لباس اور غذا کی خوف ناک زنجیروں سے آزاد رکھا تھا۔ آپؒ خوش پوشاکی اور خوش خوراکی کے اس صورت میں قائل تھے جب تمام مسلمان خدا کی ان نعمتوں سے فیض یاب ہوں۔

غرض کھانا تمام ہوا۔ کچھ دیر بعد امام شافعی نے امام محمد کے ساتھ نمازِ عشا ادا کی پھر امام محمدؒ آپ کو اپنے کتب خانے میں لے گئے۔ امام شافعیؒ نے اب تک اپنی زندگی میں اتنی کتابوں کا ذخیرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے حیران رہ گئے اور اپنے فطری ذوقِ مطالعہ سے مجبور ہو کر خواہش کرنے لگے کہ کاش انہیں ان کتابوں کو پڑھنے کا موقع میسر آ جائے۔ اسی دوران امام محمدؒ نے ایک کتاب اٹھائی اور امام شافعیؒ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے "فرزند! اسے دیکھو۔" امام شافعیؒ نے بڑے ادب سے وہ کتاب لے لی اور کھڑے کھڑے ورق گردانی کرنے لگے۔ یہ امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کی مشہور تالیف "الکتاب الاوسط" تھی۔

کتاب دے کر امام محمدؒ سونے کے لیے چلے گئے مگر امام شافعیؒ کی آنکھوں سے نیند بہت دور تھی۔ مجلسِ علم اور کتاب کی موجودگی میں آپ دنیا کی ہر شے کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ امامِ اعظم کی تصنیف دیکھی تو اس قدر طویل سفر کی تھکن بھی بھول گئے اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو کر کتاب پڑھنے لگے۔ جیسے ہی امام شافعیؒ نے آخری سطر ختم کی، قریب کی مسجد سے موذن کی صدا سنائی دی۔ "اللہ اکبر......" گویا رات تمام ہو گئی تھی۔ کوفے کے بیشتر باشندوں نے اپنے نرم بستروں میں سوتے ہوئے وقت گزار دیا تھا مگر پھر بھی کچھ جاگنے والے جاگ رہے تھے اور ان ہی شب بیداروں میں ایک حضرت امام شافعیؒ بھی تھے۔ موذن کی آواز سنتے ہی آپ نے کتاب رکھ دی اور زیرِ لب کہا "اللہ سب سے بڑا ہے۔" کچھ دیر تک فرزندِ قریش اپنے رب کی تسبیح بیان کرتے رہے اور پھر بستر سے اٹھ کر مسجد چلے گئے۔

نماز کے بعد آپ امام محمدؒ کے ہمراہ گھر واپس آنے لگے۔ "رات کیسی گزری؟" راستے میں امام محمد نے آپ کی مزاج پرسی کرتے ہوئے کہا۔

"علم کے سائے میں بسر ہونے والی راتیں بڑی پُرسکون ہوتی ہیں۔ خدا نے اپنے بندے شافعیؒ کو



گزشتہ شب وہ طمانیت بخشی کہ اسے تمام عمر فراموش نہ کر سکے گا۔" فرزندِ قریش نے شگفتہ لہجے میں جواب دینے کی کوشش کی مگر چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ "امام! جس طرح آپ نے ایک غریب الدیار طالب علم کو اپنی محبتوں سے سرفراز کیا، خدا اس حسنِ سلوک پر آپ کو بھی جزائے خیر دے۔ احسان شناسی کے اظہار کے لیے میرے پاس لفظوں کے سوا کچھ نہیں۔"

"نہیں فرزند! یہ کوئی احسان نہیں۔ تم اسی محبت و احترام کے مستحق ہو۔" امام محمدؒ نے اپنی مہمان نوازی کے ذکر کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے کتاب دیکھی تھی یا سفر کی تکان نے تمہیں گہری نیند سلا دیا تھا؟"

"رات بھر جاگتا رہا۔" امام شافعیؒ آہستہ لہجے میں بول رہے تھے۔ شب بیداری کے باعث آپ کے اعصاب بوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ "کتاب پر نظر ڈالی مگر اس کا ادراک آسان نہیں۔ کہاں وہ امامِ جلیلؒ اور کہاں علم کا ایک پریشاں حال کوچہ گرد۔" امام شافعیؒ نے حضرت ابوحنیفہؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا "میرے لیے یہی شرف کافی ہے کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس مردِ باکمال کی تصنیف کو چھو لیا اور اس فقیہہ اعظمؒ کی تحریر دیکھ کر آنکھوں کی روشنی بڑھالی۔ یہ اعترافِ حقیقت تھا لیکن اس کے باوجود امام شافعیؒ نے امام محمدؒ کو یہ نہیں بتایا کہ آپ ایک ہی رات میں پوری کتاب حفظ کر چکے ہیں۔

گھر پہنچ کر امام محمدؒ نے امام شافعیؒ کے سرہانے رکھی ہوئی کتاب اٹھالی۔ چند لمحوں تک کتاب کو درمیان سے کھول کر دیکھتے رہے پھر امام شافعیؒ سے کہا "تم بہت زیادہ تھکے ہوئے نظر آ رہے ہو۔ اب آرام کرو۔ تازہ دم ہونے کے بعد کسی دوسری کتاب کا مطالعہ کرنا۔" یہ کہہ کر امام محمدؒ چلے گئے۔ مفتی کوفہ کے جاتے ہی امام شافعیؒ نرم و گداز بستر پر دراز ہو گئے۔ بہت زیادہ مضمحل اور تھکے ہوئے تھے اس لیے لیٹتے ہی گہری نیند سو گئے۔

دوسرے دن امام محمدؒ اپنے شاگردوں اور مسائل پوچھنے والوں کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ امام شافعیؒ بھی ان کے دائیں جانب موجود تھے۔ اچانک ایک شخص مجلس میں داخل ہوا اور سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ لوگ اپنے اپنے مسائل پیش کر رہے تھے اور امام محمدؒ ان کے جوابات دے رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہی شخص کھڑا ہوا اور اپنا مسئلہ بیان کر کے امام محمدؒ سے فتویٰ طلب کرنے لگا۔ امام محمدؒ چند لمحوں تک غور و فکر کرتے رہے پھر کہنے لگے۔ "حضرت ابوحنیفہؒ نے اس مسئلے پر یہ فتویٰ دیا ہے......"

اس شخص نے امام محمدؒ کا جواب سنا اور اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا مگر امام شافعیؒ بے چینی سے بار بار پہلو بدلنے لگے۔ آپ کے نزدیک امام محمدؒ کا جواب اطمینان بخش نہیں تھا۔ فوراً خیال آیا کہ اپنے میزبان کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں۔ پھر سوچا کہ کہیں امام محمدؒ کو یہ بات گراں نہ گزرے۔ کچھ دیر تک امام شافعیؒ کے دل و دماغ میں بڑی عجیب کش مکش جاری رہی۔ ایک طرف امام محمدؒ کے احسانات تھے اور دوسری طرف دینی مسئلہ۔ مروت سے کام لیتے تو امام محمدؒ کے فتوے کی روشنی میں وہ شخص غلط قدم اٹھا سکتا تھا اور اگر اہلِ مجلس کے سامنے اپنی معلومات کا اظہار کرتے تو امام محمدؒ جیسے جلیل القدر فقیہہ کی ناراضگی کا خدشہ تھا۔ ابھی آپ ان ہی خیالات میں الجھے ہوئے تھے کہ دوسرا شخص اپنا مسئلہ دریافت کرنے کھڑا ہوا لیکن ابھی وہ کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ امام شافعیؒ، امام محمدؒ سے مخاطب ہوئے۔

''کیا آپ نے پہلے شخص کے مسئلے کا جواب بیان فرما دیا ہے؟'' امام شافعیؒ نے سر جھکا کر کہا۔ آپ پہلے ہی امام محمدؒ کا بہت احترام کرتے تھے لیکن اہلِ مجلس کے سامنے کچھ زیادہ مودب ہو گئے تھے۔

''ہاں۔ جواب مکمل ہے۔'' امام محمدؒ نے حیرت سے کہا ''تمہیں نامکمل کا خیال کیوں آیا؟'' مفتی کوفہ نے فرزندِ قریش سے پوچھا۔

''میرے خیال میں آپ اپنے جواب پر دوبارہ غور فرما لیتے۔'' امام شافعیؒ نے اس طرح کہا کہ آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔ اہلِ مجلس ایک نوعمر اور اجنبی لڑکے کی بات سن کر چونک اٹھے۔ امام محمدؒ کے چہرے پر ناگواری کا کوئی تاثر نہیں تھا مگر ان کے شاگردوں اور دوسرے معززینِ محفل کی پیشانیاں شکن آلود ہو گئی تھیں۔

''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اندازِ گفتگو مبہم تھا اس لیے امام محمدؒ ابھی تک امام شافعیؒ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکے تھے۔

''اس مسئلے میں حضرت ابوحنیفہ کا جواب آپ کے بیان سے مختلف ہے۔'' آخر علم کے تقاضے مروت کی رسموں پر غالب آ گئے اور امام شافعیؒ نے ادب کے تمام قوانین پیشِ نظر رکھتے ہوئے دل کی بات کہہ دی۔

''یہ کس طرح ممکن ہے؟'' امام محمدؒ نے اس طرح پوچھا کہ ان کے چہرے پر برہمی کی کوئی علامت نہیں تھی اور لہجے میں بھی وہی ٹھہراؤ تھا جو ایک امام کے شایانِ شان ہوتا ہے۔

''نسیان سے انسان کا گہرا تعلق ہے۔'' امام شافعیؒ بدستور ادب کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ''ممکن ہے



آپ سے سہو ہو گیا ہو۔'' جیسے ہی آپ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے اہلِ مجلس سرگوشیاں کرنے لگے۔ حاضرین میں سے کسی ایک فرد کو بھی امام شافعیؒ کی بات پسند نہیں آئی تھی۔ اہلِ محفل کے خیال میں اتنے بڑے امامؒ کے سامنے ایک نوعمر لڑکے کو بولنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس کے برعکس امام محمدؒ حاضرین کے ان سطحی خیالات سے بے نیاز تھے۔

''فرزند! تمہاری یہ بات درست ہے کہ انسانی ذہن کبھی کبھی واقعے کی تفصیلات گم کر دیتا ہے مگر میں تو حضرت ابوحنیفہؒ کا خدمت گزار رہ چکا ہوں۔ میں نے نہ صرف امامؒ کی کتابوں کو اپنی روح میں منتقل کیا ہے بلکہ اس مردِ جلیل کو زبانی فتوے دیتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔'' امام محمدؒ نے حضرت ابوحنیفہؒ سے اپنے رشتوں کا حوالہ دیا تھا کہ قول میں وزن پیدا ہو جائے اور امام شافعیؒ اچھی طرح سمجھ لیں کہ فقہ حنفی پر مفتیِ کوفہ کی نظر کتنی گہری ہے۔ یہ کوئی فخر و غرور کا مظاہرہ نہیں تھا۔ علمی بحث کے دوران میں ایسے حوالے پیش کرنا اکثر علما کا معمول رہا ہے۔ شاید اسی وجہ سے امام محمدؒ نے حضرت ابوحنیفہ سے اپنے تعلقِ خاص کا ذکر کیا تھا۔

''امام! آپ کی اس نسبتِ عظیم سے کون انکار کر سکتا ہے؟ آپ بھی معتبر ہیں اور آپ کا پیش کردہ حوالہ بھی اعتبار کے آبرو ہے۔'' امام شافعیؒ نے والہانہ انداز میں کہا ''میں صرف نسیان کی بات کر رہا ہوں جس کا شکار کوئی بھی ذی عقل ہو سکتا ہے۔''

''تو فرزند! پھر تم ہی بتا دو کہ اس مسئلے میں حضرت ابوحنیفہؒ نے کیا فتویٰ دیا ہے؟'' امام محمد نے انتہائی تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ امام محمد کی شانِ علمی تھی کہ اپنی تحقیق پر ایک نوعمر طالب علم کے اعتراض کو مسکراتے ہوئے برداشت کر لیا تھا۔

''اس مسئلے میں حضرت ابوحنیفہ کا یہ قول ہے۔'' امام شافعیؒ نے امام اعظمؒ کا تحریر کردہ ایک ایک حروف دہرا دیا پھر اپنے دعوے کو مزید تقویت دینے کے لیے کہا ''حضرت ابوحنیفہؒ نے اپنی کتاب میں اس مسئلے کو فلاں مسئلے سے پہلے بیان کیا ہے۔ اور فلاں مسئلے کے بعد۔'' امام شافعیؒ کا جواب سن کر تمام اہلِ مجلس حیرت زدہ تھے۔ ان کی نظر میں یہ عجیب و غریب طالب علم تھا جو مذکورہ مسئلے کو اس ترتیب کے ساتھ بیان کر رہا تھا جیسے اس کے سامنے حضرت ابوحنیفہؒ کی کتاب کھلی رکھی ہو اور وہ دیکھ دیکھ کر ایک ایک لفظ پڑھ رہا ہو۔

امام محمدؒ کچھ دیر تک خاموش رہے پھر اپنے ایک خادم کو کتاب لینے کے لیے بھیج دیا۔ اس وقفے میں

کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ حاضرین سر بہ گریباں تھے اور کچھ لوگ ایک حجازی لڑکے کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ اہلِ نظر بارہا اس مجلسِ علم میں شریک ہوئے تھے مگر انہوں نے آج تک بام و در کو اتنا ساکت نہیں دیکھا تھا یہاں موجود عوام ایک عجیب قسم کے سناٹے کے اسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ بعض کم علم حضرات دل ہی دل میں امام شافعیؒ کو برا کہہ رہے تھے۔ ان کے خیال میں جہاں بڑے بڑے دانش ور اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے آتے ہیں وہاں ایک اجنبی نوجوان نے نیا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔

آخر ساعتِ انتظار ختم ہوئی۔ خادم کتاب لے کر آ گیا۔ امام شافعیؒ ابھی تک اہلِ مجلس کی ناپسندیدہ نظروں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ لوگوں کو یقین تھا کہ جب اس سلسلے میں حضرت ابوحنیفہؒ کی کتاب سے رجوع کیا جائے گا تو امام محمدؒ کا دعویٰ درست ٹھہرے گا اور یہ حجازی لڑکا برسرِ محفل شرمندہ ہو جائے گا پھر اس کی ذات مسلسل طنز و اعتراض کا ہدف بن جائے گی۔

''تم اس مسئلے کا جواب پڑھ کر سناؤ۔'' امام محمدؒ نے اپنے ایک شاگردِ خاص کو کتاب دیتے ہوئے کہا۔ شاگرد ادب سے آگے بڑھا اور امام محمدؒ کے ہاتھ سے حضرت ابوحنیفہؒ کی تالیف ''کتاب الاوسط'' لے کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ شاگرد کو مذکورہ مسئلے کی جستجو تھی۔

''فلاں صفحے پر دیکھو۔'' اچانک امام شافعیؒ نے کہا۔ آپ کی آواز آہستہ تھی لیکن اس سے اعتماد جھلک رہا تھا۔ اہلِ مجلس کو یہ بات بھی گراں گزری۔ ان کے خیال میں اساتذہ کے درمیان بیٹھ کر ایک نوعمر لڑکے کو اپنے حافظے پر اتنا یقین نہیں کرنا چاہیے تھا۔ غرض وہ صفحہ تلاش کیا گیا جس کی طرف امام شافعیؒ نے اشارہ کیا تھا۔ یہ چند لمحوں کا عمل تھا۔ امام محمدؒ کے شاگرد نے مطلوبہ صفحہ ڈھونڈ کر مسئلے کا جواب پڑھنا شروع کیا۔ واقعتاً حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے اقوال میں اتنا فرق تھا کہ دونوں بیانات ایک دوسرے سے بالکل مختلف نظر آتے تھے۔ اس کے برعکس امام شافعیؒ نے حضرت ابوحنیفہؒ کے جس قول کا حوالہ دیا تھا وہ حرف بہ حرف درست تھا۔ پوری مجلس میں ہلچل سی مچ گئی۔ حاضرین کو امام شافعیؒ کی قوتِ حافظہ نے حیران کر دیا۔ پھر کسی نے کہا ''باقی مسائل کی ترتیب بھی دیکھو۔'' یہ بات اس لیے کہی گئی کہ اگر امام شافعیؒ کی بیان کردہ ترتیب غلط ثابت ہو جاتی تو کم نظر لوگوں کے ہاتھ ایک بہانہ آ جاتا اور فرزندِ قریش کو کسی نہ کسی عنوان شرمندہ ہونا پڑتا۔ بڑی عجیب خواہش تھی، بڑا عجیب منصوبہ تھا۔ مگر لوگ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ امام شافعیؒ کی قسمت میں سربلندی لکھی جا چکی تھی۔ امام محمدؒ کے شاگرد نے دوبارہ کتاب



پر نظر ڈالی۔ مذکورہ مسئلہ اسی طرح درج تھا جس طرح امام شافعیؒ نے اس کی ترتیب بیان کی تھی۔ علمائے کوفہ سوچتے ہی رہ گئے۔ ان لوگوں نے آج تک اتنا ذہین نوجوان نہیں دیکھا تھا جو ایک حوالے کے لیے کئی حوالے پیش کر رہا تھا۔ اگر اہلِ مجلس کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ فرزندِ قریش نے حضرت ابوحنیفہؒ کی اس دقیق اور فکر انگیز کتاب کو صرف ایک نظر دیکھا تھا تو خدا جانے ان کے تاثرات کیا ہوتے؟ لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہونے کے باوجود بھی حاضرینِ محفل انگشت بدنداں تھے۔ کچھ دیر پہلے جس حجازی لڑکے کو اہلِ علم کے درمیان گستاخ و بے ادب سمجھا جا رہا تھا، اب وہی نوعمر طالب علم ذہانت کی روشن ترین علامت ٹھہرا تھا۔ مگر لوگ اس سے خوش نہیں تھے۔ مجلس کے کسی گوشے سے تحسین و آفرین کی کوئی صدا بلند نہیں ہوئی تھی۔ بس لوگ فرطِ حیرت سے خاموش تھے اور سوچ رہے تھے کہ یہ لڑکا کون ہے، کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور کوفے میں کب آیا ہے؟

امام محمدؒ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ امام شافعیؒ نے ''کتاب الاوسط'' کا سرسری مطالعہ کیا تھا۔ اس صورت میں واقعات کی جزئیات تک کو ذہن نشین کر لینا، بلاشبہ امام شافعیؒ کا کمال تھا۔ آخر امام محمدؒ جیسے فقیہہ کو بھی امام شافعیؒ کی اس غیر معمولی صفت کا اعتراف کرنا پڑا۔ ''فرزند! تمہارا خیال درست تھا۔'' امام محمدؒ نے سیکڑوں انسانوں کی موجودگی میں روایتی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور اپنے فیصلے سے رجوع کر لیا پھر اس شخص سے مخاطب ہوئے ''تمہارے سوال کا جواب وہ نہیں جو پہلے میں نے بیان کیا تھا۔ درست جواب یہ ہے جسے کتاب کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔'' امام محمدؒ کے ان الفاظ سے فرزندِ قریش کی ذہانت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی گئی لیکن حاضرینِ مجلس کے دلوں پر...... بدستور ایک غبار سا چھایا ہوا تھا۔ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جانے والے انسانوں کی خواہش تھی کہ صرف ان کا امام مستند ٹھہرے اور ان ہی کا مکتبہ فکر معتبر قرار پائے۔ اس لیے امام شافعیؒ کو اہلِ کوفہ سے اس ذوقِ طلب اور جاں سوزی کی صحیح داد نہ مل سکی۔ مگر خدا نے امامؒ کو بہت پہلے دنیا کی ان تمام پر تکلف رسموں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

تنگ دل حضرات نے لطف اندوز ہونے کے لیے اس واقعے کو بڑے عجیب عجیب انداز میں بیان کیا ہے لیکن جب ہم امام شافعیؒ کے تحریر کردہ سفرنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو اس واقعے کا ذکر بہت سرسری انداز میں ملتا ہے۔ اس ذیل میں امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ جب امام محمد بن حسنؒ نے کتاب منگا کر دیکھی تو میری بات بالکل درست نکلی۔ امامؒ نے اسی وقت اپنے جواب سے رجوع کر لیا مگر اس واقعے کے بعد مجھے اور کتاب پڑھنے کے لیے نہیں دی۔

امام شافعیؒ کو دوسری کتاب نہ دینے میں کیا مصلحت تھی، اسے امام محمدؒ ہی بہتر سمجھتے ہیں لیکن اہلِ دنیا نے اس بات کو ہوا دے کر نئے نئے افسانے تراش لیے تھے۔ بعض غیر ذمے دار حضرات تو برملا کہتے تھے کہ امام محمد بن حسنؒ امام شافعیؒ کی بے مثال ذہانت دیکھ کر جل اٹھے تھے۔ اس قسم کے لوگ اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اگر امام محمدؒ کے سینے میں جذبہ حسد اپنی پوری توانائی کے ساتھ موجود نہیں تھا تو پھر انہیں امام شافعیؒ کو مطالعے کے لیے مزید کتابیں دینی چاہیے تھیں۔ یہ دلیل علمِ کلام اور منطق کے اعتبار سے تو بہت دلکش معلوم ہوتی ہے مگر امام محمدؒ جیسے پاکباز اہلِ علم کو انسانی عقل کے بنائے ہوئے چند اصولوں کے پیمانے سے نہیں ناپا جاسکتا۔ حضرت مولانا رومؒ نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔

"کارِ پاکاں برقیاس خود مگیر" (مقدس لوگوں کے کاموں پر قیاس آرائی نہ کر) ہمارے نزدیک جلال الدین رومیؒ کا یہی فرمودہ معتبر ہے اور اسی کی روشنی میں حضرت امام محمد حسنؒ کی ذاتِ گرامی ایسے تمام اعتراضات سے بلند تھی۔

اس واقعے کے کچھ دن بعد ایک روز امام محمدؒ تشریف لائے تو امام شافعیؒ خلافِ معمول اداس نظر آرہے تھے۔ امام محمدؒ نے مزاج پرسی کرتے ہوئے کہا "فرزند! تمہاری طبیعت تو ناساز نہیں؟"

"آپ کی مہمان نوازی تو بیماروں کو بھی تندرست کردیتی ہے۔" امام شافعیؒ نے خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"پھر کیا بات ہے؟ یہاں کسی سے کوئی شکایت تو نہیں؟ وطن یاد آرہا ہے یا ایسی کوئی بات ہے جسے تم مجھ سے چھپانا چاہتے ہو؟" امام محمدؒ نے فرزندِ قریش کی اداسی کے کسی امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا اور بیک وقت کئی سوال کر ڈالے تھے۔

"اہلِ شہر سے مجھے کوئی گلہ نہیں اور پھر آپ کے سوا میں یہاں کسی کو جانتا بھی نہیں۔" امام شافعیؒ نے جواباً فرمایا "وہ کون سا دن تھا جب مجھے اپنا وطن یاد نہیں آیا۔ مکہ تو آخری سانس تک میری نظروں کے سامنے رہے گا مگر اداسی کا سبب یہ نہیں۔"

"پھر تمہاری افسردگی کی کیا وجہ ہے؟ تم یقیناً مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" امام محمدؒ کے لہجے سے خلوص و محبت کا اظہار ہو رہا تھا۔

امام شافعیؒ نے فوری طور پر اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے پھر اسی انداز میں کہنے لگے "اب میں رخصت چاہتا ہوں۔ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت



دیجیے۔"

"میزبانی کے فرائض انجام دینے میں مجھ سے کوئی کوتاہی تو سرزد نہیں ہوئی؟" امام محمد اچانک فرزندِ قریش کی زبان سے جانے کی بات سن کر کچھ پریشان سے نظر آنے لگے تھے "میرے گھر سے جانا چاہتے ہو یا کوفے سے؟"

"امام! آپ نے مہمان نوازی کا حق ادا کردیا۔ آپ کے ساتھ گزارے ہوئے شب و روز مجھے ہمیشہ یاد رہے ہیں۔" امام شافعیؒ نے دل کی گہرائیوں سے اپنے میزبان کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "آپ کے گھر سے نکلا تو پھر کوفے میں کیا کشش باقی رہ جاتی ہے؟"

"تو پھر کہاں جاؤ گے؟" امام محمدؒ نے اپنے حجازی مہمان کے عزمِ سفر کی تفصیل جاننا چاہی۔

"کہیں بھی، خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔" امام شافعیؒ کا جواب بڑا بے نیاز تھا۔ "مجھے قدرت کی جانب سے جو مہلتِ زندگی بخشی گئی ہے، میں اسے علم اور مشاہدات کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔"

"بے شک! تمہارا جذبہ نیک، حوصلہ بلند اور مقصد عظیم ہے۔" امام محمدؒ نے ستائشی لہجے میں کہا "میں تمہیں فتوحاتِ مسلسل کی دعا دے سکتا ہوں مگر رخصت کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہی میرا طریقہ ہے، میں اپنے کسی بھی مہمان کو جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر تم خود ہی جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ میری خوشی تو اسی میں ہے کہ تم میرے ساتھ قیام کرو۔"

"آپ کی رسمیں بڑی دلنواز ہیں مگر امام! مجھے جانا ہی ہوگا۔" فرزندِ قریش نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "خدا کی یہ طویل و عریض دنیا مجھ سے پیہم سرگوشیاں کررہی ہے کہ بندہ خدا! رختِ سفر باندھ اور زمین پر بکھری ہوئی خدا کی بے شمار نشانیوں کو دیکھ۔ میں زیادہ دن کسی جگہ قیام کرہی نہیں سکتا۔ یہی میرا مزاج ہے یہی میری فطرت اور شاید حکمِ ربی بھی یہی ہے۔" امام شافعیؒ اس طرح بول رہے تھے جیسے آپ کی آنکھوں کے سامنے اونٹوں کی قطاریں رواں ہوں اور کان صدائے جرس سن رہے ہوں۔

امام شافعیؒ نے مفتی کوفہ کی اس فراخ دلانہ پیش کش کو قبول کرنے سے صاف انکار کردیا "آپ کی محبت اپنی جگہ مگر یہ سب کچھ میرے مقاصد کے خلاف ہے۔ میں اپنے گھر سے دولت کی ذخیرہ اندوزی کے لیے نہیں نکلا ہوں۔ میری دولت یہی ہے کہ اللہ کی تخلیقات کا مسلسل مشاہدہ کرتا رہوں۔ کائنات کو ہر زاویے سے دیکھوں۔ یہاں تک کہ میرا دماغ اور آنکھیں روشن ہوجائیں۔"

"فرزند! میری خوشی یہی ہے کہ تم اس نذر کو قبول کرلو۔" امام محمدؒ پیہم اصرار کرتے رہے۔ آخر امام

شافعیؒ نے خاموشی اختیار کر لی۔ یہ اس بات کا مبہم اشارہ تھا کہ آپ امام محمدؒ کی شدتِ خلوص کے آگے مجبور ہو گئے تھے پھر امام محمدؒ نے اپنے خادم کو طلب کر کے ایک صندوق منگایا۔ اسے کھول کر دولت شمار کی گئی تو تین ہزار درہم نکلے۔ امام محمدؒ نے وہ سب کے سب امام شافعیؒ کے حوالے کر دیے۔

پھر اہلِ کوفہ نے اس حجازی نوجوان کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھا جو چند روزہ قیام میں اپنی بے مثال قوتِ حافظہ اور جدت پسند فطرت کے باعث تنگ نظر انسانوں کے دل و دماغ پر ایک بوجھ بن گیا تھا۔ آج وہی پندرہ سالہ طالبِ علم ان کم نگاہ لوگوں کو بارگراں سے سبک دوش کر رہا تھا۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ نسیمِ سحری کی طرح آیا تھا اور بادِ صبا کی مانند واپس جا رہا تھا۔ اس کی آمد بھی قلندرانہ تھی اور رخصت بھی بے نیازانہ۔ نہ آنکھوں میں عکسِ ملال، نہ ہونٹوں پر حرفِ شکایت۔ شہر کوفہ کی فضاؤں میں جتنی بھی سانسیں لیں، احسان شناسوں کی طرح ان سب کا شکر گزار رہا۔ امام محمدؒ کی بارگاہِ علم میں سر جھکا کر بیٹھا۔ حاسدین سے بھی کشادہ دلی کے ساتھ ملا۔ پھر بھی دمِ رخصت اس کے قلبِ نازک کو ایک احساس نے بہت متاثر کیا۔ ساعتِ فراق آئی تو نہ کوئی آنکھ اس کے لیے بھیگی اور نہ کوئی چہرہ اداس ہوا۔ بے شک! امام محمدؒ نے اسے اس طرح رخصت کیا جس طرح ایک اہلِ علم، دوسرے اہلِ علم کو الوداع کہتا ہے مگر وہ کوئی اور ہی شے تھی جسے فرزندِ قریش، مفتی کوفہ کے چہرے پر تلاش کر رہا تھا۔ آخر جب وہ اپنی نامعلوم منزل کی طرف بڑھا تو اسے امامِ مدینہؒ بہت یاد آئے۔

☆☆☆

کوفے کی حدود سے نکل کر امام شافعیؒ کہاں گئے، کس سے ملے اور آپ کے ذوقِ علم نے کون سی راہ اختیار کی؟ ان اہم ترین سوالوں کا تفصیلی جواب کہیں نظر نہیں آتا۔ بعض تذکروں سے بس اتنا پتا چلتا ہے کہ امام شافعیؒ، امام محمدؒ سے رخصت ہونے کے بعد عراق کے مختلف شہروں میں قیام فرماتے رہے۔ جہاں بھی کوئی بارگاہِ علم دیکھتے، ادب کے ساتھ اس میں داخل ہو جاتے اور دل و دماغ کو روشن کر کے تیز ہوا کے جھونکے کی طرح گزر جاتے۔ نو عمری کے باعث طبیعت میں اضطراب تھا، اس لیے کسی ایک جگہ زیادہ دن تک نہ ٹھہرتے تھے۔ تبدیلی مقامات کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مختصر سے عرصے میں علم کے رموز و نکات سمجھ لیتے تھے، اس لیے کسی دوسرے استاد سے فیض یاب ہونے کے لیے نئے شہر کا انتخاب کرتے تھے۔ غالباً اسی زمانے میں آپ بصرہ بھی تشریف لے گئے تھے۔ حضرت اسمٰعیل بن علیہؒ اور حضرت عبدالوہاب بن عبدالمجیدؒ بصرہ کے مشہور بزرگ تھے۔ امام شافعیؒ نے کچھ دن تک ان دونوں صاحبانِ نظر



کی صحبت اختیار کی تھی۔ بصرہ کے علاوہ آپ کہاں کہاں پہنچے؟ اس سلسلے میں اکثر تاریخیں خاموش ہیں۔

خود امام شافعیؒ نے اپنے سفرنامے میں اس طرف مبہم سا اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ سے تین ہزار درہم لے کر عراق و فارس کی سیاحت شروع کر دی۔ پھر لوگوں سے ملتا رہا۔ یہاں تک کہ میری عمر اکیس سال کی ہو گئی۔ اس روایت کی روشنی میں اندازہ ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ نے مسلسل چھ سال تک اپنا سفر جاری رکھا۔ اس سفر کے دوران یقینی طور پر آپ اہلِ علم کے سوا کسی سے نہیں ملے ہوں گے۔ مگر وہ صاحبانِ علم کون تھے؟ اس کی کچھ خبر نہیں ملتی۔ بس اتنی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اب امام شافعیؒ لڑکپن سے گزر کر نوجوانی کی منزل میں داخل ہو گئے تھے۔

یہ ۱۷۱ھ کا زمانہ تھا۔ عباسی خلیفہ ہادی کے انتقال کو ایک سال گزر چکا تھا اور اس کی جگہ ہارون رشید اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ مسندِ خلافت پر رونق افروز تھا لیکن اس کے باوجود قصرِ اقتدار پر بیرونی اور اندرونی سازشوں کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ایسے نازک موقع پر ہارون رشید نے انتہائی ذہانت سے کام لیتے ہوئے دور دور تک جاسوسی کے جال بچھا رکھے تھے۔ حکومت کا یہ شعبہ اس قدر مضبوط و مستعد تھا کہ اگر کوئی مخالف کسی تہ خانے میں بند ہو کر بھی باغیانہ فکر سے کام لیتا تھا تو ہارون رشید کو اس کی خبر ہو جاتی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے شمشیرِ خلافت اس کے کاندھوں کا بوجھ ہلکا کر دیتی تھی۔ اس طرح اب تک بے شمار مخالفینِ حکومت تہ تیغ ہو چکے تھے اور سیاسی انتقام کا یہ سلسلہ بدستور جاری تھا۔ ایسے سنگین لمحات میں حضرت امام شافعیؒ بغداد کی طرف روانہ ہوئے جہاں آپ کو ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

امام شافعیؒ اپنے سفرنامے میں اس واقعے کی تفصیل لکھتے ہوئے فرماتے ہیں ”میں نے بغداد کے دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک شخص جو عام سے کپڑوں میں ملبوس تھا، تیزی کے ساتھ میری طرف آیا اور آتے ہی مجھ سے میرا نام پوچھنے لگا۔ اجنبی کا لہجہ بہت نرم تھا۔ میں نے جواباً کہا ”میرا نام محمد ہے۔“

”تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟“ اجنبی نے دوسرا سوال کیا۔ وہ پوری تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کے عمل پر حیرت ہو رہی تھی۔

”ادریس شافعیؒ۔“ میں نے مجبوراً اس کے دوسرے سوال کا جواب بھی دے دیا۔

”تمہارے مورثِ اعلیٰ کون ہیں؟“ اجنبی کے سوالات کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ میں خاموشی اختیار کرلوں۔ شاید اجنبی میری ذہنی کشمکش سے واقف ہو چکا تھا۔ اس لیے فوراً ہی بول پڑا ''نوجوان! گھبرانے کی بات نہیں۔ یہ اس شہر کی رسم ہے کہ جب بھی کوئی اجنبی یہاں داخل ہوتا ہے، اس کے سارے حالات دریافت کیے جاتے ہیں۔'' اجنبی کے لب و لہجے سے اب بھی نرمی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں اولادِ مطلّب سے ہوں۔'' میں نے بے جھجک ہو کر جواب دیا۔

''تم مطلّبی ہو؟'' اجنبی نے حیرت سے کہا اور پھر اپنی جیب سے ایک تختی نکال کر میری بیان کردہ تفصیلات لکھنے لگا۔ جب وہ اس تحریری کام سے فارغ ہو چکا تو یہ کہہ کر مجھے چھوڑ دیا ''اب تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔''

اس عجیب و غریب تفتیش سے نجات پا کر میں ایک مسجد میں پہنچا۔ نماز ادا کی اور سوچنے لگا ''وہ شخص کون تھا اور یہ ساری معلومات کس لیے حاصل کر رہا تھا؟ یہ سوال بہت دیر تک میرے ذہن میں گردش کرتا رہا۔ آخر میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہ تفتیش بے سبب نہیں تھی۔ میرے ذہن کے کسی گوشے سے بار بار یہ صدا ابھر رہی تھی کہ عنقریب کوئی بات ظاہر ہونے والی ہے۔ یہ صورتِ حال میرے لیے پریشان کن تھی مگر میں نے اپنے خدا پر بھروسا کرتے ہوئے اس واقعے کو یکسر فراموش کر دیا۔ اگر کوئی سانحہ پیش آیا بھی تو وہی ذات میری دستگیری کرے گی جو اب تک مجھے مصائب و آلام سے نجات دلاتی رہی ہے۔ یہ سوچ کر میں اطمینان سے اسی مسجد میں سو گیا۔ میری طرح کچھ دوسرے مسافر بھی مسجد میں آرام کر رہے تھے۔

آدھی رات کے بعد اچانک مجھے مسجد میں کچھ شور سنائی دیا۔ گھبرا کر میری آنکھ کھل گئی۔ نیند کے خمار کے باعث فوری طور پر بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن کچھ دیر بعد اندازہ ہو گیا کہ باہر کے کچھ لوگ مسجد کے اندر موجود ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں روشنیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور بہت غور سے روشنی بردار انسانوں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنے لباسوں سے حکومت کے سپاہی نظر آتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حکومت کے یہ کارندے مسجد میں ٹھہرنے والے ہر آدمی کے قریب جاتے تھے، اس کے چہرے پر روشنی ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے تھے۔ غالباً انہیں کسی خاص آدمی کی تلاش تھی۔ سپاہیوں کا یہ عمل بہت دیر تک جاری رہا۔ مسجد میں ٹھہرنے والے تمام مسافر دہشت زدہ تھے۔ مطلوبہ شخص ابھی تک سپاہیوں کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اب ان کا رخ میری طرف تھا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ آخر ایک سپاہی میرے قریب آیا اور اس نے روشنی میں میرا چہرہ دیکھا۔ پھر چیخ کر بولا ''لوگ پریشان نہ ہوں۔



ہمیں جس آدمی کی تلاش تھی وہ مل گیا۔'' میں نے سپاہی کی آواز سے پہچانا، یہ وہی شخص تھا۔ جو مجھے سادہ سے لباس میں صبح شہر کے دروازے پر ملا تھا اور اس وقت حکومت کے کسی اہم کام کی ذمے داری نبھا رہا تھا۔

''ہمارے ساتھ چلو۔'' سپاہی نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آخر آپ حضرات کو رات کے اندھیرے میں میری تلاش کیوں تھی؟'' میں نے بے خوف ہو کر حکومت کے کارندوں سے پوچھا ''کیا مجھ سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے؟''

''تمہیں امیر المومنین کے حضور پیش ہونا ہے۔'' سپاہی نے میرے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا ''اس سے زیادہ ہم لوگ کچھ نہیں جانتے۔''

''نصف شب گزر چکی ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا ''سحر کا وقت قریب ہے۔ اگر میں نمازِ فجر کے بعد چلوں تو کیا یہ بات مناسب نہیں رہے گی؟''

''ابھی نماز میں بہت دیر ہے۔'' سپاہی نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ اس کی آواز سے کسی کرختگی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ ''ہم تمہیں فجر کی اذان سے پہلے ہی امیر المومنین کے محل میں پہنچا دیں گے۔ وہاں اطمینان سے نماز ادا کر لینا۔''

میں خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سپاہیوں کے ساتھ مسجد کے دروازے پر آیا۔ باہر کئی گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ ایک سپاہی نے مجھے اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور ایڑ لگائی۔ ان عربی النسل جانوروں کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ہوا سے باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں خلیفہ ہارون رشید کے محل کے سامنے کھڑا تھا۔ سپاہی، گھوڑے کی پشت سے نیچے اترے۔ میں نے بھی ان کی تقلید کی۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر محل کے پہرے داروں سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ پھر محل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ میں حیرت زدہ سا قصرِ خلافت میں داخل ہو گیا۔ سپاہی نے مجھے ایک گوشے میں لے جا کر کہا ''تم یہاں نماز ادا کر سکتے ہو۔''

''نماز سے پہلے وضو کرنا بھی ضروری ہے۔'' میں نے سپاہی کو اپنی ضرورت کا احساس دلایا۔ وہ میری بات سنتے ہی ایک طرف چلا گیا۔ اور پھر چند لمحوں میں پانی کا برتن لے کر واپس آ گیا۔ میں نے نہایت اطمینان سے وضو کیا پھر اذان کا انتظار کرنے لگا۔ آخر کچھ دیر بعد بغداد کے گلی کوچوں میں خوش الحان موذنوں کی صدائیں گونجنے لگیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کائنات کی ہر شے اپنے اللہ کی کبریائی بیان کر رہی ہو۔ در و دیوار تک ربِ جلیل کی تسبیح بیان کرتے نظر آتے تھے۔ میں نے نماز پڑھی، عافیت کی

دعا مانگی اور ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوگیا۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا۔ اب مجھے قصرِ خلافت کی بلند دیواریں دکھائی دینے لگیں۔ در و بام دلکش نقش و نگار سے مرصع تھے۔ مسلمانوں کا امیر ایک عالی شان مکان میں رہتا تھا اور بے شمار بندگانِ خدا کے گھروں میں افلاس کی گرد اڑ رہی تھی۔ ایک بار پھر میرے دل پر چوٹ سی پڑی مگر میں نے جلد ہی اپنے جذبات پر قابو پالیا۔

پھر مجھے دربارِ خلافت میں امیر المومنین کے سامنے لے جایا گیا۔ میں نے عباسی خلیفہ ہارون رشید کو دیکھا۔ ان کے جاہ و جلال سے اہلِ دربار سہمے ہوئے تھے مگر میں نے دولت و اقتدار کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ جیسے ہی میری نظر ملتِ اسلامیہ کے حاکم پر پڑی میں نے بلند اور پر اعتماد آواز میں کہا ''السلام علیکم یا امیر المومنین!''

ہارون رشید کو میرا اندازِ گفتگو پسند آیا تھا۔ انہوں نے خوش مزاجی کے ساتھ میرے سلام کا جواب دیا اور پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تمہارا دعویٰ ہے کہ تم ہاشمی ہو؟'' یہ کہتے کہتے امیر کا لہجہ بدل گیا تھا۔ لمحاتی خوش طبعی رخصت ہو چکی تھی اور خلیفۂ وقت کے لفظوں سے حکومت کے رعب و جلال کی نمائش ہونے لگی تھی۔ مگر میں نے اقتدار کے ایسے تمام مظاہر کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ مجھے کوئی طمع نہیں تھی کہ میری زبان حاکم کے سامنے لڑکھڑانے لگتی۔ رسمِ خلافت نہیں بدلی تو میں نے بھی اپنے کلام کی روایت کو ترک نہیں کیا۔

''امیر المومنین! اللہ کی کتاب میں دنیا کا ہر دعویٰ باطل ہے۔'' میری آواز بدستور بلند تھی مگر میں نے منصبِ خلافت کا احترام ملحوظ رکھا تھا۔

میرا جواب سن کر خلیفۂ وقت نے مجھے بہت غور سے دیکھا ''تمہارا سلسلہ نسب؟''

''ابنِ آدم۔'' میں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا ''ہر انسان کی طرح یہی میرا سلسلہ نسب ہے، یہی میری پہچان۔''

''یہ حوالہ ناکافی ہے۔'' خلیفۂ وقت کی آواز سے سارا دربار گونج اٹھا تھا ''اپنا مکمل نسب نامہ بیان کرو۔'' اقتدار اپنے حقیقی رنگ میں ظاہر ہونے لگا تھا۔ شاید امیر المومنین کو مساواتِ انسانی کی بات پسند نہیں آئی تھی۔ مجبوراً مجھے اپنے آباؤ اجداد کے ناموں کا سہارا لینا پڑا۔

''محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع ......'' میں روانی کے ساتھ اپنے تمام حوالے بیان کر رہا تھا اور اہلِ دربار حیرت سے میرا منہ دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ خود عباسی خلیفہ کی نگاہیں میرے



چہرے پر مرکوز تھیں۔

جب میں نے معتبر روایات کے ساتھ اپنا نسب نامہ حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچا دیا تو امیر المومنین بے ساختہ پکار اٹھے ''بے شک! یہ فصاحت و بلاغت اولادِ مطّلب ہی کا حصہ ہے۔'' خلیفۂ وقت اچانک بہت زیادہ پُر جوش نظر آنے لگے تھے پھر مجھ سے کہنے لگے ''نوجوان! کیا تم یہ پسند کرو گے کہ میں تمہیں مسلمانوں کا قاضی بنا کر اپنی سلطنت میں شریک کرلوں؟'' یہ کہہ کر ایک بار پھر امیر المومنین نے میری جانب گہری نظروں سے دیکھا، میں اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا ''تم سنتِ رسولؐ کے مطابق میرا اور اپنا حکم نافذ کرو گے۔'' امیر المومنین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''خدا کی قسم! شریکِ سلطنت ہو کر صبح سے شام تک بھی مجھے قاضی بننا گوارہ نہیں۔'' میرے جذبے کی صداقت اور لہجے کی بے باکی نے امیر المومنین کو متاثر کیا کہ وہ رونے لگے۔ خوفِ خدا نے کچھ دیر کے لیے ان کے جسم پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ اہلِ دربار کی حالت تھی کہ سب اپنی اپنی نشستوں پر ساکت تھے۔ حاضرین کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ مجھ جیسا آشفتہ حال نوجوان امیر المومنین کے روبرو اس طرح بھی گفتگو کر سکتا ہے پھر وہ مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوئے۔

''کیا تم کوئی اور چیز قبول کرلو گے؟'' عباسی خلیفہ کا اشارہ دولت اور دیگر تحائف کی طرف تھا۔

''خدا نے مجھے دلِ بے نیاز دے کر سب کچھ بخش دیا ہے۔'' میرا دل حرص و ہوس سے خالی تھا اس لیے میں نے بے جھجک ہو کر کہا ''اگر امیر المومنین کی خواہش ہے تو میں عہدہ قضا کے سوا سب کچھ قبول کرلوں گا۔''

ہارون رشید میری اس بات سے خوش ہوئے اور انہوں نے فوری طور پر مجھے ایک ہزار درہم دیے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ دن قصرِ خلافت میں ٹھہرنے کے لیے کہا مگر مجھے دربار کی فضا راس نہیں آسکتی تھی۔ میں نے ضروری کاموں کا عذر پیش کر کے اپنا دامن چھڑایا۔ پھر جیسے ہی امیر المومنین کو سلام کر کے رخصت ہوا۔ خدمت گار میرے پیچھے دوڑ پڑے۔ اب میں ان کے درمیان گھرا ہوا تھا اور وہ مجھ سے انعام مانگ رہے تھے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی لیکن میری مروت نے اجازت نہ دی کہ مجھ پر خدا کا جو فضل ہوا ہے، اس میں دوسروں کو شریک نہ کروں۔' نتیجتاً میں نے تمام رقم برابر برابر تقسیم کی اور اپنا حصہ لے کر قصرِ خلافت سے باہر نکل آیا۔''

یہ واقعہ حضرت امام شافعیؒ کو اکیس سال کی عمر میں پیش آیا تھا۔ خود امامؒ یا کسی دوسرے تذکرہ نگار نے

اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ آخر خلیفہ ہارون رشید نے فرزندِ قریش کو اس پُراسرار طریقے سے رات کے سناٹے میں کیوں طلب کیا تھا؟ یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ اس ذیل میں بس قیاس ہی کیا جاسکتا ہے کہ خلیفہ منصور کی طرح ہارون رشید کے جاسوس بھی دور دراز مقامات تک پھیلے ہوئے تھے جو خلیفہ کو ایک ایک لمحے کی خبر فراہم کرتے تھے۔ بغداد چونکہ تمام سیاسی سرگرمیوں اور اعلیٰ حکام کا مرکز تھا اس لیے اس شہر میں داخل ہونے والے ہر شخص پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ غیر مقامی اور اجنبی افراد کے بارے میں تفصیلات باقاعدہ درج کی جاتی تھیں۔ جب بغداد میں داخل ہوتے وقت امام شافعیؒ نے ایک ہاشمی کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا تھا اور بغداد میں یہ خبر ہارون رشید تک پہنچی تھی تو اسے خیال گزرا تھا کہ کہیں آنے والا کوئی ''علوی'' نہ ہو۔ خلیفہ منصور کے خلاف حضرت محمد نفس زکیہؒ کی معرکہ آرائی تاریخِ اسلام کا ایک اہم ترین باب ہے۔ اگرچہ نفس زکیہؒ شہید ہو چکے تھے اور ''علویوں'' کی سیاسی قوت منتشر ہو چکی تھی لیکن پھر بھی بعد میں آنے والے خلفاً خاندانِ سادات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ایک ہاشمی کا نام سن کر ہارون رشید چونک پڑا تھا اور پھر اس نے امام شافعیؒ کو اپنے روبرو طلب کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی تھی۔ اس خیال کو یوں بھی تقویت پہنچتی ہے کہ جب امام شافعیؒ نے ''ابنِ آدم'' کہہ کر بات ختم کرنے کی کوشش کی تو ہارون رشید نے فرزندِ قریش سے مکمل نسب نامہ بیان کرنے کے لیے کہا تھا۔ بالآخر جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ حجازی نوجوان ''علوی'' نہیں ہے تو امام شافعیؒ کو انعام واکرام دے کر رخصت کر دیا۔

دربارِ خلافت سے نکل کر امام شافعیؒ دوبارہ اسی مسجد میں لوٹ آئے اور رات وہیں بسر کی۔ نمازِ فجر کی امامت ایک نوجوان کر رہا تھا۔ اس کی قرات اچھی تھی مگر علم زیادہ نہ تھا۔ نماز ختم ہوگئی مگر نوجوان امام کو پتا بھی نہیں چلا کہ اس سے سہو ہو گیا ہے۔ مقتدیوں میں بزرگ بھی موجود تھے لیکن کسی شخص نے امام کی غلطی پر گرفت نہیں کی۔ آخر فرزندِ قریش کو درمیان میں بولنا پڑا۔ ''بھائی! معاف کرنا۔ ہم میں سے کسی کی نماز بھی صحیح طور پر ادا نہ ہو سکی۔'' امام شافعیؒ کا لہجہ بہت نرم تھا لیکن حاضرینِ مجلس چونک پڑے۔ انہیں ایک نوعمر اجنبی کی بات گراں گزری تھی۔

''آخر کیوں؟'' نوجوان نے اس طرح سوال کیا کہ اس کے چہرے سے ناگواری کے تاثرات صاف نمایاں تھے۔

''یہ ایک باریک غلطی ہے جس پر ہر شخص کی نظر نہیں جاسکتی۔'' امام شافعیؒ نے نوجوان کی تلخ گوئی کو



نظر انداز کرتے ہوئے نہایت شیریں لہجے میں فرمایا پھر غلطی کی وضاحت اس قدر مدلل اور دلکش پیرائے میں کی کہ تمام نمازی حیرت زدہ رہ گئے اور نوجوان نے شرمسار ہو کر سر جھکا لیا۔

''مذہبی امور میں ضد سے کام نہیں لیا جاتا۔'' امام شافعیؒ نے دوبارہ حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''غلطی کا اعتراف بڑی چیز ہے۔ اس سے علم کے نئے نئے دروازے کھلتے رہتے ہیں مگر جب کوئی انسان اپنی ذات کو اہمیت دینے لگتا ہے تو یہی دروازے ایک ایک کر کے بند ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بے خبری کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔'' امام شافعی کا طرزِ کلام ہی ایسا تھا کہ حاضرین کی گردنیں خم ہو گئیں۔

پھر اسی نوجوان نے اپنی غلطی درست کر کے دوبارہ نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ اپنے گھر جانے لگا تو امام شافعیؒ نے اشارے سے رکنے کے لیے کہا۔ نوجوان ٹھہر گیا۔ آخر جب تمام نمازی مسجد سے چلے گئے تو امام شافعیؒ نے نوجوان سے اس کا نام پوچھا۔

''زعفران۔'' نوجوان نے مودب لہجے میں کہا۔ عمر میں بڑا ہونے کے باوجود وہ امام شافعیؒ کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''بہت اچھا نام ہے۔'' امام شافعیؒ نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا ''تم قرات بھی بہت اچھی کرتے ہو۔ بس ذرا علم کی طرف توجہ درکار ہے۔ اگر تم کاغذ اور قلم کا انتظام کر دو تو میں تمہیں ایسی کتاب لکھ دوں گا کہ اس کے مطالعے کے بعد پھر کوئی غلطی نہیں کرو گے۔''

امام شافعیؒ کی بات سن کر نوجوان دیوانہ وار اٹھا اور بھاگتا ہوا اپنے گھر پہنچا پھر اسی تیز رفتاری کے ساتھ تمام سامانِ تحریر لے کر اس طرح واپس آیا کہ اس کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی زندگی کے اس گراں بہا لمحے کو برباد نہیں کر سکتا تھا اسی لیے اس نے کاغذ اور قلم لانے میں غیر معمولی عجلت دکھائی تھی۔ امام شافعیؒ اس کی چڑھی ہوئی سانسیں دیکھ کر مسکرائے اور پھر قلم لے کر لکھنے لگے۔

اپنے سفرنامے میں امام شافعیؒ نے مذکورہ واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے ''جب وہ نوجوان اسباب تحریر لے کر آیا تو اللہ نے میرا ذہن کھول دیا۔ میں نے ''باب السہو'' کے موضوع پر قلم اٹھایا اور کتاب وسنت کے مطابق ایک کتاب لکھ دی۔ یہ کتاب چالیس جزو میں مکمل ہوئی اور میں نے اس کا نام اسی نوجوان کے نام پر ''کتاب الزعفران'' رکھا۔ اشاعتِ علم کے سلسلے میں امام شافعیؒ کی یہ سادگی اور بے نیازی اس قدر عجیب ہے کہ پوری تاریخِ انسانیت میں ایسی مثالیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔

☆☆☆

ان واقعات کے بعد امام شافعیؒ نے تقریباً تین سال تک بغداد میں قیام کیا۔ اس طویل عرصے میں آپ کی مصروفیات کا تفصیلی ذکر کہیں نہیں ملتا۔ بس اتنا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فرزندِ قریش نے اپنے قیمتی وقت کا ایک ایک لمحے تلاشِ علم میں گزارا ہوگا۔ اس دوران امام شافعیؒ نے کس فقیہہ اور محدث کی درس گاہ میں حاضری دی؟ اس کا بھی پتا نہیں چلتا۔ خود امام شافعیؒ کے سفرنامے سے بھی ان تین سالہ علمی سرگرمیوں کا سراغ نہیں ملتا۔ البتہ اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ آپ جب تک بغداد میں رہے حضرت ابوحنیفہؒ کے مزارِ اقدس پر حاضر ہوکر امامِ اعظمؒ کی روح کو ایصالِ ثواب کرتے رہے اور اپنے ذہن و دل کی کشادگی کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔ اس اثنا میں امام شافعیؒ کو خبر ملی کہ حاجیوں کا ایک قافلہ سعادتِ عظیم حاصل کر کے بغداد کی طرف واپس آ رہا ہے۔ یہ اطلاع پاتے ہی امام شافعیؒ بے قرار ہوگئے۔ آپ کو شدت کے ساتھ مادرِ گرامی کی یاد آئی اور ساتھ ہی تصور میں امام مالکؒ کا چہرہ مبارک ابھرنے لگا۔ فرزندِ قریش کے اضطراب کا یہ عالم تھا کہ آپ پاپیادہ چلتے ہوئے بغداد کے مضافات میں پہنچ گئے اور حجاجِ کرام کا استقبال کرنے لگے۔ اچانک امام شافعیؒ نے ایک نوجوان کو دیکھا۔ وہ اونٹ پر قبے میں بیٹھا ہوا تھا۔ امامؒ تیزی سے اس کے قریب گئے اور سلام کیا۔ نوجوان نے ساربان کو اونٹ روکنے کا حکم دیا اور فوراً ہی احتراماً نیچے اتر آئے۔ وہ امام شافعیؒ سے واقف تھا۔

امام شافعیؒ نے اہلِ حجاز کی خیریت دریافت کی اور امامِ مدینہؒ کے بارے میں پوچھا۔

''سب لوگ بعافیت ہیں اور پرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں۔'' نوجوان نے ادب سے جواب دیا ''حضرت امام مالکؒ بھی تندرست ہیں اور اب وہ بہت زیادہ دولت مند ہوگئے ہیں۔''

یہ سنتے ہی امام شافعیؒ کے شوقِ اضطراب میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اپنی اس کیفیت کے بارے میں امامؒ خود فرماتے ہیں۔ ''جب نوجوان کی زبانی مجھے امام مالکؒ کے حالات معلوم ہوئے تو میرے دل میں یہ عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ امامِ مدینہؒ سے دوبارہ ملاقات کروں۔ میں نے ان کے غربت و افلاس کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اب میری آرزو تھی کہ میں امام مالکؒ کی خوش حالی کا زمانہ بھی دیکھوں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے نوجوان سے کہا۔ کیا تمہارے پاس اتنی رقم موجود ہے جس سے میرے سفر کی ضروریات پوری ہوسکیں؟''

''میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب آپ کی نذر ہے۔'' نوجوان نے بڑی عقیدت سے کہا ''میں اس



سلسلے میں مزید انتظامات بھی کر سکتا ہوں مگر اہلِ عراق کو آپ کی جدائی بہت گراں گزرے گی۔''

امام شافعیؒ کچھ دیر تک نوجوان کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ وہ یکایک اداس نظر آنے لگا تھا۔ ''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن تم بھی میری دلی کیفیات کا اندازہ کرو۔ مجھے اپنی مادرِ مہربان اور امام مالکؒ سے بچھڑے ہوئے زمانہ گزر گیا ہے۔''

اس کے بعد نوجوان نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے تمام رقم نکالی اور امام شافعیؒ کو پیش کر دی۔ امامؒ نے اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے کچھ حصہ قبول کر لیا اور باقی رقم نوجوان کو لوٹا دی۔

''یہ بھی رکھ لیجئے۔'' نوجوان نے اصرار کرتے ہوئے کہا ''سفر طویل ہے اور خرچ نامعلوم۔''

''میرے لیے بس یہی کافی ہے۔ خدا تمہیں اجرِ عظیم دے۔'' یہ کہہ کر امام شافعیؒ علاقہ ربیعہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

ایک بار پھر راہوں سے غبار اٹھنے لگا۔ علمِ حدیث کا طالب، منزلِ فقہ کا مسافر، اپنے استادِ گرامی حضرت امام مالکؒ اور مادرِ مہربان سے ملنے حجاز مقدس کی طرف واپس جا رہا تھا۔ امام شافعیؒ کم و بیش چھ سال مکہ معظمہ سے دور رہے تھے۔ اس دوران آپ نے امام محمدؒ سے لے کر خلیفہ ہارون رشید تک بڑے بڑے اہلِ علم اور صاحبانِ اقتدار سے ملاقاتیں کیں اور ہر شخص کے دل و دماغ پر اپنی ذہانت کے اتنے گہرے نقوش چھوڑے کہ ایک بار جس نے آپ کو دیکھ لیا پھر دوبارہ دیکھنے کی تمنا ہی کرتا رہا۔ امامؒ جہاں سے گزرے، وہ راستے منتظر ہی رہے کہ فرزندِ قریش لوٹ کر آئے اور انہیں مسلسل پامال کرتا رہے۔ اس چھوٹی سی عمر میں امام شافعیؒ کو لاکھوں دینار و درہم بطور نذر پیش کیے گئے۔ مگر چند روز بھی گزرنے نہیں پائے تھے کہ یہ دولت آپ کی جیب سے منتقل ہوکر دوسرے ضرورت مندوں کے دامنوں میں چلی جاتی تھی۔ امامؒ نے شدید غربت کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ کون سی محرومیاں تھیں جن سے آپ بچپن میں دوچار نہیں ہوئے ہوں گے۔ موجودہ ماہرینِ نفسیات کے قائم کردہ اصولوں کے مطابق فرزندِ قریش کو نہایت خوف زدہ، ناآسودہ اور حریص ہونا چاہیے تھا لیکن ساری دنیا گواہ ہے کہ امام شافعیؒ بوسیدہ لباس پہن کر بھی نہیں شرمائے۔ قبائے تارتار کو اس طرح جسم پر سجا کر دربارِ خلافت میں گئے کہ اربابِ اختیار آپ کے غیر مندانہ طرزِ عمل اور باوقار اندازِ گفتگو کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ باجبروت حاکم اور خلیفہ بھی اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ امام شافعیؒ کی آنکھوں

میں طلب کا کوئی عکس ابھرے، ہونٹوں پر کوئی سوال لرزے مگر قدرت نے آپ کو ذہنِ بیدار اور دلِ خوددار عطا کیا تھا۔ اہلِ کرم سوچتے ہی رہے اور آپ اس طرح ہر مجلسِ کیف ونشاط سے بے نیازانہ گزر گئے کہ جیسے آپ کی نظروں میں دنیاوی جاہ وجلال کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ پھر کسی نے عاجزی کے ساتھ کوئی نذر پیش کی تو خوشی سے قبول فرمالی۔ امام شافعیؒ دولت کے اس بوجھ کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے تھے جو کچھ پاتے تھے، اسے فوراً ہی لٹا دیتے تھے۔ یہی ایک مردِ قلندر کی نشانی ہوتی ہے اور ہمارے نزدیک امام محمد بن ادریس شافعیؒ پیدائشی قلندر تھے۔ علامہ اقبال نے ایک موقع پر قلندر کی زبان سے یہ مکالمہ ادا کرایا ہے۔

"پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من"

حضرت امام شافعیؒ ساری زندگی خدا کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکے اس لیے تن بھی آپ کا تھا اور من بھی۔ آپ اوّل و آخر ایک ایسے باہوش قلندر تھے کہ جس کی مثال آسمانی مذاہب کے ماننے والوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔ بس تاریخِ اسلام ہی ایسے چند قلندروں کا پتا دیتی ہے۔ رہی مادہ پرستوں کی تاریخ تو وہ قلندر کا مفہوم ہی سمجھنے سے قاصر ہے۔ روٹی، کپڑے اور مکان کے پجاریوں کے پاس تو ایک شخص بھی ایسا نہیں جو امام شافعیؒ کے پیروں سے اٹھنے والی خاک کو ہی چھو سکے۔

اب یہی مردِ قلندر بغداد کی حدود سے نکل کر علاقہ ربیعہ پہنچا۔ چند لمحوں کے قیام کے بعد امام شافعیؒ نے حران کی راہ لی۔ جب آپ حران میں داخل ہوئے تو جمعے کا دن تھا۔ امامؒ کچھ دیر کے لیے اس شہر میں ٹھہر گئے۔ آپ حران میں نماز جمعہ کا اہتمام کرنا چاہتے تھے پھر آپ کو نماز سے قبل غسل کی فضیلت یاد آ گئی۔ امامؒ فوراً ہی ایک قریب کے حمام میں تشریف لے گئے مگر آپ ابھی نہانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ سر کے بالوں کی طرف دھیان گیا۔ امامؒ نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ راہ کے گرد وغبار کے باعث بال بری طرح چکٹ کر الجھ گئے تھے۔ آپ نے حمام کے منتظم کے ذریعے حجام کو طلب کیا اور اس سے بال تراشنے کے لیے کہا۔ حجام نے ایک نظر امام شافعیؒ کو دیکھا۔ اس کے سامنے ایک ایسا نوجوان بیٹھا ہوا تھا جو اپنے لباس اور ظاہری حلیے سے ایک معمولی انسان نظر آتا تھا۔

"بھائی! میری طرف کیا دیکھتے ہو؟" امام شافعیؒ نہایت شگفتہ لہجے میں حجام سے مخاطب ہوئے۔

"ایک مسافر ہوں۔ چند ساعتوں کے لیے تمہارے شہر میں ٹھہر گیا ہوں۔ نمازِ جمعہ کے بعد چلا جاؤں



گا۔ جلدی کرو۔ وقت تنگ ہوتا جا رہا ہے۔" امام شافعیؒ کی باتوں سے حجام کچھ شرمسار ہو گیا اور تیزی سے آپ کے بال تراشنے لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے کسی نے اسے باہر سے آواز دی۔ حجام! امام شافعیؒ کو چھوڑ کر کچھ کہے بغیر باہر جانے لگا۔ اپنے تمام اوزار بھی ساتھ لیے جا رہا تھا۔ امام شافعیؒ اس کی یہ حرکت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ آپ نے حجام کو جاتا ہوا دیکھ کر پوچھا "میرا کام نامکمل چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو؟"

حجام نے ایک لمحے کے لیے رکنا بھی گوارا نہیں کیا۔ چلتے چلتے کہنے لگا "باہر اس شہر کا ایک امیر شخص میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں اس کے کام سے جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ حجام باہر نکل گیا۔ امام شافعیؒ نے پھر کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی سے اٹھے اور غسل کرنے لگے۔

غسل سے فارغ ہونے کے بعد آپ حمام سے باہر تشریف لائے۔ اب حجام آپ کا منتظر تھا۔ امیرِ شہر کے بال تراشنے کے بعد وہ دوبارہ امام شافعیؒ کے پاس آیا اور کہنے لگا "اب میں آپ کی خدمت کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"وقت گزر چکا۔" امام شافعیؒ کا لہجہ تو غضب ناک نہیں تھا مگر آپ کے چہرے سے ناگواری کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ "کچھ دیر پہلے تمہیں میری ضرورت نہیں تھی اور اب میں تمہارے تعاون کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔" یہ کہہ کر امام شافعیؒ نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جس قدر دینار ہاتھ میں آئے، حجام کو دے دیے۔ فرزندِ قریش نے اس کی نامکمل خدمات کے بدلے میں جو کچھ دیا تھا، وہ حمام کے قریب موجود لوگ کے تصور سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ خود حجام بھی اپنے ہاتھ میں پھیلے ہوئے دیناروں کو دیکھ کر ساکت ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک اجنبی نوجوان ناگواری کے باوجود حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیوں کر رہا ہے؟ امام شافعیؒ کا یہ عمل دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اس طرف متوجہ ہو گئے تھے اور ایک ایک کر کے حمام کے قریب جمع ہونے لگے تھے۔ حجام کی وہی حالت تھی، وہ حیرت واستعجاب میں ڈوبا ہوا کسی پتھر کے مجسمے کی مانند کھڑا تھا۔ اس کا ہاتھ بدستور پھیلا ہوا تھا اور حضرت امام شافعیؒ کے دیے ہوئے دینار سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

"یہ تمہارے ہیں، انہیں رکھ لو۔" امام شافعیؒ نے حجام سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مگر یہ میرے کام کی اتنی اجرت تو نہیں ہو سکتی۔" حجام کی حیرانی وپریشانی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"یہ تمہاری خدمت کا نامکمل صلہ ہے۔" امام شافعیؒ نے اس کی بداخلاقی کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا ''اگر تم اپنا کام مکمل کر لیتے تو میں ہرگز تمہیں اتنی رقم نہیں دیتا۔''

''مجھے تو حران کے کسی امیر نے بھی آج تک بال ترشوانے کا اتنا معاوضہ نہیں دیا۔'' مقامی حجام ایک اجنبی نوجوان کی بات سمجھنے سے قاصر تھا۔

''میں آج تمہیں یہی سمجھانا چاہتا ہوں کہ ایک مفلس اور ایک امیر کی دنیا میں کتنا فرق ہے؟''

آہستہ آہستہ امام شافعیؒ کا لہجہ پر جوش ہوتا جا رہا تھا اور ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ حجام کے قریب جمع ہونے والے انسانوں کی بھیڑ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ''تم میرے کام کو نامکمل چھوڑ کر اس لیے چلے گئے کہ تمہیں ایک امیر شخص نے پکارا تھا۔ تمہارے نزدیک میری غربت توجہ کے قابل نہیں تھی۔ تم خود بھی غریب ہو۔ اب اگر امرائے وقت تمہاری طرف نہ دیکھیں تو پھر شکایت کیسی؟'' امام شافعیؒ کے بولنے کا انداز اس قدر اثر انگیز تھا کہ سننے والے اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے اور ہر شے گوش بر آواز نظر آ رہی تھی۔ ''بے شک! تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے مگر میں نے تمہیں نہیں چھوڑا۔ یہ سب کچھ اس لیے دے رہا ہوں کہ آئندہ تم کسی غریب الوطن یا مسافر سے ایسا سلوک نہ کرنا۔ تمہارا یہ تحقیر آمیز رویہ انسانیت کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ ہے۔'' امامؒ کی بات سن کر حجام نے پھر سر جھکا لیا اور آپ کے دیے ہوئے دینار اپنی جیب میں رکھ کر وہاں سے چلا گیا۔

حجام کے رخصت ہوتے ہی امام شافعیؒ بھی آگے جانا چاہتے تھے مگر ہجوم نے آپ کو گھیر لیا اور فرزندِ قریش پر اعتراضات کی بارش کر دی۔ کسی نے کہا ''نوجوان! تم نے یہ کیا کیا؟ ایک ایسے آدمی پر اپنی دولت لٹا دی جو نہایت بداخلاق اور ناکارہ ہے۔ اگر تمہیں ایسے ہی اپنی امارت کا مظاہرہ کرنا تھا تو یہ سب کچھ کسی غریب و محتاج کو دے دیا ہوتا۔'' کوئی اس طرح امامؒ پر اعتراض کرنے لگا ''تمہاری یہ فیاضی اسے اور بگاڑ دے گی۔'' مجمع میں ایک شخص جو بہت ہی زیادہ تنگ دل تھا، چیخ چیخ کر کہنے لگا ''کسی مسافر کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ حران کے باشندوں کے سامنے اپنی سخاوتوں کا مظاہرہ کرے؟''

غرض بے شمار باتیں تھیں۔ ہر شخص اپنے اپنے لہجے میں امام شافعیؒ کو ہدف تنقید بنا رہا تھا۔

امامؒ وہاں سے جانا چاہتے تھے لیکن مجمع کا جوش گفتار دیکھ کر آپ ٹھہر گئے۔ آخر جب اہل حران بولتے بولتے خاموش ہو گئے تو امام شافعیؒ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی ''بندگانِ خدا! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں کوئی امیر و کبیر انسان نہیں۔ ایک مسافر ہوں اور تلاشِ علم میں شہر در شہر گھوم رہا ہوں۔ مجھے اس شخص کے عمل سے شدید اذیت پہنچی تھی۔ وہ اسلامی غیرت کے اصولوں کو پامال کر دینے والا



تھا۔ میں نے جُود و سخا کی نمائش نہیں کی۔ میں تو اسے امیر و غریب کا صحیح مفہوم سمجھانا چاہتا تھا۔ امیر اس لیے امیر نہیں ہے کہ وہ اپنی دولت کی بنیاد پر انسانی معاشرے کو درہم برہم کر دے۔ مستحق لوگ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے انتظار کرتے رہیں اور اہلِ ثروت اپنے سیم و زر کو استعمال کر کے لوگوں کے اوقات کار میں خلل ڈال دیں۔ یہ ناانصافی ہے، حقوق العباد کی خونریزی ہے، بددیانتی ہے اور غریب اس لیے غریب نہیں ہے کہ وہ امیروں کی آواز پر دوڑا چلا جائے۔ اسے اپنے ضمیر اور غیرت کی صداؤں کو سننا چاہیے۔'' امام شافعیؒ تقریر کر رہے تھے اور حران کے باشندے اس طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے جیسے ان کے جسموں سے روح پرواز کر گئی ہو۔ وہ زبانیں جو کچھ دیر پہلے تک شعلہ بار تھیں اب ان کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی اور مقامی لوگوں کو اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ ان کے درمیان ایک غیر معمولی انسان موجود ہے۔

ابھی امام شافعیؒ کی تقریر جاری تھی کہ اسی حمام سے ایک اور دولت مند نہا کر نکلا۔ اس نے دروازے کے قریب کھڑے ہوئے لوگوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ غلام نے دوڑ کر سواری پیش کی۔ وہ شخص سوار ہو گیا۔ غلام نے گھوڑے کی لگام پکڑی اور آگے بڑھنا چاہا لیکن دوسرے ہی لمحے آقا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ امیر و کبیر شخص کے کان اس آواز پر لگے ہوئے تھے جو انسانی ہجوم سے ابھر رہی تھی۔ امام شافعیؒ نہایت پر جوش انداز میں تقریر فرما رہے تھے۔ گھوڑے کی پشت پر سوار اس آسودہ حال شخص کے چہرے کا رنگ اس طرح بدلنے لگا جیسے کوئی گم شدہ خیال اس کا تعاقب کر رہا ہو۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر بے قرار ہو کر نیچے اتر آیا۔

''کیا آپ کوئی چیز حمام میں بھول آئے؟'' غلام نے دست بستہ عرض کیا۔

''ہاں، میں اپنی زندگی کی سب سے قیمتی شے وہاں بھول آیا ہوں۔'' اس شخص نے مجمع کی طرف اشارہ کیا جہاں امام شافعیؒ کھڑے ہوئے تقریر کر رہے تھے۔

''مجھے بتائیے! میں جا کر لے آؤں گا۔'' بے خبر غلام نے انتہائی وفاداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''میرے ہوتے ہوئے آپ کیوں زحمت کرتے ہیں؟''

''اسے کوئی نہیں لا سکتا۔'' وہ شخص ہجوم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا ''اگر تیرا آقا بھی اسے ڈھونڈ لائے تو یہ بڑی سعادت ہوگی، بڑا شرف ہوگا۔'' غلام کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ بس حیرت سے اپنے آقا کو دیکھتا رہا جو خود بھی اس بھیڑ میں شامل ہو گیا تھا۔

حضرت امام شافعیؒ ایک عجیب عالمِ جذب میں بول رہے تھے۔ آپ کی زبان سے فصاحت و بلاغت کا سمندر ابل رہا تھا۔ سننے والے دم بخود تھے۔ انہوں نے آج تک ایسا نوجوان نہیں دیکھا تھا جس کی تقریر پختہ ذہنوں کو بھی منقلب کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ یہ امامؒ کی تقریر ہی کا اثر تھا کہ اس ہجوم میں سرمایۂ دولت کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ لوگ جو کسی دولت مند کو دیکھ کر سہم جاتے تھے، اب خود بھی غیرت کی دولت سے مالا مال نظر آ رہے تھے اور ان کے چہروں پر نئے عزائم جھلک رہے تھے۔ پھر امام شافعیؒ کی تقریر ختم ہوگی۔ لوگ اپنے گھروں کو جانے کے لیے منتشر ہونے لگے۔

امام شافعیؒ کا حران میں قیام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے نمازِ جمعہ تک آپ مسجد میں ٹھہرنا چاہتے تھے۔ جیسے ہی مجمع سے باہر نکلے، امیرِ شہر نے آگے بڑھ کر راستہ روک لیا۔ امامؒ ٹھہر گئے۔ امیر نے ادب سے سلام کیا اور نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں کہا ”آپ شافعیؒ ہیں؟“

امام نے اثبات میں جواب دیا مگر حیرت سے اس شخص کو دیکھنے لگے۔

”میں ایک مسافر ہوں۔“ امامؒ نے بے نیازانہ کہا ”مجھے بہت دور جانا ہے۔ اگر میں حران میں قیام کرتا تو تمہاری دعوت قبول کر کے مجھے خوشی ہوتی۔“ امامؒ نے اس کی دلجوئی کی خاطر کہا ورنہ آپ اہلِ ثروت کی پیش کش کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔

”میں آپ کا زیادہ وقت برباد نہیں کروں گا۔“ امیر کی درخواست سے اس کا پُرخلوص جذبہ نمایاں تھا۔ ”بس کچھ دیر کے لیے مجھے یہ شرف بخش دیجیے۔“

امام شافعیؒ اس کی محبت آمیز اور بے تکلفانہ گزارش کو نظر انداز نہیں کر سکے اور ساتھ چلنے کے لیے رضا مند ہو گئے۔ امامؒ کو آمادہ پا کر امیر کے چہرے پر اس خوشی کا رنگ ابھر آیا جو کسی انسان کو زندگی میں پہلی بار حاصل ہوتی ہے۔ ”آپ کا بے حد شکریہ۔“ امیر کی آواز جوشِ جذبات میں کانپنے لگی پھر اس نے تقریباً چیختے ہوئے اپنے غلام کو پکارا ”گھوڑا یہاں لے آؤ۔“

امام شافعیؒ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، جدھر امیر نے اشارہ کیا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا غلام گھوڑے کو لیے ہوئے تیزی سے قریب آیا۔

”آپ اس پر تشریف رکھیے۔“ امیر نے نہایت ادب سے کہا۔

”ایک سواری پر دو آدمی کس طرح بیٹھ سکتے ہیں؟“ امام شافعیؒ نے حیرت سے کہا۔

”میں آپ کے ہمراہ پاپیادہ چلوں گا۔“ امیر نے اس طرح کہا کہ عقیدت کے بوجھ سے اس کا



سر جھکا ہوا تھا۔

”یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص سواری پر ہو اور دوسرا زمین پر۔“ امام شافعیؒ نے گھوڑے پر بیٹھنے سے صریحاً انکار کر دیا تھا۔

”میری زندگی کی سب سے بڑی سعادت یہی ہوگی کہ میں آپ کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر آگے آگے چلوں۔“ امام شافعیؒ سے امیر کی عقیدت اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی ”آپ کو خدا کی قسم ہے، اس پر سوار ہو جائیے۔“ امیر اس طرح گڑگڑانے لگا جیسے ایک گداگر کوئی سوال کر رہا ہو۔

اب امام شافعیؒ کے لیے کوئی چارہ نہیں تھا۔ آپ انکار کرنا چاہتے تھے مگر حران کا وہ امیر خدا کو درمیان میں لے آیا تھا۔ مجبوراً امام گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گئے۔ امیر نے گھوڑے کی لگام پکڑنا چاہی تو امام شافعیؒ نے سختی سے منع کرتے ہوئے کہا ”کیا تم اس طرح مجھے مزید اذیت پہنچانا چاہتے ہو؟“ امامؒ کی بات سن کر امیر رک گیا اور غلام نے اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں۔

گھوڑا مختلف راستوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ غلام کے ہاتھ میں لگام تھی اور امیر حضرت امام شافعیؒ کے دائیں جانب ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ حران کا ایک معزز شخص تھا۔ شہر کے بیشتر لوگ اس سے آشنا تھے۔ راستے میں بہت سے شناسا ملے۔ لوگوں نے گفتگو کرنا چاہی لیکن امیر نے یہ کہہ کر سب کو ٹال دیا کہ اس وقت وہ اپنے مہمان کی تواضع میں مصروف ہے۔ امام شافعیؒ ایک اجنبی کے طرزِ عمل سے بہت زیادہ متاثر نظر آ رہے تھے۔ بعض دولت مند بھی فرزندِ قریش کے ساتھ عقیدت سے پیش آئے تھے مگر حران کے اس امیر کے جذبات کی فراوانی سب سے نمایاں تھی۔ بناوٹ سے پاک عقیدت، تکلف کی رسموں سے بے نیاز ادب و احترام یہی اس امیر کے کردار کی ظاہری خوبیاں تھیں۔ ایک دولت مند شخص ہوتے ہوئے وہ جس طرح حضرت امام شافعیؒ کو اپنے گھر لیے جا رہا تھا، اسے ہمیشہ علم دوستی کی اعلیٰ ترین مثالوں میں شمار کیا جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد امیر کا مکان آ گیا۔ در و دیوار سے امارت جھلک رہی تھی۔ دیکھنے والا پہلی نظر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس گھر کے مکین کس قدر آسودہ زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ امیر نے بڑے والہانہ انداز میں امام شافعیؒ کو گھوڑے سے نیچے اتارا اور اس کے ساتھ ہی بلند آواز میں اپنے خدمت گاروں کو پکارا۔ اپنے مالک کی صدا سنتے ہی کئی ملازم دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ امیر نے انہیں کھانے کے سلسلے میں کئی ہدایات دیں اور خود امامؒ کو لے کر اپنے مخصوص کمرے میں چلا گیا۔ یہاں بھی

قدم قدم پر دولت وآسائش کی واضح نشانیاں موجود تھیں۔ امامؒ نے اس سے پہلے بھی دولت کے بہت سے مظاہرے دیکھے تھے۔ آپ حاکمِ مکہ، عاملِ مدینہ اور خلیفہ ہارون رشید کے دربار سے بھی گزرے تھے مگر سرمائے کی کسی علامت نے بھی آپ کے دول دماغ پر کوئی تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ پھر حران کے اس امیر کی دولت سے کس طرح مرعوب ہوتے؟ بے نیازانہ مکان میں داخل ہوئے اور قلندرانہ انداز میں بیٹھ گئے۔ وہاں اگر امامؒ کسی چیز سے متاثر تھے تو وہ امیر کا جذبۂ عقیدت تھا۔

امیر نے ایک بار اسی احترام کا مظاہرہ کیا اور وہ امام شافعیؒ کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ امامؒ نے اس کے اس عمل کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ''اگر تم اسی طرح تکلفات کا مظاہرہ کرتے رہو گے تو میں زیادہ دیر تک یہاں نہیں ٹھہر سکوں گا۔ آزادی کے ساتھ بیٹھو۔ تم میرا جتنا ادب کر چکے ہو، وہی کافی ہے۔ میں اسی کو فراموش نہ کر سکوں گا پھر مجھے مزید زیر بار کیوں کرتے ہو؟''

امام کے اصرار پر امیر نے اپنی نشست کا انداز بدل دیا لیکن اب بھی دیکھنے والے ایک واضح فرق محسوس کر سکتے تھے۔ ''ابھی نماز میں کچھ وقت باقی ہے۔ کیا آپ اذان سے پہلے کچھ کھانا پسند فرمائیں گے؟'' امیر نے امام شافعیؒ سے اس طرح دریافت کیا جیسے فرزندِ قریش اس کے آقا ہوں اور وہ خود ان کا غلام ہو۔

''نماز کے بعد۔'' امام شافعی نے جواباً فرمایا ''مجھے صرف تمہاری خاطر یہ دعوت منظور ہے لیکن کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔'' امیر یہ سن کر کچھ دیر کے لیے اندرونِ خانہ چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کوئی مشروب تھا۔

''اسے نوش کیجیے۔'' امیر نے خود ہی مشروب پیش کرتے ہوئے کہا ''طویل سفر نے یقیناً آپ کو تھکا دیا ہوگا۔'' امام شافعیؒ نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور رک رک کر تین بار میں سارا مشروب ختم کر دیا۔ ''خدا میرے شریف النفس میزبان کو جزائے خیر دے۔'' امام شافعیؒ نے امیر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ امیر کی خوشی ناقابلِ بیان تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے فرزندِ قریش کی زبان سے ادا ہونے والے چند کلمات ہی اس کی زندگی کا سرمایہ تھے۔ پھر وہ اپنے مہمان کے سفر کا حال معلوم کرنے لگا۔ امامؒ اسے اختصار کے ساتھ بغداد سے حران تک پہنچنے کی روداد سناتے رہے۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ قریب کی مسجد سے موذن کی آواز سنائی دی ''اللہ سب سے بڑا ہے۔'' امام شافعیؒ نے پرجوش لہجے میں یہی الفاظ دہرائے اور نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔



نماز کے بعد حران کے امیر نے بصد نیاز کھانے کے لیے کہا۔ امام شافعیؒ نے فوراً ہی اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ امیر ملاقات کے کمرے سے اٹھ کر مکان کے اندر چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ملازمین کے ساتھ اس طرح واپس آیا کہ مختلف کھانے خوان پر سجے ہوئے تھے ''تم نے کھانے کے سلسلے میں بہت زیادہ تکلف سے کام لیا ہے۔'' امام شافعیؒ نے لذیذ کھانوں کو کثرت سے دیکھتے ہوئے فرمایا۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ مردِ مومن کو غذا کا یہ اہتمام پسند نہیں آئے گا مگر میری خواہش ہے کہ اس دعوت کو قبول فرما کر مجھے شرفِ خاص بخش دیجیے۔'' امیر نے اپنے ہاتھ سے امام شافعیؒ کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے کہا۔ امامؒ جواباً خاموش رہے۔ آپ میزبان کی دلجوئی کے لیے اپنی فطرت کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے۔

جب کھانا دسترخوان پر سجایا جا چکا تو امیر بھی امامؒ کے سامنے بیٹھ گیا اور اس نے اپنے محترم مہمان سے بسم اللہ کرنے کے لیے کہا۔ امامؒ بدستور خاموش بیٹھے رہے۔ آپ نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ امیر پریشان نظر آنے لگا۔ وہ گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ ہی سمجھ گیا تھا کہ امام شافعیؒ کسی وجہ سے کھانا کھانے سے گریز کر رہے ہیں ''محترم مہمان! کیا مجھ سے کوئی کوتاہی سرزد ہو گئی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آپ نے ہاتھ کیوں روک لیا؟'' امیر یکایک بہت دل گرفتہ اور اداس نظر آنے لگا تھا۔

''تم کسی غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے ہو۔'' امام شافعیؒ نے فرمایا ''تمہاری خاطر مدارات تو مجھے برسوں یاد رہے گی۔ تم نے ایک اجنبی مسافر کے ساتھ جس حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا ہے، اسے کون غیرت مند شخص فراموش کر سکتا ہے؟ مگر اس وقت تمہارا کھانا میرے لیے حرام ہے جب تک یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم نے مجھے کس طرح پہچانا؟ میں اپنی حد تک پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ میں نے تمہیں آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ چند لمحے بھی تمہارے ساتھ نہیں گزارے پھر تم اس قدر احترام سے کیوں پیش آ رہے ہو؟ میں اب تک صرف تمہارے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ میں نے اپنے ذہن کے ایک ایک گوشے میں تمہیں تلاش کیا مگر وہاں تم سے شناسائی کا کوئی نقش موجود نہیں پھر یہ گرم جوشی کیوں؟ مہمان نوازی اور قربتوں کا اظہار کس لیے؟'' امام شافعیؒ نے بے باکی کے ساتھ اپنے دل کی بات زبان پر لے آئے تھے۔

"آپ نے بغداد میں جو کتاب سہو کے مسائل پر لکھ کر سنائی تھی، میں بھی خوش قسمتی سے اس کے سننے والوں میں شامل تھا۔" امیر نے نہایت ادب سے کہا "اگرچہ میں نے باقاعدہ آپ کی شاگردی اختیار نہیں کی لیکن میں آپ کو اپنا استاد ہی سمجھتا ہوں۔" امیر کا اشارہ امام کی تصنیف "کتاب الزعفران" کی طرف تھا۔

اس انکشاف کے بعد حضرت امام شافعیؒ نے حران کے امیر کو بہت غور سے دیکھا اور پھر بڑے والہانہ انداز میں فرمایا "بے شک! دو انسانوں کے درمیان علم ہی ایک ایسا رشتہ ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا۔" یہ کہہ کر آپ نے بے تکلفانہ انداز میں کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اپنے میزبان کی خواہش کے مطابق خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

اس دعوت کے بارے میں حضرت امام شافعیؒ خود فرماتے ہیں "میں نے حران کے امیر کے ساتھ ایسی خوش دلی سے کھانا کھایا کہ خدا ہی جانتا ہے۔ وہ خوشی ہے جو اپنے جیسے اہلِ علم کے ساتھ کھانے ہی میں نصیب ہوتی ہے۔" اہلِ نظر اس واقعے سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے نزدیک علم کی کیا حیثیت تھی؟ آپ علم دوست حضرات کا احسان بھی فراخ دلی کے ساتھ برداشت کر لیا کرتے تھے۔ اس کے برعکس غیر اہلِ علم کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی امامؒ کو گوارا نہیں تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھنا ان کی دعوت کرنا بہت بڑی بات تھی۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد امام نے کچھ دیر آرام کیا۔ پھر عصر کی نماز پڑھی اور امیر سے رخصت چاہی۔ امیر حیران ہو کر اپنے مہمان کی طرف دیکھنے لگا۔ "آپ بہت زیادہ تھکے ہوئے ہیں۔ پھر رات بھی سر پر کھڑی ہے۔"

"خدا نے آدم زاد کو زمین پر بھیجا ہی اس لیے ہے کہ وہ مسلسل کام کرتا رہے اور جب اسے تھکن کا احساس ہو تو چند لمحوں کے لیے ٹھہر جائے۔ بس اتنا ہی قیام جائز ہے۔ اگر وہ زیادہ دیر آرام کرے گا تو آخر میں اسے سکون کا ایک ثانیہ بھی میسر نہیں آئے گا۔ کون جانے وہ کیسی تھکن ہو گی؟ جن لوگوں نے اپنی ساری زندگی مشقت میں گزار دی ہے، وہ بھی وہاں تھکے تھکے نظر آئیں گے۔" امام شافعیؒ انسانی ذمے داریوں کی اس طرح وضاحت فرما رہے تھے کہ امیر آپ کے سامنے حیران و پریشان کھڑا تھا "قافلے رات میں بھی چلتے ہیں۔ اندھیرے میں کاروبارِ حیات معطل نہیں ہوتا اور جو فطرتیں بہانہ تراشنے کی عادی ہیں، انہیں سورج کی روشنی بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی۔" امام شافعیؒ نے اسے



اپنے منطقی استدلال سے خاموش کر دیا تھا۔

"آخر جب امیر سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو وہ براہِ راست امامؒ سے شب بسری کی درخواست کرنے لگا "مجھے اتنا شرف اور بخش دیجیے کہ میں ایک رات مزید آپ کی خدمت کر سکوں۔ اگر آپ حران میں زیادہ دن ٹھہرنا نہیں چاہتے تو پھر کل صبح تشریف لیجائیے گا۔" امیر کی درخواست میں ایسے خلوص کی آمیزش تھی کہ امام شافعیؒ انکار نہ کر سکے۔

رات کا کھانا بھی حسبِ معمول بہت زیادہ پر تکلف تھا۔ عام طور پر امام شافعیؒ ایسی لذیذ غذاؤں کو پسند نہیں کرتے تھے مگر میزبان کی بے انتہا محبت نے آپ کو مجبور کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد رات گئے تک امیر امام شافعیؒ کی خدمت میں حاضر رہا۔ وہ کسی خاص ضرورت کے تحت اپنے غلاموں یا خادموں کو طلب کرتا ورنہ امامؒ کے بیشتر کام خود ہی نہایت ذوق وشوق سے انجام دیتا۔ آخر جب رات کا ایک حصہ گزر گیا تو امام شافعیؒ نے یہ سوچ کر اس سے آرام کرنے کے لیے کہا کہ اتنا آسودہ حال انسان اس طرح دست بستہ بیٹھے رہنے اور جاگنے کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے یہ ساری زحمتیں صرف امامؒ کی خاطر گوارا تھیں اس لیے امامؒ بھی اپنے بامروت میزبان کو تکلف کی رسمی پریشانی میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب امیر رخصت ہو کر چلا گیا تو آپ کچھ دیر تنہائی میں ذکرِ الٰہی کرتے رہے۔ پھر اس قدر نیند لینے کے لیے کہ جس سے انسانی صحت برقرار رہ سکے، بستر پر دراز ہو گئے اور حدیث و فقہ کے مختلف مسائل پر سوچتے سوچتے خوابوں کی دنیا میں چلے گئے۔

اذانِ فجر کے ہوتے ہی امیر، امام شافعیؒ کو بیدار کرنے کے لیے حاضر ہوا مگر جب وہ مہمان کے کمرے تک آیا تو فرزندِ قریش کو جاگتا ہوا پایا۔ امام مسجدؒ میں وضو کرنا چاہتے تھے لیکن میزبان نے یہ سعادت حاصل کرنے کے لیے خود امامؒ کو وضو کرایا۔ علم کے احترام میں ایک ایک قدم پر امیر کے دیدہ و دل فرشِ راہ تھے۔ حران کے اس فارغ البال شخص کی پر خلوص خدمات نے امام شافعیؒ کو بے حد متاثر کیا تھا۔ آپ نے اپنے مختصر قیام کے دوران امیر کو کئی بار "جزائے خیر" کی دعا دے چکے تھے۔ اس وقت بھی جب وہ دولت مند انسان امام شافعیؒ کے پیچھے پیچھے کسی غلام کی مانند مسجد کی جانب جا رہا تھا تو امامؒ دل ہی دل میں اس کے لیے اپنے خدا سے عافیت طلب کر رہے تھے۔

نمازِ فجر کے بعد سورج بلند ہو گیا اور ہر طرف روشنی پھیل گئی تو امام شافعیؒ نے اپنے میزبان سے اجازت چاہی "کل میں نے تمہاری بات مان لی تھی۔ اب تم مجھے ہنسی خوشی رخصت کرو۔"

''مجھے اپنی پوری امیرانہ زندگی میں وہ سکون میسر نہیں آیا جو آپ کی لمحاتی قربت میں حاصل ہوا۔'' میزبان کا لہجہ عقیدت سے لبریز تھا۔ ''میں اپنے الفاظ کا پابند ہوں مگر اس کے ساتھ میری ایک التجا بھی ہے۔''

''اب کیا باقی رہ گیا ہے؟'' امام شافعیؒ نے حیرت سے کہا۔

''میری ایک رسم ہے اور آپ جیسا مردِ آزاد رسموں کا قائل نہیں۔ اس لیے دل کی بات کہتے ہوئے جھجک محسوس کرتا ہوں۔'' امیر کا اندازِ گفتگو عاجزانہ تھا۔

''اگر تمہاری کوئی رسم، مذہب سے متصادم نہیں ہوتی تو پھر جو کچھ کہنا ہے، آزادانہ کہو۔ مجھ سے ہو سکا تو تمہارے ساتھ مکمل تعاون کروں گا۔'' امامؒ کے لہجے میں وہی سادگی تھی، وہی بے باکی تھی جس کے لیے آپ اپنی نوعمری ہی میں مشہور ہو چکے تھے۔

''میں نے اپنا ایک اصول بنا لیا ہے۔''

امام کی طرف سے اجازت پا کر امیر صاف صاف اپنے دل کی بات کہہ رہا تھا ''اب تک میرے پاس جتنے مہمان آئے ہیں، آپ ان سب میں سب سے زیادہ معزز و محترم ہیں۔ انسانی زندگی نہ جانے کیسے کیسے رنگ اختیار کرتی ہے مگر میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے جانے کے بعد میرے گھر کی دیواریں پھر کبھی اتنے عظیم انسان کو نہیں دیکھیں گی۔ اس لیے مجھے رسم نبھانے دیجیے؟''

یہ کہتے کہتے امیر کے چہرے پر گہری اداسی کا رنگ جھلکنے لگا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟'' امام شافعیؒ نے اپنے میزبان سے دریافت کیا مگر جب امیر اپنی لاعلمی کے سبب خاموش رہا تو امامؒ نے دوبارہ فرمایا ''میں علم کی خاطر تیرہ سال کی عمر میں آغوشِ مادر سے جدا ہوا تھا۔ اب مجھے گھر سے نکلے ہوئے آٹھ سال ہو چکے ہیں۔ مکے سے آنے والی ہوائیں سرگوشیاں کرتی ہیں کہ اُمِّ محترم تیرے فراق میں سوگوار ہیں جب کبھی صبا دیارِ رسولؐ سے ہو کر آتی ہے تو مجھے اس کے جانفزا جھونکوں میں امام مالکؒ کی محبتوں کی مہک محسوس ہوتی ہے۔ پہلے جذبوں اور رفاقتوں کے یہ پیغام تاخیر سے پہنچتے تھے مگر اب کچھ دنوں سے روزانہ آ رہے ہیں۔'' امام نے اپنا مقصدِ سفر بیان کیا تو امیر کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ خود فرزندِ قریش کی پلکوں پر بھی نمی نظر آ رہی تھی۔

''اب میں آپ سے اپنی رسم کا ذکر نہیں کروں گا۔'' امیر کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی اور اس کا



چہرہ اس طرح اداس نظر آ رہا تھا جیسے وہ امام شافعیؒ سے مزید قیام کی درخواست کر کے پشیمانی محسوس کر رہا ہو۔

''مجھے تم بھی عزیز ہو اور تمہاری رسم بھی عزیز ہے۔'' امام شافعیؒ نے شگفتہ لہجے میں کہا'' آپ چند لمحوں میں اپنے جذبات پر قابو پا چکے تھے۔ ''ایک تم ہی نہیں، ساری دنیا کے علم دوست میرے عزیز ہیں۔ میں تمہاری رسم کی خاطر کچھ دن اور ٹھہر جاؤں گا۔ مگر اس کے بعد مجھے مجبور نہ کرنا۔'' امام کی فطری وضعداری اور مروت نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ آپ اپنے میزبان کی التجا کو نظر انداز کر کے حران کی حدود سے چلے جائیں۔

امامؒ کی رضامندی دیکھ کر امیر کے چہرے پر ابھرنے والی تمام افسردگی زائل ہو گئی اور وہ ناقابلِ بیان خوشی کے جذبات سے سرشار نظر آنے لگا۔ ''اپنے جذبوں کو قربان کر کے دوسروں کی خواہشات کا لحاظ رکھنا، بے شک آپ ہی کا حصہ ہے۔ میں اس شرف یابی پر ساری زندگی آپ کا شکر گزار رہوں گا۔'' امیر کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ اس کے احساس کی ترجمانی کر رہا تھا۔

پھر امام شافعیؒ نے اپنے میزبان کے یہاں تین دن گزار دیے۔ امیر کا حسنِ سلوک لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے روز و شب کی ایک ایک ساعت امام شافعیؒ کی بارگاہِ جلال میں عقیدت سے خم نظر آتی تھی۔ وہ اس طرح مطمئن تھا کہ جیسے وقت کا قافلہ اسی مقام پر ٹھہر جائے گا اور فرزندِ قریش کے علم سے روشن ہونے والے لمحات کبھی ختم نہیں ہوں گے مگر جیسے ہی چوتھے دن کا سورج طلوع ہوا، امیر کو اپنی مطمئن زندگی تاریکیوں کے نرغے میں گھری ہوئی نظر آنے لگی۔ علم کے جس آفتاب کی روشنی سے اس کے بام و در جگمگا رہے تھے، آج وہی آفتاب حران کی حدود سے گزر کر کسی دوسرے افق پر ابھرنے والا تھا۔

''آج تم کچھ پریشان نظر آتے ہو؟'' امام شافعیؒ نے اپنے میزبان کو اداس دیکھ کر کہا۔

''اہلِ دنیا کو تو اس سے غرض ہی کیا مگر اہلِ خانہ بھی میری اداسی کا سبب نہیں جانتے۔'' امیر نے نہایت افسردہ لہجے میں کہا۔ ''بس ایک آپ میری آزردگی کی وجہ جانتے ہیں لیکن مجھ میں آپ کے روبرو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہے۔''

امام شافعیؒ میزبان کی ان کہی باتوں کو مفہوم سمجھ گئے تھے مگر پھر بھی آپ نے اپنے کسی گمان کو ظاہر نہیں کیا۔ ''ایک انسان کو دوسرے انسان سے خائف نہیں ہونا چاہیے۔ جب کہ دونوں کے

درمیان مذہبی رشتہ بھی قائم ہو۔ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہہ ڈالو۔'' امام شافعیؒ نے نہایت خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا تا کہ امیر بھی بے تکلفی سے کام لے سکے۔

''میں ایک موروثی جاگیردار ہوں۔ حران کے اطراف میں میرے چار گاؤں موجود ہیں۔ اپنی زرخیزی اور مقامی نوعیت کے اعتبار سے یہ گاؤں پورے علاقے میں بے مثال ہیں۔'' اتنا کہہ کر امیر خاموش ہو گیا مگر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے قصداً اپنی بات مکمل چھوڑ دی ہو۔

''میرے خیال میں تمہاری گفتگو ابھی تمام نہیں ہوئی۔'' امام شافعیؒ نے جواباً فرمایا۔

''بے شک! ابھی میری بات نامکمل ہے۔'' امیر کے لہجے کی روانی ختم ہو چکی تھی اور اب اس کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ ''دراصل میں آپ کے سامنے خود کو بہت عاجز پاتا ہوں۔''

''میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ پھر تم عاجز کیوں ہو؟'' امام شافعیؒ مسلسل اپنائیت کے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ ''تمہارا ہی یہ احسان مجھ پر ہے کہ تم چار دن سے میری خاطر تکلیف اٹھا رہے ہو۔''

''معاذ اللہ۔'' امیر ایک لمحے کے لیے لرز اٹھا ''میں تو کسی احسان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جو شخص میزبانی کی رسم صحیح طور پر ادا نہ کر سکا ہو وہ احسان کیا کرے گا؟ میں تو یہ سوچ کر شرمسار ہوں کہ مجھ سے آپ کی خدمت کا بھی حق ادا نہ ہو سکا۔'' امیر کے چہرے پر ندامت کا رنگ صاف نظر آ رہا تھا۔

''پھر دل کی بات کہتے ہوئے تمہاری زبان کیوں رکتی ہے؟'' امام شافعیؒ نے بے تکلفی سے پوچھا۔

''مجھے یہ خوف لاحق ہے کہ آپ میری بات سن کر خفا نہ ہو جائیں۔'' امیر کی اس وقت وہی کیفیت تھی جو کسی غلام کی اپنے آقا کے سامنے ہوتی ہے۔

''خدا نے مجھے اتنی قوتِ برداشت عطا کی ہے کہ میں دل آزاری کرنے والے کو بھی معاف کر دیتا ہوں۔'' یکایک امام شافعیؒ کی قلندرانہ شان ابھر آئی تھی ''معاف کرنا بڑی سعادت ہے۔ پہلے تو علم دوست کسی کا دل دکھاتے نہیں۔ اگر تم سے یہ غلطی سرزد ہو بھی گئی تو تم نے اتنی بار میرا دل خوش کیا ہے کہ یہ مفروضہ دل آزاری کے بوجھ کے نیچے دب جائے گا۔''

امام کی باتیں جلتی ہوئی دھوپ میں ایک خوش گوار سائے کی حیثیت رکھتی تھیں۔ امیر کا کھویا ہوا اعتماد لوٹ آیا۔ اب وہ روانی کے ساتھ بول رہا تھا مگر پھر بھی اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ ''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اگر آپ حران میں قیام فرمائیں تو یہ چاروں گاؤں آپ کی نذر



ہیں۔'' اتنا کہہ کر امیر نے گھبراہٹ میں امام شافعیؒ کی طرف دیکھا۔ وہ آپ کے چہرے پر اپنی گفتگو کا ردِّ عمل تلاش کر رہا تھا۔

امامؒ نے میزبان کی پیش کش پر اپنے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ باوقار خاموشی سے امیر کی طرف دیکھتے رہے۔ مہمان کے اس سکوت نے اسے مزید بدحواس کر دیا ''خدا گواہ ہے کہ میں آپ کے سامنے اپنی امارت و سرمایہ داری کی نمائش نہیں کر رہا ہوں۔ میری ساری دولت آپ کے قدموں سے اٹھنے والے غبار کے برابر بھی نہیں ہے۔''

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟'' امام شافعیؒ نے اپنے میزبان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔

''آپ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ تشریف لے جائیں پھر حجازِ مقدس سے واپس آ کر حران میں قیام فرمائیں۔ والدہ محترمہ کو بھی اپنے ہمراہ لیتے آئیں۔'' امیر ہر طرح امام شافعیؒ کو رضامند کرنا چاہتا تھا۔

''مگر تم میرے قیام پر اتنا اصرار کیوں کر رہے ہو؟'' امام نے میزبان سے اس کی بے قراریوں کا سبب پوچھا۔

''اب میں آپ کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔'' امیر کے لہجے میں دل کا درد شامل تھا۔ ''میرا خیال تھا کہ یہ عارضی ملاقات مجھے زیادہ متاثر نہیں کرے گی مگر اب سوچتا ہوں کہ چند خوش گوار لمحے میری زندگی کا مستقل حصہ بن گئے ہیں۔ اگر میں ان لمحوں کو اپنے روز و شب سے علیحدہ کر دوں تو پھر کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ یہ ساعتیں، یہ لمحے، یہ ثانئے اسی جگہ رک جائیں۔ میں ان لمحوں کے حصول کے لیے اپنا سارا مال و متاع لٹا سکتا ہوں۔'' امیر کے دل اور زبان میں بڑی ہم آہنگی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس میں جھوٹ اور تصنع کا شائبہ تک نہ تھا۔

''علم کے لیے تمہارا یہ جذبہ یقیناً قابلِ ستائش ہے مگر اس میں خود غرضی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔'' امام شافعی نے محبت آمیز لہجے میں اپنے میزبان کو سمجھاتے ہوئے کہا ''جب میں بغداد سے رخصت ہو رہا تھا، اس وقت بھی ایک آسودہ حال نوجوان نے ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا تھا لیکن میں نے اسے بتایا کہ علم ایک سورج ہے جس کی روشنی زمین کے ایک ایک گوشے تک پہنچنی چاہیے۔ اس روشنی کو کسی ایک دائرے یا مقام پر اسیر نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے دیکھو کہ علم کی خاطر زمین اور خون کے

تمام رشتے توڑ آیا ہوں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ ان گلیوں میں مستقل قیام کروں جہاں میرے بچپن کے دوست ہیں، عزیز ہیں اور جہاں ایک ایک ذرہ مجھ سے آشنا ہے۔ تمہیں کیا خبر کہ ماضی کی کتنی یادیں دامن کش ہیں مگر میں ان کو حصولِ علم کی خواہش پر غالب نہیں آنے دیتا۔ اگر تم مجھے حران میں قید کر دو گے تو اہلِ حجاز کہاں ڈھونڈتے پھریں گے؟ اہلِ مصر کا کیا ہوگا اور اہلِ شام پر کیا گزرے گی؟ یہ بھی تمہاری طرح کلمہ گو انسان ہیں۔ ان کے بھی مجھ پر بے شمار حقوق ہیں۔ کسی ایک جگہ ٹھہرنے کا یہی مطلب ہے کہ میں لاتعداد بندگانِ خدا کی حق تلفی کر رہا ہوں، کیا تمہاری شرافتِ نفسی اور کشادہ دلی اس ناانصافی کو برداشت کرلے گی؟ جب یہی بات میں نے بغداد کے اس نوجوان سے کہی تھی تو وہ اپنے ذاتی نقصان کے باوجود منزلِ فراق پر چلنے کے لیے آمادہ ہوگیا تھا اور پھر اس نے مجھے بڑی شان سے رخصت کیا تھا بلاشبہ میں اس نوجوان سے بچھڑ گیا ہوں اور آئندہ ملاقات کا کوئی امکان بھی نہیں ہے لیکن وہ مجھے آخری سانس تک یاد رہے گا۔ علم کے رشتے ہی اتنے معتبر اور مستحکم ہوتے ہیں کہ انسانی جسم کے خاک میں مل جانے کے بعد بھی وہ فنا نہیں ہوتے۔ میں کچھ دیر بعد تمہیں الوداع کہہ کر چلا جاؤں گا مگر جب بھی روز و شب کے ہنگاموں سے نجات ملے گی، مجھے حران یاد آئے گا اور حران کی یادوں کے ساتھ ہی ذہن میں تمہاری بے پناہ محبتوں کے نقوش ابھر آئیں گے۔ پھر میں لوگوں سے کیا کہوں گا کہ حران میں میرا ایک دوست رہتا ہے جس نے اپنا سارا سرمایہ علم کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ یہ کیسی خوش گوار یادیں ہوں گی؟ دماغوں کو، دلوں کو اور روحوں کو مہکانے والی یادیں۔''

امام شافعیؒ علم اور سفر کی فضیلت پر اس طرح بول رہے تھے کہ امیر ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے امامؒ کو روکنے کے لیے کئی بہانے تراشے تھے، کئی توجیہات پیش کی تھیں مگر اب اس کی زبان گنگ تھی اور اس نے امامؒ کے لفظوں کی یلغار کے سامنے سپر ڈال دی تھی۔

امیر خاموش بیٹھا ہوا بڑی حسرت سے امام شافعیؒ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں تک کمرے کی فضا پر گہرا سکوت طاری رہا۔ پھر امام شافعیؒ اپنے میزبان سے دوبارہ مخاطب ہوئے۔ ''تم جانتے ہو کہ میرے نزدیک سفر کیا ہے؟'' امیر کیا جواب دیتا، بس سوالیہ نظروں سے امامؒ کے روشن چہرے کو دیکھتا رہا ''سفر میرا مقصدِ حیات ہے، سفر ہی میری کائنات ہے۔'' امام بڑے جذب کے عالم میں بول رہے تھے۔ پھر آپ نے نہایت اثر انگیز لہجے میں اپنا یہ شعر پڑھا۔

''میں زمین کے طول و عرض کا سفر کروں گا۔''



یا اپنی مراد کو پہنچوں گا
یا غریب الوطنی میں جان دے دوں گا۔''

امیر نے پہلی بار خوش الحانی کا یہ مظاہرہ دیکھا تھا۔ امامؒ کی بلند اور پرسوز آواز اسے اپنی روح میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''اس زمین پر چلنے والے اکثر لوگ نہیں جانتے کہ سفر کیا ہے؟'' امام شرر فشاں لہجے میں فطرت کے سربستہ رازوں کو بے نقاب کر رہے تھے۔

؎ تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

''سفر ایک محدود دائرے میں گردش کرنے کا نام نہیں۔ سفر، رسم رواج، دولت، زمین اور رشتوں کی زنجیر توڑ دینے کا نام ہے، سفر گوشہ عافیت سے نکل کر دشتِ مسائل کی خاک چھاننے کا نام ہے۔'' امامؒ کی شعلہ بار تقریر جاری تھی۔ امیر حیران و پریشان تھا۔ اس نے فرزندِ قریش کی شخصیت کا یہ رخ ابھی تک دیکھا ہی نہیں تھا۔ امامؒ کی زبان سے الفاظ و معانی کی ایسی بارش ہو رہی تھی کہ جس میں امیر کے قیاس و گمان خس و خاشاک کی مانند بہہ رہے تھے۔ پھر امام شافعیؒ نے اپنے یہ اشعار پڑھے۔

''میں دیکھتا ہوں کہ رکا ہوا پانی فاسد ہو جاتا ہے۔
اگر وہ پانی رواں ہے تو پاکیزہ رہتا ہے ورنہ سمندر بھی ہو تو پاک نہیں رہتا۔
شیر اگر جھاڑی کی جدائی برداشت نہ کرے تو کبھی شکار نہیں کر سکتا
تیر اگر کمان سے باہر نہ نکلے تو نشانے پر نہیں بیٹھ سکتا۔''

امامؒ کے اشعار کیا تھے۔ ایک برقِ تپاں تھی کہ جس کی حرارت سے امیر کے ہوش و خرد جل اٹھے تھے۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے ساکت بیٹھا رہا پھر جب اس نے امام شافعیؒ کی طرف دیکھا تو آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''میری کیا مجال کہ آپ کی کسی دلیل کو رد کرنے کا تصور بھی کرسکوں۔'' امیر رقت آمیز لہجے میں بول رہا تھا ''میں جانتا ہوں کہ حران میں آپ کے قیام کے بعد مخلوقِ خدا علم کی تیز روشنی سے محروم ہو جائے گی مگر اپنے دل کو کیا کروں۔ وہاں سے بس ایک ہی صدا ابھرتی ہے کہ آپ یہیں ٹھہر جائیں اور پھر میرے پاس جو کچھ ہے، وہ سب آپ کی نذر کر دوں۔''

''پھر تم کیا کرو گے؟'' اچانک شافعیؒ نے امیر سے سوال کیا۔

''میرے پاس چالیس ہزار درہم نقد موجود ہیں، میں ان سے کوئی تجارت کرلوں گا۔'' امیر نے بڑی عاجزی سے کہا ''اگر کبھی ضرورت محسوس ہوگی تو اپنی یہ متاعِ حقیر بھی آپ پر لٹادوں گا۔'' امیر کے شدتِ جذبات میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

''نہیں۔ کبھی اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' امام شافعیؒ نے جواباً فرمایا ''میں تو یوں ہی دریافت کررہا تھا۔ تم واقعتاً علم دوست ہو۔ خدا تمہارے رزق کے ساتھ دل کو بھی مزید کشادہ کرے۔ میں قافلۂ علم کا آخری مسافر نہیں ہوں۔ میرے بعد بھی کچھ اور لوگ اس وادی پُرخار سے گزرتے ہوئے آئیں گے۔ ان کی نشانیاں یاد رکھنا۔ وہ بوسیدہ قباؤں میں ملبوس ہوں گے۔ ان کے ہونٹ مشروبات کی لذتوں سے ناآشنا، جسم خالی اور چہرے زرد ہوں گے۔ مگر ان کی آنکھوں میں حرص وطمع کا ہلکا سا عکس بھی نہیں پاؤ گے۔ ان کا دستِ طلب خدا کے بعد کسی کے آگے دراز نہیں ہوگا۔ ان کا پورا جسم سنگِ حوادث سے داغ داغ ہوگا اور پاؤں آبلوں سے بھرے ہوں گے۔ ہوسکے تو ان کا احترام کرنا۔ اور اب تم سے رخصت ہوتا ہوں۔'' یہ کہہ کر امام شافعیؒ کھڑے ہوئے اور اپنی چادر کاندھے پر ڈالی۔ بس یہی چادر اس مردِ جلیل کا سرمایہ تھی۔

امامؒ کو آمادہ سفر پاکر امیر گھبرا گیا اور اس نے بدحواسی کے عالم میں آپ کا دامن پکڑ لیا ''بے شک! میں آپ کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتا مگر اس طرح نہیں جانے دوں گا کہ ساری زندگی خود سے شرمندہ رہوں۔''

''پھر تم کیا چاہتے ہو؟'' امیر کی وارفتگیِ شوق دیکھ کر امامؒ کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھر آیا تھا۔

''میرے پاس جس قدر نقد رقم ہے، آپ قبول کرلیجیے۔'' امیر نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

''بندۂ خدا! میں دولت کے اس انبار کا کیا کروں گا؟'' امام شافعیؒ نے اس طرح کہا کہ آپ کے لہجے سے حیرت صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

''کون جانے آپ کا سفر کتنا طویل ہوگا؟'' امیر اپنی ضد پر قائم تھا۔ ''مسافر کو کوئی نہ کوئی ضرورت پیش آ ہی جاتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی سنگین وقت میں آپ چند سکوں کے حصول کے لیے رنجیدہ خاطر ہوں اور علمی مشاغل چھوڑ کر دوسرا ذریعۂ معاش اختیار کریں۔ میں کسی نہ کسی طرح اس لمحہ فراق کو برداشت کرلوں گا مگر مجھے یہ گوارا نہیں ہوگا کہ بھوک اور تنگ دستی کا کوئی مہیب سایہ آپ کے روشن چہرے پر پڑے۔'' یہ کہتے کہتے امیر رونے لگا۔



امام شافعیؒ اس کی مہمان نوازی سے پہلے ہی بہت متاثر تھے لیکن جب شدتِ احساس کا یہ مظاہرہ دیکھا تو آپ کا تاثر کچھ اور بڑھ گیا۔ ''اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو تھوڑی بہت رقم دے دو۔ میں تنہا انسان اس بوجھ کو اٹھائے اٹھائے کہاں پھروں گا؟'' امامؒ نے اپنے میزبان کی دل جوئی کرتے ہوئے فرمایا۔

''آپ کئی بار مجھے علم دوست کہہ کر پکار چکے ہیں۔'' امیر عجیب وغریب انداز میں امامؒ کو مجبور کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

''تمہارے علم دوست ہونے میں کسی کو کیا شک ہوسکتا ہے؟'' امام شافعیؒ نے پرجوش لہجے میں فرمایا۔

''تو پھر اسی علم کی خاطر میری درخواست کو قبول کرلیجیے۔'' امیر نے منطق کا سہارا لیا ''مگر ایسی منطق کہ جس میں دل کا درد شامل تھا۔

آخر امام شافعیؒ مجبور ہوگئے۔ امیر نے فوراً اپنے غلاموں کو آواز دی۔ پھر وہ دولت سے بھرے ہوئے صندوق دو خچروں پر بار کردیے گئے۔ کچھ دیر بعد امامؒ میزبان سے رخصت ہوئے تو آپ کے پاس چالیس ہزار درہم موجود تھے۔ ایک ایسی دولت جو بڑے اصرار اور خوشامد کے بعد امام کی نذر کی گئی تھی۔ امیر بہت دور تک پاپیادہ چلتا رہا۔ امامؒ نے کئی بار کہا کہ وہ اسی مقام سے اسے الوداع کہنا چاہتے ہیں، مگر امیر اس پر آمادہ نہیں ہوا ''بس اب میری سعادت کے لیے چند لمحات ہی بچے ہیں۔ میں انہیں گنوانا نہیں چاہتا۔'' امیر راستے بھر امامؒ سے معذرت ہی کرتا رہا ''میں آپ کی ایسی خدمت نہ کرسکا جو ایک عالم کی شایانِ شان ہوتی ہے۔'' امامؒ اپنے میزبان کی یہ فراخ دلی دیکھ کر حیران تھے۔ چار دن تک اس طرح مہمان نوازی کی رسم ادا کرنا کہ اگر کوئی دیکھے تو میزبان کو غلام سمجھے، ہمہ وقت اس طرح امامؒ کی خدمت میں حاضر رہنا کہ خادم بھی بیزار ہوجائے، پھر اپنا وہ سرمایہ امامؒ کے حوالے کردینا جس کی ذخیرہ اندوزی کے لیے اہلِ ثروت بندگانِ خدا کا خون بہانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بلاشبہ علم کی خاطر یہ بڑی قربانی تھی اور اب اداس جذبوں، اشکبار آنکھوں اور بے قرار حسرتوں کے ہجوم میں امام کو رخصت کرنا، علم دوستی کی ایک ایسی مثال تھی جو تاریخ کے سینے پر نقش ہوکر رہ گئی تھی۔

امیر، امام شافعی کو الوداع کہنے کے لیے حران کی سرحد تک آیا۔ پھر فرزندِ قریش کے سفر کے لیے

ایک نہایت آراستہ اونٹ کا انتظام کیا۔ وقتِ رخصت بہت دیر تک امامؒ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے کھڑا رہا۔ بڑا رقت انگیز منظر تھا۔ امیر کے آنسو اس کے دامن کو بھگو رہے تھے۔ خود امام شافعیؒ بھی اپنے میزبان کی اس جذباتی کیفیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور آہستہ آہستہ آپ کی پلکیں بھی نم ہوتی چلی گئیں۔

''کاش! میں نے آپ کو بغداد کی مسجد میں نہ دیکھا ہوتا۔ پھر آپ حران تشریف نہ لاتے یا مجھ سے ملاقات نہ ہوتی۔'' امیر بڑے حسرت ناک لہجے میں بول رہا تھا ''مجھ تشنہ کام نے اپنے دروازے پر علم کے دریا کو موجزن دیکھا۔ مگر جب میں لبِ دریا پہنچا تو اس کا شیریں پانی میرے ہونٹوں سے دور ہو گیا۔'' امیر کی گفتگو پر گمان ہوتا تھا جیسے وہ اپنے حسرت و ارمان کا مرثیہ پڑھ رہا ہو ''بے شک! میں نے علم و حکمت کے درخشاں آفتاب کو اپنے در و بام پر اترتے دیکھا تھا اور اس کی ضیا باریوں کو دائمی سمجھ بیٹھا تھا لیکن سورج تو ہمیشہ سفر میں رہتا ہے اور دریا تو بہتا ہی رہتا ہے۔''

''کیا تم اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ ہر شے کو فنا ہو جانا ہے۔ آفتاب کا مقدر بے نوری، سمندر کی قسمت بے آبی، پھر انسان کس لیے خواب دیکھتا ہے اور کیوں اداس ہو جاتا ہے؟'' امام شافعیؒ نے اپنے میزبان کو تسلی دیتے ہوئے کہا جو بہت زیادہ شکستہ نظر آ رہا تھا۔

''ہر ذی ہوش انسان قدرت کے اس نظام سے واقف ہے مگر تمناؤں کا شور اسے کچھ سننے نہیں دیتا۔'' امیر نے اپنی لرزتی ہوئی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا ''میں جوشِ جذبات میں صبر کا مفہوم بھول گیا تھا۔ واقعتاً یہ خود غرضی کی انتہا ہے کہ انسان سورج کی روشنی کو اپنے گھر میں محصور کرنے اور دریا کو صرف اپنے دروازے کے سامنے بہنے کا پابند کرنے کی کوشش کرے۔ خدا میری ناشکر گزاریوں کو معاف کرے، میرے لیے یہی شرف کافی ہے کہ سورج اور دریا نے کچھ دن کے لیے میری خاطر اپنا رخ بدل دیا تھا۔'' امیر بظاہر کسی حد تک پُرسکون ہو گیا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو اب بھی رواں تھے۔

امام شافعیؒ نے اپنے میزبان کو بڑی گرم جوشی سے گلے لگایا اور اونٹ پر سوار ہو گئے۔ پھر علم کا مسافر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ امیر نے اپنے ہاتھ کو فضا میں بلند کیا۔ وہ اپنے عظیم مہمان کو اس طرح رخصت کر رہا تھا کہ اس کی آنکھیں اشک بار تھیں اور ہونٹوں پر ''الفراق' الفراق'' کے جان گداز کلمات لرز رہے تھے۔ امام شافعیؒ بار بار مڑ کر دیکھتے رہے ''الفراق، الفراق'' کی آوازیں



مسلسل آپ کا تعاقب کر رہی تھیں۔ پھر فاصلے طویل ہو گئے۔ امیر کی آواز مدھم پڑ گئیں اور چہرہ دھندلا گیا۔ مگر وہ کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ راستے کے غبار نے اس کے اور امام شافعیؒ کے درمیان گہرا پردہ کھینچ دیا۔

اس یادگار واقعے کو حضرت امام شافعیؒ نے اپنے سفرنامے میں یوں بیان فرمایا ہے ''میں نے امیر کو خدا حافظ کہا اور حران سے اس حال میں روانہ ہوا کہ میرے آگے پیچھے دولت کے انبار تھے۔'' مگر دینار و درہم کا یہ ذخیرہ صرف کچھ دور تک ہی امامؒ کا ساتھ دے سکا۔ امامؒ سیم و زر کے اس بوجھ کو اٹھانے کے عادی ہی نہیں تھے۔ راستے میں جو بھی ضرورت مند نظر آیا، اسے تھوڑا بہت دیتے رہے۔ کوئی اہلِ علم ملا تو اس پر زیادہ مہربانیاں کیں۔ اور جب امامؒ نے اصحابِ حدیث کی ایک جماعت کو دیکھا تو سب کچھ لٹا دیا۔ اس صورتِ حال کے بارے میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ ''میرا سفر جاری تھا۔ خدا نے غریب الوطنی میں میری کفالت کی تھی۔ اس لیے میں بھی کسی مسافر کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ جہاں بھی کوئی حاجت مند دکھائی دیتا، اس کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتا۔ پھر مجھے راہ میں وہ لوگ ملے جو طلبِ حدیث میں دربدر مارے مارے پھر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرے دل کو عجیب طمانیت حاصل ہوئی۔ ان کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے چہروں نے میری آنکھیں روشن کر دیں۔ میں نے ان کی خوب تواضع کی۔ پھر جب وہ اپنی اپنی منزلوں کی طرف بڑھنے لگے تو میں نے انہیں اس قدر دیا کہ جتنا ان کے مقدر میں تھا۔ حران کے امیر نے جو کچھ میری نذر کیا تھا میں نے اسے اصحابِ حدیث میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد جب میں شہر رملہ پہنچا تو چالیس ہزار میں سے صرف دس درہم باقی تھے۔'' امامؒ کی یہی وہ قلندرانہ فطرت تھی جو دولت کے بارِ گراں کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ خدا کی ذات پر آپ کے یقین و توکل کا یہ عالم تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی آنے والے وقت کی سنگینی کا احساس نہیں کیا۔ طویل اور دشوار گزار سفر میں مادی وسائل سے یہ بے نیازی امامؒ ہی کی شان تھی۔ ورنہ انسان تو اپنی گردن میں دولت کا طوق ڈالنے کے لیے ہر موسم اور ہر زمانے میں بے چین رہتا ہے۔

☆☆☆

شہر رملہ پہنچ کر امام شافعیؒ نے یہاں مختصر قیام کیا۔ امیر حران کی دی ہوئی رقم سے اس وقت آپ کے پاس صرف دس درہم موجود تھے۔ امامؒ نے فوراً ہی کرائے کی سواری ڈھونڈنا شروع کر دی۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد آپ کو ایک ایسا ساربان مل گیا جو مدینہ منورہ کی طرف جانا چاہتا تھا۔امامؒ نے وہ رقم اسے دے دی۔ساربان بہت خوش ہوا کیونکہ امام شافعیؒ کا دیا ہوا کرایہ اس کی توقعات سے زیادہ تھا پھر منزلِ حدیث وفقہ کا یہ مسافر اونٹ پر سوار، اور ایک نئے سفر کا آغاز ہو گیا۔

امام شافعیؒ نے اپنے سفر نامے میں شہر رملہ سے حجاز مقدس تک پیش آنے والے واقعات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے مگر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس طویل سفر میں آپ کو بہت دشواریاں پیش آئی ہوں گی۔ساربان کو دس درہم دینے کے بعد آپ دولت و وسائل کی زنجیروں سے یکسر آزاد ہو گئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ کچھ اشیائے خوردنی آپ کے ہمراہ ہوں گے۔ویسے یہ بھی محض ایک قیاس آرائی ہے۔امامؒ کی زندگی کا سرسری سا مطالعہ کرنے والا شخص بھی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ امامؒ نے بھوک کے خوف سے کل کے لیے روٹی اٹھا کر اس سفر میں فاقہ کشی سے دوچار ہوئے ہوں گے۔یا پھر قدرت نے اچانک آپ کی دستگیری کی ہو گی۔بالفرض ایسا نہیں ہوا تھا تو پھر بظاہر کوئی تیسری صورت نظر نہیں آتی۔موجودہ تاریخ کا طالب علم شخصیات کا مطالعہ کرتا ہوا جس بے پروائی کے ساتھ گزر جاتا ہے، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ امام شافعیؒ کا یہ سفر اتنا آسان نہیں تھا۔ایک سفر وہ ہوتا ہے جس میں مسافر حالات کی ناسازگاریوں کا شکار ہو کر مصائب برداشت کرتا ہے اور جانِ ناتواں کو کسی نہ کسی طرح کھینچ کر منزل تک لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔دوسرا سفر وہ ہے جس میں مسافر کے پاس چالیس ہزار درہم موجود ہوتے ہیں مگر نصف راستہ طے کرنے سے پہلے ہی وہ ساری رقم دوسرے مسافروں پر لٹا دیتا ہے۔اس طرح کہ دولت لٹاتے وقت نہ چہرے پر کوئی عکسِ ملال ابھرتا ہے اور نہ دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دشتِ تنہائی میں خود اس کا کیا حشر ہو گا؟ امام شافعیؒ اسی انداز کے مسافر تھے۔ان کا ذوقِ سفر ساری دنیا سے نرالا تھا۔اگر کوئی شخص اس روح سفر سے ناآشنا ہے تو پھر وہ امام شافعیؒ سے بھی ناآشنا ہی رہے گا۔

غرض ستائیسویں دن امامؒ کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر مدینہ نظر آیا۔طویل مسافت کے باعث سارا جسم تھکن سے چور تھا لیکن سرورِ کونینؐ کی قربت کے تصور نے امامؒ کی ساری توانائیاں بحال کر دی تھیں۔آپ نے اپنی فطری خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساربان کا شکریہ ادا کیا اور بڑے والہانہ انداز میں مسجدِ نبوی کی طرف بڑھے۔امام شافعیؒ نمازِ عصر کے بعد یہاں پہنچے تھے اس لیے آپ نے تیزی کے ساتھ وضو کیا اور نماز ادا کرنے لگے۔اس کے بعد امامؒ دربارِ رسالت مآبؐ



میں سلام کے لیے حاضر ہوئے۔

"السلام علیکم یا سید المرسلین!" جیسے ہی امام کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے پورے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔فرزندِ قریش جس نے داغِ یتیمی، ماں کی جدائی، بچپن کی محرومی، غربت و افلاس کی شدت اور عزیز و اقارب کی دل آزاری کے باوجود کبھی اشک ریزی نہیں کی، وہ رحمتہ العالمینؐ کے سایہ رحمت میں آیا تو بے اختیار رو پڑا۔امامؒ بہت دیر تک دست بستہ، آنکھیں بند کیے کھڑے رہے۔بس ہونٹوں کو ہلکے ہلکے جنبش ہو رہی تھی۔یقیناً امام کوئی دعا مانگ رہے تھے مگر مانگنے والے نے کیا مانگا اور سننے والے نے کیا سنا؟ یہ بندے اور خدا کے درمیان ایک راز ہے۔

پھر امامؒ آہستہ آہستہ ادب سے چلتے ہوئے مسجد کے ایک گوشے کی طرف آئے جہاں لوہے کی ایک کرسی موجود تھی جس پر مصر کا بنا ہوا ایک قیمتی تکیہ رکھا تھا۔امام شافعیؒ سوچ میں پڑ گئے کہ یہ کرسی اور تکیہ کس کا ہو سکتا ہے؟ امامؒ نے اپنے آپ سے سوال کیا "آٹھ نو سال پہلے اسی جگہ بیٹھ کر حضرت امام مالکؒ درس دیا کرتے تھے مگر ان کی نشست کے لیے ایک عام سا تخت تھا، ہر تکلف سے عاری، ہر زیبائش سے بے نیاز پھر یہ کرسی کس کے لیے رکھی گئی ہے؟" امامؒ نے سوچا اور دوسرے ہی لمحے آپ کو بغداد کے اس نوجوان کے الفاظ یاد آ گئے جس نے حج سے واپسی کے بعد کہا تھا کہ اب حضرت امام مالکؒ بہت دولت مند ہو گئے ہیں۔امام شافعیؒ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ پوری مسجد خوشبو سے مہکنے لگی۔امامؒ چونک اٹھے۔یہ ایک مخصوص خوشبو تھی جس سے امام شافعیؒ کے دل و دماغ اس قدر آشنا تھے کہ اگر آپ کسی چمن زار میں ہوتے تو ہزاروں خوشبوؤں کے درمیان بھی اس خوشبو کو پہچان کر بے ساختہ پکار اٹھتے کہ یہ وہ خوشبو ہے جو میرے استادِ گرامی حضرت امام مالکؒ کے بدن کو چھو کر آ رہی ہے۔امام شافعیؒ بے قرار ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔پھر آپ کی مضطرب نگاہیں "باب النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کی جانب اٹھ گئیں۔حضرت امام مالکؒ درس کے لیے تشریف لا رہے تھے۔امام شافعیؒ نے حیرت سے دیکھا۔امام مدینہؒ کے ساتھ تقریباً پانچ سو عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔چار آدمی امام مالکؒ کی عبا کے دامن کو اٹھائے چل رہے تھے۔فرزندِ قریش کی حیرت میں دم بہ دم اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔امام مالکؒ کا لباس بہت زیادہ قیمتی تھا۔امام شافعیؒ کی نظروں میں آٹھ سے نو سال قبل کا زمانہ گھوم گیا، جب امامِ مدینہؒ کے جسم مبارک پر عام انسانوں جیسا لباس ہوتا تھا اور جس سے غربت صاف جھلکتی

تھی۔ "یہ اچانک کیسا انقلاب آ گیا ہے؟" امام شافعیؒ ایک گوشے میں خاموش کھڑے سوچ رہے تھے۔

"کیا امام مدینہؒ بھی امیرانہ طرز زندگی کو پسند کرسکتے ہیں؟" یہ ایک بڑا عجیب سوال تھا جس نے امام شافعیؒ کو اضطراب میں مبتلا کردیا تھا۔ فرزندِ قریش اپنی قلندرانہ فطرت کے باعث امارات کے مظاہروں کو ناپسند کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب آپ نے پہلی بار کوفے میں امام محمدؒ کے مکان پر دلکش نقش ونگار دیکھے تھے تو آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ اب امام شافعیؒ دوسری مرتبہ اپنے استادِ گرامی حضرت امام مالکؒ کے لباس پر اسی امارات کا عکس دیکھ رہے تھے، نتیجتاً دل میں وہی درد جاگ اٹھا تھا اور ذہن میں وہی اندیشے ابھرنے لگے تھے جن کا اظہار آپ نے امام محمدؒ کے سامنے کیا تھا۔

ابھی امام شافعیؒ اپنے خیالات کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے کہ امام مالکؒ مجلسِ درس میں پہنچے۔ احتراماً تمام حاضرین کھڑے ہوگئے۔ امام مالکؒ کرسی پر تشریف فرما ہوئے تو درس میں شریک ہونے والے افراد بھی فرش پر بیٹھ گئے۔ امام شافعیؒ چند لمحوں تک کھڑے سوچتے رہے اور پھر آپ بھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے حاضرینِ مجلس کی آخری قطار میں شامل ہوگئے۔

حضرت امام مالکؒ نے شرکائے مجلس سے فقہ کا ایک مسئلہ دریافت کیا "حلقۂ درس میں امامِ مدینہ کے شاگرد بھی شریک تھے اور دیارِ رسولؐ کے وہ باشندے بھی جو اس مردِ جلیل کے علم سے فیض یاب ہونے کے لیے روزانہ حاضر ہوتے تھے۔ امام مالکؒ کا سوال سنتے ہی امام شافعیؒ بے قرار ہوگئے۔ آپ نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے کہا "امام مدینہؒ نے فقہ کا جو مسئلہ بیان کیا ہے، اس کا جواب یہ ہے۔" وہ شخص معمولی علم رکھتا تھا مگر حاضرینِ مجلس میں ممتاز ہونے کے لیے کھڑا ہوگیا اور امام شافعیؒ کے بتائے ہوئے جواب کو حروف بہ حروف دہرانے لگا۔ امام مالکؒ نے اس کا بیان سنا اور پھر اپنے شاگردوں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ امام شافعیؒ کو امام مالک کے اس طرزِ عمل پر شدید حیرت تھی۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ امامِ مدینہؒ نے ایک صحیح جواب کو کس لیے نظر انداز کردیا ہے۔

ابھی امام شافعیؒ اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے کہ امامِ مدینہؒ نے فقہ کے اسی مسئلے کو دوبارہ بیان کیا اور اپنے شاگردوں سے جواب کے طالب ہوئے۔ کچھ دیر تک مجلس پر سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد امام مالکؒ کا ایک شاگرد کھڑا ہوا اور جواب دیا جو یکسر غلط تھا۔ پھر دوسرا شاگرد اپنی نشست پر ایستادہ ہوا مگر اس کا جواب بھی غلط تھا اس طرح یکے بعد دیگرے کئی شاگردوں جواب دینے کی کوشش کی مگر ان میں سے ایک بھی مسئلے کی حقیقت تک نہ پہنچ سکا۔ آخر امام مالکؒ نے فرمایا "تم سب غلطی پر



ہو۔ جس شخص نے پہلے جواب دیا تھا، وہی درست تھا۔" امامِ مدینہ کی بات سن کر وہ گمنام شخص بہت خوش ہوا۔

امام مالکؒ نے دوسرا مسئلہ پیش کیا "گمنام شخص گھبرا کر امام شافعیؒ کی طرف دیکھنے لگا۔ فرزندِ قریش نے اس بار بھی جواب بتادیا۔ وہ شخص فوراً کھڑا ہوگیا اور بلند آواز میں امام شافعیؒ کے الفاظ دہرانے لگا۔ حضرت امام مالکؒ نے حسبِ سابق اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور اپنے شاگردوں سے جواب کے طالب ہوئے۔ اتفاق کی بات دوسری مرتبہ بھی امام مدینہؒ کا کوئی شاگرد صحیح جواب نہ دے سکا۔ امام مالکؒ نے دوبارہ فرمایا "اسی شخص کا جواب درست ہے۔" جیسے ہی امامِ مدینہ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔ تمام حاضرین مجلس گمنام شخص کی جانب دیکھنے لگے۔ اب وہ ہر فرد کی توجہ کا مرکز تھا۔ درس میں شریک ہونے والے اسے ایک عالم وفاضل انسان سمجھ رہے تھے۔

امام مالکؒ نے فقہ کا تیسرا مسئلہ پیش کیا اور اس بار بھی وہی صورتِ حال سامنے آئی۔ انجام کار امام مالکؒ اس گمنام شخص کی طرف متوجہ ہوئے اور بڑی محبت سے فرمایا "تمہاری جگہ وہ نہیں ہے، تم یہاں میرے قریب آکر بیٹھو۔" تھوڑی دیر پہلے امامِ مدینہؒ کی مجلس علم میں جس شخص کی کوئی اہمیت نہیں تھی، اب وہ سب کی نگاہوں میں محترم ہوگیا تھا۔ گمنام شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا امامِ مدینہ کے نزدیک پہنچا۔ امام مالکؒ کے ہیبت وجلال سے اس کے جسم پر ہلکا سا لرزہ طاری تھا۔ آپ نے اسے اگلی صف میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

(امام مالکؒ کی مجلس درس میں حاضرین کی ترتیب اس طرح ہوتی تھی کہ اگلی صف میں وہ لوگ بیٹھتے تھے جو سب سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ دوسری قطار نسبتاً کم علم رکھنے والوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس کے بعد جس کو جہاں جگہ ملتی تھی وہاں بیٹھ جاتا تھا۔ اس حلقۂ درس میں شامل ہونے والے تمنا کرتے تھے کہ کب امام مدینہؒ انہیں پہلی صف میں بیٹھنے کا شرف بخشیں۔ یہ اہلِ علم کے نزدیک سب سے بڑا اعزاز تھا۔ امام شافعیؒ جب تیرہ سال کی عمر میں یہاں تشریف لائے تھے تو پہلے ہی دن آپ کو اگلی قطار میں امام مالکؒ کے سامنے بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی مگر آج مصلحتاً فرزندِ قریش پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔)

جب وہ گمنام شخص اگلی صف میں بیٹھنے کا اعزاز حاصل کرچکا تو امام مالکؒ نے اس سے پہلا سوال

کیا ''تم نے موطا پڑھی ہے؟''

گمنام شخص سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا ''میں نے موطا کا مطالعہ نہیں کیا۔'' شاید وہ اس بات سے بھی ناواقف تھا کہ اس عظیم و جلیل کتاب کا تعلق امام مالکؒ کی روایات سے ہے۔

''ابن جزیجؒ کے علم پر تمہاری نظر ہے؟'' امام مدینہؒ نے دوسرا سوال کیا ''گمنام شخص کا جواب سن کر امام مالکؒ کو تعجب سا ہوا تھا مگر آپ نے اتمامِ حجت کے لیے اس سے ابنِ جریجؒ کے بارے میں دریافت کیا۔

''نہیں۔'' گمنام شخص نے وحشت زدہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔ غالباً ابن حزیجؒ کا نام بھی اس کے لیے اجنبی تھا۔ امام مالکؒ کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

''کیا تم نے حضرت جعفر صادقؒ سے ملاقات کی ہے؟'' امام مالکؒ نے اس شخص کی لاعلمی کو نظر انداز کرتے ہوئے تیسرا سوال کیا۔

اس بار بھی وہ شخص اثبات میں جواب نہ دے سکا۔ حاضرینِ مجلس اسے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر امام مالکؒ کے ادب کے پیش نظر کسی میں بولنے کی جرات نہیں تھی۔

''پھر تم نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا؟'' امام مالکؒ کے چہرے سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ شخص خاموش رہا۔ امام مالکؒ چند لمحوں تک اس کے چہرے کو بغور دیکھتے رہے پھر آپ نے اس کے سامنے فقہ کا نیا مسئلہ پیش کرتے ہوئے جواب طلب کیا۔ امامِ مدینہؒ اس گمنام شخص کے علم کی حقیقت کو سمجھ گئے تھے مگر آپ اپنی زبان سے اس کی عدم ناواقفیت کا راز فاش کرنا نہیں چاہتے تھے۔

وہ شخص کچھ دیر تک اس طرح سر جھکائے بیٹھا رہا جیسے مسئلے کی نوعیت پر غور و فکر کر رہا ہو مگر جلد ہی اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ نہایت سراسیمگی کے عالم میں کھڑا ہوا اور شرمسار لہجے میں عرض کرنے لگا ''مجھے تو محض آپ کی عارضی قربت درکار تھی کہ کسی طرح زندگی میں یہ اعزاز حاصل ہو جائے اس لیے خاموش رہا، ورنہ حقیقتاً میں کچھ بھی نہیں جانتا۔'' اس شخص کے بے باکانہ اعتراف پر تمام حاضرینِ مجلس حیرت زدہ تھے۔

''پھر تم میرے بیان کردہ مسائل کا صحیح جواب کس طرح دے رہے تھے؟'' امام مالکؒ نے پوچھا ''آپ کو بھی اس شخص کی صاف گوئی پر سخت تعجب تھا۔



''وہاں ایک نوجوان بیٹھا ہوا ہے۔'' اس نے آخری قطار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''وہی نوجوان مجھے ہر مسئلے کا جواب بتا رہا تھا۔''

امام مالکؒ نے نظر اٹھا کر امام شافعیؒ کی جانب دیکھا مگر فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث امامِ مدینہؒ فرزندِ قریش کو نہ پہچان سکے۔ دوسرے لوگ بھی اس طرف دیکھ رہے تھے، جدھر اس شخص نے اشارہ کیا تھا پھر امام مالکؒ نے فرمایا ''تم اپنی جگہ واپس جاؤ اور اس نوجوان کو میرے پاس بھیج دو۔''

وہ شخص جیسے ہی مڑا ''امام شافعیؒ کھڑے ہو گئے اور بڑے ادب کے ساتھ چلتے ہوئے اس طرح امامِ مدینہؒ کے قریب.... آئے کہ آپ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اہلِ مجلس اس نوجوان کو دیکھتے ہی رہ گئے جس کی عمر اکیس بائیس سال تھی۔

''بیٹھ جاؤ نوجوان!'' امام مالکؒ نے بڑی شفقت سے فرمایا۔ ''آٹھ نو سال کی طویل مدت میں امام شافعیؒ کے چہرے کے نقش و نگار بڑی حد تک بدل چکے تھے اور پھر ستائیس دن تک مسلسل صحرا میں سفر کرتے کرتے لباس غبار آلود ہو گیا تھا اور سرخ و سفید رنگت سیاہی مائل ہو چلی تھی۔ اس لیے امامِ مدینہؒ اتنے قریب سے بھی اپنے عزیز شاگرد کو نہ پہچان سکے۔

''شاہا! تیرے روبرو کھڑے رہنا ہی میرا شرف ہے، میرا اعزاز ہے۔'' امام شافعیؒ کی پرسوز آواز سن کر اہلِ مجلس چونک اٹھے عجیب صدا تھی، عجیب آہنگ تھا۔

امام مالکؒ نے غور سے فرزندِ قریش کی طرف دیکھا۔ مجلس کا سکوت کچھ اور بڑھ گیا۔ امامِ مدینہؒ اتنے انہماک سے اس نوجوان کو دیکھ رہے تھے جیسے آپ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو گئے ہوں۔ حاضرین نے محسوس کیا جیسے وقت کی رفتار تھم سی گئی ہو پھر امام مالکؒ اچانک مضطرب نظر آنے لگے

''فرزند! یہ تم ہو؟'' امامِ مدینہؒ شدتِ جذبات میں کرسی سے نیچے اتر آئے۔

''جی ہاں! یہ میں ہوں محمد بن ادریس، مالک بن انسؒ کا غلام۔'' یہ کہتے کہتے امام شافعیؒ کا سر عقیدت سے خم ہو گیا۔

پھر اہلِ مجلس نے دیکھا کہ جس مردِ جلیل کی ہیبت سے لوگوں کی نگاہیں فرش پر جمی رہتی تھیں، وہ امام شافعیؒ کو اپنے سینے سے لگائے کہہ رہا تھا ''فرزند! وقت کی تیز دھوپ نے تیرے چہرے کی شادابی چھین لی مگر آواز تو وہی ہے، دلوں کو پگھلا دینے والی آواز، آنکھوں کو رلا دینے والی آواز۔'' یہ کہہ کر امامِ مدینہؒ نے امام شافعیؒ کو کرسی پر بٹھانا چاہا مگر فرزندِ قریش کو یہ کس طرح گوارا ہوتا؟ آپ امام مالکؒ

کے دائیں جانب کھڑے ہو گئے۔

پھر امامِ مدینہؒ نے فرمایا ''فرزند! علم کا جو باب ہم شروع کر چکے ہیں، تم اسے مکمل کرو۔''

امام مالکؒ کا حکم پاتے ہی امام شافعیؒ نے تقریباً چار سو مسائل پیش کیے مگر حاضرین میں سے کوئی شخص بھی ان کا جواب نہ دے سکا۔ امام مدینہؒ بار بار فرزندِ قریش کی طرف ستائشی نظروں سے دیکھتے تھے اور جب اس نوجوان طالب علم نے جہاندیدہ افراد کو بھی اپنی بے پناہ ذہانت سے عاجز کر دیا تو امام مالکؒ بے ساختہ پکار اٹھے ''محمد! خدا تمہارے دل و دماغ کو مزید روشن کر دے کہ تم ہی علم کے وارث ہو...... تم ہی میرے جانشین ہو۔'' یہ کہہ کر امامِ مدینہؒ اٹھے اور امام شافعیؒ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہی ہاتھ جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ!
غالب وکار آفریں، کار کشا، کارساز

اسی وقت موذن کی آواز سنائی دی اور امام مالکؒ، امام شافعیؒ کو لیے ہوئے اسی طرح مسجد نبوی میں داخل ہوئے کہ آپ کا دستِ محبت فرزندِ قریش کے دوش پر تھا جس نے یہ منظر دیکھا، دیکھتا ہی رہ گیا۔ بہت سے لوگوں کے دل میں حسرت ہی رہ گئی کہ کاش انہیں بھی امام مالکؒ سے اتنی ہی قربت میسر آ جاتی۔ مگر یہ کس طرح ممکن تھا۔

عشق کی چوٹ تو پڑتی ہے دلوں پر یکساں
ظرف کے فرق سے آواز بدل جاتی ہے

آرزوؤں کے چراغ تو ہر دل میں فروزاں تھے لیکن کسی سینے میں محمد بن ادریسؒ کی طرح علم کی آگ روشن نہیں تھی۔ منتظرِ کرم تو ہزاروں تھے مگر ان میں شافعیؒ کی طرح مانگنے والا کوئی نہیں تھا۔ امام مالکؒ نے اسے وہی دیا جس کا وہ طلب گار تھا۔

نمازِ مغرب کے بعد امامِ مدینہؒ اسی طرح مسجد سے باہر تشریف لائے اور امام شافعیؒ کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ فرزندِ قریش کی تو آمد کا مقصد ہی یہ تھا، امام مالکؒ نے عزت افزائی کی تو سر جھکا دیا۔ راستے میں زیادہ تر خاموشی رہی۔ کبھی کبھی امامِ مدینہؒ کچھ دریافت کرتے تو امام شافعیؒ مختصر جواب دے کر چپ ہو جاتے۔ آپ کی ہمیشہ کی عادت تھی کہ گفتگو میں اختصار سے کام لیتے اور احترامِ استاد کے پیشِ نظر بلا ضرورت ایک لفظ بھی زبان پر نہ لاتے۔ اس وقت بھی امام شافعیؒ کی یہی کیفیت تھی مگر



دل میں جذبات کا سمندر موجزن تھا۔ بغداد میں جس نوجوان نے امام شافعیؒ کو خبر دی تھی کہ امام مالکؒ اب بہت زیادہ دولت مند ہو گئے ہیں، اس کی بات میں سچائی نظر آ رہی تھی۔ امام مدینہؒ کے قیمتی لباس پر آسودہ حالی کے واضح نشانات موجود تھے اور امام شافعیؒ نے یہی دیکھنے کے لیے اتنا طویل سفر اختیار کیا تھا کہ امارت و خوش حالی کے دور میں امام مالکؒ شب و روز کیسے گزرتے ہیں؟

اچانک امام مدینہؒ ایک عالی شان مکان کے سامنے ٹھہر گئے۔ امام شافعیؒ نے چونک کر دیکھا۔ یہ کوئی اور جگہ تھی۔ آٹھ نو سال پہلے آپ جس مکان میں امام مالکؒ کے مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے تھے، وہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ فرزندِ قریش نے کچھ دیر کے لیے تصور کر لیا کہ امام مدینہؒ کسی دوسرے شخص کی اقامت گاہ پر تشریف لائے ہیں لیکن جب امام مالکؒ نے پکار کر کہا ''محمد! اندر چلو۔ یہی مکان ہے۔'' تو امام شافعیؒ حیرت زدہ رہ گئے۔ پرانے کھنڈر کی جگہ اب ایک شاندار عمارت نظر آ رہی تھی۔ امام شافعیؒ کو ایک بار پھر عراقی نوجوان کے الفاظ کی بازگشت سنائی دینے لگی ''امام مالکؒ بہت زیادہ دولت مند ہو گئے ہیں۔'' اور اس امیری کے آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ امام شافعیؒ کے قدم جم کر رہ گئے۔

''فرزند! کیا سوچ رہے ہو؟ تم اندر کیوں نہیں چلتے؟'' امام مالکؒ نے دوبارہ فرمایا مگر امام شافعیؒ نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور نہ کوئی جواب دیا ''بس خاموشی سے اس عمارت کو دیکھتے رہے جو امام مالکؒ جیسے پرہیز گار انسان کی نئی قیام گاہ تھی۔

''محمد! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' امام مالکؒ جو دروازے میں داخل ہو چکے تھے، امام شافعیؒ کو ساکت و جامد دیکھ کر پلٹ آئے۔ قریب پہنچ کر اپنے شاگرد کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالی۔ پھر افسردہ لہجے میں فرمانے لگے ''فرزند! تم رو رہے ہو؟''

امام شافعیؒ بدستور خاموش رہے ''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے دنیا کے بدلے آخرت بیچ دی ہے؟'' اب امام مالک کی آواز بھی جذباتی ہو گئی تھی۔

''یہی اندیشے میرے ذہن کو مسلسل پریشان کر رہے ہیں۔'' آخر امام شافعیؒ نے لب کشائی کی ''ان ہی اندیشوں نے مجھے بغداد میں بھی چین سے رہنے نہیں دیا۔ لوگ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ تمہارے استادِ گرامی دولت مند ہو گئے ہیں اور اب میں ہر طرف دولت کے مظاہرے دیکھ رہا ہوں۔'' امام شافعی کی آواز اس قدر رقت انگیز تھی کہ ایک ایک لفظ سے دل کا درد جھلک رہا تھا۔

"محمد! تمہارے دل کو سکون حاصل ہو اور آنکھیں ٹھنڈی رہیں، تمہارا استاد مالکؒ اسی مقام پر ہے۔ خوفِ خدا بھی وہی ہے۔ اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی، جذبہ بھی وہی، دل بھی وہی، مکان بھی وہی، مکین بھی وہی۔ ظاہری حالت سے باطن کا اندازہ نہ کرو۔ آؤ اندر چلو۔" یہ کہہ کر امام مدینہؒ نے فرزندِ قریش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مکان میں داخل ہو گئے۔

روشنی میں امام مالکؒ نے امام شافعیؒ کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا۔ امامِ مدینہؒ بے قرار ہو کر کہنے لگے "جو کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے، سب ہدیہ ہے۔ خراسان سے۔ مصر سے، دنیا کے دور دراز گوشوں سے لوگ مسلسل نذر بھیج رہے ہیں۔ یاد رکھو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ہدیہ قبول فرما لیتے تھے اور صدقہ رد کر دیتے تھے۔ اس وقت میرے پاس بہترین کپڑے کے تین سو خلعت موجود ہیں اور اب یہ سب کچھ تمہاری نذر ہے۔ صندوقوں میں دینار بھرے ہوئے ہیں۔ سالانہ زکوۃ نکالتا ہوں۔ اس سے بھی نصف رقم تمہاری ہے۔" امام مالک نے اپنی شانِ امارات کی وضاحت کی تو امام شافعیؒ کے دل کا بوجھ اتر گیا مگر پھر بھی ذہن پر ایک غبار سا چھایا رہا۔

اس کے بعد فرزندِ قریش کے سامنے دستر خوان بچھایا گیا۔ جب امام مالکؒ کے غلاموں نے پر تکلف کھانے لا کر رکھے تو ایک بار پھر امام شافعیؒ مضطرب سے نظر آنے لگے۔ کہاں وہ زمانہ کہ اسی دستر خوان پر امامِ مدینہؒ اور ان کا ایک مہمان شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھا سکتے تھے اور کہاں یہ دور کہ امام شافعیؒ کے آگے انواع واقسام کی نعمتیں سجی ہوئی تھیں۔ "محمد! انسان کو ہر حال میں اپنے خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔" اچانک امام مدینہؒ کی بارعب آواز گونجی "فاقہ کشی بھی اسی کے لیے تھی اور آسودہ حالی بھی اسی کے لیے ہے۔" امام مالک نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے فرمایا "بسم اللہ کرو۔" امام مدینہؒ نے امام شافعیؒ کی فکر آمیز خاموشی کا مفہوم سمجھ لیا تھا، اس لیے... در پردہ آپ نے ان تمام سوالوں کے جواب دے دیا تھا جو فرزندِ قریش کے ذہن کو مسلسل پریشان کر رہے تھے۔ امام شافعیؒ ماضی سے گزر کر حال میں لوٹ آئے اور سر جھکا کر کھانا کھانے لگے۔

پھر عشا کا وقت آ گیا۔ امام شافعیؒ نے امام مالکؒ کے ساتھ نماز ادا کی۔ طویل سفر کی تھکن سے آپ کا بدن چور چور تھا مگر زبان سے اس تکلیف کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ امامِ مدینہؒ بہت پہلے ہی آپ کی اس کیفیت کا اندازہ کر چکے تھے۔ نماز ختم ہوتے ہی امام مالکؒ نے فرمایا "فرزند! اب تم آرام کرو۔ انشاء اللہ! صبح تفصیلی گفتگو ہو گی۔" یہ کہہ کر امام مالکؒ رخصت ہو گئے۔



نرم و گداز بستر امام شافعیؒ کے جسم کے لیے بڑا سکون بخش تھا لیکن دل و دماغ پر اب بھی وہی گرانی تھی۔ آپ بار بار امام مالکؒ کی امیرانہ زندگی کے متعلق سوچتے تھے اور پریشان سے ہو جاتے تھے کہ کہیں کثرتِ مال کے سبب استادِ گرامی کی زندگی میں کوئی انقلاب نہ آ گیا ہو۔ آخر اسی ذہنی کشمکش میں بہت دیر تک جاگتے رہے پھر غور کرتے کرتے تھک گئے تو بوجھل اعصاب فرزندِ قریش کی نیند کو وادی میں لے گئے۔

صبح امام شافعیؒ اپنے وقت پر بیدار ہوئے اور حسبِ دستور امام مالکؒ کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی۔ جب واپس آئے تو مکان کے دروازے پر خراسانی گھوڑے کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی امام شافعیؒ بے اختیار پکار اٹھے "ایسے خوب صورت جانور تو میں نے آج تک نہیں دیکھے؟"

"یہ سب جانور بھی تمہاری نذر ہیں۔" امام مدینہؒ نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا "محمد! میرے پاس جو کچھ ہے، وہ سب تمہارا ہے۔"

"کم سے کم ایک گھوڑا تو اپنے لیے رہنے دیجیے۔" امام شافعیؒ نے ادب سے کہا۔

"فرزند! مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں اپنی سواری سے اس زمین کو پامال کروں جس کے نیچے میرے آقا محوِ خواب ہیں۔" یہ کہتے کہتے امام مدینہؒ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

اب امام شافعیؒ کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ جن اندیشوں کی مسلسل یلغار نے دماغی سکون چھین لیا تھا، وہ زائل ہوئے تو فرزندِ قریش بھی رو پڑے "خدا کی قسم! دولت کے ذخائر بھی میرے امامؒ کو نہ بدل سکے۔ آسائشوں کے ہجوم میں بھی وہی تقویٰ ہے، وہی درد ہے، وہی گداز ہے۔" یہ کہہ کر آپ امامِ مدینہؒ کے قدموں سے لپٹ گئے "شاہا! تیرے کردار کی دلیل سامنے نہ ہوتو غلام بھٹک جائیں۔" امام شافعیؒ زار و قطار رو رہے تھے۔ بغداد کی ہواؤں سے جو غبار آپ کے ذہن میں اٹھا تھا، اسے مدینہ کی بارشِ کرم نے دھو دیا تھا۔

آپ تین دن تک امام مالکؒ کے مہمان رہے، چوتھے دن مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کی جانب اس طرح روانہ ہوئے کہ آپ کے آگے پیچھے خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کے انبار تھے۔ امام شافعیؒ نے روانگی سے پہلے ہی ایک آدمی مکے بھیج دیا تھا کہ وہ مادرِ گرامی کو آپ کی آمد کی خبر دے دے۔ نتیجتاً جب امام شافعیؒ حدودِ حرم میں پہنچے تو والدہ محترمہ چند عورتوں کے ہمراہ نظر آئیں۔ ابھی ایک ماں اور بیٹے کے درمیان کافی فاصلہ تھا مگر امام شافعیؒ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ مادرِ مہربان کو دیکھتے ہی

گھوڑے سے اتر پڑے اور دیوانہ وار دوڑتے ہوئے اس آغوشِ محبت میں سما گئے جو روئے زمین پر آپ کے لیے سب سے زیادہ محترم تھی۔ ایک جاں گداز لمحہ تھا جس نے اس بلند حوصلہ خاتون کو بھی رلا دیا تھا جو مسلسل آٹھ سال سے آتشِ فراق میں جل رہی تھی اور کبھی کسی پر اپنے غم کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ بہت دیر بعد امام شافعیؒ مادرِ مہربان کے سینے سے الگ ہوئے تو دوسری عورت نے آپ کو گلے لگالیا۔ فرزندِ قریش بچپن ہی سے اس عورت سے بہت مانوس تھے اور والدہ محترمہ کے بعد آپ اسی خاتون کو سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ بوڑھی عورت نے جوشِ محبت میں امام شافعیؒ کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

موت تیری ماں کو بہا کر نہیں لے سکی
مامتا میں ہر دل تیری ماں ہے

امام شافعیؒ فرماتے ہیں "یہ پہلا لفظ تھا جو مکے کی سرزمین پر میرے کانوں نے سنا۔"

جذبات کی یہ رقت انگیز رو گزرنے کے بعد امام شافعیؒ نے آگے بڑھنا چاہا لیکن مادرِ گرامی نے آپ کو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے پوچھا "محمد! کہاں جا رہے ہو؟"

"اپنے مکان پر جس کے در و دیوار سے بچھڑے ہوئے آٹھ سال ہو چکے ہیں۔" امامؒ نے بڑے والہانہ انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

"افسوس!" مادرِ گرامی نے اداس لہجے میں کہا "تجھے اپنا ماضی یاد نہیں؟ کل تو مکے سے فقیروں کے لباس میں نکلا تھا اور آج امرا کی خلعت پہن کر واپس آیا ہے۔ یہ قیمتی لباس، یہ سیم و زر کے انبار، یہ شاندار سواریاں، کیا اس لیے ہیں کہ تو اپنے چچازاد بھائیوں پر برتری حاصل کرے، اہلِ شہر کے سامنے فخر و غرور کا مظاہرہ کرے۔" مادرِ گرامی کی آواز شدتِ جذبات سے لرز رہی تھی۔

"خدا علیم و خبیر ہے کہ آپ کے بیٹے کو یہ بیماری چھو کر بھی نہیں گزری۔" امام شافعیؒ اچانک پریشان نظر آنے لگے تھے "وہ کسی انسان کے سامنے نخوت و غرور کا کیا مظاہرہ کرے گا جو اللہ کی کبریائی پر یقین رکھتا ہے اور جسے بہرحال لوٹ کر اپنے خالق کی طرف جانا ہے۔ پھر بھی آپ بتائیں، میں کیا کروں؟"

"ان چیزوں کے استعمال کے بارے میں سوچنا ہی کیا؟" مادرِ گرامی بہت زیادہ پرجوش نظر آرہی تھیں۔ بیٹے سے مخاطب ہو کر فرمانے لگیں "بھوکے آئیں اور شکم کی آگ بجھائیں۔ بے لباس



آئیں اور امیرانہ خلعت سے اپنے بدن چھپائیں، پیادہ آئیں اور سواریوں پر واپس چلے جائیں۔ اس طرح دنیا میں بھی تیری آبرو رہے گی اور آخرت میں بھی خدا کی رحمتیں تجھ پر سایہ فگن ہوں گی۔"

امام شافعیؒ نے مادرِ مہربان کے حکم پر اس طرح عمل کیا کہ گھر پہنچتے پہنچتے آپ کے پاس پچاس دینار اور ایک گھوڑے کے سوا کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ اتفاق سے مکان کے قریب امامؒ کے ہاتھ سے کوڑا گر گیا۔ ایک کنیز جو پیچھے پیچھے چل رہی تھی، اس نے بڑی تیزی کا مظاہرہ کیا اور کوڑا اٹھا کر امامؒ کو پیش کر دیا۔ اگرچہ یہ معمولی بات تھی لیکن امامؒ کی غیرت نے کنیز کے اس احسان کو بھی گوارا نہیں کیا۔ آپ نے فوراً ہی کنیز کو انعام دینے کے لیے پانچ دینار نکالے۔

"محمد! یہ کیا ہے؟" اس سے پہلے کہ آپ کنیز کو انعام دیتے، مادرِ گرامی درمیان میں ہی بول پڑیں۔

"میں اس عورت کی خدمت کے صلے میں کچھ انعام دینا چاہتا ہوں۔" امامؒ نے نظریں جھکائے ہوئے عاجزی سے کہا۔

"یہ احتیاط اور تکلف کیوں؟ جو کچھ تیرے پاس ہے، سب دے دے۔" مادرِ گرامی نے بے نیازانہ کہا۔ اہلِ نظر غور کریں۔ یہ اس خاتون کا طرزِ عمل تھا جس کی زندگی گزشتہ چوبیس سال سے شدید غربت و افلاس کی لپیٹ میں تھی۔ دوسروں کے اداس چہرے آپ کی نظر میں تھے مگر اپنے شکستہ دل کی خبر نہیں تھی۔ یہ عجیب تغافل تھا، عجیب توجہ تھی۔ اہلِ دل اس نکتے کو محسوس کریں تو امام شافعیؒ کی قلندرانہ فطرت کا راز ان کی سمجھ میں آجائے گا۔ اور پھر یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے گی کہ اس لالہ صحرائی کی حنابندی کسی معمولی عورت نے نہیں، اس عظیم خاتون نے کی تھی جس کا نام فاطمہ بنت عبداللہ تھا۔

اس مرحلے سے گزرنے کے بعد امام شافعیؒ اپنے گھر پہنچے اور مکے میں پہلی رات بسر کرنے سے پہلے ہی مقروض ہو گئے مگر اس واقعے کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ یہاں تک کہ امام مالکؒ کو بھی خبر ہو گئی۔ امام مدینہؒ نے فوراً ہی آپ کو خط لکھا۔

"فرزند! میں تم سے یہی حسنِ ظن رکھتا تھا۔ خدا تمہارے حوصلوں کو بلند رکھے اور تم صراطِ مستقیم پر اسی طرح گامزن رہو۔ دنیا کے نشاط و غم سب عارضی ہیں۔ خدا اپنے بندوں کا خود کفیل ہے۔ اہلِ یقین اس کے کرم کے سوا کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔ میں نے تمہیں جس قدر مدینے میں دیا تھا اتنا ہی

ہر سال بھیجتا رہوں گا اور پھر امام مدینہؒ ہر سال گیارہ ہزار دینار اور دیگر تحائف بھیجتے رہے۔

امام شافعیؒ چاہتے تو اس کثیر رقم کے سہارے امیرانہ زندگی گزار سکتے تھے مگر وہ مردِ قلندر زیادہ دیر تک دولت کے اس بوجھ کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ جیسے ہی امام مدینہؒ کی طرف سے سامانِ آسائش موصول ہوتا، فرزندِ قریش اسے اہلِ علم اور ضرورت مندوں میں لٹا دیتے۔ امام مدینہؒ کی نوازشات اور امام شافعیؒ کی سخاوت کا یہ سلسلہ گیارہ سال تک جاری رہا۔

اور پھر ایک دن کسی نے پکار کر کہا ''محمد! تمہارے استاد امام مالکؒ دنیا سے رخصت ہوگئے۔'' یہ ایک خارا شگاف چیخ تھی جس سے پورا صحرائے عرب گونج رہا تھا۔ امام شافعیؒ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔

☆☆☆

امام مالکؒ زیرِ خاک کیا سوئے کہ علم نے دنیا سے پیٹھ موڑ لی، اہلِ نظر بے اختیار ہوئے تو ان کے دلوں سے شورِ فغاں اٹھا۔ اہلِ دل نے ضبط کیا تو ان کے سینے چاک ہوگئے، امام شافعیؒ اپنے ہوش ہی میں نہیں تھے۔ آپ کی اشکبار نگاہوں کے سامنے بار بار وہ منظر آتا تھا جب امام مدینہ باب النبی ﷺ سے نمودار ہوتے تھے اور پوری مسجد ایک خالص خوشبو سے مہک اٹھتی تھی۔

''خدا کی قسم! اب کوئی اس طرح مسجد نبویؐ میں داخل نہیں ہوگا۔'' امام شافعیؒ کے ہونٹوں سے آہِ سرد نکل گئی۔

پھر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی، دھندلی آنکھوں کے سامنے دوسرا منظر ابھرا، امام مالکؒ مسندِ درس پر جلوہ افروز ہیں اور بڑے والہانہ انداز میں حدیثِ رسولؐ بیان فرما رہے ہیں ''مجھ سے نافعؒ نے ابن عمرؓ کے حوالے سے صاحبِ قبرؐ کی یہ روایت بیان کی ہے۔'' یہ کہہ کر امام مالکؒ اپنا دایاں ہاتھ پھیلا دیتے ہیں اور ایک جاں نثار کی مانند رسالت مآب ﷺ کی قبر مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

''خدا کی قسم! آج کے بعد زمین و آسمان ایسا کوئی دوسرا حدیث بیان کرنے والا نہیں دیکھیں گے۔'' امام شافعیؒ کی آواز شدتِ غم سے لرز رہی تھی۔

پھر ایک اور جانگداز منظر تصورات کے افق پر ابھرا، امام مدینہ نادر و نایاب خراسانی گھوڑے امام شافعیؒ کی نذر کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں ''فرزند! مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں اپنی سواری سے اس زمین کو پامال کروں جس کے نیچے میرے آقاؐ محوِ خواب ہیں۔''



''خدا کی قسم! حشر تک عاشقوں کے بے شمار قافلے مدینے کی طرف آئیں گے اور خاکِ دیارِ رسولؐ کو بوسہ دے کر واپس چلے جائیں گے مگر ان میں مالک بن انسؒ کی طرح اپنے آقاؐ کا احترام کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔'' یہ کہتے کہتے امام شافعیؒ کی آواز ڈوبنے لگی۔

پھر کسی نے سرورِ کونینؐ کی حدیث تلاوت کی۔ ''عنقریب لوگ علم کی طلب میں سفر کرکے اونٹوں کے جگر پگھلا دیں گے پھر بھی انہیں عالم مدینہ سے بہتر کوئی عالم نہ مل سکے گا۔''

''خدا کی قسم! انسانی آنکھ نے مالک بن انسؒ جیسا کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔'' امام شافعیؒ کی آواز نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا، اب صرف شدتِ غم سے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

پھر فرزندِ قریش کا کئی دن تک یہی حال رہا، اشک بہتے رہے اور دامن بھیگتا رہا، کوئی غم گسار تسکین آمیز کلمات کہتا تو امام شافعیؒ جواباً فرماتے۔ ''اگر زمین پر بسنے والے یہ اندازہ کرلیں کہ وہ کس نقصانِ عظیم سے دوچار ہوئے ہیں تو پھر ان کے چہروں کی رنگت بدل جائے، آنکھیں اشک ریزی کرتے کرتے بے خواب ہوجائیں اور ہونٹ مسکرانا چھوڑ دیں۔''

پھر مخالفین امام شافعیؒ کی یہ حالتِ زار دیکھ کر اذیت ناک باتیں کرنے لگے ''محمد بن ادریس اس لیے روتے ہیں کہ ان کی کفالت کرنے والا دنیا سے چلا گیا۔ اب انہیں ہر سال اتنے گراں بہا تحائف کون بھیجے گا؟ اب ان کے گھر کی دیواروں پر غربت و افلاس دوبارہ سایہ فگن ہوجائیں گے۔ امام شافعیؒ ماضی کی ان ہی آسائشوں کا ماتم کررہے ہیں۔'' مخالفین کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ میں بڑی جارحیت پوشیدہ تھی بڑی تلخی پنہاں تھی۔

امام شافعیؒ خاموش رہے، آپ بچپن ہی سے زبردست قوتِ برداشت کے مالک تھے۔ نکتہ چینوں کا جو نشتر بھی آپ کے جسم کی طرف آیا ٹوٹ گیا۔ بدخواہوں کے جس تیر نے بھی علم اور تقوے کی چٹان کا رخ کیا، اپنا اثر کھو بیٹھا یا مڑ کر کسی دوسری سمت چلا گیا، تمام کم نظر ظاہری سود و زیاں کا حساب کررہے تھے انہیں دل کی تباہی کا اندازہ نہیں تھا۔ پھر اس سوگوار فضا میں کئی دن گزر گئے امام شافعیؒ کے تمام علمی مشاغل چھوٹ گئے تھے، آپ بار بار مدینہ منورہ کی جانب رخ کرکے مسلسل کسی غیر مرئی شے کو دیکھتے رہتے، امامؒ کا یہ انہماک دیکھ کر کبھی کبھی کوئی ہمدرد پوچھ لیتا۔

''امام! کس کا انتظار ہے؟''

''ہوائے مدینہ کا۔'' امام شافعیؒ نہایت آزردہ لہجے میں جواب دیتے۔ ''نسیم و صبا کا جو دیارِ رسولؐ کو

چھو کر مجھ تک پہنچتی ہیں۔''

''کیا وہ ہوائیں اب تک نہیں آئیں؟'' یہ کہتے کہتے غم گساروں کا لہجہ بھی اداس ہو جاتا۔

''روز آتی ہیں مگر اب ان میں میرے استادِ گرامی کے پیرہن کی خوشبو شامل نہیں ہوتی۔'' امام شافعیؒ اس طرح اپنے دل کا درد بیان کرتے کہ سننے والوں کی آنکھیں بھی نم ہو جاتیں۔

''پھر کب تک انتظار کرو گے؟'' کسی نے آہستہ سے کہا۔ ''مالک بن انسؒ کا جسم تو خاک میں مل چکا اب پیرہن کی خوشبو کہاں سے آئے گی؟''

''وہ خوشبو ہواؤں کی پابند نہیں۔'' شکستگی کے باوجود امام شافعیؒ کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ ابھر آیا تھا۔ وہ خوشبو تو میرے مشامِ جاں میں اتر گئی ہے۔

''پھر کیوں اداس بیٹھے ہو؟'' کوئی دوسرا ہمدرد سوال کرتا ''مالک بن انسؒ کی خوشبو تو ہر وقت تمہارے ساتھ ہے۔''

''وہ خوشبو تو قبر میں بھی میرے ساتھ جائے گی۔'' امام شافعیؒ کے لہجے کی افسردگی بدستور تھی۔ ''میں تو ہواؤں کی سرگوشیاں سنتا ہوں، ہوائیں مجھے امام مالکؒ کا پیغام پہنچایا کرتی تھیں وہ ہی پیغام کہ فرزند! میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے۔ مادرِ گرامی کے بعد وہ امام مدینہؒ ہی تھے جو فرزند کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ زمین و آسمان وہی ہیں، مکیں و مکان وہیں ہیں۔ سب کچھ وہی ہے بس ایک وہ شخص نہیں ہے جو فرزند کہہ کر اس طرح آواز دے کہ اس لفظ کا حق ادا ہو جائے۔ خدا امامِ مدینہؒ کی قبر کو نور سے بھر دے کہ ان کے بعد اس دنیا میں بڑا اندھیرا ہے۔''

پھر تمام غم گسار چلے گئے اور امام شافعیؒ تنہا رہ گئے، فرزندِ قریش کی آنکھوں کے سامنے امام مدینہؒ کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ مجسم ہوتا رہا۔ ایک ایک یاد نورانی پیکر میں ڈھلتی رہی، جذبات کا یہ سیلاب اتنا شدید تھا کہ امام شافعیؒ بہت دن تک اس کے حصار سے باہر نہیں نکل سکے، مدینے کی ہوائیں آتیں اور فرزندِ قریش کو رلا کر گزر جاتیں، لوگوں نے ایک بار پھر طعنہ زنی کی۔

''محمد بن ادریس اس لیے روتے ہیں کہ ان کی اقتصادی پناہ گاہ تباہ ہو گئی۔''

اب کی بار امام شافعیؒ خاموش نہ رہ سکے۔ ''ہاں میں اس مردِ جلیل کے لیے روتا ہوں جس کی نظروں میں شاہانِ وقت کی کوئی حیثیت نہیں تھی جس نے گیارہ سال تک مجھ پر اتنی دولت لٹائی کہ اہلِ دنیا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بے شک وہ عالمِ اسباب میں میرے کفیل تھے کبھی مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے



دینار و درہم کے ذخائر کہاں خرچ کیے؟ اگر میں اس شخص کے الطاف و کرم یاد کر کے آنسو نہ بہاؤں تو یہ کیسی احسان ناشناسی ہو گی، اہلِ غرض نے میرے مادی وسائل کی موت پر نظر کی مگر کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ دنیا سے کون گزر گیا؟ لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ شافعیؒ کے مفلس ہو جانے کا ماتم نہ کرو، یہ دیکھو کہ آج ساری کائنات تہی دست ہو گئی ہے۔ دماغوں کو متاثر کرنے والے بہت آئیں گے مگر وہ تو دلوں کا تاجدار تھا، جذبوں کا حکمران تھا، روحوں پر اس کی حکومت تھی۔ بزمِ حیات ہر دور میں نئے انداز سے آراستہ ہو گی، مقتلِ ہستی سے بڑے بڑے جانفروش گزریں گے مگر خاک مدینہ کو اس طرح اپنے جسم پر سجانے والا اب کوئی دوسرا نہیں آئے گا۔ علم و آگہی کی تلاش میں در بدر پھرنے والو! تمہیں نہیں معلوم کہ آج علمِ حجازی دنیا سے رخصت ہو گیا، میں اسی کی یاد میں آنسو بہاتا ہوں۔ تم بھی مالک بن انسؒ کے غم میں اپنی آنکھوں کو نم کرو کہ شاید خدا امام مدینہؒ کی نسبت سے تمہاری کثیف روحوں کو روشن کر دے۔''

جب یہ طوفانِ رنج و الم گزر گیا اور اس جانگداز واقعے کی شدت کم ہو گئی تو امام شافعیؒ نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ ہر طرف غربت اور افلاس کی ہولناکیاں اس طرح نمایاں تھیں کہ فرزندِ قریش کو ایک وقت کی خوراک بھی میسر نہ تھی۔ امام مالکؒ کی بے پناہ نوازشات نے ایک لمحے کے لیے بھی آپ کو غمِ دوراں کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا تھا، جس شخص کو گیارہ ہزار دینار سالانہ ملتے ہوں، وہ اس کثیر رقم کے سہارے امیرانہ زندگی بسر کر سکتا تھا، مگر امام شافعیؒ فطرتاً قلندر تھے اس لیے ہمیشہ ہی اپنی آسائشوں پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیتے رہے، نتیجتاً امام مالکؒ کے دیے ہوئے عطیات کو اس طرح لٹاتے رہے کہ اگر شام کو رقم فراہم ہوئی تو صبح تک کچھ باقی نہ رہتا...... اور اگر صبح کو دولت کا یہ ذخیرہ حاصل ہوتا تو شام تک امام شافعیؒ کا دامن خالی ہو جاتا، یہی وہ غیر معمولی فیاضی تھی جس کے باعث فرزندِ قریش کو تنگ دستی ہر وقت گھیرے رہتی تھی، امام مالکؒ کو فرزندِ قریش کی سخاوت کی خبریں مسلسل پہنچتی رہتیں۔ امامِ مدینہؒ کے بعض شاگرد امام شافعیؒ کے اس عمل کو فضول خرچی سے تعبیر کرتے اور امام مالکؒ کو دبی زبان سے مشورہ دیتے۔

''آپ ایک ایسے نوجوان پر دولت کے انبار ضائع کر رہے ہیں جسے مادی وسائل کی اہمیت کا احساس تک نہیں۔''

شاگردوں کے اس مشورے میں یہ خواہش بھی پوشیدہ ہوتی کہ امام مدینہؒ فرزندِ قریش کی اس دریا دلی سے تنگ آ کر روش بدل دیں۔ مگر امام مالکؒ نے اس سلسلے میں امام شافعیؒ سے کبھی بازپرس نہیں

کی آپ اعتراض کرنے والوں کو یہ کہہ کر خاموش کر دیتے۔

''شافعیؒ جو کچھ کرتا ہے' اسے کرنے دو'' پھر فوراً ہی امام شافعیؒ کو خط لکھ کر حوصلہ افزائی کرتے۔

''فرزند! فکر نہ کرو میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے میں ہر سال اتنا ہی بھیجتا رہوں گا۔''

امام مالکؒ کی اس مثالی محبت نے امام شافعیؒ کو کبھی کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا' بالفرض اگر امامؒ محتاط ہونے کی کوشش بھی کرتے تو اپنی قلندرانہ فطرت کے باعث اس پر عمل نہیں کر سکتے تھے' انجام کار جو کچھ امامِ مدینہؒ کی طرف سے ملتا رہا' اسے بندگانِ خدا میں تقسیم کرتے رہے۔ پھر جب امام مالکؒ دنیا سے رخصت ہو گئے تو امام شافعیؒ پر خوش حال معیشت کا یہ باب بھی بند ہو گیا اگر اہلِ نظر حالات پر ذرا بھی غور کریں تو انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ فرزندِ قریش کی زندگی میں یہ گیارہ سال بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس طویل عرصے میں امام شافعیؒ فکرِ معاش سے یکسر آزاد رہے اور آپ نے پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے علمی مشاغل جاری رکھے۔ ایک عام انسان یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتا کہ اگر امام مالکؒ کی پشت پناہی حاصل نہ ہوتی تو امام شافعیؒ کی علمی سرگرمیاں ختم ہو جاتیں کیوں کہ فرزندِ قریش کی بلند حوصلگی اس قیاس آرائی کی نفی کرتی ہے۔ امام شافعیؒ تو وہ تھے کہ آپ کی عالی ہمتی کی دلیل پیش کرنے کے لیے ہمیں الفاظ کی ایک طویل فہرست تیار کرنی ہوگی پھر کہیں ہم فرزندِ قریش کے عزم کی بلندی کا ہلکا سا عکس دیکھ سکیں گے۔ امام شافعیؒ کو تو مسلسل فاقہ کشی بھی حصولِ علم سے باز نہ رکھ سکی' دراصل علم ہی امام کی بھوک تھی' علم ہی غذا لیکن پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ اگر فرزندِ قریش کی زندگی میں امامِ مدینہؒ کی عنایات شامل نہ ہوتیں تو اس فقیہہ جلیل کو بڑے دشوار مرحلوں سے گزرنا پڑتا۔ بے شک! امام مالکؒ کا التفات خاص ایک مضبوط سائبان تھا جس نے امام شافعیؒ کو مسائل کی بارش اور سنگِ حوادث سے گیارہ سال تک محفوظ رکھا۔ یہ امام مدینہ کا علم کی دنیا پر احسانِ عظیم تھا اور اسی وجہ امام شافعیؒ امام مالکؒ کو اپنا محسنِ عظیم کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

آج وہی محسنِ عظیم زیرِ خاک سو رہا تھا۔ اور امام شافعیؒ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے کسی روزگار کی تلاش میں سرگرداں تھے' امامؒ کی غیرت کا یہ عالم تھا کہ کسی کے سامنے اپنی پریشانیاں بیان کرنا تو کجا کبھی آنکھوں میں عکسِ سوال نہیں ابھرا' یہ اسی غیرت مندی کا نتیجہ تھا کہ بہت دنوں تک قریبی دوستوں کو بھی پتہ نہیں چلا کہ امامؒ پر کیا گزر رہی ہے؟ کیسا عجیب تھا وہ شخص جس نے دنیا والوں پر لاکھوں دنیا لٹائے اور خود تہی دامن رہا جس نے پیادہ پا لوگوں کو خراسانی گھوڑے بخشے اور خود مکے کی گلیوں میں گھاٹیوں میں پیدل پھرا۔ جس نے دریدہ لباسوں کو قبائے زرنگار پہنائی اور خود اپنے پیرہن کو پیوند سے سجاتا رہا۔ جس



نے بے گانوں کے غم میں رفیقوں سے بڑھ کر شرکت کی اور خود اپنے مصائب سے بے خبر رہا۔ آج وہی مردِ قلندر سانسوں کا رشتہ بحال رکھنے کے لیے معاش کی جستجو کر رہا تھا مگر اہلِ مکہ اس کی نگاہوں کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے یا سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر کسی اہلِ دل نے امامؒ کے کرب کو محسوس کیا اور ذاتی طور پر کوشش کی کہ کوئی ایسا کام مل جائے جس سے فرزندِ قریش اپنی مختصر سی ضرورتیں پوری کر سکے' لیکن وقت ابھی ناساز گار تھا۔ اس دردمند انسان کی ساری دوڑ دھوپ بے اثر ثابت ہوئی۔ پھر یہ خبر دوستوں میں عام ہو گئی کوششیں مزید تیز کر دی گئیں مگر ان کا نتیجہ بھی ناکامی کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس واقعے کی مکمل تفصیلات تو کتابوں میں نہیں ملتیں لیکن کوئی بھی ذی ہوش انسان یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ امام شافعیؒ کے حلقۂ احباب میں سارے کے سارے اہلِ درد تھے جو اپنے سینوں میں علم دوستی کے شدید جذبات رکھتے تھے۔ اگر امامؒ کے دوستوں میں کوئی صاحبِ حیثیت شخص ہوتا تو اس جدوجہد کی نوبت ہی نہ آتی۔ وہ اکیلا فرزندِ قریش کی کفالت کر سکتا تھا۔ ایک قلندر کی کفالت ہی کیا؟ چند خشک روٹیاں اور ایک سادہ سا لباس' اگر کوئی خرچ تھا تو وہ نادر و نایاب کتابوں کا حصول تھا جن کے خریدنے کے لیے امام شافعیؒ ہمیشہ بے چین رہتے تھے۔ اور بدقسمتی سے امامؒ کے حلقے میں ایسا کوئی فرد موجود نہیں تھا جو اعلیٰ ظرفی کے ساتھ ایک تشنۂ علم کی پیاس بجھا سکتا۔ امامؒ کی اس محرومی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس وقت معاشی اعتبار سے اہلِ مکہ کی حالت زیادہ بہتر نہیں تھی' بس چند خاندان تھے جو اقتصادی لحاظ سے آسودہ زندگی گزار رہے تھے اور انہیں اس بات کا ہوش نہیں تھا کہ علم کس حال میں ہے اور اہلِ علم پر کیا گزر رہی ہے؟ ان حالات میں کون امام شافعیؒ کی طرف متوجہ ہوتا؟ اب فرزندِ قریش جیسے غیور انسان سے یہ توقع تو نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اہلِ ثروت کے دروازوں پر صدائیں دیتے یا صاحبانِ زر کے سامنے دستِ طلب دراز کرتے' اور ایسا ہی ہوا امام شافعیؒ نے اس اذیت ناک دور کو جس حوصلہ مندی اور بے نیازی کے ساتھ گزارا وہ بذاتِ خود سیرت و کردار کی ایک مکمل تاریخ ہے۔

ابھی گردشِ روز و شب جاری تھی کہ اتفاق سے والیٔ یمن مکہ آیا' امام شافعیؒ کے دوستوں اور بہی خواہوں کو خبر ہوئی تو ان کے چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی' انہیں یقین تھا کہ یہ ایک سنہری موقع ہے جس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے' یہی سوچ کر پہلے کچھ دوست امام شافعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہنے لگے'' محمد! اس شہر میں والیٔ یمن کی موجودگی تمہارے مسائل حل کر سکتی ہے۔''

امام شافعیؒ حیرت سے دوستوں کی طرف دیکھنے لگے‘ آپ اپنے ہمدردوں کی مبہم گفتگو کا مفہوم نہیں سمجھ سکے تھے۔’’والیٔ یمن کا میرے ذاتی مسائل سے کیا تعلق ہے؟‘‘

’’والیٔ یمن ایک بااختیار انسان ہے۔‘‘ ایک دوست نے کہا’’وہ آسانی کے ساتھ تمہیں ایسا کام دے سکتا ہے جو تمہارے شایانِ شان ہو‘ ہمارے خیال میں یہ اچھا موقع ہے جسے ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہیے۔‘‘

’’میں تسلیم کرتا ہوں کہ والیٔ یمن بہت اختیارات رکھتا ہے مگر میں اس کے سامنے جانے سے قاصر ہوں۔‘‘ امام شافعیؒ نے بڑے بے نیاز انداز میں کہا۔’’مجھے اپنی ذات کے لیے کسی حاکم سے درخواست کرتے ہوئے شرم آتی ہے اگر وہ عالم ہوتا تو میں بے جھجک اس کی مجلس میں چلا جاتا‘ میں نے امام مالکؒ تک پہنچنے کے لیے والیٔ مکہ کا سفارش نامہ بھی حاصل کیا تھا۔ عاملِ مدینہ کے دربار میں بھی حاضری دی تھی مگر مجھے اپنے شکم کی خاطر والیٔ یمن کے حضور جانا گوارا نہیں۔‘‘ امام شافعیؒ نے درخواست لے کر ایک صاحبِ اقتدار کے روبرو جانے سے صاف انکار کر دیا تھا‘’’میں تمہارے جذبوں کی قدر کرتا ہوں کہ تم میری تنگ دستی کے سبب آزردہ خاطر ہو لیکن یہ میرا شعار نہیں کہ بااختیار لوگوں کے سامنے اپنی پریشانیاں بیان کر کے تمام عمر شرمسار ہوں‘ یہ غربت‘ یہ افلاس میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں‘ میں نے تو بچپن ہی سے اپنے سر پر مسائل کی کڑی دھوپ دیکھی ہے‘ اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ میں ساری زندگی تپتی ہوئی دھوپ میں کھڑا رہوں تو پھر قدرت کے کھینچے ہوئے حصار سے انسان کس طرح باہر نکل سکتا ہے؟ کسی امیر کے در پر آواز دینے سے کہیں بہتر ہے کہ میں اتنی دیر اپنے خدا کو پکاروں اور اس سے مزید صبر و استقامت طلب کروں۔ وہ یقیناً بے نیاز ہے۔ اور اپنی اس صفتِ عالیہ کے صدقے میں عنقریب مجھے بھی امیروں کے کرم سے بے نیاز کر دے گا۔‘‘ امامؒ کے ایک ایک لفظ سے قلندرانہ شان کا اظہار ہو رہا تھا۔

’’ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ آپ اس کے سامنے اپنے مسائل بیان کریں‘‘ دوسرے دوست نے امامؒ کو سمجھانے کی کوشش کی’’حکومت کو ہمیشہ ایسے افراد کی ضرورت رہتی ہے جو انتظامی امور کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں۔‘‘

’’ان کاموں کے لیے مجھ سے بہتر لوگ موجود ہیں۔‘‘ امام شافعیؒ نے نہایت بے باکی کے ساتھ جواب دیا۔’’ مجھے انتظامی امور کا کوئی تجربہ نہیں۔‘‘

’’آپ کی ذہانت تجربے کی محتاج نہیں‘‘۔ تیسرے دوست نے بات کی واضح کرتے ہوئے کہا’’چند



روز میں آپ سب کچھ سمجھ جائیں گے اور جہاں تک بہتر لوگوں کی موجودگی کا سوال ہے تو ایوانِ حکومت اچھے انسانوں سے تقریباً خالی ہو چکا ہے۔ ایسے نازک وقت میں بندگانِ خدا کو آپ کی ضرورت ہے۔‘‘

امام شافعیؒ نے فوری طور پر اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا‘ بہت دیر تک سوچتے رہے‘ آپ کے چہرے سے مختلف کیفیات ظاہر ہوتی رہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے امامؒ ذہنی کش مکش کا شکار ہوں اور کسی فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ دوستوں کی نظریں آپ کے چہرے پر مرکوز تھیں‘ اور ان کی دلی خواہش تھی کہ امامؒ کسی نہ کسی طرح اپنی آمادگی کا اظہار کر دیں۔

’’اگر تم سمجھتے ہو کہ میں اللہ کے بندوں کی خدمت کر سکوں گا پھر والیٔ یمن سے بات کر لو۔‘‘ امام شافعیؒ طویل غور و فکر کے بعد کسی حد تک آمادہ نظر آنے لگے تھے’’مگر میں ذاتی طور پر والیٔ یمن سے کسی عہدے یا ملازمت کی درخواست نہیں کروں گا‘ تمہاری مرضی ہے تو اس کے سامنے میرا ذکر کر دیکھو اگر وہ مجھ سے ملنے کی خواہش کرے گا تو میں بھی ملاقات کی غرض سے اس کے پاس چلا جاؤں گا۔‘‘ شدید غربت و احتیاج میں بھی امام شافعیؒ کی آن باقی تھی۔

امام شافعیؒ کی نیم رضامندی دیکھ کر دوستوں کے ہونٹوں کی گم شدہ مسکراہٹ لوٹ آئی تھی اور ان کے افسردہ چہروں پر شادابی کا رنگ جھلکنے لگا تھا مکے میں یہ اہلِ درد کی ایک مختصر سی جماعت تھی‘ جو اپنے امامؒ کے ماتھے پر فکر کی دھندلی سی لکیر دیکھ کر بھی پریشان ہو جاتی تھی‘ یہ تمام لوگ بظاہر مفلس تھے مگر امام شافعیؒ کی آسودگی کے لیے ہر وقت بے قرار رہتے تھے۔ آج جب کہ فرزندِ قریش کے مسائل کا حل نظر آیا تو دوستوں کی خوشی ناقابلِ بیان تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا سنگین مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ امامؒ کی خواہش تھی کہ والیٔ یمن خود انہیں اپنی قیام گاہ تک آنے کی دعوت دے اور یہ ایک مشکل کام تھا‘ والیٔ یمن بہر حال ایک علاقے کا حکمران تھا اور ایک حکمران کے لیے اس اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنا کار دشوار تھا کہ وہ کسی محدث یا فقیہہ کا استقبال کرے اگر والیٔ یمن علم دوست ہوتا تو ہر مرحلہ آسانی کے ساتھ طے ہو جاتا مگر وہ ایک جابر حاکم کے سوا کچھ نہ تھا پھر ایک ایسے فقیہہ سے ملاقات کے لیے کس طرح آمادہ ہوتا جو امیروں کی دیوار کے سائے میں بھی کھڑا ہونا پسند نہیں کرتا تھا‘ بات یہاں آ کر الجھ گئی تھی۔

امام شافعیؒ کے غم گسار ساری رات سوچتے رہے‘ آپس میں طویل مشورے کے بعد ایک منصوبہ تیار کیا گیا اور پھر صبح ہوتے ہی امامؒ کے دوست ان اصحابِ قریش سے ملے جو مکہ معظمہ میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور جو براہِ راست والیٔ یمن تک پہنچ سکتے تھے‘ امامؒ کے دوستوں نے ایک قریشی بزرگ سے کہا

''آپ جانتے ہیں کہ محمد بن ادریس قریش کے بڑے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں' آپ شاید اس راز سے بھی واقف ہیں کہ شافعیؒ نوعمری کے باوجود علم وفضل میں درجہ کمال رکھتے ہیں' پھر آپ کے خیال میں ایسے شخص کو کسی منصب پر فائز ہونا چاہیے یا نہیں؟'' عوام کے دوستوں نے قریش بزرگ سے بڑا عجیب سوال کیا تھا۔

''بے شک! محمد بن ادریس اعلیٰ نسب ہے۔'' قریش بزرگ نے امام شافعیؒ کی خاندانی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ''اہلِ عرب اس کے نسب نامے پر انگلی بھی نہیں اٹھا سکتے لیکن جہاں تک اس کی علمی فضیلت کا سوال ہے تو اس سلسلے میں زیادہ نہیں جانتا۔''

''ہم لوگ آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ شافعیؒ کی ذہانت بے مثال ہے اور وہ اپنے اندر غیر معمولی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔''

دوستوں نے امامؒ کی وکالت کرتے ہوئے کہا

''یقیناً ایسا شخص اعلیٰ منصب کا مستحق ہے۔'' بزرگ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''مگر میں اس ذیل میں کیا کرسکتا ہوں؟'' بزرگ کے ذہن میں صورتِ حال الجھی ہوئی تھی اور وہ ابھی تک نہیں سمجھ سکے تھے کہ یہ لوگ ان سے کیا چاہتے ہیں؟

''والیٔ یمن آج کل مکے میں موجود ہے۔'' امام کے دوستوں نے جواباً کہا۔ ''آپ کا شمار معززینِ مکہ میں ہوتا ہے اس لیے وہ آپ سے ملنے سے گریز نہیں کرے گا' اگر مناسب سمجھیں تو ملاقات کے وقت والیٔ یمن کو شافعیؒ کے بارے میں بتائیں اور اس سے کہیں کہ یہ نوجوان فقیہہ حکومت کے انتظامی امور میں بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوسکتا ہے' ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ کی بات نہیں ٹالے گا اور اگر ایک بار اس نے محمد بن ادریس کو طلب کرلیا تو سارے مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے' امام شافعیؒ کی فصاحت و بلاغت اسے چند لمحوں میں اپنا اسیر کرلے گی۔''

بزرگ خاموش ہوگئے اور انہوں نے امامؒ کے غم گساروں سے اقرار کرلیا وہ والیٔ یمن کے روبرو امام شافعیؒ کا ذکر ضرور کریں گے اور پھر فوراً ہی نتائج سے بھی آگاہ کردیں گے' اس کے بعد ان بزرگ نے چند اور معززین قریش کو جمع کیا پھر والیٔ یمن سے ملنے کے لیے چلے گئے۔ والیٔ یمن قریش کی اعلیٰ نسبی سے بخوبی آشنا تھا اس لیے شرفائے مکہ کے ساتھ بہت احترام سے پیش آیا' دورانِ گفتگو بزرگانِ قریش نے نہ صرف امام شافعیؒ کا ذکر کیا بلکہ پرزور سفارش بھی کی کہ اس نوجوان کو صلاحیتوں سے استفادہ کیا جائے۔



والیٔ یمن نے بغیر کسی پس و پیش کے ان لوگوں کی بات مان لی اور امام شافعیؒ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

دونوں مراحل بخیر وخوبی طے ہوچکے تھے' امام شافعیؒ کو والیٔ یمن سے ہونے والی گفتگو کی اطلاع دی گئی فرزندِ قریش کو اب بھی ایک حاکم سے ملنے میں تردد تھا مگر جب یہ کہا گیا کہ والیٔ یمن آپ کا منتظر ہوگا تو امامؒ جانے کے لیے راضی ہوگئے۔ پھر امام مالکؒ کا یہ شاگردِ جلیل اس امیر کے سامنے پہنچا جو اپنی سفاکیوں کے باعث مشہور تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ایک بارعب شخصیت رکھتا ہے اور لوگ اس سے گفتگو کرتے ہوئے گھبراتے ہیں (یہ رعب و بدوبہ ذاتی وجاہت کے سبب نہیں تھا ظلم و تشدد کی وجہ سے کمزور لوگ اپنے دلوں پر اس کی ہیبت محسوس کرتے تھے اور دنیا پرستوں نے اسی چیز کو والیٔ یمن کے جلال سے تعبیر کردیا تھا) غرض وہ منظر قابلِ دید تھا' جب امام شافعیؒ ایک جابر حاکم کے روبرو تشریف لائے۔ فرزندِ قریش کی ظاہری حالت یہ تھی کہ آپ کا لباس سادہ بھی تھا اور بوسیدہ بھی تھا...... مگر چہرے پر سیرت و کردار کی وہ آگ روشن تھی جس کے سامنے حاضرین کے شاداب و مطمئن چہرے بجھ کر رہ گئے تھے یہ غربت وافلاس کا ایک ایسا پیکر تھا جس کے آگے امارت و ثروت شرمسار نظر آتی تھی۔ امامؒ کا مجلس میں داخل ہونا ہی عجیب تھا۔ امرا نے آج تک ایسی رفتار نہیں دیکھی تھی وہ رفتار جس میں کبر و غرور کا شائبہ تک نہ تھا مگر پھر بھی امامؒ کے قدموں کی دھمک لوگوں کو اپنے دل کے قریب محسوس ہوتی تھی۔

پھر امامؒ کی پرسوز آواز مجلس میں گونجی' امامؒ نے اہلِ مجلس کو سلام کیا تھا۔ اس سلام میں کوئی تخصیص نہیں تھی یہ سلام والیٔ یمن کے لیے بھی تھا اور حاضرینِ محفل کے لیے بھی۔ یہ وہی سلام تھا جس کا حکم رسالت مآب ﷺ نے قیامت تک کے لیے ہر مومن کو دیا ہے' اہلِ مجلس حیران تھے اور خود والیٔ یمن بھی امامؒ کا یہ انداز دیکھ کر چونک اٹھا تھا' فرزندِ قریش کے طرزِ عمل سے اس کے جذبۂ اقتدار کو ٹھیس پہنچی تھی۔ مگر وہ امام شافعیؒ کی بے باکی کو برداشت کرگیا۔ پھر والیٔ یمن نے امام شافعیؒ سے کئی سوالات کیے جواب میں فرزندِ قریش نے جو کچھ کہا اسے سن کر اہلِ مجلس حیران رہ گئے۔ اگرچہ یمن کو امام شافعیؒ کی جراتِ گفتار پسند نہیں تھی لیکن وہ بھی آپ کے حسنِ کلام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا یہاں تک کہ اس نے امامؒ کو نجران کا عامل نامزد کرتے ہوئے کہا۔

''میں اپنی مصروفیات کے باعث یہاں زیادہ دن تک نہیں ٹھہر سکتا' تم جلد از جلد اپنے سفر کی تیاریاں مکمل کرکے یمن پہنچو۔'' بعض کتابوں میں درج ہے کہ والیٔ یمن امام شافعیؒ کو اپنے ہمراہ لے گیا تھا

مگر یہ روایت چند حقائق کی موجودگی میں کمزور نظر آتی ہے اگر والئ یمن فرزندِ قریش کو اپنا شریکِ سفر بنا لیتا تو پھر یہ نوبت ہرگز نہ آتی کہ امامؒ کی مادرِ گرامی زادِ سفر فراہم کرنے کے لیے اپنا مکان رہن رکھ دیتیں۔

اس واقعے کی تفصیل یوں ہے کہ جب والئ یمن نے امام شافعیؒ کو نجران کا عامل مقرر کر دیا تو امامؒ گھر تشریف لائے اور والدہ محترمہ کو یہ خوشخبری سنائی ''آپ کی دعاؤں کے طفیل خدا نے میرا معاشی مسئلہ حل کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے بندوں کی خدمت کا موقع بھی فراہم کیا ہے۔''

مادرِ گرامی نے بڑے تحمل سے یہ خبر سنی جس ماں نے تیس سال تک اپنے خونِ جگر سے بیٹے کی پرورش کی ہو اس ماں کے لیے یہ ایک بڑی خبر تھی مگر فاطمہ بنت عبداللہ نے ایسے نشاط انگیز لمحات میں بھی اسلامی روایات کو فراموش نہیں کیا۔ امام شافعیؒ سے فرمانے لگیں ''محمد یہ سب عارضی چیزیں ہیں جو اپنے رب سے عہد کر چکے ہیں ان کے لیے تمام موسم یکساں ہیں، اختیار بھی جبر سے اور جبر بھی اختیار سے۔'' امامؒ نے مادرِ گرامی کی نصیحت سن کر سر جھکا لیا، پھر وہ دستِ محبت بلند ہوا اور امامؒ کے سر پر سایہ فگن ہو گیا۔ ''خدا اس راہِ دشوار میں تمہارے قدموں کی لغزشوں سے محفوظ رکھے۔''

امامؒ کے ہمدرد غم گسار آج بہت خوش تھے مگر خود امامؒ کی اداسیاں لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ ''محمد کیا تم اس منصب سے ناخوش ہو؟'' کسی نے پوچھا۔

''میرے نزدیک خوشی اور ناخوشی کی کوئی حیثیت نہیں۔'' امام شافعیؒ نے فرمایا ''مجھے ان ذمے داریوں کا احساس ہے جو عنقریب میرے کاندھوں کو جھکا دیں گی اور دل پر ایک بارِ گراں بن جائیں گے میں نہیں جانتا کہ اپنے فرائض سے سبکدوش ہو سکوں گا یا نہیں؟ یہی اندیشے میرے ذہن کو پریشان کرتے ہیں۔''

''محمد! تم تو اہلِ دل کی آخری امید ہو۔'' دوستوں نے بیک زبان ہو کہا ''اگر تم بھی ہمت ہار بیٹھے تو وہ لوگ کہاں جائیں گے جو خدا کی زمین پر انصاف کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔''

''خدا کا اپنا ایک نظام ہے۔'' امام شافعیؒ نے جواباً فرمایا۔ ''عقلِ انسانی اس نظام کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ محمد بن ادریس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، خدا اس بات پر قادر ہے کہ ہزاروں شافعیؒ پیدا کر دے۔ اور پھر شافعیؒ کی حقیقت ہی کیا؟ جب وہ نہیں چاہتا تو شافعیؒ بھی عاجز رہ جاتے ہیں یہ کوئی نہیں جانتا کہ آزمائش کی راہوں سے کون سرخرو گزرے گا اور کون ناکام و نامراد؟ جب ساری امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں تو بارشِ کرم مردہ کھیتوں میں جان ڈال دیتی ہے اور جب انسانی عزائم



انتہائی بلندیوں کو چھونے لگتے ہیں تو بادِ سموم کا ایک ہی جھونکا سرسبز و شاداب فصلوں کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے کسی کو کیا معلوم کہ شافعیؒ اس کے کرم کا کتنا محتاج ہے؟ تم آخری امید کہتے ہو اگر میں اس کا دھندلا عکس بھی ثابت ہو جاؤں تو یہ بڑی کامیابی ہو گی۔''

دوست امام شافعیؒ کے دلائل کا کیا جواب دیتے۔ بس حوصلہ افزائی کی کچھ باتیں کر کے چلے گئے اب امامؒ تنہا تھے اور ایک ہی پہلو سے بیٹھے ہوئے مسلسل سوچ رہے تھے، چہرے پہ فکر و پریشانی کا رنگ صاف نمایاں تھا، مادرِ گرامی نے کئی بار دیکھا اور نظر انداز کر دیا۔ وہ بیٹے کی اس عادت سے واقف تھیں۔ امامؒ فقہ کے مختلف مسائل پر گھنٹوں غور و فکر کرتے رہتے تھے مگر آج امامؒ کی سوچ کا یہ انداز تمام دنوں سے جداگانہ تھا کبھی آپ آنکھیں بند کر لیتے اور کبھی چہرہ متغیر ہو جاتا۔ جب بہت دیر تک امامؒ کی یہی کیفیت برقرار رہی تو والدہ محترمہ بیٹے کے قریب آئیں اور نہایت شفقت سے فرمانے لگیں۔

''محمد! آج تم بہت پریشان نظر آتے ہو، کیا دنیا میں کوئی ایسا مسئلہ بھی ہے جسے تم میرے سامنے بیان کرنا نہیں چاہتے؟''

''اُمِّ محترمہ! شافعیؒ نے ہمیشہ آپ کے لیے مسائل ہی پیدا کیے ہیں۔'' یہ کہتے کہتے امامؒ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''فرزند! آج تم نے بیگانگی کا لہجہ کیوں اختیار کیا ہے؟'' مادرِ گرامی بے قرار ہو گئیں ''تم تو وہ لالۂ صحرائی ہو جس کی حنابندی کے لیے میں اپنی جان سے بھی گزر سکتی ہوں۔ اسے قریش کے غیور وارث! اپنی ماں سے پردہ داری نہ کر۔''

''والئ یمن واپس جا چکا ہے۔'' امام شافعیؒ اپنے دل کا درد بیان کرنے لگے ''اگر وہ چاہتا تو مجھے اپنے ہمراہ بھی لے جا سکتا تھا اسے میری ظاہری حالت کا احساس ہونا چاہئے تھا کہ میں یہ طویل سفر کس طرح طے کروں گا؟ بہت دیر سے اسی سوچ میں گم ہوں کہ کہاں سے آئے گا؟ مجھے گھر کے ایک ایک گوشے کا حال معلوم ہے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کا دامن خالی ہو چکا ہے پھر مجھے کیا حق ہے کہ اپنا مسئلہ بیان کر کے آپ کی پریشانیوں میں اضافہ کروں۔''

''فرزند! یہ ممکن ہے کہ میری پریشانیاں حد سے گزر جائیں مگر یہ سفر نہیں ٹل سکتا۔ تمہیں جانا ہی ہو گا۔'' اچانک مادرِ گرامی کی اداسیوں کے تمام رنگ زائل ہو گئے اور چہرہ کسی چٹان کی طرح سخت نظر آنے لگا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہیں پھر امام سے فرمایا ''تم جس گھر کے گوشے گوشے سے واقف ہو، آج

وہی گھر تمہارے کام آئے گا تمہارے آباؤ اجداد کی یہ نشانی' تمہاری یہ میراث اسی دن کے لیے تھی۔''

امام شافعیؒ والدہ محترمہ کا اشارہ سمجھ گئے تھے' یہ ایک انتہائی اقدام تھا' امامؒ کا اضطراب کچھ اور بڑھ گیا آپ نے مادرِ گرامی کو اس ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے ''فرزند اس کے سوا کوئی چارہ نہیں جو کسی کے سامنے قرض کے لیے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا' اسے لازم ہے کہ وہ اپنا سائبان فروخت کردے اور حالات کی دھوپ میں جلنے لگے۔''

''پھر آپ کہاں رہیں گی؟'' امام شدید اضطراب میں مبتلا تھے۔

''میں تمہارا سفر جاری رکھنے کے لیے کھلے آسمان کے نیچے بھی رہ سکتی ہوں' خدا کی زمین بہت کشادہ ہے ویسے بھی اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' مادرِ گرامی نے اپنے فرزند کو تسلی دیتے ہوئے کہا ''یمن تک پہنچنے کی لیے تمہیں اندازاً کتنی رقم درکار ہوگی؟''

امام شافعیؒ نے کچھ تو قلندرانہ فطرت سے مجبور ہو کر اور کچھ والدہ محترمہ کی پریشانیوں کے خیال سے اپنی ضروریات کو اتنا مختصر کر دیا تھا کہ کوئی دوسرا انسان اس قدر محدود وسائل کے ساتھ یہ سفر اختیار کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' مادرِ گرامی نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''بس مجھے یمن تک پہنچنے کے لیے تھوڑی بہت رقم درکار ہوگی۔'' امامؒ نے مادرِ گرامی کو مطمئن کرتے ہوئے کہا ''کام شروع کرنے کے بعد میرے اخراجات کی تمام تر ذمے داری حکومت پر ہوگی۔''

اس کے بعد فاطمہؒ بن عبداللہ نے شوہر کی نشانی خاندان مُطّلب کی یادگار اور اپنے گھر کی چار دیواری کو رہن رکھ دیا۔ پھر جب امامؒ مادرِ گرامی سے رخصت ہونے لگے تو اس مسلمان جانباز خاتون نے بیٹے سے کہا ''محمد! یہ بارِ گراں کچھ اتنا زیادہ نہیں کہ اسے اٹھاتے ہوئے تمہارے کاندھے شل ہو جائیں اگر فطرتِ انسانی کی کمزوریوں سے مجبور ہو کر کسی مقام پر لڑکھڑانے لگو تو اپنے آقا سرورِ کونینؐ کے دربارِ امانت کا تصور کر لینا۔ یہ خیال آزمائش کی راہوں میں تمہارے ناتواں قدموں کو استقامت بخشے گا۔ صحابہ اکرامؓ کی جانفروشی کی یاد تازہ کر لینا پھر خدا کی زمین پر عدل و انصاف قائم کرنے میں تمہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔'' یہ کہہ کر فاطمہؒ بنت عبداللہ نے اپنے دستِ محبت دراز کر دیے۔ اور امامؒ آغوشِ مادر میں سما گئے۔ پھر اہلِ مکہ نے فرزندِ قریش کی حدودِ حرم سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ امام شافعیؒ اس حاکم کی دعوت پر یمن کی طرف جا رہے تھے۔ جو اپنے فطرت و مزاج میں نہایت جابر و سفاک تھا۔

☆☆☆



آخر امام شافعیؒ کو نجران کا عامل بنا دیا گیا، نجران یمن ہی کا ایک علاقہ تھا یہاں آنے سے پہلے امامؒ کا خیال تھا کہ ناتجربہ کار ہونے کے باعث کچھ دن تک آپ کو انتظامی امور سرانجام دینے میں دشواریوں کا سامنا ہوگا۔ مگر جب عمل کا وقت آیا تو امامؒ کی غیر معمولی ذہانت کے سبب حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے دیکھنے والے محسوس کر رہے تھے جیسے اس نوجوان کو اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمانہ گزر گیا ہے یہ امامؒ کی ان صلاحیتوں کی طرف واضح اشارہ تھا جو آپ کو خدائے کریم کی بارگاہ سے عطا ہوئی تھیں...... اور صفاتِ عالیہ کا یہ اجتماع صدیوں بعد کسی کسی انسان کی ذات میں نظر آتا ہے۔

امام شافعیؒ کی اعلیٰ کارکردگی کی خبریں والیٔ یمن کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں اور وہ بھی فرزندِ قریش سے بہت خوش نظر آ رہا تھا لیکن اس کی خوشی کا سبب امامؒ کی ان تھک محنت اور عدل و انصاف نہیں تھا۔ والیٔ یمن محض اس لیے مسرور مطمئن تھا کہ امام شافعیؒ جیسے جلیل القدر عالم اس کے ماتحت و ملازم تھے۔ والیٔ یمن نے اس پہلی ملاقات کو فراموش نہیں کیا تھا جو مکہ معظّمہ میں ہوئی تھی اور جس ملاقات میں امام شافعیؒ نے ایک مردِ مومن کی روایتی جرات و بیباکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ یمن کے سنگدل حاکم کی فطری کمینگی یہ تھی کہ وہ فرزندِ قریش کے قلندرانہ رویے کو نہیں بھولا تھا اور اس نے انتقام لینے کے لیے امامؒ کو نجران کا عامل بنا دیا تھا۔ سرِ دربار جب کوئی شخص امام شافعیؒ کا ذکر کرتا تو والیٔ یمن کے چہرے پر کبر و غرور کا ایک عجیب سا رنگ ابھر آتا اور احساسِ برتری سے اس کی گردن کج ہو جاتی۔ اس کے برعکس امامؒ دنیا کی ہر شے سے بے نیاز اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھے' ستائش سے بے پروا' نکتہ چینی سے بے خبر' آپ کا دروازہ ہر خاص و عام کے لیے کھلا ہوا تھا۔ مستحق افراد اس دروازے سے بامراد لوٹتے تھے اور بندگانِ خدا کے حقوق غصب کرنے والوں کے لیے وہ در خود بخود بند ہو جاتا تھا۔

ایک مختصر سی مدت میں امامؒ نے اس دور کی تمام روایتوں کو بدل ڈالا تھا' اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ مزاجِ خلافت بہت دن تک بگڑتے بگڑتے شاہانہ ہو گیا تھا۔ جب امیر المومنین ہی خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو فراموش کر کے سلطنتِ اسلامیہ کو اپنی خاندانی میراث سمجھنے لگے تو پھر دیگر عاملین کا ذکر ہی کیا۔ والیٔ یمن بھی اسی بگڑے ہوئے نظام کی بساط کا ایک مہرہ تھا جس نے یمن کے پورے علاقے میں بے انصافی اور افراتفری کو فروغ دیا تھا۔ امام شافعیؒ دیگر مقامات کے انتظامی امور میں تو بے دست و پا تھے لیکن آپ نے نجران کی مسخ شدہ شکل کو اپنے عدل و انصاف اور فکری اجتہاد سے نیا نکھار دے دیا تھا۔ یہ آپ کی روز

وشب کی جانسوزی ہی کا نتیجہ تھا کہ لوگ بے اختیار کہنے لگے تھے۔ ''خدا اس نوجوان کی عمر دراز کرے کہ یہ خزاں کے جلتے ہوئے موسم میں بہار وشبنم کا نقیب ہے۔'' پھر امامؒ کے علم وانصاف کے چرچے عام ہوگئے۔ یہاں تک کہ آپ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

یہ امامؒ کی زندگی کے انقلابی لمحات تھے پہلے آپ حکام کے سائے سے بھی گریزاں رہتے تھے اور شریکِ سلطنت ہونا آپ کے لیے ایک بارِگراں تھا مگر نجران کا عامل ہوجانے کے بعد خیالات میں اسی قدر تبدیلی نمایاں ہوئی کہ اس بوجھ کو ہنسی خوشی برداشت کرنے لگے۔ اسی دوران ایک اور واقعہ پیش آیا۔ جب امام شافعیؒ کے عدل وانصاف اور علم وفراست کی تشہیر ہوئی تو یہ خبریں ان حضرات تک بھی پہنچیں جن سے امامؒ نے استفادہ کیا تھا۔ ان لوگوں میں نامور محدث اور فقیہہ شامل تھے۔ ایک محدث نے امام شافعیؒ کو عامل کے منصب پر فائز دیکھ کر نصیحت کی۔ ''محمد! حکام کی قربت تمہارے لیے مناسب نہیں۔ یہ ایک وادیٔ پرخار ہے جس سے گزرتے ہوئے بڑے بڑے صاحبانِ کردار بھی مجروح ہوجاتے ہیں۔''

جواب میں امام شافعیؒ نے فرمایا۔ ''میں حالات کے اس پہلو سے بےخبر نہیں پھر بھی اپنے خدا کی رحمت پر نظر رکھتا ہوں۔ وہی مجھے اس خارزار سے سلامتی کے ساتھ گزارے گا۔''

پھر ایک دوسرے فقیہہ نے امام شافعیؒ کو نصیحت آمیز خط لکھا۔ ''مجھے اس اطلاع سے دکھ پہنچا ہے کہ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح سے امورِ سلطنت میں شریک ہوگئے ہو۔ یہ منصب ایک عالم کے شایانِ شان نہیں۔ اندیشہ ہے کہ ان ہنگاموں میں الجھ کر کہیں تمہارے دل ونظر کا مرکز تبدیل نہ ہوجائے۔ محمد! تم اپنی منزل کی طرف لوٹ آؤ اور اس خطرناک راستے کو اہلِ دنیا کے لیے چھوڑ دو۔''

جواب میں امام شافعیؒ نے خط لکھا۔ ''میں خدا کی مخلوق کو اس اذیت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا کہ وہ حصولِ انصاف کے لیے دربدر بھٹکتے رہیں اگر مسندِ حکومت کو دنیاداروں کے لیے چھوڑ دیا جائے تو پھر دین ومذہب پر کیا گزرے گی؟ کیا گمراہ حاکموں کی دست درازیوں سے اخلاق کا پیرہن تار تار نہیں ہوجائے گا؟ میں انسانی کردار کی اسی قبا کو چاک ہونے سے بچانا چاہتا ہوں۔ اب تک خدا نے مجھے میرے مقاصد میں توقع سے زیادہ نصرت وکامیابی عطا کی ہے۔ آئندہ بھی اسی کی رحمتِ خاص کا طالب رہوں گا۔'' امام شافعیؒ مسلسل نصیحتوں کے باوجود کسی قسم کی بے دلی کا شکار نہیں ہوئے بلکہ اپنے اصلاحی اور علمی کاموں کی رفتار پہلے سے بھی زیادہ تیز کردی۔

پھر ایک اور خط امام شافعیؒ کو موصول ہوا، یہ ایک دردمند محدث کا خط تھا۔ اس بلند کردار بزرگ نے



فرزندِ قریش کو لکھا تھا۔ ''شافعی! میں دونوں جہان میں تمہاری سربلندی کے لیے دعا کرتا ہوں مگر اس کے ساتھ ہی ڈرتا بھی ہوں کہ تمہاری جرائت مندیوں نے تمہیں بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ تم یہ بات کیسے بھول سکتے ہو کہ ابوحنیفہؒ نے کبھی امرائے وقت کی صحبت اختیار نہیں کی، سفیان ثوریؒ عہدہ ومنصب سے اس طرح بھاگتے رہے جیسے کوئی خونی درندہ ان کے تعاقب میں ہو۔ اور خود تمہارے استاد امام مالکؒ نے کبھی اقتدار میں شرکت گوارا نہیں۔ بلاشبہ تم بنی نوع آدم میں ذہین ترین فرد ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے لیے اسلاف کے عمل کی یہ چند مثالیں کافی ہوں گی۔'' اگرچہ یہ خط بہت محتاط انداز میں تحریر کیا گیا تھا لیکن درپردہ اس کا بھی یہی مفہوم تھا کہ امام شافعیؒ عاملِ نجران کی کرسی کو خیرباد کہہ دیں اور کسی علمی درس گاہ کی بوریا نشینی اختیار کرلیں۔

امامؒ نے ان بزرگ کو جواب دیتے ہوئے لکھا۔ ''بے شک! امام ابوحنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ امرائے وقت کے نزدیک جانے سے گریز کرتے تھے مگر جب بھی حکمران زیادہ بے لگام ہوئے اور ضرورت پڑی تو ان بزرگ نے صدائے حق بلند کی اور اس قدر سچ بولا کہ جان سے بھی گزر گئے۔ میرے استادِ گرامی امام مالکؒ نے بلاشبہ کوئی منصب قبول نہیں کیا مگر ہمیشہ حکام کو بے راہ روی سے روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ میں بھی اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کررہا ہوں۔ خدا میری مدد کرے اور آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے غم گساری کا حق ادا کردیا۔'' اس کے بعد امام شافعیؒ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور آپ مکمل یقین کے ساتھ ہدایت یافتہ لوگوں کے راستے پر گامزن رہے۔

فرزندِ قریش جس وقت نجران تشریف لائے تھے۔ اس وقت آپ کی عمر انتیس یا تیس سال تھی۔ آپ نے چار سال کے عرصے میں مظلوموں کو انصاف اور ظالموں کو عبرت ناک سبق دیا۔ ان جرات مندانہ اقدامات سے امامؒ کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ محدثینِ عظام اور فقیہانِ کرام کی وہ جماعت جو امام شافعیؒ کو انتظامی امور میں شریکِ سلطنت ہونے سے باز رکھنا چاہتی تھی، اب اس کی نظریں بھی امامؒ کے روشن چہرے پر مرکوز تھیں۔ امامؒ نے جس ذہانت واستقامت سے نجران کے معاشرے کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی، وہ یقیناً ایک کارنامہ تھا اگر اہلِ اقتدار اپنی فکر اور عمل میں مخلص ہوتے تو انہیں امام شافعیؒ کا احسان مند ہونا چاہیے تھا کہ فرزندِ قریش نے تیزی سے بگڑتی ہوئی اسلامی قدروں کا حقیقی رنگ نمایاں کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ بات بہرحال والیٔ یمن کو سرخرو کرنے کے لیے کافی تھی۔

مگر وہ جابر و سفاک حاکم فطرتاً گمراہ تھا۔ دولت و ہوس کی سیاہیاں بڑھتے بڑھتے قلب تک جا پہنچی تھیں اور اب روشنی کی کوئی کرن کسی روزن سے گزر کر اس کے دل و دماغ کے زنگ کو دور نہیں کر سکتی تھی۔ اس چار سال کے دوران کئی ایسے اہم واقعات پیش آئے جن کا تعلق براہِ راست والیٔ یمن سے تھا۔

امام شافعیؒ کے سامنے ایک ایسا شخص پیش ہوا جو بدعنوانیوں کا مرتکب تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ امامؒ اس کے خلاف فردِ جرم کی سماعت کرتے، والیٔ یمن کی سفارش آ پہنچی۔ اس نے صاف صاف کہا تھا کہ یہ شخص حکومتِ یمن کا پسندیدہ ہے۔ گردشِ وقت کے سبب عدالت کے سامنے پیش ہو گیا ہے۔ پھر اس نے امامؒ کو حکم دیتے ہوئے لکھا تھا۔ ''تمہیں لازم ہے کہ اسے اس طرح بری کرو کہ دامن رسوائی کے غبار سے محفوظ رہے۔''

امامؒ نے والیٔ یمن کا تحریری حکم دیکھا اور اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے وہ دنیا کی حقیر ترین شے ہو۔ امامؒ نے اس شخص پر عائد شدہ الزامات کی مکمل تحقیق کی اور پھر جب اسے مجرم پایا تو اتنی ہی سزا دی جس کا وہ مستحق تھا۔ امامؒ نے جوشِ جذبات میں نہ حد سے تجاوز کیا اور نہ حاکم کے خوف سے سزا میں کمی کی۔ بس پورا پورا انصاف کر دیا۔ وہی انصاف جس کا تقاضا خدا اپنے بندوں سے کرتا ہے۔ جب والیٔ یمن کو اس واقعے کی خبر ہوئی کہ امامؒ نے اس کی سفارش کو ٹھکرا دیا تو پیشانیٔ اقتدار پر ایک ایسی گہری شکن پڑ گئی جسے تمام درباریوں نے محسوس کیا۔ والیٔ یمن پہلے ہی جرأت گفتار کے باعث امامؒ سے کدورت رکھتا تھا، اس واقعے نے دل کی کثافت کو نفرت میں بدل دیا۔

پھر والیٔ یمن نے اپنی بساطِ سیاست کو نئے انداز سے بچھایا۔ مہرے بدل دیے گئے۔ پس پردہ نجران کے با اثر لوگوں کو حکم دیا کہ وہ محمد بن ادریس کے قریب ہونے کی کوشش کریں اور اس نوجوان کو ایسی راہوں پر لے جائیں جہاں پہنچ کر انسانی قدموں کی لغزش نمایاں ہو جاتی ہے۔ والیٔ یمن کے اس منصوبے میں مختلف طبقوں کے مقامی افراد شریک تھے جو ایک ایک کر کے امامؒ کے نزدیک آئے۔ کسی نے یہ سوچ کر کہ فرزندِ قریش کا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے اور اس نو عمر فقیہہ نے بچپن سے جوانی تک آسودہ حالی نہیں دیکھی ہے، بڑی رشوت پیش کی۔ مگر امامؒ نے والیٔ یمن کے اس جاسوس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا' یہاں تک کہ حکومت کا وہ بازی گر شکست کھا کر واپس لوٹ گیا۔



جب امامؒ پر یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا تو کچھ خوشامدیوں نے آپ کے گرد جمع ہونا شروع کر دیا' یہ تعلیم یافتہ افراد کی ایک جماعت تھی جو ہر وقت امام شافعیؒ کی تعریف و توصیف میں مشغول رہتی تھی۔ یہ لوگ بڑی ہنر مندی سے امامؒ کی ستائش میں ایسے کلمات ادا کرتے کہ اگر انسان اس طرف ذرا بھی مائل ہو جائے تو پھر اسکی بربادی میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ لیکن امام شافعیؒ کو خدا نے پہلے ہی ان تمام چیزوں سے بے نیاز کر دیا تھا آپ نے ان خوشامدیوں اور چاپلوسی کرنے والوں سے فرمایا۔

''تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔'' امامؒ کے لہجے میں ایسا جلال تھا کہ فتنہ پردازوں کے ہوش اڑ گئے'' تم میرے منہ پر میری تعریفیں کر کے مجھے ہلاک نہیں کر سکتے۔''

والیٔ یمن کے آگے بڑھائے ہوئے مہرے یہاں بھی شکست کھا گئے اور پھر انہوں نے اپنے آقا کو لکھا'' ہم نے بہت کوشش کی کئی حصار کھینچے مگر یہ شخص محمد بن ادریس آہنی عزائم رکھتا ہے اس پر ہم نے جو حربے استعمال کیے اگر وہ کسی دوسرے انسان پر آزمائے جاتے تو شاید وہ اپنا ایمان تک گنوا بیٹھتا لیکن شافعیؒ کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یا تو براہِ راست خدا اس کی مدد کرتا ہے یا پھر وہ کسی دوسری مٹی کا بنایا ہوا آدم زاد ہے۔''

جب والیٔ یمن کو اپنے زر خرید کارندوں کا یہ خط ملا تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ سرِ دربار وہ اپنے ردِ عمل کا اظہار نہ کر سکا مگر دل میں یہ بات طے کر لی کہ وہ امام شافعیؒ کو اپنے حکم کے آگے سرنگوں ہونے کے لیے مجبور کر دے گا۔

پھر مسلسل کچھ اور واقعات پیش آئے' والیٔ یمن کے ستائے ہوئے انسان فرار ہو کر نجران پہنچے اور بڑے عاجزانہ لہجے میں امام شافعیؒ سے فریاد کرنے لگے'' نوجوان! ہم نے سنا ہے کہ تیرے دروازے پر انصاف ملتا ہے؟''

''مگر میں مکمل طور پر آزاد نہیں ہوں۔'' امامؒ نے بے قرار ہوتے ہوئے فرمایا۔'' اگر تم پر نجران کی حدود میں کوئی زیادتی ہوئی تو بے شک میں اس کا ذمے دار تھا تم والیٔ یمن کے ہاتھوں ستائے گئے ہو تمہارا انصاف بھی وہی کرے گا۔''

''اس کی سفاکیاں اور بے انصافیاں حد سے گزر چکی ہیں۔'' ستم رسیدہ انسانوں نے کہا۔

''پھر صبر کرو۔'' امامؒ نے ان غمزدہ لوگوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا'' جب یہ صورتِ حال پیدا ہو جاتی

ہے تو پھر خدا کوئی دوسرا انتظام کرتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اسی کا حکم زمین و آسمان پر نافذ العمل ہے۔ اگر تمہارا ہاتھ والیٔ یمن کے گریبان تک نہیں پہنچ سکتا تو پھر قدرت کے فیصلوں کے منتظر رہو۔ اس کا ہاتھ بیک وقت کائنات کے تمام ظالموں کی گردنوں تک پہنچ سکتا ہے۔"

اس کے بعد امام شافعیؒ نے والیٔ یمن کو ایک خط تحریر کیا "بے شک خدا کے سامنے ہر شے جواب دہ ہے اور ہر شخص اپنا بوجھ خود اٹھائے گا' پھر بھی میں آپ کو یومِ جزا کے خوف سے ڈراتا ہوں' وہ دن بہت قریب ہے جو لوگ آپ کے ہاتھوں سے زخم کھا چکے ہیں انہیں آپ ہی مرہم بھی فراہم کیجئے اللہ توبہ کا سننے والا اور قبول کرنے والا ہے اگر شورِ دنیا میرے اور آپ کے درمیان حائل ہے اور آپ کچھ سننا ہی نہیں چاہتے تو پھر اللہ بے نیاز ہے۔"

اس واقعے کے بعد بھی امام شافعیؒ نے کئی بار والیٔ یمن کو اس کے ظلم و تشدد سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی زنگ آلود فطرت سے مجبور تھا۔ اس لیے کوئی نصیحت قبول کرنے کے بجائے امام شافعیؒ کا دشمن ہو گیا جب خوشامدی درباریوں اور مصاحبوں نے یہ حالات دیکھے تو والیٔ یمن کو سمجھایا۔

"آپ اس شوریدہ سر نوجوان کو معزول کیوں نہیں کر دیتے؟"

"معزولی اس کا علاج نہیں"۔ والیٔ یمن غضب ناک نظر آ رہا تھا "جس مفلس کو میری نوازشات نے عاملِ نجران کے اعلیٰ عہدے تک پہنچایا' اب وہی میرے اعمال کا احتساب کر رہا ہے یہ ایک ناقابلِ معافی جرم ہے اس بے ادبی کی سزا معزولی نہیں' میں عنقریب اسے والیٔ یمن کے اقبال سے روشناس کراؤں گا۔ پھر قریش کا یہ افلاس زدہ نوجوان مزاجِ حکمرانی کو سمجھ لے گا مگر وقت گزر چکا ہو گا۔ اور اس زمین پر شافعی کے لیے کوئی پناہ گاہ باقی نہیں رہے گی"۔ تمام حاشیہ بردار اور خوشامدی لرزہ براندام نظر آنے لگے ان کی نظریں والی یمن کی سفاک آنکھوں میں وہی رنگ نمایاں دیکھ رہی تھیں جو اب تک صدہا انسانوں کے لیے پیغامِ اجل ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

والیٔ یمن کا عیار ذہن تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ اب اسے روز و شب یہی ایک فکر تھی کہ کسی طرح امام شافعیؒ کے بے داغ لباس کو سیاہ کر دیا جائے' وہ دن میں ایک منصوبہ تیار کرتا اور رات میں اس کے تمام خاکے بکھر جاتے۔ پھر والیٔ یمن کے پیشانی پر فکر کی بے شمار لکیریں ابھر آتیں۔ مصاحب اور خوشامدی



دست بستہ خم ہو کر اس اضطراب کا سبب پوچھتے' والیٔ یمن جواب میں کہتا۔

"اس قریش زادے نے میری نیندیں حرام کر دی ہیں وہ سمجھتا ہے کہ میں آدابِ حکمرانی سے واقف نہیں' اس کے فیصلے میرے طرزِ حکومت کی نفی کرتے ہیں اب میں لوگوں کی سرگوشیاں سننے لگا ہوں' وہ عوام جو کل تک میرے خوف و دہشت سے لرزہ براندام رہتے تھے برملا کہنے لگے ہیں کہ محمد بن ادریس بہترین منتظم ہے' منصف و عادل ہے۔ اس کے قریب پہنچ کر لوگوں کو سکونِ دل حاصل ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ تم میں سے کوئی شخص ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا میں تصورات میں خاندانِ مطلب کے اس نوجوان کو اپنے اقتدار کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ یہ میرے جلالِ حکومت کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ میں اس خطرے کو زیرِ خاک دفن کرنا چاہتا ہوں۔" والیٔ یمن جوشِ غضب سے کانپنے لگا تھا' اس کے خوفناک عزائم حاشیہ برداروں پر بے نقاب ہو چکے تھے اس لیے حاضرین میں جس قدر بے ضمیر افراد موجود تھے وہ سب کے سب والیٔ یمن کے منصوبے کی تائید کرنے لگے۔

خوشامدیوں کے اسی حلقے میں ایک اور شخص بھی موجود تھا۔ جو اپنے چہرے سے ایک ذہین انسان نظر آتا تھا۔ جب والیٔ یمن اپنے قہر کا مظاہرہ کرتے کرتے خاموش ہو گیا تو وہ شخص بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بولا "محمد بن ادریس تو آپ کے لیے آسانیاں فراہم کر رہا ہے نجران کے معاشی حالات میں جو اصلاحات ہو رہی ہیں وہ خلافتِ عباسیہ کے لیے ایک اچھی علامت ہیں۔ فرزندِ قریش کو راستے سے ہٹانے کے بجائے سیاست یہ ہے کہ آپ اس کی کوششوں سے فائدہ اٹھائیں' خلیفہ ہارون رشید کو مطلع کریں کہ آپ تنہا یہ کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح آپ کا نام مملکت کی فلاح چاہنے والوں میں شمار ہونے لگے گا۔ محمد بن ادریس اپنے علم و فضل کی بنیاد پر اجتہاد سے کام لے گا' مخلوق کو انصاف فراہم کرے گا۔ مگر ان تمام کاموں کا فائدہ براہِ راست آپ کو پہنچے گا نجران کے باشندے دل سے اس کا احترام کرتے ہیں یہ کسی بھی ریاست کے لیے سلامتی کا نشان ہے۔ اس سے آپ کے اقتدار کی جڑیں مزید گہری ہو جائیں گی۔" وہ شخص والیٔ یمن کا ہمدرد تھا اس لیے بہترین مشورہ دے رہا تھا "میں نے شافعیؒ کو دیکھا ہے وہ دولت و اقتدار سے یکسر بے نیاز ہے۔ اس کے ذہن میں مخلوقِ خدا کی خدمت و اصلاح کے سوا کوئی تصور موجود نہیں واقعتاً اس کی آمد کے بعد نجران کی پیاسی زمین پر ابرِ کرم برسنے لگا ہے۔ شافعیؒ کو اس کے منصب سے ہٹانا زیادتی ہے۔ اگر آپ سرزمینِ عرب کا گوشہ گوشہ چھان ماریں گے تب بھی محمد بن ادریس جیسا نوجوان نہیں ملے گا۔ اسے اپنے قریب بلائیں' محبت سے گفتگو کریں وہ آپ کے بہت

کام آئے گا۔'' کہنے والے نے بے شمار بندشوں کے باوجود اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔

والیٔ یمن کا غصہ دوبارہ بھڑک اٹھا ''میرے کسی نمک خوار کو آج تک اتنی جرات نہیں ہوئی کہ وہ میری باتوں کو جھٹلا سکے۔'' والیٔ یمن کے لہجے سے شدید نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''آپ کی نمک خواری ہی کا حق ادا کر رہا ہوں ورنہ میں بھی خاموش رہ کر تماشائی بن جاتا۔'' اس شخص نے بے جھجک ہو کر کہا ''آپ کے الطاف و کرم کا یہی تقاضہ تھا کہ میں کسی نازک موقعے پر صحیح راستے کی نشان دہی کروں میرے خیال میں اب وہی سنگین لمحہ آ گیا ہے' آج تک آپ نے بے شمار فیصلے کیے بہت سے لوگ بلا سبب اپنی زندگی سے محروم ہو گئے' عزت و آبرو کھو بیٹھے' اعلیٰ مناصب سے معزول کر دیئے گئے مگر میں نے آپ کے کسی اقدام پر اعتراض نہیں کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آپ نے قہر و عتاب کا نشانہ بننے والوں میں شافعیؒ جیسا کوئی انسان نہیں تھا۔ یہ میری کم ہمتی تھی کہ میں آپ کے بڑھتے ہوئے دستِ ستم کو نہ روک سکا لیکن آج میں شافعیؒ کے بارے میں آپ کو یوم حساب سے ڈراتا ہوں۔ خدا کے لیے فرزندِ قریش کو اس کے راستے پر چلنے دیں۔ اقتدار و حکومت عارضی چیزیں ہیں مگر اس نوجوان کا عمل ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ ایک بار محمد بن ادریس کے چہرے کو غور سے دیکھیں۔ وہ عام انسانوں سے کتنا مختلف ہے۔ کیسا بے ضرر ہے؟ کیسا قلندر ہے؟ پھر بھی اگر آپ نجران میں شافعیؒ کا وجود برداشت نہیں کر سکتے تو اسے مکے کی گھاٹیوں کی طرف چلا... جانے دیں' وہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر اپنے لیے کوئی نہ کوئی گوشۂ عافیت تلاش کر لے گا......'' جوشِ جذبات میں اس شخص کی آواز لرزنے لگی تھی۔

والیٔ یمن اپنے ایک نمک خوار کے اس بے باک لہجے کو برداشت نہ کر سکا۔ کچھ دیر پہلے جس شخص کو ایک بااثر حاکم کے درباری ہونے کا شرف حاصل تھا اب اس شخص کو مجلسِ اقتدار سے شدید رسوائی کے ساتھ باہر نکالا جا رہا تھا مگر وہ جاتے جاتے بھی پرانی روایتوں کا حق ادا کر گیا ''میرے نکل جانے سے حقیقت تبدیل نہیں ہوگی' شافعیؒ میری طرح کسی حاکم کا کاسہ لیس نہیں ہے وہ اس زمین پر علم و کردار کی آبرو ہے اگر وہ کسی طرح آپ کے پنجۂ ظلم کی گرفت میں آ بھی گیا تو خلافتِ عباسیہ کی تاریخ... مزید سیاہ ہو جائے گی اسے یہاں سے چلے جانے کے لیے راستہ دے دیں۔ اگر واپسی کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے تو قیامت تک آپ کی بڑی رسوائی ہوگی۔''

پھر وہ شخص کہیں نظر نہیں آیا روایت ہے کہ اسے والیٔ یمن کے حکم پر قتل کر دیا گیا' قتل نامے پر دستخط کرنے سے پہلے فردِ جرم تحریر کی گئی کہ یہ شخص خلافتِ عباسیہ سے منحرف ہو چکا تھا اور درپردہ ہارون رشید



کے خلاف سازش کر رہا تھا۔ اقتدار پرستوں میں کس کو اتنی فرصت تھی کہ عائد شدہ الزام کی تحقیق کرتا۔ بس رات کے اندھیرے میں کچھ شمشیریں بے نیام ہوئیں اور ایک ایسے انسان کو تہہ تیغ کر دیا گیا جس نے جھوٹ اور مصلحت کے کوچے میں زندگی بسر کرنے کے باوجود آخری رات سچ بولنے کی کوشش کی تھی۔

نہ مدعی' نہ عدالت' حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا' رزقِ خاک ہوا

اس قتل کے بعد والیٔ یمن کے ہونٹوں کے سفاک مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی' مصاحب اور درباری مزید سہم گئے تھے پھر بھی کچھ ہوشمند لوگوں نے والیٔ یمن کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ امام شافعیؒ کو معزول کر کے اپنی نفرت کی آگ کو ٹھنڈا کر لے مگر یہ مشورہ اس کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ انسان کی جابرانہ فطرت بڑے بڑے عجیب رخ اختیار کرتی ہے والیٔ یمن بھی اپنے نفسِ امادہ کی تسکین کی خاطر اس انداز سے منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ پہلے امام شافعیؒ ذلت و رسوائی کے اذیت ناک مرحلے سے گزریں اور ساری دنیا ان کی بے کسی کا تماشا دیکھے۔ اور پھر کچھ دن اس مردِ جلیل کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے' اس سلسلے میں کچھ بے ضمیر مصاحبوں نے والیٔ یمن کو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ محمد بن ادریس کو یہاں بلا کر قتل کر دیا جائے۔ یہ بڑی سنگدلانہ تجویز تھی مگر والیٔ یمن نے اس پر عمل کرنے سے گریز کیا تھا۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ اگر والیٔ یمن' امام شافعیؒ کو معزول کر سکتا تو بہت پہلے کر چکا ہوتا۔ دراصل اسے ہوش اس وقت آیا جب طوفان سر سے گزر چکا تھا۔ امام شافعیؒ نے نہایت مختصر وقت میں اہلِ نجران کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ آپ ان کے دل و دماغ پر چھا کر رہ گئے تھے۔ پھر یہ شہرت نجران سے نکل کر دوسرے علاقوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ اس صورت میں امام شافعیؒ کا کرنا آسان نہیں تھا' ویسے والیٔ یمن اپنے آمرانہ حکم کے ذریعے یہ کام انجام دے سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں امامؒ کی معزولی کی خبر خلیفہ ہارون رشید تک نہ پہنچ جائے اور پھر خود والیٔ یمن کو جواب طلبی کے لیے بغداد نہ جانا پڑے۔ اس ذیل میں دوسرے حقائق یہ ہیں کہ والیٔ یمن فطری خباثت کے سبب امام شافعیؒ پر صرف اپنی برتری قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ محمد بن ادریس نجران میں کیا کر رہے ہیں مگر جب امام شافعیؒ نے مسلسل کئی مواقع پر والیٔ یمن کی سفارشات کو ٹھکرا دیا تو مزاجِ اقتدار اس ضرب گراں کو برداشت نہ کر سکا۔ اور جب فرزندِ قریش نے والیٔ یمن کو اس کے ظلم و تشدد سے روکنے کے لیے براہ راست نصیحت کی تو سفاکیوں کا عادی حکمران برہم ہو گیا۔ اب اسے اندازہ ہوا کہ محمد بن ادریس کتنا

جرات مند ہے اور اس کی یہ بے باکی مستقبلِ قریب میں کیا گل کھلائے گی۔ان تاریخی حقائق سے آگہی کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر شافعیؒ والئ یمن کے اعمال پر سخت نکتہ چینی نہ کرتے تو وہ بھی کبھی فرزندِ قریش کی طرف متوجہ نہ ہوتا...... اور پھر یہ سنگین صورتِ حال بھی پیدا نہ ہوتی بہر حال یہ محض انسانی قیاسات ہیں۔رسالت مآب ﷺ کے ایک قولِ مقدس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ

''اگر تم یہ سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس بات کا بہت امکان ہے لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ فلاں شخص کی فطرت بدل گئی ہے کہ تو اس پر ہرگز یقین نہ کرو۔''

والئ یمن کی شخصیت بھی اس فرمودہ رسولؐ کے مطابق تھی۔امام شافعیؒ نصیحت کرتے کرتے اپنی جان سے بھی گزر جاتے تو اس جابر حاکم کی فطرت تبدیل نہیں ہوتی پھر بھی امامؒ نے اہلِ ایمان کی روایت کا حق ادا کر دیا۔اور اسی حق کی ادائیگی نے والئ یمن کو فرزندِ قریش کی جان کا دشمن بنا دیا۔یہاں تک کہ اب اسے اس کے سوا کوئی کام نہیں تھا کہ وہ بساطِ سیاست بچھا کر مہروں کو آگے بڑھاتا رہے۔والئ یمن کوئی ایسی چال چلنا چاہتا تھا کہ امام شافعیؒ اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ جائیں اور خود اس کا دامن داغدار نہ ہونے پائے۔والئ یمن کے روز و شب اسی کشمکش میں گزر رہے تھے۔مگر اب تک کوئی محفوظ ترکیب اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔

اسی دوران حضرت امام شافعیؒ کو مادرِ گرامی کی یاد آنے لگی' چار سال سے آپ نے اس شفیق ہستی کے قرب کی حرارت محسوس نہیں کی تھی جس کی محبت کا ایک لمحہ ساری کائنات پر بھاری تھا۔امامؒ اس بے قراری کو تو روزِ اول سے محسوس کر رہے تھے مگر ذمے داریوں کے بوجھ نے آپ کو اس قدر تھکا دیا تھا کہ والدہ محترمہ کی یادیں بھی دھندلی ہونے لگی تھیں۔آخر کب تک؟ پھر دل و جاں کی گہرائیوں میں سمایا ہوا یہ اضطراب آہستہ آہستہ ابھرنے لگا اور فضاؤں میں ہر طرف پھیل گیا۔اب امام شافعیؒ کسی طرح بھی ان یادوں سے دامن کش نہیں ہو سکتے تھے' انجام کار آپ نے والی یمن کو ایک خط تحریر کیا:

''مجھے نجران میں بندگانِ خدا کی خدمت انجام دیتے ہوئے چار سال گزر چکے ہیں' میں نے اپنی ذمے داریوں کو کس حد تک نبھایا' اس کا اندازہ آپ ہی کر سکتے ہیں' ویسے محمد بن ادریس کو قدرت کی طرف سے جو استطاعت بخشی گئی تھی' اس کے مطابق میں نے قصداً کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا ہے پھر بھی اگر کسی مقام پر نادانستہ لغزش سرزد ہو گئی ہو تو خدا مجھے معاف کرے اور آپ کو ہدایت دے۔میں آج بھی کسی قسم کی تھکن کا احساس نہیں کر رہا ہوں لیکن مادرِ گرامی کے تصورِ فراق سے افسردہ و ملول ہوں۔خدا اور



رسولؐ کے فرمان کے مطابق انسان پر اس کی جان کے بھی کچھ حقوق ہیں۔میں اپنی ذاتی آسائش کے لیے آپ سے مہلت طلب نہیں کرتا مگر والدہ محترمہ کا اداس چہرہ اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے۔میں جانتا ہوں کہ وہ میری سربلندی اور کامرانی کے لیے زندگی بھر اپنے دلی اضطراب کا اظہار نہیں کریں گی لیکن مجھے تو یہ احساس ہونا چاہئے کہ ایک غم گسار ماں اپنے بیٹے کی جدائی میں کس قدر کرب میں مبتلا ہو سکتی ہے۔اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر مجھے کچھ دن کی رخصت درکار ہے۔میں مادرِ گرامی سے مل کر بہت جلد واپس آ جاؤں گا' اس عبوری وقت کے لیے آپ کسی دوسرے عامل کا انتظام کر لیں اور حکومت کو میری مزید خدمات کی ضرورت نہیں ہے تو میں اس سلسلے میں اصرار نہیں کروں گا' خدا بے نیاز ہے' وہ اپنے بندوں سے جس طرح چاہتا ہے کام لے لیتا ہے......والسلام:

جیسے ہی امام شافعیؒ کا یہ خط والئ یمن کے پاس پہنچا' وہ خلافِ عادت مسکرانے لگا پھر اس نے فوراً امام شافعیؒ کو جواب لکھا:

''محمد بن ادریس! میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں تم نے چار سال کے عرصے میں بڑے بڑے کام سرانجام دیئے ہیں تم نے اپنی مادرِ محترم کے سلسلے میں جن احساسات کا اظہار کیا ہے انہیں پڑھ کر مجھے تکلیف پہنچی۔ماں آخر ماں ہے۔اس کی بے قراریوں کو دنیا کا کوئی انسان اپنے فہم و تصور میں نہیں لا سکتا۔مجھے شکوہ ہے کہ تم نے یہ بات بہت پہلے کیوں تحریر نہیں کی۔میں تمہیں اس وقت بھی نہیں روکتا اور اب بھی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔تم پوری طمانیتِ قلب کے ساتھ مکہ جا سکتے ہو اور اپنی مرضی کے مطابق وہاں قیام بھی کر سکتے ہو۔میری طرف سے مکمل اجازت ہے اس کے ساتھ ہی میں تم پر یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری نظر میں عاملِ نجران کے عہدے کے لیے تم سے زیادہ مناسب شخص کوئی دوسرا نہیں ہے' وقتی طور پر میں اس منصب کے لیے کسی فرد کا تقرر کر دوں گا لیکن یہ عہدہ میری زندگی تک تمہارے لیے خالی رہے گا' تم جب بھی واپس آئے گے یہ کرسی تمہاری منتظر ہو گی۔اس کے علاوہ اگر تمہیں سفر کے لیے مزید رقم درکار ہو تو بلا تکلف مجھے لکھ دو۔فوری طور پر اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔''

والئ یمن کے خط کا ایک ایک لفظ عیاری اور نفاق سے لبریز تھا' وہ جابر و سفاک انسان جو اس زمین پر ایک لمحے کے لیے بھی امام شافعیؒ کا وجود برداشت نہیں کر سکتا تھا' اچانک اس طرح مہربان نظر آنے لگا تھا جیسے ساری دنیا میں اس کے سوا فرزندِ قریش کا کوئی ہمدرد ہی نہ ہو۔

امام شافعیؒ نے جواب پاتے ہی سفر کی تیاریاں شروع کر دی' والئ یمن نے اپنے خط میں جس مالی

اعانت کی پیش کش کی تھی' امامؒ نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی' فرزندِ قریش کی جانب سے درخواست کرنا تو کجا اگر خود والیٔ یمن آپ کے قدموں میں دولت کا ذخیرہ رکھ دیتا تب بھی امام شافعیؒ کی غیرت اس احسان کو قبول نہ کرتی۔ نتیجتاً امام ہر شے سے بے نیاز ہو کر مکے کی طرف روانہ ہو گئے۔

امام شافعیؒ نے اس سے پہلے بھی کئی سفر کئے تھے مگر یہ سفر آپ کے لیے بڑا اذیت ناک تھا۔ ہر طرف سے یادوں کا غبار اٹھ رہا تھا۔ اور امامؒ کے دل و دماغ پر چھاتا جا رہا تھا۔ مادرِ گرامی کا مقدس چہرہ بار بار ذہن میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ اسلام کی اس عظیم جانباز خاتون نے اپنی جوانی فرزندِ قریش کی تعلیم و تربیت میں اس طرح گم کر دی تھی کہ انسانی فطرت کا یہ پہلو بے نفس فرشتوں کو بھی حیران کر گیا ہوگا۔ اس تصور کے ساتھ ہی امامؒ کی روشن آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ پھر خیالات کی رو امامؒ کو دیارِ رسولؐ تک لے گئی جہاں امام مالکؒ زیرِ خاک سو رہے تھے۔ ایک بار فرزندِ قریش نے عراق کا طویل سفر اختیار کیا تھا اور واپسی میں امامِ مدینہ کی قدم بوسی کو حاضر ہوئے تھے۔ وہ ایک یادگار واقعہ تھا جو تاریخِ اسلام کے سینے پر نقش ہو کر رہ گیا تھا' مگر اس مرتبہ راستے کے سنگریزے' سرنگوں درخت اور گرم ہوائیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں...... ''شافعیؒ اب وہ شخص دنیا میں موجود نہیں ہے جس نے تمہیں علم و آگہی کے اس مقام تک پہنچایا ہے تمہاری روح کے ساتھ جسمانی آسائشوں کا خیال کرنے والا بہت دور جا چکا ہے۔'' جذبوں کی یلغار اتنی شدید تھی کہ امام شافعیؒ رونے لگے۔

''خدا امامِ مدینہ کو اپنی لامحدود رحمتوں کے دامن میں چھپالے اور انکی قبر کو اپنے بے شمار الطاف و کرم کے نور سے بھر دے۔''

امام شافعیؒ کی پرسوز آواز صحرا میں گونج رہی تھی مگر یہ ایسی گونج تھی جسے فرزندِ قریش خود ہی سن سکتے تھے' اہلِ قافلہ کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ یہ نوجوان کون ہے؟ کیوں رو رہا ہے؟ اور زیرِ لب کس سے گفتگو کر رہا ہے؟

''سلامتی ہو مالک بن انسؒ پر کہ اس سے محمد بن ادریس کا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر وہ عزیزوں سے زیادہ مہربان تھے۔ خدا کی رحمت نازل ہو' امامِ مدینہ کہ جن کے عکسِ جلال نے شافعیؒ کو شاہوں کے دربار سے بے نیاز کر دیا۔'' امامؒ زیرِ لب کہہ رہے تھے اور دل سے ناکام حسرتوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ امام شافعیؒ کی ذات میں جو بے نیازی' غیرت' امراء کے سامنے بے باکی اور سب سے بڑھ کر دل و جاں کا سوز و گداز نظر آتا ہے۔ وہ حضرت امام مالک بن انسؒ ہی عظیم شخصیت ہی



کا ایک عکس تھا۔ امام شافعیؒ کی ذہانت بے شک ایک عجوبہ روزگار شے ہے مگر روح کا اضطراب اور دل کی تڑپ' رقت اور گداز یہ اوصاف تو صدیوں میں کسی کسی انسان کو میسر آتے ہیں فرزندِ قریش کی فطرت میں چنگاریاں تو موجود تھیں مگر انہیں شعلگی کی قبا امام مدینہؒ کی محبتِ خاص نے پہنائی۔ یہ قلندروں کی طرح امام مالکؒ ہی کا عشقِ رسولؐ تھا جسے دیکھ کر امام شافعیؒ رو پڑے تھے۔ ایک بار روئے تو دل کی تمام سختیاں دور ہو گئیں اور پھر وہ رقتِ قلب پیدا ہوئی جس نے شافعیؒ کو شافعیؒ بنا دیا۔

امام اپنے استادِ گرامی کو یاد کر کے اشک ریزی کرتے رہے اور سفر تمام ہوتا رہا کبھی مادرِ مہربان کا چہرہ مبارک نظروں کے سامنے ابھر آتا تو امامؒ کے آنسوؤں میں کیف و نشاط کا رنگ بھی جھلکنے لگتا اور فرزندِ قریش بے اختیار پکار اٹھتے۔ ''اگر مادرِ گرامی بھی دنیا سے اٹھ جاتیں تو یہ زمین شافعیؒ کے لیے ایک مقبرہ بن جاتی۔''

یادوں کا غبار مسلسل اٹھ رہا تھا جس میں کچھ اور چہرے بھی نظر آ رہے تھے' ایسے چہرے جو نفاق و حسد کی تہ در تہ نقابوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ امامؒ نے ان سے بھی نفرت کا اظہار نہیں کیا' بس ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیا۔ یہی امامؒ کا کردار تھا' یہی امامؒ کی سیرت تھی وقت گزرتا رہا فاصلے مختصر ہوتے گئے' یہاں تک کہ امام شافعیؒ حدودِ حرم میں داخل ہو گئے۔

اب کی بار امامؒ کا استقبال کرنے والے بے شمار تھے۔ دنیا پرستوں کو اندازہ تھا کہ اس مرتبہ مکہ معظمہ میں داخل ہونے والا مفلس نوجوان محمد بن ادریس نہیں' عاملِ نجران ہے جس کے اشارے پر اقتدار کی قوتیں متحرک ہو سکتی تھیں۔ ایسا سوچنے والوں کا اپنا ایک انداز تھا۔ امام شافعیؒ عراق سے واپسی پر جب اپنے اہلِ وطن کے درمیان پہنچے تھے اور کوئی کلاہِ منصب آپ کے سر پر نہیں تھی اس وقت بھی امامؒ کسی کے سامنے شرمسار نہیں تھے...... آج جب خلافتِ عباسیہ کے ایک شریک کار کی حیثیت سے..... اہلِ شہر سے ملے تو اسی طرح کہ امامؒ کو نہ احساسِ سربلندی تھا اور نہ آپ کی گردن میں کوئی کجی نظر آتی تھی۔ امامؒ کل بھی عجز و انکسار کا پیکر تھے اور آج بھی ایک عام انسان کی مانند سر جھکائے ہوئے مادرِ گرامی کی جانب بڑھ رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ امام شافعیؒ مادرِ مہربان کی آغوشِ محبت میں سما جاتے' فاطمہ بنت عبداللہ نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے فرزند کو روک دیا۔ ''محمد! کیا آزمائش کے یہ چار سال تم نے سلامتی کے ساتھ گزارے ہیں؟'' مادرِ گرامی نے امامؒ سے سوال کیا۔ ''کیا اس عرصے میں کوئی ایسا لمحہ بھی گزرا ہے کہ تم سرورِ کونینؐ کی

سنت سے بے خبر ہو گئے ہو؟''

بڑا عجیب سوال تھا۔ امام شافعیؒ فوراً کوئی جواب نہ دے سکے' چند لمحوں تک سوچتے رہے پھر بہت آہستہ لہجے میں کہنے لگے''مادرِ گرامی! محمد بن ادریس یہ تصور نہیں کر سکتا کہ وہ قصداً تارکِ سنتؐ کہلائے۔ پھر بھی میں سہواً کسی کوتاہی کا شکار ہو سکتا ہوں اگر مجھ سے کوئی لغزش ہوئی ہے تو خدا معاف کرنے والا ہے کہ سب کچھ اسی کے رحمت کے دائرے میں گردش کر رہا ہے۔''

''محمد! غور سے اپنے لباس کی طرف دیکھو'' فاطمہ بنت عبداللہ کا لہجہ اس قدر پُرجلال تھا کہ امام شافعیؒ لرز کر رہ گئے''تم نے چار سال میں بے شمار مقدمات کے فیصلے کیے ہوں گے' کہیں تمہارے دامن پر بندگانِ خدا کے خون کی کوئی چھینٹ تو نہیں ہے؟''

''اُمِ محترم! خدا نے میری قبا کو اس داغ سے محفوظ رکھا ہے۔'' مادرِ گرامی کے بے انتہا ادب کے باعث امام شافعیؒ کی آواز میں اب بھی ہلکی سی لرزش باقی تھی۔'' آپ یقین کیجیے میرا دامن صاف ہے۔''

فاطمہ بنت عبداللہ کا چہرہ جو کچھ دیر پہلے تک کسی چٹان کی مانند سخت نظر آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ مامتا کے مہکتے ہوئے گلزار میں تبدیل ہونے لگا پھر آپ کے دونوں ہاتھ بلند ہو گئے۔''محمد! میرے قریب آ جاؤ'' امامؒ بے اختیار آگے بڑھے اور اس آغوش میں سما گئے جو اپنی محبت اور ایمان کے سبب زمین و آسمان سے بھی کشادہ تھی۔''شافعیؒ! میں نے اسی دن کے لیے خدا سے تیری جوانی کی دعائیں مانگی تھیں۔ بے شک وہ کریم ہے کہ اس نے میری دعاؤں کو بابِ قبولیت سے واپس نہیں لوٹایا'' یہ کہتے کہتے فاطمہ بنت عبداللہ رونے لگیں' امام شافعیؒ حیرت زدہ رہ گئے آپ نے مادرِ مہربان کو اپنی چونتیس سالہ زندگی میں پہلی بار روتے ہوئے دیکھا تھا۔ امامؒ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوہسار رو رہا ہو' سنگلاخ چٹانوں میں شگاف پڑ گئے ہوں اور کسی صحرا کے قلب میں کوئی چشمہ ابل پڑا ہو' پھر امامؒ نے والدہ محترمہ کی رقت آمیز صدا سنی۔ فاطمہ بنت عبداللہ آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں اور ان کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

''اے خدائے لم یزل! اے عزیز و جلیل! میں محمد بن ادریس سے راضی ہوں' تو بھی اس سے راضی ہو جا۔''

یہ فرزندِ قریش کی زندگی کے سب سے عجیب لمحات تھے۔ امامؒ کو محسوس ہو کہ جیسے فلک سے کوئی روشنی زمین پر اتری ہو اور پھر اس نے امامؒ کو اپنے حصار میں لے لیا ہو' ہوش و خرد کے بیس سالہ دور میں یہ سکون کی ایک ایسی ساعت تھی جس کا احساس امامؒ کو پہلی بار ہوا تھا۔



اس جذباتی مرحلے سے گزرنے کے بعد امام شافعیؒ نے مادرِ گرامی کو کچھ نقد رقم پیش کی۔''چار سال میں بمشکل تمام بس اتنا ہی سرمایہ جمع کر سکا ہوں کہ آپ اپنی چار دیواری کو رہن کی زنجیروں سے آزاد کرا لیں۔'' امام شافعیؒ کا لہجہ اداس تھا۔''اگر مجھے یہ احساس نہ ہوتا کہ میرے آبائی مکان کی دیواریں غیروں کے احسانات کے بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں تو شاید میرے دامن میں ایک درہم بھی نہ ہوتا۔''

''بس فرزند! یہ کافی ہے۔'' مادرِ گرامی نے امامؒ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا''سرائے میں رہنے والوں کو مستقل قیام کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔'' یہ دنیا کی بے ثباتی کی طرف ایک واضح اشارہ تھا جسے امام شافعیؒ نے فوراً ہی سمجھ لیا اور آپ کے چہرے پر طمانیت کا گہرا رنگ نمایاں ہو گیا حقیقت تو یہ ہے کہ امامؒ کی بے نیازی کو قلندری تک پہنچانے میں فاطمہ بنت عبداللہ کا بڑا ہاتھ تھا۔ اگر آپ کی مادرِ گرامی بچپن ہی سے دولت کی ترغیب دیتیں تو امام شافعیؒ کی آزاد فطرت اس تحریص کا تاثر قبول کیے بغیر نہ رہتی۔ یہ فرزندِ قریش کی خوش نصیبی تھی کہ آپ کو ایک قناعت پسند' غیور اور علم دوست ماں کی آغوشِ محبت میسر آئی۔ پھر اسی عظیم خاتون کی حنا بندی نے حدیث و فقہ کے لالہ صحرائی کو عظیم تر بنا دیا۔

☆☆☆

اِدھر حضرت شافعیؒ مکہ معظمہ میں اپنے اساتذہ' اہلِ علم اور احباب کے درمیان سلطنت کے انتظامی امور سے بے نیاز ہو کر سکون کے چند لمحے گزار رہے تھے' اور اُدھر والیٔ یمن رات رات بھر جاگ کر اپنے منصوبوں کے مختلف خاکوں میں عیاریوں کا رنگ بھر رہا تھا۔ اب تک والیٔ یمن نے امام شافعیؒ کے خلاف کئی منصوبے تیار کیے تھے مگر جب تکمیل سے پہلے ان کا بغور جائزہ لیا جاتا تو کوئی نہ کوئی خامی نظر آ جاتی اور پھر وہ سفاک حاکم سارے منصوبوں کو اپنے ذہن سے کھرچ دیتا۔ اس کے خیال میں قدرت نے یہ ایک سنہری موقع فراہم کیا تھا کہ امام شافعیؒ نجران سے بہت دور تھے اور آپ کی اس غیر حاضری سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا' والیٔ یمن گزرتے ہوئے ایک ایک لمحے کو اپنے استعمال میں لانا چاہتا تھا مگر اب تک اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ شکار، دام کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن ابھی زیرِ دام نہیں آیا تھا۔ والیٔ یمن کے اضطراب میں ہر لحظہ شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی' اس کے دن بے قرار اور راتیں بے خواب تھیں۔

آخر تاریخِ اسلام کی وہ سنگین ساعت آ گئی جب والیٔ یمن کے چہرے پر دل کی ساری کثافتیں اور منافقانہ جذبے نمایاں ہو گئے۔ اس کا منصوبہ تکمیل کے مراحل تک پہنچ چکا تھا۔ والیٔ یمن کئی دن تک اس

منصوبے کے ایک ایک پہلو پر غور کرتا رہا۔ حیرت ناک بات یہ تھی کہ اس نے اپنے منصوبے میں کسی وفادار مصاحب یا مشیر کو بھی شریک نہیں کیا تھا۔ اس کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے سائے سے بھی گریزاں رہتا تھا۔ اور رات کے سناٹے میں ایک بند کمرے میں کاغذات پر اپنی سازشوں کو منتقل کرتا رہتا تھا اور جب ان میں کوئی کمی پاتا تھا تو سازش کا یہ سارا دفتر نذرِ آتش کر دیتا تھا' انجام کار وہ اپنے خوف ناک مقصد تک پہنچ گیا اور جب اس کے منصوبے کے تمام گوشے روشن ہو گئے تو والیٔ یمن نے نصف شب کی تاریکی میں چیختے ہوئے کہا۔

''اب اس قریش زادے کو دنیا کی کوئی طاقت تہہ تیغ ہونے سے نہیں بچا سکتی' آج اس کا علم' اس کی ذہانت' اس کا تقویٰ' اس کا نسب نامہ میرے قدموں کے نیچے ہے' وہ بڑا منطقی ہے مگر اس کی کوئی دلیل خلافتِ عباسیہ کی شمشیر کو بے نام ہونے سے نہیں روک سکتی۔ وہ دوسروں کے مسائل کا مشکل کشا ہے مگر اسے نہیں معلوم کہ عنقریب وہ خود کس مسئلے پر دوچار ہونے والا ہے'' والیٔ یمن کچھ دیر تک بڑے وحشیانہ انداز میں اپنے منصوبے کی ہولناکیوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر اس نے مسلح دربانوں میں سے ایک کو اپنے خلوت کدے میں طلب کرتے ہوئے کہا ''تم اسی وقت محرّر کے گھر پہنچو اگر وہ سو رہا ہو تو اسے نیند کی وادیوں سے کھینچ کر میرے روبرو حاضر کرو۔''

مسلح دربان لرزتا ہوا والیٔ یمن کے خلوت کدے سے باہر آیا اور فوراً ہی ایک برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر سرکاری محرر کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ دن بھر کے کاموں کے بوجھ سے تھکا ہوا محرر چند لمحوں کی آسودگی کے لیے وادیٔ خواب میں گم تھا مگر والیٔ یمن کے قاصد نے اس سے نیند کی یہ عارضی مہلت بھی چھین لی۔ اور کچھ دیر بعد وہ اپنے حاکم کے سامنے اس طرح دست بستہ کھڑا تھا کہ جسم کے ساتھ اس کی روح بھی لرز رہی تھی۔ ایک طویل ملازمت کے دوران یہ پہلا موقع تھا کہ والیٔ یمن نے اسے رات کے اندھیرے میں ہنگامی طور پر طلب کیا تھا۔ سرکاری محرّر صورت حال کی سنگینی کو تو سمجھ چکا تھا مگر اسے حضورِ حاکم لب کشائی کی جرات نہیں تھی۔

''سنو! پورے ہوش و حواس کے ساتھ سنو۔'' آخر والیٔ یمن کی ہیبت ناک آواز گونجی۔ ''میں امیر المومنین کے نام ایک اہم سرکاری خط ارسال کرنا چاہتا ہوں۔ اس خط کے ایک ایک حرف کی قیمت تمہاری زندگی سے زیادہ ہے۔'' یہ کہہ کر والیٔ یمن نے سرکاری محرر کے کانپتے ہوئے جسم پر نظر ڈالی' خوف و دہشت کی فضا اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی' محرر چند لمحوں تک کسی نہ کسی طرح برداشت کرتا رہا مگر پھر اس



کے پاؤں جواب دے گئے اور وہ لڑکھڑا کر اقتدار کے سنگی فرش پر گر پڑا۔ خلوت کدے میں والیٔ یمن کا مغرور قہقہہ گونج اٹھا۔

''میں اپنے غلاموں سے اسی وفاداری کی توقع رکھتا ہوں' اپنے قدموں پر دوبارہ کھڑے ہونے کی کوشش کرو۔'' والیٔ یمن کی سفاک آواز ابھری۔ تم اس حقیقت سے بھی باخبر ہو کہ میں اپنے نمک خواروں پر کس قدر مہربان رہتا ہوں۔ میرے قہر کا مظاہرہ تو صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو حکومت کے کسی راز کو فاش کر دیتے ہیں۔''

محرّر نے والیٔ یمن کے الفاظ سنے اور پھر اپنی شکستہ قوتِ ارادی کو سمیٹ کر اٹھنے لگا ''تم شاید میرے حضور کھڑے نہ رہ سکو۔ مجبوراً یہ بے ادبی اور گستاخی بھی گوارا ہے' سامنے کی نشست پر بیٹھ جاؤ اور غور سے میری باتیں سنو کہ میں نے رات کے پچھلے پہر تمہیں کیوں بلایا ہے؟''

محرّر بمشکل تمام اپنی جانِ ناتواں کو گھسیٹتا ہوا اس کرسی تک لے گیا جو خلوت کدے کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی تھی۔

''وہ خط جو ابھی کچھ دیر بعد تم تحریر کرو گے ایک سربستہ راز ہے۔ کاغذ پر منتقل ہونے کے باوجود وہ تمہارے سینے میں اس وقت تک محفوظ رہے گا جب تک تم زیرِ زمین نہیں چلے جاؤ گے۔'' والیٔ یمن نے ایک بار پھر سرکاری محرّر کی طرف دیکھا' آمریت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسان نے بڑی مشکل سے اثبات میں گردن کو جنبش دی اور پھر اپنی غلامی کی تصدیق کرنے کے لیے سر کو جھکا لیا۔ ''اگر یہ راز تمہارے ہونٹوں کی قید سے آزاد ہوا تو اس بددیانتی کی سزا بھی بڑی عجیب ہو گی۔ میں براہِ راست تمہیں قتل نہیں کروں گا' تم پر موت اس طرح مسلط کی جائے گی کہ زندہ ہوتے ہوئے بھی تمہیں ہر روز اپنے عالمِ نزع کا احساس ہو گا پہلے تمہاری بیوی کی سانسیں غصب کی جائیں گی پھر تمہارے بچے خون میں نہائیں گے......''

اگرچہ کسی حکمران کی گفتگو میں مداخلت کرنا ایک سنگین جرم ہے لیکن سرکاری محرّر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور بے اختیار بول پڑا۔ ''میرا ماضی گواہ ہے کہ میں والیٔ یمن کے نمک خواروں میں ہوں اور میرے مستقبل کے گلے میں بھی آپ ہی کا طوقِ غلامی نظر آئے گا اگر بے اعتبار ٹھہرا تو آپ کے حلقۂ اثر سے نکل کر کہاں جاؤں گا؟'' محرّر کی زبان سے ایک ایک لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہا تھا۔

والیٔ یمن کے ہونٹوں کی مسکراہٹ لوٹ آئی مگر اس طرح کہ جیسے مورت ہنس رہی ہو پھر اس نے محرر

کو وہ خط تحریر کرنے کا حکم دیا جو اپنی جارحیت، سفاکی اور دروغ کے سبب تاریخ کا ایک داغ بن کر رہ گیا ہے، اس خط کی اصل عبارت درج کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ قارئین دوسری صدی ہجری کے آخری عشرے کی سیاست کے مزاج کو سمجھ لیں پھر انہیں والئ یمن کے ناپاک منصوبے کے سنگدلی کا صحیح اندازہ ہوگا۔ تاریخ کے طالب علم اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ بنو عباس نے خلفائے بنو امیہ کی قبریں کھود کر اور ان کی ہڈیاں جلا کر اقتدار حاصل کیا تھا، ابو العباس سفّاح خلافتِ عباسیہ کا پہلا حکمران تھا جس نے انتہائی ظلم وتشدد کی بنیادوں پر اپنے اقتدار کی عمارت بلند کی۔ سفاح دنیا سے رخصت ہوا تو ابو جعفر منصور نے درندگی کے اس کاروبار کو یہاں تک فروغ دیا کہ تاریخ اسلام میں سفاکی کی روشن ترین علامت ٹھہرا۔ منصور ہی کے زمانے میں ساداتِ علوی کے ایک معزز فرد محمد نفس زکیہ نے خلافتِ عباسیہ کے آئینی وجود سے انکار کر دیا اور اپنی رائے کے اظہار کے لیے شمشیرِ بے نیام کر لی۔ محمد نفس زکیہ خاندانِ رسالت مآبؐ سے قربت کے سبب خود کو خلافت کا جائز حقدار سمجھتے تھے۔ نتیجتاً بنو عباس اور ساداتِ علوی کے درمیان خوفناک تصادم ہوا، محمد نفس زکیہ اس قدر شجاعت سے لڑے کہ جانفروشی کی نئی تاریخ رقم کی مگر بعض مبصرین کے خیال کے مطابق فنونِ جنگ سے ناواقفیت کے سبب شہید ہوگئے۔ ابو جعفر منصور فاتح قرار پایا اور پھر علویوں کی بیخ کنی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ منصور کے بعد خلیفہ مہدی اور ہادی تک یہی سیاسی کشمکش جاری رہی پھر ہارون رشید کا دور آیا۔ اگرچہ اس خاندانی نفرت میں پہلے جیسی شدت باقی نہیں رہی تھی لیکن پھر بھی بنو عباس، علویوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔

والئ یمن بھی اس راز سے واقف تھا کہ مکمل اقتدار حاصل ہونے کے باوجود خلیفہ ہارون رشید ''علوی تحریک'' کے نام سے خوف زدہ رہتا ہے۔ بس اسی نقطے کو بنیاد بنا کر اس نے امام شافعیؒ کے خلاف سازش کا ایک دائرہ کھینچنا شروع کر دیا پھر اسی دائرے نے ایک پیچیدہ اور خوف ناک منصوبے کی شکل اختیار کر لی۔

جب سرکاری محرر کے اعصاب پرسکون ہوگئے تو والئ یمن نے بلند آواز میں بولنا شروع کیا۔

''خاندانِ بنو عباس کے عظیم جانشین خلیفہ ہارون رشید کے نام۔

ایک خادم کا مکتوب جسے ولایتِ یمن کے اعزاز سے شرف یاب کیا گیا۔

امیر المومنین پر خدا کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں۔ اور ابنِ مہدی کے دشمنوں پر ہلاکت وقہر کا آسمان ٹوٹے خدا خلیفۂ وقت کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابو العباس سفاح اور حضرت ابو جعفر منصور کی قبروں کو روشن



کرے کہ ان کی بے پناہ قوت وذہانت نے علویوں کے ہر دعوے کو باطل ثابت کیا اور انھیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ پھر کبھی تختِ خلافت کی آرزو کر سکیں، خدا میدانِ حشر میں امیر المومنین کے والدِ محترم حضرت مہدی بن منصور کا درجہ بلند کرے کہ ان کی جانفشانیوں کے باعث آپ کے راستے کے تمام بھاری پتھر ہٹا دیے گئے، حضور کے مخبروں اور جاسوسوں نے اب تک جو اطلاعات فراہم کی ہیں ان کے مطابق اس زمین پر علویوں کے لیے کوئی پناہ گاہ موجود نہیں۔ مگر اس نمک خوار کو باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ابھی یہ تحریک مکمل طور پر دفن نہیں ہوئی ہے۔ خلافتِ عباسیہ کے بدخواہ زیرِ زمین رہ کر فتنوں کی پرورش کر رہے ہیں۔ امیر المومنین کو اپنے اس وفادار خادم کی بات پر یقین کر لینا چاہئے کہ یہاں ''علوی تحریک'' کے نو سر بر آوردہ لوگ موجود ہیں جنہیں شافع مطّلبی کا لڑکا مسلسل گمراہ کر رہا ہے۔ اور اب صورتحال یہ ہے کہ خلافتِ عباسیہ کے خلاف یہ نفرت بند کمروں سے نکل کر شاہراہوں تک پہنچنے والی ہے۔''

اتنا کہہ کر والئ یمن خاموش ہوگیا۔ اس کا فریب کار ذہن اپنے منصوبے کے دھندلے خاکوں میں مزید رنگ بھرنے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ محرّر کا قلم بھی رک گیا اور خلوت کدے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔

کچھ دیر بعد والئ یمن کے ہونٹوں کو پھر جنبش ہوئی اور محرّر کا فرمانبردار قلم روانی کے ساتھ چلنے لگا۔

''مجھے اندیشہ ہی نہیں یقین ہے کہ یہ لوگ ایک دن ضرور آمادہ پیکار ہوں گے۔ ابھی یہ تمام افراد بڑی رازداری کے ساتھ متحد ہو رہے ہیں اور اس لمحۂ خاص کا انتظار کر رہے ہیں جب خلافتِ عباسیہ کی بنیادوں پر لگائی جانے والی ضرب کارگر ثابت ہو سکے۔ یہ سب کے سب نہایت ذہین وعیار ہیں، میرے اندازے کے مطابق مفسدین کا یہ گروہ اس وقت خروج کرے گا جب اسے اپنی فتح وکامرانی میں کوئی شک باقی نہیں رہے گا۔ اب میں اس علوی زادے کی فتنہ پردازیوں کا تفصیلی ذکر کرتا ہوں جو تحریکِ بغاوت میں پس پردہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

امیر المومنین اپنے اس خادم کی بات کو یوں سمجھنے کی کوشش کریں کہ اگر تمام باغیوں کو ایک جسم قرار دیا جائے تو وہ مطّلبی نوجوان دماغ کا کام کر رہا ہے اس کا نام محمد بن ادریس ہے اور وہ عام طور پر شافعی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ میں نے اسے عاملِ نجران کا عہدہ دے کر ہمیشہ کے لیے خاموش کرنا چاہا تھا مگر وہ سخت ناشکر گزار انسان ہے ایک بار جب میں کسی سرکاری کام سے مکہ گیا تھا تو کچھ معززینِ شہر نے اس نوجوان کی مجھ سے سفارش کی تھی۔ اس وقت یہ فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہا تھا، میرا خیال تھا کہ عاملِ نجران

کا عہدہ اسے احسان شناس بنا دے گا لیکن میرے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔ یہ قریش زادہ آسودگی پاتے ہی کچھ اور سرکش ہو گیا۔ اب اس کی کج روی کا یہ حال ہے کہ انتظامی امور کے سلسلے میں نہ وہ میرا حکم مانتا ہے اور نہ میری پابندیوں کو خاطر میں لاتا ہے۔ امیر المومنین نے اپنے کرم سے مجھ ناتواں کو جو طاقت بخشی ہے میں اسی طاقت کے ذریعے شافعیؒ کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتا تھا۔ مگر میں اپنے ارادے سے محض اس لیے باز رہا کہ اس قریش زادے کے قتل کے بعد باغیانہ تحریک کے کئی گوشے بے نقاب ہونے سے رہ جاتے میں نے شافعیؒ کی گستاخیاں صرف خلافتِ عباسیہ کی خاطر برداشت کی ہیں تا کہ یہ خوفناک ذہن رکھنے والا مجرم مکمل طور پر روشنی میں آجائے۔''

اتنا کہہ کر والیٔ یمن ایک بار پھر خاموش ہو گیا اور سرکاری محرر کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکائے حکم کی تعمیل میں مصروف تھا اسے اتنی تو خبر تھی کہ یہ سب کچھ عاملِ نجران کے خلاف لکھا جا رہا ہے' مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ شافعیؒ کون ہے اور واقعتاً وہ مجرم ہے یا اسے جبراً کھینچ کر سیاست کے مقتل کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ اس لمحاتی وقفے میں والیٔ یمن کی پیشانی پر کئی فکر انگیز علامتیں ابھر کر ڈوب چکی تھیں۔ اس کا غبار آلود ذہن حضرت امام شافعیؒ کے لباسِ تقدس کو مزید داغ دار کرنے کے لیے سازش کے نئے رنگ تلاش کر رہا تھا۔ آخر کچھ دیر بعد والیٔ یمن کی آواز گونجنے لگی۔

''امیر المومنین! آپ اس قریش زادے' محمد بن ادریس سے واقف نہیں وہ ایسا فصیح البیان ہے کہ اگر آلام و مصائب کی تعریف کرنے پر آجائے تو اہلِ دنیا کیف و نشاط کو ترک کر کے رنج والم کو گلے سے لگالیں۔ وہ لوگوں کے ذہن بدل دینے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتا ہے' وہ ایسا بلیغ اللسان ہے کہ عرب کے برگزیدہ ادیب و شاعر بھی اس کے سامنے عجمی (گونگے) نظر آتے ہیں وہ ایسا منطقی ہے کہ اگر کسی مجمع کے سامنے دن کو رات کہنے لگے تو ہجوم انسانی اپنی گردنیں جھکا لے اور کسی شخص میں اتنی جرات نہ ہو کہ وہ اس کی بات جھٹلانے کے لیے ہونٹ کو جنبش بھی دے سکے۔ اس کی تقریر ساحرگی کے درجے تک پہنچ گئی ہے۔ اس نے بے شمار انسانوں کو سحر زدہ بنا دیا ہے۔ حضور والا! اس نکتے پر توجہ فرمائیں کہ شافعی کی زبان میں وہ جراحت ہے جو ایک سپاہی کی تلوار کو بھی میسر نہیں۔ وہ تنہا ایک فوج کا کردار انجام دے رہا ہے اور اپنے الفاظ سے آپ کے عقیدت مندوں کو بے دریغ قتل کر رہا ہے اگر محمد بن ادریس کو نہیں روکا گیا تو اس گناہ گار کے خیال کے مطابق خوفناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ خدا امیر المومنین کے جلال کو حاسدین کی نگاہِ بد سے محفوظ رکھے اور قصرِ عباسیہ کے بلند میناروں پر کبھی اندیشۂ زوال سایہ فگن نہ ہو۔''



خط تکمیل پا گیا اور سازش مکمل ہو گئی۔

''اب والیٔ یمن کے نافرمان کو خونین موت کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔'' جابر و سفاک حاکم اپنے خفیہ پیغام کو کاغذ پر منتقل کرانے کے بعد سرکاری محرر سے مخاطب ہوا ''کیا کوئی بچا سکتا ہے؟'' اگرچہ والیٔ یمن اپنے منصوبے کی کامیابی پر سو فیصد یقین رکھتا تھا لیکن پھر بھی کسی نامعلوم اندیشے کے زیرِ اثر وہ ایک معمولی ملازم سے یہ سوال کر رہا تھا۔

''ہرگز نہیں۔'' سرکاری محرر وحشت زدہ لہجے میں بولا ''اگر اس زمین پر آپ کسی کو اماں نہیں دے سکتے تو پھر ساری دنیا میں اس کے لیے پناہ گاہ موجود نہیں۔'' بظاہر یہ ایک بدترین اقرار تھا۔ شرمناک تصدیق تھی مگر سرکاری محرر' والیٔ یمن کے روبرو بالکل بے دست و پا تھا۔ وہ حاکم کی رائے سے اختلاف کر کے اپنے قتل نامے پر دستخط نہیں کر سکتا تھا۔

''بے شک! میں نے شافعیؒ کے سر سے عافیت کا سائبان کھینچ لیا ہے۔'' والیٔ یمن نے سرکاری محرر کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''اب قریش زادے کو مصائب کی کڑی دھوپ میں جلنا ہے' ایسی دھوپ جو اس کے دل و دماغ کو پگھلا کر رکھ دے گی۔'' والیٔ یمن کے لہجے میں ایسی طمانیت تھی جیسے اس نے اپنی آنکھوں سے حضرت امام شافعیؒ کو قتل ہوتے دیکھ لیا ہو۔ پھر تہمت اور جھوٹ کا یہ دفتر خلیفہ ہارون رشید کے پاس بغداد بھیج دیا گیا۔ عباسی حکمراں اپنے قصرِ زرنگار میں دولت و اقتدار کی فراوانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک اسے والیٔ یمن کے خفیہ پیغام کی خبر ملی۔ یہ ابتدائے شب کے لمحات تھے اس لیے ہارون رشید نے والیٔ یمن کے قاصد کو کوئی اہمیت نہیں دی اور یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ اسے کل صبح دربار میں حاضر کیا جائے۔ قاصد خلیفۂ وقت کا جواب سن کر پریشان سا نظر آنے لگا۔ والیٔ یمن نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر امیر المومنین سے رابطہ کرے اور تنہائی میں یہ دستاویز ان تک پہنچا دے۔ اس ہدایت کا خیال آتے ہی قاصد نے تحریری طور پر ہارون رشید سے درخواست کی کہ اسے ہر حال میں شرفِ ملاقات بخشا جائے' ایک محکوم شخص کی طرف سے یہ اصرار بڑا معنی خیز تھا۔ ہارون رشید نے فوراً سمجھ لیا کہ اتنی دور سے آنے والا کیا چاہتا ہے؟ نتیجتاً کچھ دیر بعد والیٔ یمن کا قاصد ہارون رشید کی خلوت گاہ میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

پھر قصرِ عباسی کے در و دیوار نے دیکھا کہ حکومت کا ایک کارندہ اپنے امیر کو کچھ کاغذات منتقل کر رہا تھا۔ یہ بڑی سنگین ساعت تھی۔ ہارون رشید والیٔ یمن کی بھیجی ہوئی خفیہ دستاویز کا خود مطالعہ کر رہا تھا۔

اپنے آباؤ اجداد کی شان میں ستائشی کلمات پڑھ کر اس کے چہرے پر احساسِ غرور کی ایک روشن علامت ابھری اور خوشی کا ایک تیز رنگ بکھر گیا۔ مگر یہ حالتِ سکون بہت عارضی تھی' ہارون رشید یکایک اپنی نشست سے پہلو بدلنے لگا پھر چہرے سے شدید اضطراب کی جھلک نمایاں ہونے لگی' والیٔ یمن کا خط اپنے انجام کے قریب تھا۔ آخری سطریں پڑھتے پڑھتے عباسی خلیفہ کا اضطراب کیفیتِ غضب میں تبدیل ہو گیا' یہاں تک کہ ہارون رشید نے والیٔ یمن کے ارسال کردہ مسودے کو فرش پر پھینک دیا۔ ''کیا عقل کے ان دشمنوں کو اپنے پیش روؤں کا حشر یاد نہیں؟'' حالتِ غیظ میں ہارون رشید کی آواز اتنی بلند ہو گئی تھی کہ قاصد کو محل کے بام و در لرزتے محسوس ہو رہے تھے۔

ایک روایت ہے کہ والیٔ یمن کا خط پڑھنے کے بعد ہارون رشید نے خادمِ خاص کو اسی وقت طلب کر کے اپنے قلم سے حکم نامہ تحریر کیا: تمام مفسدین کو مع شافعیؒ کے بغداد بھیج دو۔'' اس روایت کے مطابق والیٔ یمن کو حکم دیا گیا تھا کہ تحریک کے نو سر برآوردہ افراد کے ساتھ امام شافعیؒ کو بھی گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا جائے۔ صورتحال کی سنگینی کا یہ عالم تھا کہ خلیفۂ وقت کا فرمان لے کر قاصد اسی رات یمن روانہ ہو گیا تھا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ ہارون رشید نے والیٔ یمن کے خط کو نہایت سکون سے پڑھا۔ اس دوران میں خلیفہ کے چہرے پر نفرت و غضب کے پریشان سائے تو نظر آئے مگر اس نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا جیسے عباسی حکمران یہ تاثر دینا چاہتا ہو کہ اس کے نزدیک علوی تحریک کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس روایت کے مطابق ہارون رشید نے والیٔ یمن کے قاصد کو بغداد میں کئی دن تک ٹھہرایا۔ پھر یہ فرمان جاری کیا۔

''پہلے تمام باغیوں کو ایک مقام پر جمع ہونے دو پھر نہایت ہوشیاری سے ان سب کو زنجیریں پہنا کر میرے حضور بھیج دو۔'' نتیجتاً جب حضرت امام شافعیؒ مادرِ گرامی سے مل کر واپس نجران آ گئے اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے تو ایک دن والیٔ یمن نے آپ کو گرفتار کرا لیا۔ امامؒ کے ساتھ ہی وہ نو افراد بھی پابندِ سلاسل کر دیے گئے جن کا ذکر والیٔ یمن نے اپنے خط میں کیا تھا۔

اس سلسلے میں تیسری روایت یہ ہے کہ امام شافعیؒ اس وقت گرفتار کیے گئے جب آپ مکہ معظمہ میں موجود تھے۔ بیشتر مورخین کے خیال میں یہی روایت زیادہ قرین قیاس ہے' خود حضرت امام شافعیؒ نے اس المناک واقعے کو بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

''میں اس وقت والدہ محترمہ کی قدم بوسی کے لیے مکہ معظمہ حاضر ہوا تھا' اسی دوران فتنہ پردازوں



نے نئی سیاسی ہنگامہ آرائی شروع کر دی' خلیفہ ہارون رشید تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ اہلِ مکہ نے یمن سے ایک علوی زادے کو بلایا ہے۔ پھر دوسری اطلاع یہ فراہم کی گئی کہ وہ علوی زادہ مکہ معظمہ پہنچ گیا ہے اس کے آتے ہی قریش کی ایک جماعت اپنے سیاسی عزائم لے کر شخصِ مذکور کے گرد جمع ہونے لگی ہے۔ پھر خلیفہ کو بتایا گیا کہ قریش کی یہ جماعت اس علوی زادے کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتی ہے تاکہ یہ تحریک شدت کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔ ان ساری گمراہ کن اطلاعات نے عباسی خلیفہ کے مزاج کو برہم کر دیا اور وہ انتہائی قہر کے عالم میں یحییٰ بن خالد برمکی سے مخاطب ہوا۔

''عاملِ مکہ کو لکھو کہ اس حکم کی فوراً تعمیل کی جائے۔ وہ تین سو قریش جو سلطنتِ عباسیہ کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں انہیں اس حالت میں بغداد بھیج دیا جائے کہ ان کے ہاتھ گردنوں سے بندھے ہوئے ہوں۔''

حضرت امام شافعیؒ نے اس شخص کی طرف واضح اشارہ نہیں کیا جو درپردہ یہ ساری اطلاعات خلیفہ ہارون رشید کو پہنچا رہا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ امام شافعیؒ نے اپنا سفرنامہ بہت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور یہ سفرنامہ بھی ان کے شاگرد خاص ربیع بن سلیمان نے (غالباً امامؒ کی وفات کے بعد تحریر کیا تھا۔ اس طرح اس بات کے روشن امکانات پائے جاتے ہیں کہ کچھ واقعات اور شخصیات' ربیع بن سلیمان کے حافظے میں محفوظ نہ رہے ہوں۔ اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ امام شافعیؒ نے اپنی اعلیٰ ظرفی کے سبب بعض افراد کی پردہ پوشی کی ہو اور وارداتِ قلبی کو سرسری انداز میں بیان کر دیا ہو۔ بہر حال یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ والیٔ یمن ہی وہ فتنہ گر تھا جس نے امام شافعیؒ کی صداقت و بے باکی اور سیرت و کردار سے حسد رکھتے ہوئے یہ ناپاک منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ تاریخ پر نظر رکھنے والے کچھ حضرات کا خیال ہے کہ اگر امام شافعیؒ والیٔ یمن کی مرضی کے مطابق انتظامی امور سر انجام دیتے رہتے اور کبھی کبھی اس جابر و سفاک حاکم کے روبرو خوشامدانہ روش اختیار کر لیتے تو امامؒ کی زندگی میں یہ سنگین مرحلہ کبھی نہ آتا۔ مگر یہ محض انسانی قیاس آرائی ہے لوحِ محفوظ پر اس واقعے کو بہت پہلے درج کر دیا گیا تھا۔ دنیا کو خواہ کتنا ہی ناگوار گزرتا لیکن یہ آسمانی فیصلہ زمین پر نازل ہو کر رہتا' خدا اس واقعے کے ذریعے کچھ لوگوں کے نامۂ اعمال کو سیاہ کرنا چاہتا تھا اور کچھ لوگوں کو آزمائش کی اس منزل سے گزار کر انہیں مزید سربلندی عطا کرنا چاہتا تھا۔ ازل سے یہی قدرت کا ایک طریقہ کار ہے۔ امام شافعیؒ کو جو فطرتِ راست بخشی گئی تھی اس کا کج ہونا ممکن ہی نہیں تھا اور اسی طرح والیٔ یمن کی روح پر جو کثافتیں اور غلاظتیں مسلط

کی جا چکی تھیں' انہیں بھی وعظ و نصیحت یا کسی خاص عمل کے ذریعے دھویا نہیں جا سکتا تھا۔ انجام کار اس نے اپنی فطرت کے ایک ایک تقاضے کو پورا کیا اس کے برعکس حضرت امام شافعیؒ نے تمام نتائج سے بے پرواہ ہو کر اپنی فطرت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

خلیفہ ہارون رشید کا حکم ملتے ہی عاملِ مکہ نے تین سو قریش کی آزادیاں سلب کر کے انہیں زنجیریں پہنا دیں۔ ان تین سو اشخاص میں وہ نو افراد بھی شامل تھے جنہیں والیٔ یمن نے اپنے خط میں تحریک کا بانی قرار دیا تھا۔ دسویں حضرت امام شافعیؒ تھے اور باقی وہ لوگ تھے جو اپنے رہنماؤں کی آواز پر لبیک کہنے والے تھے۔ آخر سیاسی اسیروں کا یہ قافلہ مکہ معظمہ سے بغداد کی طرف روانہ ہوا۔ ایک عجیب سا منظر تھا قریش کے معززین افراد اس طرح ترکِ وطن کر رہے تھے کہ ان کے ہاتھ گردنوں سے باندھ دیئے گئے تھے۔ حجازِ مقدس کے باشندوں نے خاموش قیدیوں کو ایک ہی لمحے میں پہچان لیا تھا کہ یہ سب کے سب ''معتوبِ خلافت'' ہیں اور آہستہ آہستہ اپنے ہولناک انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کو ان کے مکان سے گرفتار کیا گیا ہوگا۔ اور ہم تصورات کے سہارے یہ اندازہ بھی کر سکتے ہیں کہ امام شافعیؒ کو ان کی مادرِ گرامی کے سامنے زنجیریں پہنائی گئی ہوں گی' ہمیں فرزندِ قریش کی اسیری کے ابتدائی واقعات کے سلسلے میں کوئی مستند تاریخی حوالہ نہیں ملتا مگر پھر بھی ہم احساس کر سکتے ہیں کہ امامؒ کو اس حال میں دیکھ کر فاطمہ بنت عبداللہ پر کیا گزری ہوگی؟ اپنی فطری غیرت و شجاعت کے سبب مادرِ مہربان نے سپاہیوں سے بیٹے کی گرفتاری کا سبب نہیں پوچھا ہوگا۔ اور نہ خلیفہ ہارون رشید کے حضور رحم کی کوئی درخواست گزاری ہوگی۔ اور نہ عاملِ مکہ کے سامنے امامؒ کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ہوگا کہ محمد بن ادریس بے قصور ہے۔ فاطمہ بنت عبداللہ نے بیوگی کے روزِ اول سے امام شافعیؒ کی جوانی تک جس مثالی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا تھا' اس کا یہی تقاضہ تھا کہ وہ ایک بار بیٹے کے جسم پر فولاد و آہن کی گل کاریاں بھی دیکھ لیں' تاریخ شاہد ہے کہ فاطمہ بنت عبداللہ نے امام شافعیؒ کو جس حال میں بھی دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اسی کو تسلیم و رضا کی آخری منزل کہتے ہیں جس کے بغیر کسی بھی مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

''مادرِ گرامی!'' زنجیریں پہننے کے بعد رخصت ہوتے وقت امام شافعیؒ نے کہا ''میں بالکل بے قصور ہوں اور یہ وضاحت اس لیے کر رہا ہوں کہ خدا کے بعد اس زمین پر مجھے سب سے زیادہ آپ کے سامنے شرم آتی ہے۔ میں نے اپنے نفس کی خاطر آج تک ایسا کوئی کام نہیں کیا جو آپ کی تعلیم و تربیت کے منافی



ہو' میں نے جھوٹ کو جھوٹ کہا' خیانت کو بدترین عمل سمجھا' بندگانِ خدا کے حقوق کی حفاظت کے لیے رات رات بھر جاگتا رہا۔ امیروں کی خوشامد سے گریز کیا اور حاکموں کی سفارشات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ گواہ رہیں کہ یہی میرا جرم ہے۔'' حضرت امام شافعیؒ کی آواز اس قدر پُرسوز تھی کہ گرفتاری کی خبر سن کر جمع ہو جانے والے انسانوں کی آنکھیں اشکبار ہو گئی تھیں۔

مگر فاطمہ بنت عبداللہ کی آنکھوں میں ایک آنسو نہیں تھا۔ بس چہرے پر ایک عکسِ ملال تھا جسے تاریخِ انسانی' احتجاج سمجھ لے یا خاموش حرفِ شکایت جو بظاہر کوئی مفہوم نہیں رکھتا تھا۔ سپاہیوں نے امام شافعیؒ کو زبردستی کھینچنا چاہا' فاطمہ بنت عبداللہ نے نہایت مہذب و شائستہ لہجے میں مداخلت کی۔ ''تمہارا یہ قیدی سرکش نہیں ہے تم اسے جس طرح لے جانا چاہو گے یہ اسی انداز میں قصرِ خلافت تک جائے گا' میں نہیں جانتی کہ عباسی قانون اسے اس کے خون سے سرخرو کرے گا یا زنداں کی نذر کر دے گا۔ خود میری زندگی کا بھی اعتبار نہیں۔ اس لیے کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔ میں محمد بن ادریس کو آخری نصیحت کرنا چاہتی ہوں۔''

سپاہیوں نے اپنی زندگی میں آج تک ایسی باوقار گفتگو نہیں سنی تھی شرمسار ہو کر ٹھہر گئے۔

مادرِ گرامی فرزندِ قریش سے مخاطب ہوئیں ''محمد! جن ہاتھوں نے قلم کی امانت کا بار اٹھایا ہو ان کا اعزاز یہ ہے کہ وہ کاٹ دیے جائیں' جو زبان قرآن و حدیث کی قرأت کرتی ہو' اس کا شرف یہ ہے کہ وہ قطع کر دی جائے۔ جرم میں تو سبھی اسیر ہوتے ہیں معزز وہ ہے جو بے قصور گرفتار کیا جائے' اگر تم آزاد کر دیئے جاؤ تو یہ خدا کا احسان ہوگا اگر زندگی سے محروم ہو جاؤ تو یہ تمہارے پالنے والے کا احسانِ عظیم ہوگا۔ دولت و رزق حاصل کرنے کے بعد شکر گزاری کے چند کلمات ادا کرنا ایک عام رسم ہے۔ افلاس اور بھوک میں خدا کے اندازِ تقسیم پر رضامند ہو جانا' بندگی ہے اگر لوحِ محفوظ پر تحریر ہے کہ تم زندگی کے ہر سکون سے محروم ہو جاؤ تو میں آسمان کے اس فیصلے پر راضی ہو جاؤں گی لیکن اگر تمہیں بندوں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا تو یہ ہلاکت و بربادی ہے میں خدا سے دعا کروں گی کہ وہ تمہیں اس ہلاکت و بربادی سے بچا لے کہ اس کے کرم کے بغیر کوئی انسان ہدایت و فلاح نہیں پا سکتا۔ محمد! تیز قدموں سے جاؤ' کہیں اہلِ عرب تمہاری سست رفتاری کو کم ہمتی سے تعبیر نہ کریں۔ فرزند! خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر فاطمہ بنت عبداللہ گھر کے اندر تشریف لے گئیں پھر سپاہیوں کو حرکت ہوئی پھر زنجیریں بجیں پھر قصرِ جہالت کی طرف ایک نابغۂ روزگار کا سفر شروع ہو گیا۔

امام شافعیؒ حجازِ مقدس کی حدود میں جہاں جہاں سے گزرے لوگ بے اختیار اپنے مکانوں سے نکل

آئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے دماغوں کو روشن کرنے والا زندگی کے اس قدر تاریک دور سے گزرے گا؟ پوچھنے والوں نے پوچھا۔

"آخر اس شخص کا جرم کیا ہے؟" کہنے والوں نے جواباً کہا "یہ خلافتِ عباسیہ کا دشمن ہے امیر المومنین کے بدخواہوں کا دوست ہے' اور ان کا شریک ہے جو سلطنت کی بساط الٹ کر برسرِ اقتدار آنا چاہتے ہیں' بوئے حکومت نے اس کا دماغ پراگندہ کر دیا ہے۔"

سننے والوں نے ہارون رشید کے وکیلوں کی گفتگو سنی' امام شافعیؒ کے جسم پر سپاہیوں کے بے نیام شمشیروں کا پہرہ تھا اور سپاہیوں کے دل و دماغ پر خلافتِ عباسیہ کے جاہ وجلال کا پہرہ تھا۔ ان کے ضمیر بھی بازارِ سیاست میں فروخت ہو چکے تھے اور ان کی زبانیں بھی نیلام شدہ تھیں' وہ خود کو احکامِ خلافت کا پابند سمجھ کر مطمئن تھے جیسے ان کی تلواروں کے ذریعے خدا کی زمین پر عدل وانصاف قائم کیا جا رہا تھا۔ انہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کس کی گردن کاٹ رہے ہیں اور کیوں کاٹ رہے ہیں؟ بس خلیفہ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور رقصِ شمشیر جاری ہو گیا۔ حضرت امام شافعیؒ بھی خلافتِ عباسیہ کی ان ہی کج ادائیوں کا شکار تھے۔

سرِ رہ گزر جمع ہو جانے والوں نے سپاہیوں کی الزام تراشیاں سن کر کہا۔ "یہ کسی کی حکومت سے کیا حسد کرے گا۔ یہ تو خود دلوں کا تاجدار ہے' اس کا دماغ تو روشنیوں کا مرکز ہے وہاں تصورِ اقتدار کی تاریکیاں کس طرح جاگزیں ہوں گی؟ اس قلندر کو عارضی حکومت کا طلب گار سمجھتے ہو؟ یہ تو اس ابدی سلطنت کا نائب ہے جس پر نہ سایہ زوال پڑتا ہے' نہ جلتا ہوا سورج اثر انداز ہوتا ہے اور نہ باغیانہ موسم۔"

ہارون رشید کے سپاہی اہلِ دل کی زبان کس طرح سمجھتے؟ انہیں صرف طاقت کی زبان آتی تھی۔ اس لیے طاقت کے ذریعے امام شافعیؒ کو کھینچتے ہوئے لے گئے' سب تماشائیوں کے سینے میں گداز نہیں تھا پھر بھی ان کے چہرے اداس نظر آتے تھے۔ مگر جو اہلِ درد تھے وہ امام شافعیؒ کے ساتھ یہ ذلت آمیز سلوک دیکھ کر رو پڑے تھے۔ اسیروں کا قافلہ دم بدم آگے بڑھتا جا رہا تھا لیکن فضاؤں میں اب بھی امام سفیان ثوریؒ کے الفاظ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

"اگر تمام مخلوق کی عقل کا وزن کیا جائے تو نصف انسانوں پر اس لڑکے کی عقل بھاری ہوگی۔"

جو باخبر تھے وہ امام سفیان ثوریؒ کے اسی قول کا سہارا لے کر کہہ رہے تھے، جہالت نے اس شخص کو رسوائی کا طوق پہنا دیا جس کے آگے عرب وعجم کے اہلِ دانش سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ کیسا ظلم



ہے اور اقتدار کا کیسا مظاہرہ ہے؟ کہنے والے کہتے رہے لیکن حکومت کے دستِ جفا کار کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

پھر تاریخِ آدم کے وہ لرزہ خیز لمحات آ گئے جب شمشیرِ اختیار اپنے حریفوں کا خون بہانے کے لیے مضطرب تھی۔ خلیفہ ہارون رشید کے سامنے دس افراد پیش کئے گئے۔ جن میں سے نو پر "علوی تحریک" کی سربراہی کا الزام تھا اور دسویں امام شافعیؒ تھے' جنہیں والیٔ یمن نے ایک مسلح فوج سے زیادہ طاقت ور اور خوفناک قرار دیا تھا۔ تمام اسیروں کے ہاتھ اسی طرح گردنوں سے بندھے ہوئے تھے جس طرح ہارون رشید نے یحییٰ بن خالد برمکی کو حکم دیا تھا۔ قیدیوں کو اپنے روبرو پا کر عباسی خلیفہ مسکرایا۔ اگرچہ یہ تبسم خفیف تھا لیکن اس میں ساری دنیا کی تحقیر وتضحیک سمٹ آئی تھی۔

"تم نے دیکھ لیا کہ خلافتِ عباسیہ کن بنیادوں پر قائم ہے؟" ہارون رشید کے لہجے سے ہیبت و جبروت کے تمام پہلو نمایاں تھے "جو تم سے پہلے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ قصرِ منصور کی طرف بڑھے تھے آج ان کی قبروں کے نشان تک باقی نہیں' ہارون رشید کا اشارہ محمد نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کی طرف تھا جو منصور کے ساتھ معرکہ آرائی میں شہید ہو گئے تھے "تم نے علمِ بغاوت بلند کرنے سے پہلے گورستان میں جا کر اپنے بزرگوں کی بکھری ہوئی ہڈیوں کو تو دیکھ لیا ہوتا۔ کیا ان کی خاکِ پریشان میں تمہارے لیے عبرت کی کوئی نشانی موجود نہیں؟" ہارون رشید کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ کبر و غرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ قوت واقتدار کا نشہ اس قدر تیز تھا کہ عباسی خلیفہ نے احتیاط وتدبر کے تمام آداب کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔ اور وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے اس کی ذات کو عالمِ فانی میں بقائے دوام حاصل ہے۔

اسیرانِ سیاست نے جان بچانے کے لیے منطق کا سہارا لیا' عقلی دلائل پیش کئے مگر ہارون رشید نے ان کے کسی عذر کو تسلیم نہیں کیا۔ پھر وہ نو کے نو معززینِ قریش ہلاک کر دیئے گئے۔ ایک روایت ہے کہ عباسی خلیفہ نے ان سب کو بیک وقت خونیں انجام تک پہنچا دیا تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ہارون رشید پہلے ایک علوی سے سوال کرتا تھا پھر اسے سب کے سامنے قتل کرا دیتا تھا۔ اس طرح وہ دوسرے باغیوں کو خوف زدہ کر کے لطف اندوز ہوتا تھا۔ یہ اذیت ناک کھیل بہت دیر تک جاری رہا۔ بالآخر نفس زکیہ اور ابراہیم کے نقشِ قدم پر چلنے والے ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

جب قصرِ خلافت کا سفید فرش نو محترم انسانوں کے خون سے سرخ ہو گیا تو ہارون رشید دسویں قیدی سے مخاطب ہوا' یہ حضرت امام شافعیؒ تھے۔ اگرچہ عباسی حکمران امام شافعیؒ سے ایک بار پہلے بھی مل چکا تھا لیکن وہ ہنگامی اور لمحاتی ملاقات تھی جب فرزندِ قریش کو کسی شبے کی وجہ سے گرفتار کر کے ہارون رشید کے سامنے لایا گیا تھا۔ یہ واقعہ کئی سال قبل پیش آیا تھا۔ اس وقت امام شافعیؒ کی شہرت بہت محدود تھی۔ اس لیے ہارون رشید اس مردِ جلیل کی یادوں کو اپنے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ نہ رکھ سکا۔

''تم بھی علوی زادے ہو؟'' ہارون رشید کے لہجے میں اقتدار کی وہ گرمی موجود تھی۔

''نہیں۔'' حضرت امام شافعیؒ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔'' یہ میرے بارے میں غلط بیانی ہے'' امامؒ کے لہجے سے ایک فقیہہ و محدث کا جلال ظاہر ہو رہا تھا۔

ہارون رشید اس جراتِ گفتار پر حیران رہ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اپنے ساتھیوں کی خون میں نہائی ہوئی لاشیں دیکھ کر یہ نوجوان بدحواس ہو جائے گا مگر جب اس نے فرزندِ قریش کے پائے استقامت میں ہلکی سی لرزش بھی نہیں پائی تو مڑ کر اپنی بائیں طرف بیٹھے ہوئے ایک وزیر کی طرف تیز نظروں سے دیکھا۔

وزیر کھڑا ہوا' خلیفہ کے حضور ادب و احترام کا مظاہرہ کیا اور پھر سرِ دربار والیٔ یمن کا خط پڑھنے لگا۔ امام شافعیؒ حیرت سے وزیر کا منہ دیکھنے لگے یہ امامؒ کے خلاف ایک طویل فردِ جرم تھی' جو ہارون رشید کے روبرو بیان کی جا رہی تھی۔ امام والیٔ یمن کے اس منافقانہ سلوک کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ایک طرف وہ عاملِ نجران کی حیثیت سے امامؒ کی خدمت کا معترف تھا اور دوسری طرف آپ کو خلافتِ عباسیہ کا سب سے بڑا دشمن قرار دے رہا تھا۔

آخر تہمتوں کا یہ دفتر ختم ہوا تو ہارون رشید غضبناک لہجے میں بولا۔ ''نوجوان! اگر علویوں سے تیرا نسبی تعلق نہیں تو پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟''

''امیر المومنین! اہلِ نجران گواہ ہیں کہ میں چار سال تک خود جاگتا رہا اور وہ چین کی نیند سوتے رہے میں نے انہیں انصاف فراہم کیا جس سے وہ محروم ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں آزادیٔ رائے بخشی جو سلب کر لی گئی تھی' میں نے والیٔ یمن کے دستِ تشدد کو روکا جو خلافتِ عباسیہ کی تاریخ سیاہ کر رہا تھا۔ میں اپنے دل میں ہوس زر رکھتا ہوں نہ شوقِ اقتدار' مکے کی گلیاں اس لیے چھوڑی تھیں کہ بندگانِ خدا کے کام آسکوں۔ مگر وقت کیسی عجیب شے ہے کہ وہ مجھے میری خدمات کے صلے میں سیاست کے مقتل تک لے آیا ہے۔ خدا کی قسم میرے نام کے ساتھ جو کچھ منسوب کیا جا رہا ہے وہ بہتان ہے' کذب و افترا



ہے' دروغ ہے' تہمت ہے۔ آپ اہلِ نجران کو بلائیں اور ان سے میرے اعمال پر گواہی لیں۔''

امام کی طرزِ خطابت قابلِ دید تھا۔ اہلِ دربار ساکت تھے کہ ان کی آنکھوں نے آج تک ایسا کوئی فصیح البیان نہیں دیکھا تھا اور سماعتیں ایسی پرسوز آواز سے نا آشنا تھیں جو پتھر ہو جانے والے دلوں میں گداز پیدا کر رہی تھی۔

امامؒ کا تقریر کا آہنگ عجیب تھا مگر عباسی خلیفہ نے کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ فرزندِ قریش کا ایک ایک لفظ رائیگاں گیا۔ علوی تحریک کی دہشت نے ہارون رشید کو اس قدر محتاط بنا دیا تھا کہ اس نے اپنے کان بند کر لیے اور سچائی کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ ''بے شک! تو بڑا فصیح و بلیغ ہے مگر تیری شدتِ گفتار تجھے معصوم ثابت کرنے سے قاصر ہے۔'' یہ کہہ کر ہارون رشید نے جلاد کی طرف دیکھا جس کی تلوار سے معززینِ قریش کا خون ٹپک رہا تھا۔ ''اس کا سر کاندھوں پر گراں ہے۔'' یہ امام شافعیؒ کی طرف اشارہ تھا۔

''اسے بھی ان علوی زادوں کی آرام گاہ تک پہنچا دو جو خلافت کا انتظار کرتے کرتے ابدی نیند سو گئے ہیں۔''

فیصلہ سنایا جا چکا تھا' جلاد نے آگے بڑھ کر امام شافعیؒ کے ہاتھ کھول دیے' پھر آپ کے قتل کرنے کے لیے مروجہ قانون کے تحت چمڑے کے فرش پر بٹھا دیا گیا' دربارِ جہل میں علم و آگہی کو ذبح کرنے کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ یکایک ہارون رشید نے جلاد کو دوسرا اشارہ کیا جلاد نے خلیفہ کا حکم پاتے ہی ایک خاص انداز سے کچھ دیر تک شمشیر کو ہوا میں لہرایا' غالباً یہ امام شافعیؒ کو خوف زدہ کرنے کا ایک حربہ تھا فرزندِ قریش نے نہایت اطمینان سے خون میں ڈوبی ہوئی تلوار کو دیکھا نہ آنکھوں کی پتلیاں کانپیں' نہ سانسیں منتشر ہوئیں' نہ چہرے پر ہراس کی کوئی علامت ابھری۔ اہلِ دربار اس نوجوان کی حالتِ سکون پر حیران تھے کہ جسے چند ساعتوں کے بعد موت سے گلے ملنا تھا ابھی حاضرین کا یہ استعجاب برقرار تھا کہ اچانک امام شافعیؒ کھڑے ہو گئے خلیفہ ہارون رشید چونک اٹھا اس کے نزدیک امامؒ کا یہ اضطراری عمل دہشتِ مرگ کے سبب تھا۔ مگر امام شافعیؒ کا پرسکون چہرہ عباسی حکمران کے خیالات کی نفی کر رہا تھا۔

''امیر المومنین!'' حضرت امام شافعیؒ کی پرسوز آواز گونجی۔ ''میں موت سے خائف ہوں اور نہ چند لمحوں کے لیے فرصتِ ہستی کا طلب گار ہوں وقتِ معلوم سے پہلے کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا۔ یہ قدرت کا فیصلہ ہے اور تمام کائنات اس فیصلے کی تابع ہے پھر بھی مرنے سے پہلے میری خواہش ہے کہ میں آپ کے سامنے ایک مسئلہ پیش کروں۔''

ہارون نے اثبات میں اپنی گردن کو جنبش دی۔ یہ مسئلے کی سماعت کے سلسلے میں اظہار آمادگی تھی۔

''امیر المومنین! آپ ان دو آدمیوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جن میں سے ایک مجھے اپنا بھائی سمجھتا ہے اور دوسرا غلام تصور کرتا ہے ان دونوں میں سے میرے نزدیک کسے محبوب ہونا چاہیے؟''

''وہ شخص جو تمہیں اپنا بھائی سمجھتا ہے'' ہارون رشید نے مسئلے کی گہرائی پر غور کیے بغیر جواب دیا۔

''امیر المومنین! یہ آپ کے الفاظ ہیں؟'' امام شافعیؒ نے اس طرح کہا کہ جیسے آپ ہارون رشید سے اس کے الفاظ کی تصدیق چاہتے ہوں۔

''بے شک یہ میرا قول ہے۔'' ہارون رشید کا غرور حکمرانی ایک بار پھر لوٹ آیا۔

''امیر المومنین! آپ حضرت عباسؓ کی اولاد ہیں علوی حضرت علیؓ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں' اور میں محمد بن ادریس خاندانِ بنو مطلب سے ہوں عباسی مجھے اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور علوی غلام کہہ کر پکارتے ہیں۔''

ہارون رشید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ قریشی نوجوان مقتل میں کھڑے ہو کر اپنے دفاع کے لیے اس قدر مضبوط دلیل لائے گا' خلیفہ کے ساتھ تمام درباری بھی اپنی اپنی نشستوں پر بے قراری کے عالم میں پہلو بدل رہے تھے۔ امام شافعیؒ کی اس منطق کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اسی دوران امام ابوحنیفہؒ کے شاگردِ خاص حضرت امام محمد بن حسن شیبانیؒ دربار میں داخل ہوئے۔ اس وقت امام محمدؒ بغداد کے منصبِ قضا پر فائز تھے۔ امام شافعیؒ نے جیسے ہی عراق کے اس عظیم فقیہہ کو دیکھا بے اختیار بول اٹھے۔

''امیر المومنین! اب میری زبان سمجھنے والا آ گیا۔'' امام شافعیؒ کا ایک ہاتھ بلند تھا اور آپ اس فقیہہِ جلیل کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ جس کے علم و فضل کے سامنے اہلِ عراق دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔'' امام محمد میرے کردار پر شہادت دیں گے۔ یہ آپ کو بتائیں گے کہ میں سازشی ہوں یا حدیث وفقہ کا طالب علم؟ اگر امام محمدؒ بھی خاموشی اختیار کر لی تو پھر میں کسی کو آواز نہیں دوں گا۔ اپنی نجات کے لیے کوئی دلیل نہیں لاؤں گا' بس میرے مقدمے میں یہ پہلی اور آخری گواہی ہو گی۔''

حضرت امام محمدؒ ہارون رشید کے دربار میں داخل ہو چکے تھے۔ آپ نے امام شافعیؒ کی آواز بھی سن لی تھی اور وہ ہولناک منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ ایک وجیہہ نوجوان کے سر پر شمشیرِ خلافت اپنی تمام تر خون آشامیوں کے ساتھ لہرا رہی تھی مگر نوجوان کے چہرے پر خوف و ہراس کا ہلکا سا عکس بھی نمایاں نہیں تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی' امام محمدؒ حیرت زدہ سے' آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنی نشست تک



پہنچے۔ اس دوران دربار پر سکوت طاری رہا۔ جب امام محمدؒ بیٹھ گئے تو ہارون رشید دوبارہ حضرت امام شافعیؒ سے مخاطب ہوئے۔

''نوجوان! کیا تجھے یقین ہے کہ امام محمدؒ تیری حق میں گواہی دیں گے؟'' خلیفۂ وقت نے در پردہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی' وہ حضرت امام شافعیؒ کو بتانا چاہتا تھا کہ مملکتِ اسلامیہ کا نظام اس کی جنبشِ چشم سے جاری ہے۔ اگرچہ امام محمدؒ قاضی بغداد تھے اور ہارون رشید ان کے منصفانہ مزاج سے واقف تھا لیکن پھر بھی بوئے خلافت نے اس کے دماغ کو پریشان کر دیا تھا اور اب وہ نہایت بے باکی سے ہر شخص کے بارے میں سوچنے لگا تھا کہ کوئی بھی اس کے حلقۂ اثر سے باہر نہیں ہے۔

''مجھے یقین ہے کہ ایک اہلِ علم ہی دوسرے اہلِ علم کے حق میں گواہی دے سکتا ہے۔'' حضرت امام شافعیؒ مقتل کی خونیں فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہایت بے باکی کے ساتھ بول رہے تھے۔ ''مجھے اپنے انجام کی فکر نہیں مگر اتنا ضرور پسند کروں گا کہ حضرت ابوحنیفہؒ کا شاگردِ جلیل میرے مقدمے میں شہادت دے اگر امام محمدؒ کی گواہی بھی میرے خلاف جاتی ہے تو پھر مجھے قرار آ جائے گا۔ میں سکون سے شمشیرِ خلافت کو گلے لگا لوں گا کہ میرے خدا کی یہی مرضی ہے۔'' امام شافعیؒ کا طرزِ گفتگو فطری طور پر اثر انگیز تھا۔ لیکن اس ہولناک فضا نے آپ کی تقریر میں مزید اثر پیدا کر دیا تھا' یہاں تک کہ ہارون رشید اور اس کے حاشیہ بردار بھی ساکت بیٹھے تھے۔ عباسی خلیفہ کسی حد تک فرزندِ قریش کو بے گناہ سمجھنے لگا تھا مگر علوی تحریک کے حوالے سے اب بھی اس کے دل میں کچھ شکوک وشبہات باقی تھے۔ نتیجتاً ہارون رشید نے اپنے دائیں...... جانب مڑ کر حضرت امام محمدؒ کی طرف دیکھا۔

''کیا آپ اس قریشی نوجوان محمد بن ادریسؒ سے واقف ہیں؟'' ہارون رشید نے بارعب آواز میں سوال کیا' اب بھی اس کے لہجے سے تلخی جھلک رہی تھی۔

اس دوران امام محمدؒ بہت غور سے امام شافعیؒ کے چہرے کی طرف دیکھتے رہے تھے' پھر اچانک انہیں سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ امام محمدؒ کے ذہن میں وہ رات ابھر رہی تھی جب قریش کا ایک لڑکا ان کے یہاں مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا تھا اور اس نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی ضخیم کتاب ''الاوسط'' ایک ہی رات میں حفظ کر لی تھی' گردشِ روز وشب کے باعث اب وہی نوعمر لڑکا جوان ہو چکا تھا۔ اور وقت کی الٹی چالیں اسے کسی علمی درس گاہ کے بجائے جبر واقتدار کے مقتل میں کھینچ لائی تھیں۔ امام محمدؒ کے قلبِ نازک نے اس واقعے کا بڑا گہرا اثر قبول کیا اور امام شافعیؒ کے سر پر شمشیرِ ظلم کا سایہ فگن دیکھ کر ان کا چہرہ اداس ہو گیا۔

"کیا قاضی بغداد اس شخص سے ناواقف ہیں؟" ہارون رشید نے امام محمدؒ کو دوبارہ مخاطب کیا۔ "کیا علوی تحریک سے وابستہ یہ نوجوان آپ کی جلالتِ علمی کا سہارا لے کر اپنی جان بچانا چاہتا ہے؟ کیا یہ جھوٹ بول کر ایک نئے جرم کا مرتکب ہو رہا ہے؟"

"امیر المومنین! ہرگز نہیں۔" حضرت امام محمدؒ نے بے قرار ہو کر فرمایا "محمد بن ادریسؒ حرف بہ حرف سچ بول رہے ہیں۔ خدا نے انہیں علم کے عظیم سرمائے سے بہت بڑا حصہ عطا کیا ہے۔ میرے خیال میں علوی تحریک سے وابستگی شافعیؒ پر ایک تہمت ہے میں اپنی معلومات کی حد تک پورے یقین سے کہتا ہوں کہ محمد بن ادریسؒ ایسے نہیں ہیں جیسا کہ ان کے بارے میں کہا جا رہا ہے۔" جیسے ہی امام محمدؒ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے سازش کرنے والوں کے چہرے مسخ ہو گئے' والیٔ یمن کے آدمی جو دربارِ خلافت میں موجود تھے اپنی نشستوں پر اس قدر بے چینی کے ساتھ پہلو بدلنے لگے جیسے وہ کسی ناقابلِ برداشت درد میں مبتلا ہوں۔ امام محمدؒ کی گواہی نے والیٔ یمن کی طویل منصوبہ سازی کے دفتر کو اس طرح منتشر کر دیا تھا کہ اب اس کا ایک لفظ بھی قابلِ اعتبار نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہارون رشید قاضی بغداد کی شہادت پر کچھ دیر تک سوچتا رہا اور مخالفین شدید اذیت کے عالم میں پیچ و تاب کھاتے رہے' بالآخر عباسی خلیفہ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی وہ حضرت امام محمدؒ سے مخاطب تھا۔ "اگر محمد بن ادریسؒ کے بارے میں آپ کی یہ رائے ہے تو آپ اس شخص کو اپنے ہمراہ لے جائیے' میں بعد میں کوئی آخری فیصلہ کروں گا۔"

حضرت امام شافعیؒ کو عارضی طور پر امان مل گئی تھی' شمشیرِ اختیار نیام میں چلی گئی جب فرزندِ قریش کے جسم کو زنجیروں سے آزاد کیا جا رہا تھا اس وقت سازش کرنے والوں کی حالت قابلِ دید تھی۔ ان کے چہرے احساسِ شکست سے دھواں ہو رہے تھے اور جسموں پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری تھا' جب ہارون رشید کا دربار ختم ہوا اور امام شافعیؒ مقتل سے نکل کر امام محمدؒ کے ساتھ ان کے گھر جانے لگے تو والیٔ یمن کے حامی اور دیگر مخالفین قاضی بغداد پر اپنا غصہ اتار رہے تھے' وہ سرگوشیوں میں کہہ رہے تھے کہ منصوبہ اپنی جگہ مکمل تھا مگر امام محمدؒ نے محمد بن ادریسؒ کو بچا لیا۔ اب یہ ممکن نہیں کہ فرزندِ قریش کو دوبارہ زنجیریں پہنا کر مقتل کر لایا جائے' امام محمدؒ تنہائی میں اپنی پرجوش منطق سے خلیفہ ہارون رشید کو قائل کر دیں گے اور اس طرح فرزندِ قریش بے گناہ ٹھہرے گا۔ تاریخ آدم کا یہ کیسا عجیب منظر تھا کہ حضرت امام شافعیؒ کی رہائی پر امام محمدؒ کے سوا کوئی خوش نہیں تھا۔

حاسدین اس بات پر کفِ افسوس مل رہے تھے کہ شمشیرِ جہل پیاسی رہ گئی اور علم کا خون فرشِ خلافت کو



رنگین نہ کر سکا۔

☆☆☆

بعد میں جب خلیفہ ہارون رشید کا غصہ فرو ہو گیا اور حالات کسی قدر پرسکون ہو گئے تو ایک دن خلوت میں حضرت امام محمدؒ نے عباسی خلیفہ کے سامنے فرزندِ قریش کی صفائی پیش کرتے ہوئے فرمایا "امیر المومنین! آپ کا دورِ حکومت اہلِ علم کے لیے ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور شافعیؒ بھی علم کے بڑے وارث ہیں۔ وہ امام مالک بن انسؒ کے شاگردِ جلیل ہیں' اور خدا نے انہیں فہم و فراست کے خزانے سے بہت بڑا حصہ عطا کیا ہے۔ جب دنیا پرست خود کوئی کمال حاصل نہیں کر پاتے تو اہلِ دانش کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ شافعیؒ کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہے۔ میں نے اس عرصے میں ذاتی طور پر تحقیق کی ہے کہ عاملِ نجران کی حیثیت سے شافعیؒ نے وہاں کے باشندوں کو حق و انصاف فراہم کیا ہے۔ والیٔ یمن جو بذاتِ خود ایک غیر ذمے دار حاکم ہے' شافعیؒ کی خدا ترسی اور انتظامی امور میں انتہائی سختی کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ محمدؒ بن ادریسؒ کو اس طرح راستے سے ہٹانا چاہتا تھا کہ اس کی قبائے سیاست بے داغ رہے اور شافعیؒ اپنے خون میں نہا کر ہمیشہ کے لیے پیوندِ زمین ہو جائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ شافعیؒ' خاندانِ بنو مطلب سے ہیں۔ ان کا نسبی اعتبار سے سادات علوی سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اول و آخر ایک غیرت مند طالب علم ہیں۔ شافعیؒ نے کبھی اپنے ذہن و دل کو غبارِ سیاست سے آلودہ نہیں کیا۔ علوی تحریک میں ان کی شمولیت ایک سنگین تہمت ہے۔ خدا شافعیؒ کے دشمنوں کو ہدایت دے کہ وہ ایسے گناہوں کی فصل بو رہے ہیں جو حشر میں ان سے کاٹی نہیں جا سکے گی اور امیر المومنین کو جزائے خیر دے کہ آپ کے حسنِ تدبر نے شافعیؒ کو بچا لیا ورنہ علم لاوارث ہو جاتا۔" حضرت امام محمدؒ نے امام شافعیؒ کی اس قدر پرزور وکالت کی تھی کہ ہارون رشید حیران رہ گیا۔

"امام! تم بھی یہی کہتے ہو کہ قریش کا یہ بیٹا بڑا عالم ہے؟" ہارون رشید کے لہجے سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا "کیا اتنی نوعمری میں بھی کوئی انسان علم کے مقامِ بلند تک پہنچ سکتا ہے؟"

"بے شک! اس نوجوان کا علم قدرت کے خاص عطیات میں سے ہے۔" حضرت امام محمدؒ نے فرمایا۔ "امیر المومنین کو میری بات پر یقین آ جانا چاہئے کہ خدا شافعیؒ جیسے انسان کبھی کبھی پیدا کرتا ہے۔ آپ عنقریب میرے دعوے کو عملی شکل میں ظاہر ہوتے ہوئے دیکھ لیں گے۔" امام محمدؒ والہانہ انداز میں امام شافعیؒ کی صفات بیان کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہارون رشید کے ذہن سے شکوک و شبہات کا غبار

چھٹ گیا اور اس طرح امام شافعیؒ نے شمشیرِ ستم سے نجات پائی۔

یہاں ایک سنگین روایت کا ذکر بھی ضروری ہے جو کچھ غیر ذمے دار حضرات کی کوتاہی کے سبب تقریباً تاریخی حیثیت اختیار کر گئی ہے جس کے نتیجے میں فقہ کے طالبِ علم اس روایت کو پڑھ کر پریشان سے نظر آتے ہیں۔ ان کے ذہن منتشر ہو جاتے ہیں اور دلوں میں وسوسے سر ابھارنے لگتے ہیں اگر اس نازک موقع پر کوئی فراخ دل استادان کی رہنمائی نہ کرے تو اکثر طالب علموں کے بھٹک جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ کو علوی تحریک میں ملوث کرنے اور پھر مقتل تک پہنچانے میں امامِ اعظم ابو حنیفہؒ کے دونوں جلیل القدر شاگردوں حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام محمدؒ کا ہاتھ تھا۔

اس روایت کی بنیاد یہ بیان کی جاتی ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ حضرت امام شافعیؒ سے حسد رکھتے تھے اگر ہم اس الزام تراشی کو حقائق کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کریں تو بیک وقت کئی شکلیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی شیشہ نما شخصیات پر یہ پتھر ان لوگوں کی طرف سے برسائے گئے ہیں جو امام شافعیؒ کی اندھی عقیدت میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے اور انہیں یہ اندازہ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کن عظیم المرتبت بزرگوں پر تہمت لگا رہے ہیں، حفظِ مراتب کو پس پشت ڈال کر ان لوگوں کی ایک ہی کوشش تھی کہ اپنے امامؒ کو بلند رکھنے کے لیے فقہ حنفیہ کے اہم ترین ستونوں پر سنگ باری کی جائے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کیسی عقیدت تھی اور کیا مذہبی جوش تھا۔

اس الزام تراشی کے سلسلے میں جو دوسری شکل سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کی گرفتاری اور مقتل میں کھڑے ہونے کا واقعہ ۱۸۲ ہجری میں پیش آیا۔ اسی سال حضرت امام ابو یوسفؒ کا انتقال ہوا۔ تمام مستند مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ جس زمانے میں والئ یمن حضرت امام شافعیؒ کے گرد سازش کا حصار کھینچ رہا تھا اس وقت امام ابو یوسفؒ مرض الموت میں مبتلا تھے اور اس سے پہلے کہ امام شافعیؒ کو پابندِ سلاسل کیا جاتا' امامِ اعظمؒ کا یہ نابغہ روزگار شاگرد دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اس قبیل کے لوگوں نے ایک لمحے کے لیے بھی تاریخ کے مطالعے کی زحمت گوارا نہیں کی اگر الزام تراشی کرنے والے ذرا بھی احساسِ ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے تو ان پر یہ راز فاش ہو جاتا کہ جب امام شافعیؒ کو قتل کرنے کے لیے چمڑے کے فرش پر کھڑا کیا جا رہا تھا اس وقت حضرت امام ابو یوسفؒ کے انتقال کو کئی ماہ ہو چکے تھے۔ اب ایک شخص قبر کے اندر رہ کر تو حسد کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ بالفرض امام ابو یوسفؒ زندہ بھی ہوتے تو وہ امام شافعیؒ سے کس طرح حسد کرتے؟ ایک تو امام شافعیؒ عمر کے اعتبار سے امام ابو یوسفؒ کی اولاد کے



برابر تھے' دوسرے خدا نے امام ابو یوسفؒ کو علم و فضل کے علاوہ دینوی اعتبار سے بھی بلند ترین درجہ عطا فرمایا تھا۔ امام ابو یوسفؒ مملکتِ اسلامیہ کے پہلے قاضی القضاۃ تھے۔ اس منصب عظیم کے حصول کے بعد ایک خدا ترس اور پرہیزگار انسان کا امام شافعیؒ سے حسد رکھنا محض تہمت کے سوا کچھ نہیں۔

اب امام محمدؒ رہ جاتے ہیں جن کی ذاتِ گرامی کو بھی اس سازش میں ملوث کیا گیا ہے۔ یہاں بھی الزام تراشی کرنے والے نہ صرف خوفِ خدا سے بے نیاز ہو چکے تھے بلکہ تاریخی حقائق کو مسخ کر کے ایک اور جرم کا ارتکاب کر رہے تھے اگر امام محمدؒ حضرت امام شافعیؒ کے لیے اپنے سینے میں جذباتِ حسد رکھتے تو پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ آپ ہارون رشید کے سامنے فرزندِ قریش کی پُرزور وکالت کرتے۔ تمام معتبر تاریخیں گواہ ہیں کہ امام محمدؒ کی شہادت نے عباسی خلیفہ کے شکوک و شبہات دور کیے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت امام شافعیؒ نے ایک خوفناک سازش سے نجات پائی تھی اگر غیر ذمے دار حضرات کا یہ گروہ جوشِ تعصب میں تاریخی حقیقت کو نظر انداز بھی کر دے تو وہ حضرت امام شافعیؒ کے ان الفاظ کو کس طرح مٹائے گا جو انسان کی لوحِ دماغ پر ثبت ہو کر رہ گئے اور جن کی گونج آج بھی دنیا کے گوشے گوشے میں سنائی دیتی ہے۔

حضرت امام شافعیؒ ایک موقعے پر امامِ اعظمؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "جو شخص فقہ حاصل کرنا چاہتا ہو اسے لازم ہے کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کے اصحاب سے استفادہ کرے کیونکہ اللہ نے ان لوگوں پر فہم و فراست کی راہیں کشادہ کر دی ہیں۔" اہلِ نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ اصحاب ابو حنیفہؒ سے امام شافعیؒ کی کیا مراد ہے؟

ایک دوسرے موقع پر حضرت امام شافعیؒ نے نہایت وارفتگی کے عالم میں فرمایا "خدا کی قسم! مجھے فقہ کی یہ گہرائی ہرگز نصیب نہ ہوتی اگر میں امام محمدؒ بن حسن شیبانیؒ کی کتابوں کا مطالعہ نہ کرتا۔"

ایک مقام پر حضرت امام شافعیؒ نے امام محمدؒ کی عنایات و نوازشات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "علم فقہ میں جس شخص کا مجھ پر سب سے زیادہ احسان ہے وہ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد جلیل امام محمدؒ بن حسن شیبانیؒ ہیں۔"

ایک موقع پر حضرت امام شافعیؒ کی مجلس میں اہلِ علم اور ان کے عادات و خصائل کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس ذیل میں مختلف لوگ اپنے اپنے تجربات بیان کر رہے تھے' آخر میں اہلِ مجلس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ امام شافعیؒ بھی اس سلسلے میں اپنے مشاہدات بیان فرمائیں۔ فرزندِ قریش کچھ دیر سوچتے رہے

اور پھر بڑے والہانہ انداز میں فرمایا۔ ’’میں نے جس استاد سے بھی حدیث وفقہ کے مسائل دریافت کیے اس نے کسی نہ کسی موقع پر اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔ بس امام محمدؒ ہی ایک ایسے شخص ہیں کہ میں نے انہیں علم کی ہر منزل میں شگفتہ مزاج پایا اگر میں پہلی بار کسی مسئلے کو صحیح طور پر ذہن نشین نہ کر سکا تو دوسری مرتبہ دریافت کیا۔

امام محمدؒ نے اسی خوش طبعی کے ساتھ دوبارہ وہی مسئلہ مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا۔ میں اکثر سوچتا کہ امام محمدؒ میرے طرزِ عمل پر کہیں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہ کریں لیکن اس مردِ جلیل کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک تبسم جانفزا نمایاں رہتا۔‘‘

ایک اور موقعے پر حضرت امام شافعیؒ نے برسرِ محفل امام محمدؒ کی جلالتِ علمی کے بارے میں فرمایا ’’میں نے امام محمدؒ بن حسن شیبانیؒ سے زیادہ کسی کو قرآن حکیم کا عالم نہیں پایا جب امامؒ کسی آیتِ مقدسہ کی تفسیر بیان فرماتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان ہی کے سامنے یہ کتاب نازل ہوئی ہے۔‘‘

حفظِ ذہبیؒ نے اپنی تاریخِ کبیری میں یہ واقعہ تحریر کیا ہے کہ ایک بار امام محمدؒ نے حضرت امام شافعیؒ کو پچاس اشرفیاں دیتے ہوئے فرمایا ’’اگر آپ علم حاصل کرنا چاہیں تو میرے ساتھ قیام فرمایئے یہ حقیر سی رقم آپ کی نذر ہے۔ اسے قبول کرنے میں کسی قسم کے تکلف کا مظاہرہ نہ کیجیے۔‘‘

حضرت امام شافعیؒ نے کسی جھجک کے بغیر امام محمدؒ کا عطیہ قبول کر لیا اور نہایت ادب کے ساتھ فرمایا ’’آپ کی ذاتِ گرامی تو وہ ہے کہ جس کے روبرو میں اپنے دل کا حال بیان کر سکتا ہوں اگر میرے نزدیک آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا جن سے مجھے تکلف برتنا چاہیے تو میں ہرگز یہ امداد قبول نہ کرتا۔‘‘ اس واقعے سے کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ ذہنی طور پر امام محمدؒ سے کس قدر متاثر تھے۔

ابن سماعہؒ نے ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ امام محمدؒ حضرت امام شافعیؒ کی ضروریات کا بہت خیال رکھتے تھے۔ طویل رسم وراہ کے زمانے میں کبھی ایسا کوئی موقع نہیں آیا کہ امام شافعیؒ کو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے امام محمدؒ سے زبانی یا تحریری طور پر کچھ کہنا پڑا ہو۔ امام محمدؒ فرزندِ قریش کے فطرت سے بخوبی واقف تھے کہ آپ حد درجہ غیور انسان ہیں۔ انتہائی سنگین مرحلے میں بھی اپنی ذاتی طلب کا اظہار نہیں کریں گے۔ اس لیے امام محمدؒ ہمیشہ حضرت امام شافعیؒ کے چہرے پر نظر رکھتے تھے اور ظاہری کیفیات سے اندازہ کرتے تھے کہ فرزندِ قریش پُرسکون ہیں یا مضطرب؟ اگر امام شافعیؒ کے



چہرے پر ٹھہراؤ اور سکون نظر آتا تو مطمئن ہو جاتے لیکن پھر بھی اتنا ضرور دریافت کرتے ’’فرزند! تمہیں کوئی اقتصادی مسئلہ تو درپیش نہیں؟‘‘

اگرچہ امام شافعیؒ کے چہرے پر ہلکا سا بھی عکسِ غم نظر آ جاتا تو امام محمدؒ بے قرار ہو اٹھتے۔ بار بار پوچھتے ’’فرزند! میں کوئی غیر تو نہیں ہوں کہ تم مجھ سے اپنے دل کے معاملات چھپا رہے ہو۔‘‘ جواب میں حضرت امام شافعیؒ خاموش رہتے اگر امام محمدؒ زیادہ اصرار کرتے تو بس یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ’’انسان کو کبھی اپنا ماضی، اپنا وطن اور اپنا گھر یاد آ جاتا ہے۔ ایسے میں کسی کا اداس ہو جانا کوئی غیر فطری بات نہیں‘‘ امام محمدؒ آپ کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوتے مسلسل اضطراب کے وجہ دریافت کرتے رہتے۔ اس کے بعد بھی اگر امام شافعیؒ سکوت اختیار کرتے تو امام محمدؒ بزرگانہ لہجے میں مخاطب ہوتے ’’فرزند! میں تمہارا استاد بھی ہوں۔ ایک استاد کی حیثیت سے تمہیں حکم دیتا ہوں کہ مجھ سے اپنی پریشانی بیان کرو۔‘‘ بالآخر امام شافعیؒ مجبور ہو جاتے اور نہایت مبہم الفاظ میں اپنی مالی ضرورت بیان کرتے‘ ابن سماعہؒ کی روایت ہے کہ امام محمدؒ نے کئی بار ایک ایک لاکھ درہم حضرت امام شافعیؒ کو جمع کر کے دیے (یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ حضرت امام محمدؒ ذاتی طور پر آسودہ حال ضرور تھے لیکن آپ کوئی امیر وکبیر انسان نہیں تھے ایک وقت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ کئی لاکھ درہم حضرت امام شافعیؒ کی نذر کر دیتے بعض تاریخی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب ایسا کوئی موقع آتا تو امام محمدؒ اپنے عقیدت مندوں اور حلقہ اثر کے لوگوں کو اشارہ کر دیتے۔ پھر اتنی بڑی رقم جمع ہو جاتی اور امام محمدؒ فرزندِ قریش سے کہتے کہ فی الحال اسے اپنے استعمال میں لائیں) معتبر روایات گواہ ہیں کہ ایسے واقعات کئی بار پیش آئے‘ ہر مرتبہ امام محمدؒ اسی طرح انتظام کرتے تا کہ حضرت امام شافعیؒ مطمئن زندگی گزار سکیں مگر یہ کہاں ممکن تھا۔ ادھر امام محمدؒ نے یہ کثیر سرمایہ امام شافعیؒ کی نذر کیا اور ادھر فرزندِ قریش نے سب کچھ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ امام محمدؒ، امام شافعیؒ کی اس عادتِ کریمانہ سے واقف تھے اس لیے کبھی ایک حرف زبان پر نہیں لاتے تھے۔ اہلِ نظر اس واقعے سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام محمدؒ، امام شافعیؒ سے حسد رکھتے تھے یا آپ کو فرزندِ قریش سے بے پناہ محبت تھی؟

ایک بار حضرت امام شافعیؒ کے ساتھ عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ اس وقت آپ عراق میں تھے امامؒ کی شہرت دور دور پھیل چکی تھی اس لیے شناساؤں کا حلقہ بھی بہت وسیع ہو گیا تھا‘ لوگ قطار در قطار آتے اور اپنے مسائل بیان کرتے‘ جہاں تک حدیث وفقہ اور دیگر علمی مسائل کا تعلق ہوتا امام شافعیؒ اپنی

غیر معمولی ذہانت سے کام لے کر سوال کرنے والوں کو مطمئن کر دیتے مگر انسانی ہجوم میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے جن کی دینوی ضروریات انہیں امامؒ کے آستانہ عالیہ تک کھینچ کر لے آتیں۔ پھر وہ اپنی الجھنیں، اپنی مالی پریشانیاں امامؒ کے سامنے بیان کرتے، ضرورت مندوں کو یہ احساس تک نہ ہوتا کہ جس شخص کے سامنے یہ مسائل بیان کئے جا رہے ہیں، وہ خود دینوی اسباب کے اعتبار سے ایک تہی دست انسان ہے۔ لوگ صورتِ حال پر غور کیے بغیر امامؒ کے سامنے دستِ طلب دراز کرتے۔ مخلوقِ خدا کی زبوں حالی دیکھ کر امامؒ اس قدر دل گرفتہ ہو جاتے کہ آپ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا اور اہلِ مجلس کو صاف محسوس ہونے لگتا کہ ان کا امامؒ افسردہ و ملول ہے پھر یہ اضطراب اس قدر بڑھ جاتا کہ امامؒ کے علمی کاموں میں خلل واقع ہونے لگتا۔ امامؒ اپنی فطری مجبوریوں کے باوجود یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ آپ کے سامنے حاجت بیان کرنے والا شخص ناکام و نامراد واپس لوٹ جائے۔ نتیجتاً امام شافعیؒ صاحبِ حیثیت افراد سے قرض لے کر ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرتے، اس نازک موقع پر بعض عقیدت مند بے اختیار کہہ اٹھتے۔

"امامؒ! مفلوک الحال لوگوں سے تو ساری دنیا بھری ہوئی ہے آپ کس کس کا خیال کریں گے؟"

"مجھے اپنے خدا سے شرم آتی ہے کہ وہ مہمانوں کو میرے پاس بھیجے اور میں ان کو تواضع نہ کر سکوں۔" امام شافعیؒ بڑے سوزناک لہجے میں کہتے اور پھر شدتِ انکسار سے اس طرح جھک جاتے جیسے اپنے رب کا شکر ادا کر رہے ہوں۔

"یہ تو درست ہے مگر تواضع کے لیے وسائل بھی تو ضروری ہیں"، کہنے والا در پردہ امامؒ کے غربت و افلاس کی طرف اشارہ کرتا۔

"جن لوگوں کو نظامِ کائنات کا شعور نہیں وہ اسباب و وسائل کی بات کرتے ہیں۔" امام شافعیؒ بڑے تحمل سے فرماتے۔

"خدا نے جنہیں نظر بخشی ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ایک بندہ دوسرے بندے کو کچھ نہیں دے سکتا۔ مہمان ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں دنیا سمجھتی ہے کہ صاحبِ خانہ ان کی مدارات میں مشغول ہے مگر کسی کو کیا معلوم کہ غائبانہ طور پر خدا ہی اپنے بندوں کی میزبانی کرتا ہے۔ شافعیؒ کے پاس بھی اس کے حکم سے کچھ ضرورت مند آتے ہیں اور پھر وہی اہلِ حاجت کی کفالت کرتا ہے شافعی کو تو درمیانی ذریعہ بنا کر ایک عظیم سعادت بخشی گئی ہے۔ میں سعادت سے کیسے منہ موڑ لوں؟ پھر میرا



کہاں ٹھکانہ ہوگا؟" اہلِ مجلس امامؒ کی باتیں سن کر خاموش ہو جاتے۔ بندگی کے اس مفہوم سے ناآشنا لوگ کسی طرح سمجھتے کہ محمدؒ بن ادریسؒ کس مقام سے بول رہے ہیں۔ ہر طرف گہرا سکوت چھا جاتا تھا اور پھر امام شافعیؒ بڑی خاموشی کے ساتھ اہلِ ثروت سے قرض لے کر اہلِ ضرورت کے دامن میں ڈال دیتے کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ امامؒ نے کس سے کیا لیا اور کس کو کیا دیا۔

یہ سلسلہ کئی ماہ سے چل رہا تھا۔ عراق کے مقامی باشندوں میں سے ایک دولت مند شخص امامؒ کو بڑی فراخدلی کے ساتھ قرض دیتا رہا اور امامؒ اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے۔ پھر ایک دن نہ جانے کیا ہوا کہ امام شافعیؒ اس شخص کے گھر گئے تو وہ انتہائی تلخ لہجے میں کہنے لگا۔ "امامؒ! میں تمہیں اس وقت تک واپس جانے نہیں دوں گا جب تک تم میری ساری رقم واپس نہیں کر دو گے۔"

کسی تاریخ میں اس واقعے کی مکمل تفصیلات تو نہیں ملتیں کہ امام شافعیؒ نے اس شخص کے جارحانہ مطالبے پر اپنے ردِ عمل کا کس طرح اظہار کیا مگر قیاس ہے کہ امامؒ نے اتمامِ حجت کے طور پر اس سے وعدہ کیا ہوگا کہ آپ کسی مناسب موقع پر اس کا سارا قرض ادا کر دیں گے بعد میں جو واقعات مستند کتابوں میں نظر آتے ہیں، انہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس عراقی نے امام شافعیؒ کا کوئی عذر قبول نہیں کیا تھا بلکہ اپنی سنگدلی کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے آپ کو ایک کمرے میں قید کر دیا تھا۔

کسی تاریخی حوالے سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس شخص نے ذاتی طور پر امام شافعیؒ سے انتقام لینے کے لیے یہ فضا پیدا کی تھی یا پھر کسی سازشی گروہ کے فریب میں آ کر وہ اس قدر پستی میں اتر گیا تھا۔ بعض تحقیق کرنے والوں نے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ کئی روز تک ان نامعلوم شخص کی قید میں رہے۔

پھر نہ جانے کس طرح امام محمدؒ کو یہ خبر ہوگئی کہ امام شافعیؒ ایک شخص کے مکان میں اسیری کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ امام محمدؒ جیسے علم دوست انسان کے لیے یہ بڑی اذیت ناک اطلاع تھی۔ آپ بے قرار ہو کر اپنی مجلس سے اٹھے اور اس شخص کے مکان پر پہنچے۔ جہاں امام شافعیؒ ایک کمرے میں قید تھے۔ امام محمدؒ نے صاحبِ خانہ سے اس عجیب و غریب گرفتاری کی وجہ پوچھی۔ اس نے صورتِ حال کی وضاحت کرنے کے بعد ایک بار پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔ "جب تک یہ نوجوان میرا تمام قرض ادا نہیں کرے گا میں اس وقت تک اُسے مکان سے باہر نہیں جانے دوں گا۔"

امام محمدؒ واپس آئے اور آپ نے فوری طور پر مطلوبہ رقم کا انتظام کی۔ پھر اس شخص کا قرض ادا کرنے کے بعد امام شافعیؒ تک پہنچے اور بے اختیار فرزندِ قریش کو گلے لگا لیا۔ امام شافعیؒ امام محمدؒ کی محبتوں سے اس

قدر زیرِ بار تھے کہ شدتِ جذبات میں ایک لفظ بھی نہ بول سکے‘ دل پر چوٹ پڑی تو بس پلکیں بھیگ گئیں۔

’’اے شخص!‘‘ امام محمدؒ قرض خواہ سے مخاطب ہوئے ’’تو نے جس نوجوان کو اتنے دن سے قیدی بنا رکھا تھا وہ اپنی ذات کے لیے قرض مانگتا تو کجا ہونٹوں کو جنبش بھی نہیں دیتا‘ دستِ طلب کا دراز کرنا تو بہت بری بات ہے اس کی آنکھوں میں تو عکسِ سوال بھی نہیں ابھرتا۔‘‘ یہ کہہ کر امام محمدؒ نے امام شافعیؒ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس طرح مکان کی طرف لوٹے کہ دیکھنے والے اہلِ علم کی قربت و محبت پر حیران رہ گئے اس وقت نہ خاندانِ قریش کا ایک مفلس نوجوان تھا اور نہ بغداد کا عظیم المرتبت قاضی۔ بس ہر طرف علم تھا اور علم کے لازوال رشتے تھے۔

حضرت امام شافعیؒ کے شاگرد امام مزنیؒ نے اس واقعے کا مختصر ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ’’میرے استاد امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک بار عراق میں قرض کی وجہ سے محبوس ہو گیا تھا جب حضرت امام محمدؒ بن حسن شیبانیؒ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے ساری رقم ادا کر کے مجھے چھڑا لیا۔ اس لیے میں روئے زمین پر امام محمدؒ کا سب سے زیادہ شکر گزار ہوں۔‘‘

ایک اور موقع پر حضرت امام شافعیؒ اپنے استادانِ گرامی حضرت امام مالک بن انسؒ اور حضرت امام محمدؒ بن حسن شیبانیؒ کے بارے میں فرماتے ہیں ’’حضرت امام مالک درمیان میرے ایک ایسے استاد تھے جن سے مجھے علم ملا اور ان سے بڑھ کر کسی کا بھی مجھ پر احسان نہیں جو میرے اور خدا کے درمیان دلیل بنے‘‘ یہ امام مالکؒ کی اس نظرِ خاص کا ذکر ہے جو شافعیؒ پر پڑی تو دماغ کے ساتھ دل کو بھی روشن کرتی چلی گئی‘ یہ اس روحانی سفر کی مختصر سی روداد ہے جو امام شافعیؒ نے امامؒ مدینہؒ کی محبتوں کے سہارے طے کیا امام شافعیؒ کے قلب پر معرفت کے بعض سربستہ راز امام مالکؒ ہی کے ذریعے منکشف ہوئے‘ یہ علم کتابوں کے ذریعے ممکن نہ تھا امام شافعیؒ نے اس علم کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا ہے اور امام مالک بن انسؒ کو اپنا محسنِ عظیم قرار دیا ہے۔

اور جہاں تک مذہب کے روایتی علم کا تعلق ہے اس کے بارے میں امام شافعیؒ کھلے دل سے امام محمدؒ کے احسانات کا ذکر کرتے ہیں۔

’’علم اور دینوی وسائل و اسباب کے اعتبار سے مجھ پر کسی اور کا اتنا احسان نہیں ہے جس قدر امام محمدؒ کا ہے۔‘‘ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت امام شافعیؒ امامِ مدینہؒ کے انتقال کے بعد مکہ معظمہ کی حدود سے باہر نکلتے تھے اور پھر کئی سال تک مسائل اور حوادث کی آگ میں جلتے ہوئے امام محمدؒ کی



بارگاہ تک پہنچے تھے۔ جب تک امام مدینہؒ زندہ رہے اس وقت تک فرزندِ قریش نے کسی استاد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کئی سفر کیے‘ بے شمار محدثین و فقہا سے ملاقاتیں کیں مگر آپ کا مرکزِ قلب و نظر صرف امام مالکؒ ہی رہے۔ امامِ مدینہؒ ہی نے گیارہ سال تک آپ کی کفالت کی۔ اس تاریخی حقیقت کی روشنی میں امام مالک بن انسؒ ہی امام شافعیؒ کے محسنِ اول تھے۔ ان کے دامنِ محبت سے بچھڑ جانے کے بعد فرزندِ قریش کو امام محمدؒ کی قربت میسر آئی۔ اب یہ اتفاقاتِ زمانہ تھے کہ بغداد پہنچنے کے بعد امام شافعیؒ پر مصائب کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ یہاں تک کہ قتل ہوتے ہوتے بچے۔ ایسے سنگین مرحلے میں امام محمدؒ کی رفاقت نے فرزندِ قریش کو خلافتِ عباسیہ کی شمشیرِ ستم سے نجات دلائی۔ امام شافعیؒ جیسے حساس انسان کے دل پر امام محمدؒ کی یہ سفارش نقش ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد بھی پے در پے کئی حادثات پیش آئے امام محمدؒ نے ان گراں لمحات میں بھی امام شافعیؒ کا ساتھ نہیں چھوڑا‘ نتیجتاً فرزندِ قریش کو ہمیشہ کے لیے امام محمدؒ کے حلقۂ احسانات میں محصور ہونا پڑا۔

پھر جب اظہار کا وقت آیا تو امام شافعیؒ ساری دنیا کے سامنے بے اختیار پکار اٹھے ’’مجھ پر امام محمدؒ سے زیادہ کسی کا احسان نہیں ہے‘‘ بے شک یہ ایک مردِ قلندر کا اعتراف ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ امام مالکؒ کے احسانات کا درجہ امام محمدؒ کی عنایات سے کم ہے۔ امام مالکؒ بہر حال امام شافعیؒ کے محسنِ اول بھی تھے اور محسنِ اعظم بھی یہی وجہ ہے کہ امام محمدؒ سے بے پناہ علم حاصل کرنے کے باوجود امام شافعیؒ کا شمار اصحابِ مالکؒ میں ہوتا ہے۔ اور خود فرزندِ قریش بھی اس نسبت پر فخر کیا کرتے تھے‘ ہاں یہ ضرور ہے کہ امام مالک بن انسؒ کے بعد امام شافعیؒ جس شخص سے بہت زیادہ متاثر ہوئے وہ امام محمدؒ بن حسن شیبانیؒ ہی تھے۔

اتنے تاریخی حوالوں کے بعد کوئی ناقص العقل ہی یہ بات کہہ سکتا ہے کہ امام محمدؒ حضرت امام شافعیؒ سے حسد رکھتے تھے۔ اس قسم کی الزام تراشی کرنے والا شخص اگر ناقص العقل نہیں ہے تو سخت مذہبی تعصب کا شکار ہے۔ ایسا تعصب جو انسان کو روشنی کے سیدھے راستے سے ہٹا کر پر پیچ اور تاریک راہوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ امام شافعیؒ کو بڑا ثابت کرنے کے لیے امام محمدؒ کے کردار اور علمی کارناموں سے انکار کر دیا جائے۔ ہم تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہیں کہ اگر امام محمدؒ حضرت امام شافعیؒ پر ایک بھی احسان نہ کرتے تو ان کی عظمت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔ کم نظر افراد‘ امام محمدؒ کو حاسد قرار دینے کے لیے دفتر کے دفتر... سیاہ کر ڈالیں مگر امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کا یہ شاگردِ جلیل عظیم ہے اور اس وقت تک عظیم ہی رہے گا جب تک زمین پر حشر برپا نہ ہو اور قیامت کا وہ دن نہ آ جائے جس کا خدا نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے۔

یہ امام محمدؒ کی عظمت ہی تھی کہ جب خلیفہ ہارون رشید نے امام شافعیؒ کی قسمت کا فیصلہ کرنے سے پہلے ان کی طرف دیکھا تو وہ اپنی نشست پر کھڑے ہو گئے۔ تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دیا اور حکومتِ وقت کی مرضی کے خلاف فرزندِ قریش کے کردار پر گواہی دی۔ ''خدا کی قسم! محمدؒ بن ادریسؒ کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے محض ایک تہمت ہے۔ وہ تو بڑے علم والے ہیں'' معاذ اللہ! اگر امام محمدؒ کے دل پر حسد و تنگ نظری کا عکس بھی پڑ جاتا بھر انسانی جذبات کی تسکین کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسرا موقع فراہم نہیں ہو سکتا تھا۔ امام محمدؒ امام شافعیؒ کے خلاف گواہی بھی دے سکتے تھے اگر ایسا نہ کرتے تو خاموشی بھی اختیار کر سکتے تھے۔ امام محمدؒ کے ہونٹوں کا سکوت ہی امام شافعیؒ کو علوی تحریک سے وابستہ کر سکتا تھا...... اور پھر اہلِ نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہارون رشید کی شمشیرِ اقتدار جو بہت دیر سے امام شافعیؒ کے سر پر سایہ فگن تھی وہ دوبارہ کس طرح نیام میں داخل ہوتی۔ اللہ علیم و خبیر ہے۔ وہی بہتر جانتا ہے کہ امام محمدؒ کی خاموشی کے بعد کیا نتائج برآمد ہوتے مگر ظاہری طور پر حالات کا ایک رخ صاف نظر آ رہا تھا کہ امام شافعیؒ قتل کر دیئے جاتے اگر یہ اذیت ناک واقعہ پیش آ جاتا تو کیسا لرزہ خیز منظر ہوتا کہ فرشِ خلافت پر شافعیؒ کا خون بہہ رہا ہے۔ وہ خون جس کا ایک ایک قطرہ علم کا سمندر تھا۔ بلاشبہ زمانہ قدیم سے اب تک اس زمین سے بڑے بڑے نقصانات برداشت کیے ہیں۔ مرگِ شافعیؒ کے بعد یہ ایک اور نقصان عظیم ہوتا لیکن خدا نے فرزندِ قریش کو بچا لیا اور اس ناقابلِ فراموش مقدمے میں حضرت امام محمدؒ کو امام شافعیؒ کا وکیل بنا کر پیش کیا۔

پھر یہی وکیل، فرزندِ قریش کو سیاست کے مقتل کے نکال کر اپنے گھر لے گیا۔ امام شافعیؒ پہلے ہی امام محمدؒ کے ممنونِ احسان تھے۔ اس وقت مزید زیر بار ہو گئے جب ایک دن امام محمدؒ نے فرمایا ''فرزند! خدا کا شکر ہے کہ تم دنیا پرستوں کے فتنے سے نجات پا گئے۔ اب تمہیں اپنے ذہن سے اس قسم کے تمام خدشات کو مٹا دینا چاہیے۔''

امام شافعیؒ نے بڑے والہانہ انداز میں اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا۔

''اگر تم علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو دنیوی اسباب سے بے نیاز ہو کر اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل کرو۔'' امام محمدؒ نے نہایت فراخدلانہ انداز میں فرمایا ''میرے تمام وسائل تمہارے لیے وقف ہیں۔''

یہ حضرت امام شافعیؒ کی زندگی کا نیا موڑ تھا۔ قدرت نے رہنمائی کرتے ہوئے آپ کو ایک ایسے وسیع القلب انسان کے دروازے تک پہنچا دیا تھا جو فقہ عراق کا بہت بڑا عالم تھا۔ امام شافعیؒ اب تک علمِ حدیث



کی تلاش میں سرگرداں رہے تھے جس کا بڑا حصہ آپ کو امام مالکؒ کی بارگاہ سے حاصل ہو چکا تھا۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد امامؒ کی طبیعت فقہ کی طرف مائل تھی اگرچہ امام مالکؒ کے دامن سے وابستہ رہ کر آپ کو فقۂ مدینہ کا بھی ادراک ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود فقۂ عراق کی حیثیت بھی اپنی جگہ مسلم تھی۔ اور جہاں تک فقۂ عراق کا تعلق تھا اس کے رموز و نکات امام ابوحنیفہؒ پر ختم تھے۔ اس بات کا امام شافعیؒ کو بھی اعتراف تھا کہ امام ابوحنیفہؒ فقیہہ اعظم ہیں اس لیے فطری طور پر آپ اسی درس گاہ سے وابستگی چاہتے تھے۔ اب یہ قدرت کی کرشمہ سازی تھی کہ اس نے عجیب و غریب انداز سے امام شافعیؒ کو امام محمدؒ کی مجلسِ علم تک پہنچایا نتیجتاً آپ نے امام محمدؒ کی باقاعدہ شاگردی اختیار کر لی۔

☆☆☆

اب امام شافعیؒ کے روز و شب کا ایک ایک لمحہ فقہائے عراق کی کتابوں کے مطالعے میں گزر رہا تھا۔ فرزندِ قریش نے سب سے پہلے امام محمدؒ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا' غیر معمولی حافظے کے سبب امام شافعیؒ بڑی سے بڑی کتاب کو چند روز میں حفظ کر لیا کرتے تھے۔ امام محمدؒ کی کتابیں ازبر کرنے کے بعد آپ نے اپنے استادِ گرامی سے دیگر فقہائے عراق کی کتابیں طلب کیں۔ امام محمدؒ کے کتب خانے میں نادر و نایاب تصانیف کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ جب ایک کتاب ختم ہو جاتی تو امام شافعیؒ دوسری طلب کرتے۔

امام محمدؒ کو فرزندِ قریش کے اس عمل پر ذرا بھی حیرت نہ ہوتی۔ امام محمدؒ اس راز سے باخبر تھے کہ امام شافعیؒ دنیا کے سب سے زیادہ قوی الحافظہ انسانوں میں سے ایک ہیں۔ البتہ امام محمدؒ کے دوسرے شاگرد امام شافعیؒ کے اس تیز رفتار مطالعے پر حیران ہو جاتے اور کبھی کبھی نکتہ چینی بھی کرنے لگتے۔ ان لوگوں کے خیال میں یہ محض ورق گردانی تھی جس سے طالبِ علم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ غرض بہت دن تک اسی قسم کے تبصرے جاری رہے مگر امام شافعیؒ نے ایک بار بھی پیچھے کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا کہ ان کا مخاطب کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟ آپ کو تو ایک ہی دھن تھی کہ اہلِ علم کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ذہن میں منتقل ہو کر روح کی گہرائیوں تک پہنچ جائے اور ایسا ہی ہو رہا تھا' اب تک فقہائے عظیم کے تحریر کردہ ہزاروں صفحات نہ صرف امام شافعیؒ کے ذہن پر نقش ہو چکے تھے بلکہ ان کی تہہ در تہہ گہرائیاں بھی آپ کے دل پر بے نقاب ہو چکی تھیں۔ امامؒ کے شوقِ مطالعہ کا یہ حال تھا کہ کتاب کے سلسلے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے جب امام شافعیؒ عراق کے فقہائے عظام کی کتابیں اجرت دے کر نقل کرا رہے تھے' طریقہ یہ تھا کہ امام شافعیؒ امام محمدؒ سے عارضی طور پر کتابیں لے کر

انہیں نقل کراتے تھے اور پھر فوراً ہی واپس کر دیا کرتے تھے۔

ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ امام شافعیؒ نے اپنے استادِ گرامی سے ایک کتاب طلب کی۔ اس وقت امام محمدؒ یا تو بہت زیادہ مصروف تھے یا ان کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ امام شافعیؒ کتاب حاصل کرنے کے لیے باہر کھڑے ہیں۔ فرزندِ قریش کچھ دیر تک انتظار کرتے رہے مگر جب اندر سے کوئی جواب نہیں آیا تو آپ نے فی البدیہہ چار اشعار لکھے اور ایک خدمت گار سے کہا کہ وہ اس درخواست کو امام محمدؒ تک پہنچا دے۔ خادم فوراً ہی اندر چلا گیا۔ ان اشعار کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

''جس کو دیکھنے والوں نے اس کا مثل نہیں دیکھا۔

اور جس نے اسے دیکھا، گویا اس سے پہلے کے امام کو بھی دیکھ لیا۔

اس شخص کو میرا پیغام پہنچاؤ کہ علم اہلِ علم کو اس بات سے روکتا ہے کہ مستحق لوگوں کو اس سے محروم رکھا جائے۔

امید یہی ہے کہ وہ مستحقِ علم بھی آگے کسی دوسرے مستحق کو فائدہ پہنچائے گا۔''

ابن جوزیؒ نے اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جیسے ہی خدمت گار امام شافعیؒ کی یہ درخواست لے کر مکان کے اندر پہنچا' امام محمدؒ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئے پھر آپ نے امام شافعیؒ کے تحریر کردہ اشعار پر نظر ڈالی۔ اہلِ خانہ نے دیکھا کہ اچانک امام محمدؒ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آپ بہت زیادہ مسرور نظر آنے لگے تھے۔ دوسرے ہی لمحے امام محمدؒ اپنی جگہ سے اٹھے اور کتب خانے میں تشریف لے گئے مطلوبہ کتابیں نکالیں...... ایک مختصر سی تحریر امام شافعیؒ کے نام لکھی اور خدمت گار کو کتابیں دے کر فرمایا۔ یہ محمد بن ادریس کو دے دو۔

خدمت گار باہر آیا اور اس نے دونوں چیزیں امام شافعیؒ کے حوالے کر دیں۔ امام نے تیزی سے اس مکتوب کو کھولا اور پڑھنے لگے یہ امام محمدؒ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چند سطریں تھیں جو امام شافعیؒ کے نام تحریر کی گئی تھیں۔

''فرزند یہ کتابیں عاریتاً نہیں ہیں بلکہ تمہیں نذر کی جا رہی ہیں۔'' علم کی یہ عجیب منزل تھی اور عجیب مسافر تھے۔

☆☆☆

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا امام شافعیؒ کے ذوقِ علم میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ روز و شب کی



عبادات اور ذکرِ الٰہی کے بعد آپ اپنا تمام وقت کتابوں کے مطالعے میں گزارتے تھے۔ امامؒ کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی کتاب شروع کر دی تو پھر اسے ختم کر کے ہی سکون کی سانس لیتے تھے اگر اس دوران کھانے کا وقت بھی آ گیا تو امامؒ اسے نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ اگرچہ امام محمدؒ کے یہاں آپ کو طعام کے علاوہ دیگر آسائشیں بھی حاصل تھیں...... لیکن امام شافعیؒ نے کتابوں کے سوا دنیا کی کسی نعمت کو بھی قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ بالآخر اس کثرتِ مطالعہ کا یہ حاصل برآمد ہوا کہ امام شافعیؒ فقہائے عراق کی کتابوں کے حافظ قرار پائے کسی امام کی کسی تصنیف کا کوئی حصہ آپ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہا۔

جب امام شافعیؒ عراقی علم کے سمندر کی تہہ تک اتر گئے تو پھر آپ نے امام محمدؒ کے شاگردوں سے اکثر مسائل پر بحث شروع کر دی اس بحث و مباحثے کا واقعہ بھی بڑا عجیب و غریب ہے جب تک امام محمدؒ مجلسِ درس میں موجود رہتے تھے اس وقت تک حضرت امام شافعیؒ کی ظاہری کیفیت یہ ہوتی تھی کہ آپ دست بستہ سر جھکائے اس طرح بیٹھے رہتے تھے کہ جیسے اپنے گرد و پیش سے بھی بے خبر ہوں۔ اکثر امام شافعیؒ کی آنکھیں بھی بند ہوتی تھیں لیکن سماعت کی بیداری کا یہ حال ہوتا تھا کہ آپ کے کان امام محمدؒ کی تقریر پر لگے رہتے تھے۔ اور ایک ایک لفظ سماعت کے راستے سے گزرتا ہوا دل و دماغ پر نقش ہوتا رہتا تھا۔ اس کے بعد مجلسِ درس ختم ہو جاتی تھی اور جب امام محمدؒ اپنے گھر تشریف لے جاتے تھے اور امام شافعیؒ ان کے شاگردوں سے مختلف مسائل پر بحث شروع کر دیتے تھے۔

ابتدا میں کچھ ایسے واقعات بھی پیش آتے رہتے تھے کہ امام شافعیؒ حضرت امام محمدؒ کے شاگردوں سے بحث کرتے تھے مگر فقہ کا علم کم ہونے کے باعث آپ کسی مقام پر جواب دینے سے عاجز رہ جاتے تھے۔ اگرچہ امام شافعیؒ کا نقطہ بحث برائے بحث نہیں ہوتا تھا اور آپ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ امام محمدؒ کے شاگردوں کو لاجواب کر کے قلبی طمانیت حاصل کریں۔ امام شافعیؒ کی بحث کا ایک ہی مقصد تھا کہ علم کے پوشیدہ گوشے بے نقاب ہوں اور آپ کے دماغ پر مسائل کے رموز و نکات منکشف ہو جائیں۔

یہ امام شافعیؒ کی اپنی سوچ تھی مگر امام محمدؒ کے بعض شاگرد اس کا غلط مفہوم لیتے تھے اور اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ برسرِ محفل کوئی مسئلہ زیرِ بحث آئے اور امام شافعیؒ کو لوگوں کی موجودگی میں شکست ہو جائے۔ اتفاق سے ایک تقریبِ نکاح میں کچھ اہلِ علم جمع ہوئے۔ ان میں حضرت امام شافعیؒ بھی تھے نکاح سے قبل اچانک فقہ کے چند مشکل مسائل پر بحث ہونے لگی اس محفل میں حضرت امام محمدؒ کے شاگرد خاص سفیان بن سحبانؒ بھی موجود تھے۔ سفیانؒ حضرت امام محمدؒ کے شاگردوں میں بہت زیادہ ذہین اور

صاحبِ فراست سمجھے جاتے تھے' جب مسائل پر بحث شروع ہوئی تو سفیان بن سحبانؒ حضرت امام شافعیؒ سے مخاطب ہوئے اور گفتگو کا نہایت پیچیدہ طریقہ اختیار کیا۔ ابھی امام شافعیؒ کو فقہ کے دقیق مسائل کا علم زیادہ نہیں تھا اس لیے آپ سفیان کے اندازِ تقریر سے الجھنے لگے۔ دورانِ گفتگو امام شافعیؒ نے دبے لفظوں میں اشارہ بھی کیا کہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آسکی ہے۔ اصولی طور پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سفیانؒ کو بات سمجھانے کے لیے سیدھا اور آسان راستہ اختیار کرنا چاہئے تھا مگر وہ علم اور خطابت کے جوش میں امام شافعیؒ کی مجبوریوں کو نہ سمجھ سکے۔ فرزندِ قریش نے دوبارہ اپنی کم فہمی کا اظہار کیا تو سفیان نے اور بھی زیادہ مشکل مسائل پر بحث چھیڑ دی۔ سفیانؒ کے مزاج میں شوخی بھی تھی اس لیے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے امام شافعیؒ کو مجبور دیکھ کر طنز ومزاح سے بھی کام لیا ہوگا امام شافعیؒ خاموش رہے مگر آپ کے چہرے سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اہلِ مجلس اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ امام شافعیؒ کا مسلسل سکون اور سفیان بن سحبانؒ کی پیہم تقریر نے محفل کا رنگ ہی بدل ڈالا تھا۔ بعض تنگ نظر عراقی اس بات سے بے حد خوش نظر آرہے تھے کہ سفیانؒ نے کثرتِ علم سے ایک حجازی کو عاجز کر دیا تھا۔

آخر تقریبِ نکاح ختم ہوگئی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کے جانے لگے۔ امام شافعیؒ اور سفیان بن سحبانؒ بھی اٹھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ علمی بحث تو بہت پہلے تمام ہو چکی تھی مگر سفیان کے چہرے پر اب بھی شوخی کا رنگ نمایاں تھا جیسے وہ فرزندِ قریش کے لاجواب ہو جانے پر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہوں۔ امام شافعیؒ نے بھی اس صورتِ حال کو محسوس کر لیا۔ نتیجتاً آپ رخصت ہونے سے پہلے سفیانؒ کے پاس تشریف لے گئے اور نہایت سنجیدہ لہجے میں فرمانے لگے۔

''فقہ کے ان مسائل پر بحث کرنے سے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ میں برسرِ عام اپنی علمی حیثیت کا مظاہرہ کروں اور آپ کی عالمانہ شان کو لوگوں کے سامنے جھٹلانے کی کوشش کروں۔ معاذ اللہ! یہ کس طرح ممکن ہے؟ میں تو فقہ اور حدیث کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ جہاں جہاں بھی گمان ہوتا ہے علم کی دولت مل جائے گی وہاں بے دریغ چلا جاتا ہوں اور اپنا دامن پھیلا دیتا ہوں۔'' یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جسے حضرت امام شافعیؒ نے بلاتکلف بیان کر دیا تھا۔ مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ اظہارِ معذرت کے بعد بھی اہلِ مجلس نے سفیان بن سحبانؒ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی جو غالباً ان کی فطری شوخی کا مظہر تھی۔

بعد میں کسی شاگرد نے امام محمدؒ کے سامنے اس واقعے کی تفصیلات بیان کر دیں۔ امام محمدؒ کو تمام حالات سن کر افسوس ہوا۔ پھر آپ نے اپنے سارے شاگردوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا ''شافعی



''ہمارے شریکِ مجلس ہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ محبت اور نرمی سے پیش آنا چاہئے۔ آئندہ ان کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرنا کہ وہ پریشان ہو جائیں۔'' امام محمدؒ کی اس تنبیہہ کے بعد امام شافعیؒ کے معاملے میں دوسرے شاگرد تو محتاط ہو گئے تھے مگر سفیان بن سحبانؒ کا انداز وہ برقرار رہا۔ اگرچہ امام محمدؒ کی ہدایت کے بعد سفیانؒ کی شوخیوں میں کسی حد تک کمی آگئی تھی لیکن فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ کبھی کبھی امام شافعیؒ کو چھیڑ دیا کرتے تھے۔ بعض تاریخی روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب تک حضرت امام شافعیؒ بغداد میں مقیم رہے اس وقت تک یہ معاصرانہ چشمک جاری رہی۔ سفیان بن سحبانؒ اس موقعے کی تلاش میں رہتے تھے کہ جب فقہ کے مسائل زیرِ بحث آئیں اور وہ امام شافعیؒ کو عاجز کرنے کے لیے اپنے دلائل پیش کریں۔ ایسی بھی کچھ روایتیں موجود ہیں جن سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ عام طور پر حضرت امام شافعیؒ سفیان بن سحبانؒ کے ساتھ بحث کرنے سے گریز کرتے تھے' بہرحال حقائق کچھ بھی ہوں لیکن یہ امر طے شدہ ہے کہ وہ معاصرانہ چشمک فقہائے عظیم کے درمیان تھی۔ ہم علمائے ظاہر اور دنیا پرست مولویوں پر اس کا اطلاق نہیں کر سکتے۔

اس طرح کم وبیش دو سال گزر گئے۔ سیکڑوں کتابوں کا مطالعہ اور پھر علمی مباحث نے امام شافعیؒ پر فقہ کے بے شمار دروازے کھول دیے تھے اب آپ امام محمدؒ کے شاگردوں سے بلاجھجک بحث کرتے تھے اور ہر مسئلے میں انہیں عاجز کر دیا کرتے تھے۔ سفیان بن سحبانؒ اپنی اس روش پر قائم تھے لیکن وہ دقیق سے دقیق مسائل میں بھی امام شافعیؒ کو شکست نہیں دے سکتے تھے۔ فرزندِ قریش کی بحث کا طریق کار آج وہی تھا۔ جب تک امام محمدؒ مجلس میں موجود رہتے' امام شافعیؒ باادب سر جھکائے بیٹھے رہتے۔ اور جب امام محمدؒ اٹھ کر چلے جاتے تو امام شافعیؒ ان کے شاگردوں سے بحث کرتے ...... تمام حاضرینِ مجلس ایک طرف ہوتے اور امام شافعیؒ تنہا دوسری طرف۔ بحث شروع ہوتی' امام محمدؒ کے سارے شاگرد اس مسئلے پر اپنے دلائل پیش کرتے مگر آخر میں امام شافعیؒ ان سب پر حاوی رہتے۔ اگرچہ اب بھی امام شافعیؒ کا نقطہ نظر یہی تھا کہ اہلِ علم کو پوری فراخدلی کے ساتھ مناظرہ کرنا چاہیے تاکہ لوگ ایک دوسرے کو اپنے خیالات منتقل کر سکیں اور علم کو فروغ حاصل ہو۔

لیکن امام محمدؒ کے کچھ شاگردوں نے امام شافعیؒ کے اس نظریے کو قبول نہیں کیا اور اپنے طور پر یہ سمجھتے رہے کہ حجازی نوجوان انہیں شکست دے کر خوش ہوتا ہے جب امام محمدؒ کے شاگردوں کے ذہنوں میں یہ خیال پوری طرح جڑ پکڑ گیا تو ایک دن ان لوگوں نے امام محمدؒ سے امام شافعیؒ کی شکایت کرتے ہوئے

کہا "اب محمدؒ بن ادریسؒ کی یہ عادت مستقل ہوگئی ہے کہ وہ آپ کی عدم موجودگی میں نئے نئے مسائل اٹھاتے ہیں اور درس گاہ ابوحنیفہؒ کے تربیت یافتہ افراد سے اختلافی بحث کرتے ہیں۔"

امام محمدؒ سے یہ شکایت بڑی سطحی انداز میں کی گئی تھی' کہنے والوں کے الفاظ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اہلِ عراق کو ایک حجازی نوجوان کی علمی فضیلت کسی طرح گوارا نہیں تھی۔ جب تک علمی مباحث کے دوران حضرت امام شافعیؒ شکست کھاتے رہے اس وقت تک یہی لوگ خاموش رہے مگر جیسے ہی فرزندِ قریش کے علم میں اضافہ ہوا اور وہ امام محمدؒ کے شاگردوں سے آگے نکل گئے اہلِ مجلس کو ان کی یہ برتری گراں گزرنے لگی۔ علم کا جواب علم تھا اور دلیل کا جواب دلیل۔ لیکن امام محمدؒ کے شاگردوں نے علم کو حجاز و عراق کا مسئلہ بنا کر اپنے استادِ گرامی کے سامنے پیش کیا۔ اگر یہ بات سرسری انداز میں امام محمدؒ کے گوش گزار کی جاتی تو یقیناً امام محمدؒ اسے نظر انداز کر دیتے۔ یہ کوئی پرخاش یا کدورت نہیں تھیں جو اہلِ علم کے دلوں میں پیدا ہو گئی تھی اور جسے دور کرنے کے لیے امام محمدؒ کی مداخلت ضروری تھی اگر درس گاہ میں امام شافعیؒ اور دیگر شاگردوں کے درمیان کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا تو پھر امام محمدؒ کے لیے لازم تھا کہ آپ پوری شدت کے ساتھ اس طرف متوجہ ہوتے اور فریقین کے تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے اپنے اثرات کو بروئے کار لاتے مگر یہاں تو معاملہ ہی مختلف تھا۔ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ امام محمدؒ کے شاگردوں نے امام شافعیؒ کے طریقہ کار بحث کو کچھ اور ہی رنگ دے کر اپنے استادِ گرامی کے سامنے پیش کیا تھا۔ نتیجتاً ایک روز امام محمدؒ نے حضرت امام شافعیؒ کو طلب کیا اور ان سے پوچھا۔

"کیا تم میری عدم موجودگی میں ان لوگوں سے بحث کرتے ہو؟" امام محمدؒ کا اشارہ اپنے شاگردوں کی طرف تھا۔

"جی ہاں۔ وہ ایک علمی بحث ہوتی ہے۔" امام شافعیؒ نے ادب کے پیشِ نظر بہت آہستہ لہجے میں کہا۔ "میں نے اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لیے فقہ کے مسائل چھیڑتا ہوں۔ میرے نزدیک اس میں کوئی ہرج بھی نہیں ہے کہ تبادلہ خیالات ہو جائے اور ہم لوگ ایک دوسرے کی معلومات سے مستفیض ہو سکیں۔" امام شافعیؒ نے پوری سچائی کے ساتھ وہی بات کہہ دی جو آپ کے دل میں تھی۔

"وہ کون سے مسائل ہیں؟" امام محمدؒ نے دریافت کیا۔ "تم ان مسائل میں مجھ سے مناظرہ کرو۔"

اس صورت حال سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام محمدؒ کے شاگردوں نے امام شافعیؒ کے مناظروں کو دوسری ہی شکل دے دی تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو امام محمدؒ حضرت امام شافعیؒ کو مناظرے کی دعوت نہ دیتے۔



امام محمدؒ شاگردوں کے بحث میں اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گئے تھے' اس کی مکمل تفصیلات تو نہیں ملتیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ بعض غیر ذمے دار حضرات نے مالکی اور حنفی مسلک کے اختلافات کو ضرورت سے زیادہ ہوا دے دی تھی جس کے باعث حضرت امام محمدؒ اپنے شاگرد حضرت امام شافعیؒ سے آمادۂ بحث ہو گئے تھے۔

مختصر یہ کہ جب امام محمدؒ نے فرزندِ قریش کو مناظرے کی دعوت دی تو امام شافعیؒ نے نہ صرف سکون اختیار کیا بلکہ انتہائی ادب و احترام کا مظاہرہ کرنے کے لیے اہلِ مجلس کے سامنے اپنا سر جھکا لیا۔ یہ امام شافعیؒ کے انکار کی واضح علامت تھی کہ آپ اپنے استادِ گرامی کے سامنے لب کشائی کی جرات نہیں رکھتے۔

"فرزند! اس مسئلے پر تم کھل کر مجھ سے بحث کرو۔" حضرت امام محمدؒ نے دوبارہ امام شافعیؒ کو مخاطب کیا۔ جواب میں حضرت امام شافعیؒ کی گردن مزید خم ہو گئی۔ فرزندِ قریش استادِ گرامی کا سامنا کرنے سے مسلسل گریز کر رہے تھے۔ یہ آپ کے لیے ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا کہ جس مردِ جلیل سے علم حاصل کیا تھا اسی کے سامنے اپنے دلائل پیش کریں۔ بحث کا تو بنیادی مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی معاملے میں اپنی دلیل لائے اور دوسرا فریق اس دلیل کو اپنے علم کے ذریعے رد کرے۔ امام شافعیؒ بھی آج اپنی زندگی کے دشوار ترین لمحات سے گزر رہے تھے۔ کرب و اذیت میں ڈوبے ہوئے لمحات کہ جب امام محمدؒ دعوت مناظرہ دے رہے تھے اور فرزندِ قریش اس طرح سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے کہ جیسے آپ کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی ہو۔

"فرزند! تم خاموش کیوں ہو؟" امام محمدؒ نے تیسری بار امام شافعیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "علمی معاملات میں تمہارا یہ سکوت کوئی مناسب طرزِ عمل نہیں۔"

"مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ اس شخص کے سامنے اپنی زبان کھولوں جس نے مجھے بولنا سکھایا ہے۔" آخر امام شافعیؒ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "شافعیؒ کو یہ کس طرح گوارا ہوگا کہ آپ کوئی دلیل پیش کریں اور وہ اسے جھٹلانے کی کوشش کرے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ محمدؒ بن ادریسؒ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" احترامِ استاد کی یہ عجیب مثال تھی' مروت و وضعداری نے امام شافعیؒ کو یکسر بے زبان بنا کر رکھ دیا تھا۔

"نہیں فرزند! تمہارا یہ خیال درست نہیں۔" امام محمدؒ نے فرمایا "مذہبی مسائل کے سلسلے میں شرم و تکلف کو دیوار نہیں بنانا چاہئے۔ استاد کا احترام اپنی جگہ مگر یہ محض ایک علمی بحث ہے۔ آخر ایک اہم مسئلے پر تبادلہ خیال میں ہرج ہی کیا ہے" امام محمدؒ کا اصرار لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ امام شافعیؒ بدستور خاموش رہے

آپ ہر صورت میں اس بحث سے گریز چاہتے تھے مگر امام محمدؒ کا اصرار کرتے رہے۔ یہ اصرار اس قدر بڑھا کہ حکم کا درجہ اختیار کر گیا۔ بالآخر امام شافعیؒ مجبور ہو گئے۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری نے اپنی کتاب ''آثارِ امام شافعیؒ'' میں اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ نے بڑی ناگواری کے عالم میں بحث چھیڑی اہلِ نظر کسی حوالے کے بغیر ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس شخص نے اس زمین پر استاد کے ادب و احترام کی بہترین مثال قائم کی ہو اس کے لیے وہ کیسے اذیت ناک لمحات ہوں جب اسے ایک علمی مسئلے میں اپنے معلم کا سامنا کرنا پڑا ہو گا...... بہر حال بحث کا آغاز ہوا۔ یہ مشہور مسئلہ ''شاہد و یمین'' کا تھا جس میں حنفیہ اور شافعیہ کے درمیان واضح اختلاف موجود ہے۔ دونوں جانب سے بہت دیر تک دلائل پیش کیے جاتے رہے۔ مجلسِ علم کے بام و در ساکت تھے اور حاضرین اس طرح خاموش تھے کہ صرف ان کی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھیں' کوئی شخص اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک تو درس گاہ کے آداب اور دوسرے امام شافعیؒ کے درمیان مناظرہ۔ امام محمدؒ جو فقہ حنفیہ کی عمارت کا مضبوط ترین ستون تھے' اس نوجوان سے بحث کر رہے تھے کہ جس نے امام مالک بن انسؒ کی آغوشِ محبت میں تربیت پائی تھی۔ بلاشبہ امام محمدؒ اور حضرت امام شافعیؒ کی عمروں میں بڑا فرق تھا۔ دوسرے یہ کہ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے امام شافعیؒ بہر حال امام محمدؒ کے شاگرد تھے۔ اس لیے حاضرینِ مجلس کا خیال تھا کہ کچھ دیر تک دلائل پیش کرنے کے بعد امام شافعیؒ عاجز آ جائیں گے۔ یہ اہلِ عراق کی خوش گمانی نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت تھی کہ امام محمدؒ آخر امام محمدؒ تھے۔ انہیں علمی اعتبار سے ہر صورت میں امام شافعیؒ پر غالب رہنا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا یقیناً احترامِ استاد میں امام شافعیؒ کی نظریں جھکی ہوئی تھیں لیکن آپ اس طرح بول رہے تھے جیسے افکار و معانی کا سمندر ابل پڑا ہو۔ سفیان بن سحبانؒ جو اکثر مواقع پر امام شافعیؒ کو چھیڑا کرتے تھے وہ بھی اس بحث کے دوران مجلس میں موجود تھے۔ انہیں حیرت تھی کہ آج یہ حجازی نوجوان کس قدر استقامت کے ساتھ امام محمدؒ سے بحث کر رہا ہے وہ تنگ نظر ہو یا روشن خیال، کسی شاگرد کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی کہ کوئی شخص ان کے استاد سے مناظرہ کرے۔ یہ ایک فطری عمل ہے جس سے کسی انسان کو روکا نہیں جا سکتا اور پھر امام شافعیؒ تو خود بھی امام محمدؒ کے شاگرد تھے، اس لیے شرکائے مجلس کے چہروں پر ناگواری کی جھلک صاف نمایاں تھی اگرچہ اس مناظرے کا آغاز امام محمدؒ کے شدید اصرار پر ہوا تھا اور یہ ایک خالص علمی بحث تھی لیکن بیشتر افراد نے اسے جانب داری کا رنگ دے کر بہت زیادہ پیچیدہ بنا دیا تھا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ امام شافعیؒ تنہا تھے مگر اس کے باوجود آپ استادی و شاگردی کے



تمام آداب و قوانین کو ملحوظ رکھ کر بحث کر رہے تھے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا اور پھر یہ عظیم الشان مناظرہ اپنے اختتام تک پہنچ گیا۔ اس ذیل میں امام محمدؒ کے مسلک سے وابستہ افراد کوئی دعویٰ نہیں کرتے مگر فرزندِ قریش کے ماننے والے کہتے ہیں کہ بالآخر امام شافعیؒ کو غلبہ حاصل ہوا تھا۔ کہنے والے اسے حسنِ عقیدت بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر شخص اپنے امام کو سر بلند دیکھنا چاہتا ہے خواہ یہ حقیقت تاریخ کے سراسر خلاف ہو۔ ہم بھی اس بات کو تسلیم کیے لیتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے جس غلبے کا ذکر کیا گیا ہے' وہ شدتِ جذبات کا نتیجہ ہو لیکن پھر بھی تاریخ کے اوراق میں کچھ ایسی روایات محفوظ ہو گئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ واقعتاً اس مناظرے میں امام شافعیؒ ہی غالب رہے تھے ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ امام محمدؒ کے شاگرد کیا کہتے ہیں اور امام شافعیؒ کے عقیدت مندوں کا نقطہ نظر کیا ہے؟

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اس مناظرے کے بعد امام محمدؒ نے امام شافعیؒ کے حسنِ کلام اور شدتِ دلائل کی بہت زیادہ ہی تعریف کی' امام محمدؒ کی اعلیٰ ظرفی کی ایک اور مثال یہ ہے کہ جب آپ خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں تشریف لے گئے تو اس کے سامنے بھی اس واقعے کا ذکر کیا اور بڑے فراخدلانہ انداز میں امام شافعیؒ کی عالمانہ حیثیت کا اعتراف کیا۔ نتیجتاً ہارون رشید بھی امام شافعیؒ کی جلالتِ علمی سے متاثر ہوا اور اگر اب بھی اس کے ذہن میں فرزندِ قریش کی طرف سے شکوک و شبہات کا غبار باقی تھا تو امام محمدؒ کے اعتراف نے اس غبار کو بھی ہمیشہ کے لیے صاف کر دیا۔ پھر دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک دن ہارون رشید کا کارندہ خاص امام شافعیؒ کے دروازے پر کھڑا ہوا کہہ رہا تھا۔

''امیر المومنین دل سے اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ آپ دربارِ خلافت میں حاضر ہوں۔''

اس کے بعد جب حضرت امام شافعیؒ ہارون رشید کے دربار میں پہنچے تو خلیفۂ وقت بہت احترام کے ساتھ پیش آیا۔ امامؒ پر وہ سنگین وقت بھی گزرا تھا کہ جب آپ کے دونوں ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے تھے اور شمشیرِ اقتدار آپ کے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتی تھی' اور ایک وقت یہ تھا کہ جب ہارون رشید نے خود امام شافعیؒ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور جب امام سرِ دربار آئے تھے تو آپ کو معزز ترین افراد کی صف میں جگہ دی تھی۔ امام شافعیؒ کو ایک مطلق العنان حکمران کی نظر میں ''مجرم'' سے ''محترم'' بنانے تک وقت کا کچھ بھی کردار رہا ہو لیکن امام محمدؒ کی عنایات کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہی نوازشات کی بارش تھی جس سے سیراب ہو کر امام شافعیؒ نے برسرِ عام کہا تھا۔

"علم اور اسباب دینوی کے اعتبار سے مجھ پر امام محمدؒ سے زیادہ کسی کا احسان نہیں۔"

آئمہ کرام کے ظاہری اختلافات کو ہوا دینے والے کچھ بھی کہیں مگر کارِ پیمبری انجام دینے والے ان تمام آلودگیوں سے پاک تھے۔ اگر امام محمدؒ بن حسن شیبانیؒ علمائے ظاہر میں سے ہوتے تو اس واقعے کے بعد آپ کا طرزِ عمل یکسر بدل جاتا۔ ایک مناظرے میں استاد کا شاگرد کے سامنے مغلوب ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اگر امام محمدؒ کے دل پر دنیا پرستی کا ہلکا سا عکس بھی پڑ جاتا تو آپ اپنا راستہ بدل دیتے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اس علمی مباحثے کے اختتام پر امام محمدؒ کچھ اور زیادہ وسیع القلب ہو گئے تھے۔ امام شافعیؒ سے آپ کی محبت میں کچھ اور شدت آ گئی تھی۔

ایک بار حضرت امام محمدؒ اپنی سواری پر ہارون رشید سے ملنے کے لیے دارالامرا کی طرف جا رہے تھے کہ آپ کو راستے میں حضرت امام شافعیؒ نظر آ گئے۔ فرزندِ قریش کو دیکھتے ہی امام محمدؒ نیچے اتر آئے۔ اور خادم سے کہا "میری طرف سے معذرت کر دو اور شافعیؒ کو بلا کر لے آؤ۔"

خادم حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک پہنچا اور پھر اس نے سلام عرض کرتے ہوئے امام محمدؒ کا پیغام پہنچایا۔ امام شافعیؒ تیزی سے اپنے استاد کی طرف بڑھے اور نہایت ادب سے کہنے لگے۔ "میں آپ ہی کی طرف آ رہا تھا مگر ظاہری تیاری سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ خلیفہ سے ملنے کے لیے دارالامرا تشریف لیے جا رہے ہیں، میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا۔"

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" امام محمدؒ نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ "تمہاری صحبت خلیفہ کی ملاقات سے بدرجہا افضل ہے۔" یہ کہہ کر آپ نے امام شافعیؒ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام شافعیؒ سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ ایسی محبت کہ جس کے سامنے خلیفہ کے عظمت و جبروت کی بھی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

☆☆☆

شاہد و یمین کے مسئلے پر مناظرے کے بعد نہ صرف پورے بغداد میں امام شافعیؒ کی شہرت پھیل گئی تھی، بلکہ ہارون رشید بھی آپ کو عزت و احترام کے ساتھ اپنے دربار میں طلب کرنے لگا تھا۔ اسی زمانے میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کے باعث قصرِ خلافت میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ بات بہت معمولی تھی لیکن جب بگڑی تو خوفناک رخ اختیار کر گئی۔ تاریخ کا ذوق رکھنے والے اچھی طرح



جانتے ہیں کہ خلیفہ ہارون رشید اپنی بیوی زبیدہ خاتون سے شدید محبت کرتا تھا۔ لیکن اس جذباتی وابستگی کے باوجود کبھی کبھی دونوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو جاتی تھی چند روز گفتگو بند رہتی اور پھر ایک دوسرے سے راضی ہو جاتے یہاں تک کہ ازدواجی زندگی معمول پر آ جاتی۔

ایک رات ہارون رشید اور زبیدہ خاتون کسی خاص موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ اتفاق سے زبیدہ خاتون کے دلائل زیادہ مضبوط تھے اس لیے ہارون رشید کی شکست صاف نظر آ رہی تھی۔ اچانک عباسی خلیفہ کی ذہنی رو بہک گئی اور طاقت و اقتدار کے نشے نے اسے بدحواس کر دیا وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی بات رہ جائے اور زبیدہ خاتون کسی دلیل کے بغیر اپنی شکست تسلیم کر لے...... حالانکہ زبیدہ خاتون ایک شوہر پرست اور سلجھی ہوئی عورت تھی مگر ہارون رشید کے بے جا ضدوں نے اسے عارضی طور پر سرکش بنا دیا تھا اور وہ مسلسل اپنی دلیلوں سے ثابت کر رہی تھی کہ عباسی خلیفہ اس کے سامنے عاجز ہے۔ بالآخر ہارون رشید بدکلامی پر اتر آیا۔ زبیدہ خاتون نے اسے بے ہودہ گفتگو سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر اقتدار کا نشہ مزید گہرا ہو گیا تھا۔ انجام کار زبیدہ خاتون بھی غضب ناک ہو گئی اور اس نے عالمِ طیش میں شوہر کو مخاطب کر کے کہا "تو جہنمی ہے۔"

ہارون رشید کے اعصاب پہلے ہی بکھر چکے تھے۔ بیوی کے لفظوں کی اس ضرب نے اسے مکمل طور پر شکستہ کر دیا پھر وہ بھی چیخ کر کہنے لگا "اگر میں دوزخی ہوں تو تجھے طلاق ہے" یہ کہہ کر ہارون رشید نے بیوی کو اپنے کمرے سے نکال دیا۔ زبیدہ خاتون بھی اپنی شکست تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ نتیجتاً وہ بھی خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس طرح میاں بیوی کی خوشگوار تعلقات نے ایک اذیت ناک رنگ اختیار کر لیا۔

ہارون رشید نے کوئی ایک ہفتہ صبر و سکون سے گزارنے کی کوشش کی مگر جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا اس کے اضطراب میں شدت آتی جا رہی تھی، غرورِ حکمرانی اپنی جگہ لیکن ہارون رشید زبیدہ خاتون سے والہانہ محبت کرتا تھا۔ آخر دو ہفتے گزرنے کے بعد وہ اپنے دل و دماغ پر قابو نہ رکھ سکا۔ پھر اس نے بغداد کے تمام علما کو دربار میں جمع کر کے اپنا یہ عجیب و غریب مسئلہ پیش کیا۔ اہلِ علم کئی دن تک اس مسئلے کا حل تلاش کرتے رہے مگر انہیں کامیابی کا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ انتہا یہ ہے کہ خود حضرت امام محمدؒ بھی اس عجیب و غریب مسئلے کا حل پیش نہ کر سکے۔ اس دوران امام شافعیؒ کے کانوں تک بھی یہ خبر پہنچی۔ آپ نے ہارون رشید کے بجائے اپنے استادِ گرامی امام محمدؒ سے کہا "میں اس مسئلے کا حل جانتا ہوں۔" امام محمدؒ نے چونک کر

امام شافعیؒ کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر آپ فرزندِ قریش کو لے کر خلیفہ کے دربار میں پہنچے۔

"امیر المومنین!" حضرت امام محمدؒ نے ہارون رشید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "آپ کے ذاتی اضطراب و کشمکش نے اہلِ بغداد کو بھی ایک عجیب سی اذیت میں مبتلا کر دیا ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ محمدؒ بن ادریسؒ کے خلاقِ ذہن نے اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا ہے۔" جیسے ہی امام محمدؒ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے پورے دربار میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خود ہارون رشید کا چہرہ بھی خوشی مسرت سے سرخ ہو گیا۔

"محمدؒ! ہمارے مسئلے کا حل پیش کرو۔ ہم تم پر اپنے انعام واکرام کی بارش کر دیں گے۔" فرطِ جذبات میں ہارون رشید کی آواز لرز رہی تھی۔

"میرا انعام یہی ہے کہ امیر المومنین کو ذہنی سکون حاصل ہو جائے۔" حضرت امام شافعیؒ نے بے نیازی سے فرمایا "اس مسئلے کے حل سے پہلے مجھے اتنا بتایئے کہ اس وقت آپ ضرورت مند ہیں یا میں؟" امام نے خلیفہ سے سرِ دربار عجیب سوال کیا۔

"یہ بات سب جانتے ہیں کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔" امام شافعیؒ کا سوال سن کر ہارون رشید یک دبیک سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"تو پھر آپ تخت سے نیچے اتر آیئے۔" امام شافعیؒ نے دوبارہ فرمایا "سائل ہمیشہ نیچے کھڑا ہوتا ہے اور جواب دینے والا بلند مقام پر، اہلِ علم کی یہی رسم ہے آپ بھی اس رسم کی تکمیل کیجئے۔"

امام شافعیؒ کا مطالبہ سن کر پورے دربار پر سناٹا چھا گیا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ کہیں ہارون رشید اس گستاخی پر امام شافعیؒ کو موجب سزا قرار نہ دے۔ مگر یہ بات بہت کم لوگ جانتے تھے کہ ہارون رشید بہر حال علم دوست تھا۔ اس نے امام شافعیؒ کی بات کا ذرا بھی برا نہیں مانا اور تخت سے نیچے اتر آیا۔ امام شافعیؒ بے جھجک ہو کر آگے بڑھے اور تختِ عباسیہ پر جلوہ افروز ہو گئے، پھر آپ نے ہارون رشید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"کیا آپ کی زندگی میں کبھی ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے کہ آپ گناہ کرنے پر قادر ہوں لیکن صرف خوفِ خدا کے باعث گناہ سے باز رہے ہوں؟"

"ہاں کئی بار۔" ہارون رشید نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "خدا کی قسم! میں کئی بار مکمل قدرت رکھنے کے باوجود صرف اس لیے گناہ سے باز رہا کہ مجھے اپنے خدا سے ڈر لگتا تھا۔"



"پھر میں فتویٰ دیتا ہوں کہ آپ دوزخی نہیں ہیں، اہلِ جنت میں سے ہیں۔" امام شافعیؒ نے بڑی متانت اور عالمانہ وقار کے ساتھ فرمایا۔

"دعویٰ بے دلیل ہے۔" کئی علماء بیک وقت پکار اٹھے۔ ان کے چہروں پر ناپسندیدگی اور تضحیک کے آثار صاف نمایاں تھے۔

حضرت امام شافعیؒ نے تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر قرآن کریم کی ایک آیت کی تلاوت فرمائی جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"جو گناہ کا ارادہ کرے اور خوفِ خدا سے باز رہے اس کا مقام جنت ہے۔"

یہ دلیل سن کر تمام علمائے دربار حیران رہ گئے۔ حاضرین کی صفوں سے دادِ تحسین کا ہلکا ہلکا شور بلند ہو رہا تھا۔ ہارون رشید کی خوشی ناقابلِ بیان تھی اور امام شافعیؒ بہ آواز بلند فرما رہے تھے۔

"جب امیر المومنین دوزخی نہیں تو پھر طلاق بھی واقع نہیں ہوئی۔"

اس واقعے نے خلیفہ ہارون رشید کے ذہن کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ امام شافعیؒ کی جس تاریخی ذہانت کا ذکر حضرت امام محمدؒ نے کیا تھا آج وہی ذہانت عباسی خلیفہ کے ناقابلِ بیان کرب کا مداوا بن گئی تھی جس مسئلے کی سنگینی نے کئی راتوں تک علمائے بغداد کو سونے نہیں دیا تھا اور جس کے اثر سے خود ہارون رشید اور زبیدہ خاتون کی بھی نیندیں حرام تھیں، جب وہی مسئلہ امام شافعیؒ کے سامنے پیش کیا گیا تو قریش کے اس جلیل القدر فرزند نے اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ فقہ اور دیگر مسائل پر گہری نظر رکھنے والے پختہ کار افراد جن کے علم کی وسعتوں کی بغداد میں قسمیں کھائی جاتی تھیں جب ان کی پیشانیاں فکر کی لکیروں سے بھر گئیں دماغ سوچتے سوچتے عاجز آ گئے۔ چہروں پر احساسِ شکست کے سائے گہرے ہو گئے اور زبانیں اعترافِ ناکامی کے لیے مجبور ہو گئیں تو امام شافعیؒ انکسار کی ایک ادائے خاص کے ساتھ آگے بڑھے، خلیفۂ وقت کو علم کے احترام میں تختِ اقتدار سے نیچے اترنے پر مجبور کر دیا اور پھر ایک نہایت پیچیدہ مسئلے کو اس طرح بیان کیا کہ تمام اہلِ ہوش وخرد سوچتے ہی رہ گئے۔

پھر امامؒ سر جھکائے ہوئے اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ ہارون رشید دوبارہ تختِ خلافت تک آیا مگر اس طرح کہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے فرزندِ قریش کی طرف دیکھا۔ امام شافعیؒ کا دربار میں بیٹھنے کا انداز بھی قلندرانہ تھا حاضرین کی نظریں مسلسل آپ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن خود امامؒ قصرِ عباسیہ میں اس طرح تشریف فرما تھے جیسے یہ کسی عام عرب کا گھر ہو۔ اتنے بڑے مسئلے کا حل تلاش کرنے

کے باوجود آپ کی گفتگو میں غرور کی ہلکی سی بھی آمیزش نہیں تھی۔ چہرے پر فخر و برتری کا دھندلا سا عکس بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہارون رشید چند لمحوں تک حضرت امام شافعیؒ کو ستائشی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ مڑ کر حضرت امام محمدؒ سے مخاطب ہوا ''آپ سچ کہتے ہیں بے شک' محمد بن ادریسؒ ایسے ہی ہیں۔'' آج ہارون رشید کے دل سے وہ غبار صاف ہو گیا تھا جس کی کثافت نے کچھ روز پہلے امام شافعیؒ کو سیاست کے مقتل تک پہنچا دیا تھا۔

''کیا تم یہ پسند کرو گے کہ میں تمہیں کسی اسلامی شہر کا قاضی بنا کر اپنی سلطنت میں شریک کر لوں؟''
اب ہارون رشید' حضرت امام شافعیؒ سے مخاطب تھا۔ عباسی خلیفہ نے چند سال پہلے بھی فرزندِ قریش کو یہی پیش کش کی تھی مگر وہ ہنگامی لمحات تھے جنہیں ہارون رشید فراموش کر چکا تھا۔ البتہ امام شافعیؒ کے ذہن پر ماضی کی ایک ایک بات نقش تھی۔ اس وقت بھی امامؒ نے کسی عہدہ و منصب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ آج دفعتاً حالات نے پھر کروٹ لی تھی اور عباسی خلیفہ امامؒ کو شریکِ سلطنت بنانے پر دوبارہ اپنی آمادگی کا اظہار کر رہا تھا۔

''منصبِ قضا کو قبول کرنے میں آخر تمہیں پس و پیش کیوں ہے؟'' حضرت امام شافعیؒ کو خاموش پا کر ہارون رشید نے دوبارہ کہا۔ ''اس میں کیا قباحت ہے کہ تم سنت رسول ﷺ کے مطابق میرا حکم بھی نافذ اور اپنا حکم بھی جاری کر دو......''

اب دربارِ خلافت میں امام شافعیؒ کے لیے سکوتِ لب کی زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ ہارون رشید کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کرنا ہی تھا' مجبوراً امامؒ کو برسرِ دربار اپنی فکر اور خواہش کا اظہار کرنا پڑا۔ تمام اقتدار پرستوں کی نظریں فرزندِ قریش کے رخِ تابناک پر مرکوز تھیں۔ امامؒ نے ہارون رشید جیسے باجبروت حکمران کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''امیر المومنین! وہ آسمان ہو کہ زمینؒ حکم تو اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کا نافذ العمل ہے۔ اس کائنات میں محمد بن ادریسؒ کی حیثیت ہی کیا؟ وہ تو ربِ کائنات اور سرورِ کونینؐ کے ارشاداتِ گرامی کو لوگوں تک پہنچانے والا ہے۔ ایک قاصدِ حقیر ایک ادنیٰ سا سفیر۔'' امامؒ اپنے آزاد لہجے کی پوری توانائیوں کے ساتھ بول رہے تھے۔ درباریوں کا تو ذکر ہی کیا' خود ہارون رشید بھی اس طرح گوش برآواز تھا کہ اس کے چہرے پر کئی رنگ ابھر کر ڈوب چکے تھے۔ ''مجھے یہ اعلیٰ ترین منصب قبول نہیں۔'' امام نے بے نیازانہ کہا اور پورا دربار ساکت ہو کر رہ گیا۔ ''سلطنت میں شرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس طرح تو مجھے صبح سے شام تک بھی قاضی بننا گوارا نہیں۔'' امامؒ نے جس طرح اپنے



جذبات کا اظہار کیا تھا' وہ خلافتِ عباسیہ کی تاریخ کے اوراق پر ثبت ہو کر رہ گیا۔ یہ دوسرا مردِ بے باک تھا جس نے بنو عباس کی نوازشات سے منہ موڑ لیا تھا۔ اہلِ دل کی تاریخ میں امام شافعیؒ کے جواب کو وہی حیثیت حاصل ہے جو منصور کے دورِ اقتدار میں امامِ اعظم ابو حنیفہؒ کے جواب کو حاصل تھی۔ بے شک الفاظ میں فرق ہے مگر دونوں مردانِ جلیل کی زبان سے ادا ہونے والے کلمات کی روح ایک ہے۔ امامِ اعظمؒ نے پہلے دن ہی خلافتِ منصور میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا اس کے برعکس حضرت امام شافعیؒ نے کئی سال تک عاملِ نجران کی حیثیت سے بندگانِ خدا کی خدمت کے لیے شب و روز اپنا خون جلایا تھا مگر بعد میں آپ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ آمریت خلافتِ راشدہ کے قوانین کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لیے آپ کو صریحاً انکار کرنا پڑا۔

''امیر المومنین! مجھے صبح سے شام تک کے لیے بھی وہ منصب قبول نہیں جس پر انسانی اقتدار سایہ فگن ہو۔'' امامؒ کا انکار کیا تھا پگھلی ہوئی آگ کی ایک موج تھی جس نے غرورِ حکومت کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اہلِ دربار نے ہارون رشید کے جسم پر ہلکی سی لرزش دیکھی پھر اس کا چہرہ متغیر ہوا۔ جذبۂ خودی شعلوں کی لپیٹ میں آیا تو پورے وجود پر دھواں سا چھا گیا۔ خلیفہ کے حلقہ بگوش سمجھے کہ امامؒ کی شدتِ انکار ان کے لیے موجبِ قہر و عتاب بن جائے گی مگر اس وقت دربارِ خلافت پر سکوتِ مرگ طاری ہو گیا جب حاضرین نے ہارون رشید کو روتے ہوئے دیکھا۔ طاقت و اختیار کا آہنی مجسمہ زار و قطار رو رہا تھا۔ امامؒ کے لہجے کا سوز ایسا ہی تھا کہ جب آپ خدا اور رسولؐ کے احکام بیان کرتے تھے تو موسم کی سختیوں سے بے نیاز پتھر بھی پگھلنے لگتے تھے۔

جب ہارون رشید اپنا دامن بھگو چکا تو نہایت شکستہ آواز میں امامؒ سے کہنے لگا۔ ''محمد بن ادریسؒ! اپنی کسی اور ضرورت کا اظہار کرو۔ میری دلی خواہش ہے کہ اگر تم منصبِ قضا کی طرف مائل نہیں ہوتے تو دنیا کی کوئی اور چیز قبول کر لو۔'' عباسی خلیفہ امام شافعیؒ کی ذہانت اور بلاغتِ کلام سے اس قدر متاثر تھا کہ کسی نہ کسی عنوان آپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا تھا۔

''خدا امام محمدؒ کو جزائے خیر دے کہ وہ دین و دنیا کے معاملات میں میری خبر گیری رکھتے ہیں۔'' امام شافعیؒ نے اپنے استادِ گرامی کی طرف اس طرح دیکھا کہ سر سے پاؤں تک احسان شناسی کا پیکر بن گئے۔ ''بس ایک طالبِ علم کے لیے اتنے وسائل کافی ہیں کہ وہ اپنے جسم کو لباس سے چھپا لے اور شکم کو غذا کے ذریعے اتنی حرارت پہنچائے کہ دوسرے اعضا متحرک رہ سکیں۔ خدا امیر المومنین کو بھی اجرِ عظیم دے کہ

کے حلقۂ عقیدت میں سمٹ آیا۔ اگرچہ سرزمین عراق فقہ حنفیہ کے دو بڑے اماموں قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے زیرِ اثر تھی لیکن پھر بھی مقامی باشندے حضرت امام شافعیؒ کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اب ان لوگوں کے ہونٹوں پر بھی مہرِ سکوت نظر آتی تھی جو ایک حجازی نوجوان کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ امام شافعیؒ کی ذہانت اور حسنِ کلام نے اپنے حریفوں کو بھی یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ فرزندِ قریش آخر فرزندِ قریش ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ امام شافعیؒ کے عقیدت مندوں نے بعض واقعات کے سلسلے میں نہایت مبالغے سے کام لیا ہے۔ خلیفہ ہارون رشید اور اس کی بیوی زبیدہ خاتون کے جھگڑے کے تصفیے کا ذکر کرتے ہوئے بعض تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ اس وقت امام شافعیؒ کا لڑکپن تھا۔ کچھ تذکرہ نگاروں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس وقت حضرت امام شافعیؒ کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ سولہ سال تھی۔ ممکن ہے کہ فرزندِ قریش کے عقیدت مند جوشِ جذبات میں ان روایتوں کو درست تسلیم کر لیں مگر جو حضرات تاریخ پر نظر رکھتے ہیں انہیں بخوبی اندازہ ہے کہ امام شافعیؒ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور آپ کو ۱۸۴ھ میں گرفتار کر کے بغداد بلایا گیا۔ اگر ہارون رشید اور زبیدہ خاتون کے درمیان اسی سال تنازعہ کھڑا ہوا تھا تو امام شافعیؒ کی عمر چونتیس سال تھی اور اگر ایک برس بعد یہ واقعہ پیش آیا تھا تو امامؒ اپنی زندگی کے پینتیسویں سال سے گزر رہے تھے عمر کی اس منزل کو جوانی کا نام تو دیا جا سکتا ہے لڑکپن نہیں کہا جا سکتا۔ غالباً امامؒ کے عقیدت مند عمر کم کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ زندگی کے اس مرحلے میں کوئی دوسرا انسان ایک پیچیدہ سوال کو حل نہیں کر سکتا۔ یہ عجیب حسنِ عقیدت ہے کہ لوگ اپنی محبت ظاہر کرنے کے لیے تاریخ کو بھی مسخ کر دیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ اندازِ فکر نہایت غیر محتاط اور غیر فطری ہے اگر حضرت امام شافعیؒ پچاس سال کی عمر میں بھی اس مسئلے کا حل پیش کر دیتے تو آپ کی بے مثال ذہانت پر کوئی حرف نہ آتا جب ہارون رشید اس عجیب و غریب مسئلے سے دوچار ہوا تھا اس وقت دربارِ خلافت میں ایسے علما بھی موجود تھے جن کی عمریں ستر اور اسی سال سے بھی متجاوز ہو چکی تھیں۔ خود امام شافعیؒ کے استادِ گرامی حضرت امام محمدؒ بھی عمر کی پچاس منزلیں طے کر چکے تھے۔ اب تو خداوندِ ذوالجلال کی کرشمہ سازی ہے کہ وہ کس کے ذہن کو کشادہ کرتا ہے۔ امامؒ کے عقیدت مند اور مخالفین اپنے اپنے اعتبار سے ذہانت و فراست کی کوئی بھی توجیہہ پیش کریں مگر جہاں تک محمد بن ادریسؒ کے فہم و تدبر کا سوال ہے تو اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ امام شافعیؒ کا ذہن قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی



تھا۔

☆☆☆

یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے، بغداد کا ایک بزرگ شخص امام شافعیؒ کے پاس آیا اور آپ کی غیر معمولی ذہانت کے تعریف کرنے لگا ''فرزند! خدا تمہاری عمر دراز کرے کہ تم اہلِ دانش کی آبرو ہو'' امام شافعیؒ خاموشی سے سنتے رہے وہ بزرگ شخص مسلسل آپ کی ستائش کر رہا تھا۔ ''تم نے بڑے بڑے مسائل کی گرہ کشائی اس طرح کی ہے کہ آج بغداد کے تمام ذکی و فہیم افراد تمہارے دلائل کے سامنے عاجز ہیں۔''

جب وہ شخص خاموش ہو گیا تو امام شافعیؒ لب کشا ہوئے۔ ''بزرگ! خدا آپ کو اس حسنِ ظن کے صلے میں اجرِ عظیم دے ورنہ انسانی ذہن کی حقیقت کیا ہے؟ اگر آپ محمد بن ادریسؒ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو وہ زیادہ ذہین نہیں ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ خدا اس سے دماغ کی گرہ کھول دیتا ہے اور اہلِ دنیا سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ مشکل ترین مسائل کا حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' اتنا کہہ کر حضرت امام شافعیؒ نے اپنا ایک خواب بیان کیا ''اس وقت میں بچہ ہی تھا کہ ایک رات میں نے اپنے آقا رسالت مآب ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ سرورِ کونینؐ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا ''لڑکے! تم کون ہو؟'' میں نے عرض کیا ''آپ ہی کی جماعت کا ایک فرد ہوں'' محمد بن ادریسؒ مطلّبی۔ حضور اکرمؐ نے دوبارہ فرمایا ''میرے پاس آؤ'' مجھ پر رسالت کا جلال طاری تھا مگر پھر بھی کانپتے قدموں سے آگے بڑھا۔ جب نزدیک پہنچا تو میرے آقا کا دستِ کرم دراز ہوا آپ نے مجھے اپنے سینے کے قریب کر لیا پھر اپنا لعاب دہن میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا ''فرزند! اب جاؤ اللہ کی رحمتیں تم پر نازل ہوں'' خواب بیان کرنے کے بعد حضرت امام شافعیؒ نے اس شخص کی طرف غور سے دیکھا ''بزرگ! اب آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں کہ محمد بن ادریسؒ کا علم کس کے زیرِ اثر ہے؟ جو علم دربارِ رسالت سے شرف یاب نہیں ہوتا اس کی خدا کے یہاں کوئی حیثیت نہیں ہوتی انسان کتنی ہی کتابیں ازبر کر لے علم کے کتنے ہی دفتر اس کے ذہن میں منتقل ہو جائیں مگر علم تو وہی ہے جس پر رسالتؐ کی مقدس پرچھائیاں پڑ رہی ہیں لوگ محمد بن ادریسؒ کے حسنِ کلام کی تعریف کرتے نہیں تھکتے، شافعیؒ کے لہجے کا سوز نہیں رلا دیتا ہے مگر وہ نہیں جانتے کہ سرورِ کونینؐ نے قریش کے اس مفلس فرزند کو کیسی دولت سے سرفراز کیا ہے؟ جس کے ہونٹوں سے رسالت مآبؐ کا لعاب دہن چھو جائے اس کی شیریں سخنی کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ ہاں میں وہی ہوں...... محمد بن ادریسؒ شافعیؒ محمد مصطفی ﷺ کا ادنیٰ ترین غلام جس کی زبان میں قدرت نے شعلے

بھر دیے ہیں۔اہلِ دنیا کو حیرت کیوں ہوتی ہے؟ خدا جسے جس طرح چاہتا ہے سرخرو کر دیتا ہے میں تو خالقِ کون و مکاں کے در کا گدائے ازلی ہوں جو کچھ مجھے مل جاتا ہے اسی کے بندوں میں لٹا دیتا ہوں۔''
یہ کہہ کر حضرت امام شافعیؒ اس قدر روئے کہ اس بزرگ شخص کی پلکیں بھی نم ہو گئیں۔

☆☆☆

اگر چہ امام شافعیؒ نے نوجوانی ہی میں بغداد کے علمی حلقوں کو متاثر کر دیا تھا اور خلیفہ ہارون رشید بھی آپ کو عزت واحترام کی نظروں سے دیکھنے لگا تھا لیکن در پردہ عراق کے بیشتر فقیہہ امامؒ سے خوش نہیں تھے۔قاضی ابو یوسفؒ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔لے دے کر زندہ افراد میں صرف امام محمدؒ تھے جو اس حجازی نوجوان سے محبت بھی کرتے تھے اور علمی معاملات میں رہنمائی بھی۔باقی تمام فقیہانِ عراق، امام شافعیؒ کے وجود کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ہم اسے نفرت کا نام تو نہیں دے سکتے لیکن تاریخ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اصحابِ فقہ کسی بھی صورت میں امام شافعیؒ کو پسند نہیں کرتے تھے۔جب ''شاہد و یمین'' کے مسئلے میں امام شافعیؒ کو امام محمدؒ پر غلبہ حاصل ہو گیا تو اہلِ عراق کو یہ بات سخت گراں گزری۔وقت کی یہ عجیب ستم ظریفی تھی کہ بغداد کے علما امام شافعیؒ کے دلائل کا جواب نہ دے سکے تو اپنے دلوں میں کدورتوں کی پرورش کرنے لگے۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ امام محمدؒ فرزندِ قریش کے خلاف صف آرا ہوتے مگر ابو حنیفہؒ کا یہ شاگردِ جلیل آخر امام تھا، اس لیے اپنی کشادہ فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر حجازی نوجوان کو سینے لگا لیا اس کے برعکس دوسرے فقیہانِ عراق نے امام شافعیؒ کی برتری تسلیم کرنے کے بجائے اپنے ذہنوں کو اور مکدر کر لیا۔یہاں تک کہ سب کے سب امام شافعیؒ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

پروفیسر ابو زہرہ مصری اپنی مشہور تصنیف ''آثارِ امام شافعیؒ'' میں تحریر کرتے ہیں۔''ان لوگوں نے ہر طرح سے شافعیؒ کو زچ کرنے کی کوشش کی۔مناظرات کا ایک سیلِ رواں تھا جو امامؒ کے خلاف چل پڑا تھا یہ لوگ چاہتے تھے کہ محمد بن ادریسؒ ان کے دلائل کی موجوں میں غرق ہو جائیں۔مگر شافعیؒ علم کے سمندر کے بڑے شناور تھے آپ نے موجوں کی سرکشی کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی۔امامؒ نے مخالفت کے اس طوفان کا نہایت باوقار انداز میں مقابلہ کیا اور مردانہ وار آگے ہی بڑھتے رہے۔امامؒ کے مخالفین مناظروں کے دوران بدگوئی پر بھی اتر آتے تھے مگر آپ نے اپنے کسی حریف کے لیے کبھی کوئی برا لفظ استعمال نہیں کیا۔امامؒ اس شان سے گفتگو کرتے کہ دشمن بھی آپ کے شریفانہ لہجے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ضد



اور کج بحثی کی بات الگ ہے مگر جہاں تک حسنِ کلام کا سوال ہے تو مخالفین بھی امامؒ کی تقریر کے طلسم میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔شافعیؒ کی بحث کا انداز خالص فلسفیانہ ہوتا تھا جو عراق کے کسی فقیہہ کو میسر نہ تھا۔نتیجتاً امامؒ کے حریف بری طرح الجھ کر رہ جاتے تھے اور آخر میں عاجز آ کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے تھے۔''

امام شافعیؒ کے عظیم شاگرد حضرت امام احمد بن حنبلؒ اپنے استاد کی اس صفتِ عالیہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔
''شافعیؒ چار چیزوں میں خالص فلسفی تھے۔ایک لغت میں ......دوسرے لوگوں سے اختلاف (مناظرہ) کرنے میں......تیسرے فنِ معانی میں......اور چوتھے فقہ میں۔''
حضرت امام فخر الدین رازیؒ اپنی کتاب ''مناقب شافعیؒ'' میں تحریر کرتے ہیں۔''شافعیؒ سے قبل مذہبی مکتبِ فکر میں دو فریق تھے ایک اصحابِ حدیث اور دوسرے اصحاب رائے۔اصحابِ حدیث کا یہ علم تھا وہ رسول ﷺ کے ارشاداتِ مقدسہ کے حافظ تو تھے لیکن مناظرے کے فن سے بالکل ناواقف تھے۔جب کبھی کوئی اہلِ رائے اصحابِ حدیث سے کوئی سوال کرتا تو وہ عاجز و حیران نظر آنے لگتے۔دوسری طرف اصحاب رائے کا یہ حال تھا کہ وہ آثار و سنت سے تہی دامن تھے ان دونوں جماعتوں کے برعکس حضرت امام شافعیؒ ایک طرف عارفِ سنتِ رسولؐ تھے اور دوسرے طرف مناظرے کے تیز ترین ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح۔امامؒ کی فصاحتِ کلام اپنی مثال آپ تھی۔جب اصحاب رائے میں سے کوئی شخص امام شافعیؒ کے سامنے کوئی سوال اٹھاتا تو آپ اس طرح دلائل پیش کرتے کہ بالآخر وہ خاموش ہو جاتا۔''
حضرت امام شافعیؒ ایک سیاسی قیدی کی حیثیت سے ۱۸۴ھ میں بغداد لائے گئے تھے۔پھر جب آپ طویل کشمکش کے بعد سازش کی زنجیروں سے آزاد ہو گئے تو مجالسِ علم کا رخ کیا۔فقیہانِ عراق نے کچھ دن تک تو اس حجازی نوجوان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا مگر جب امامؒ علمی مباحث میں شریک ہوئے اور آپ کی زبان سے فصاحت و بلاغت کا آبشار جاری ہوا تو اہلِ بغداد حیرت سے دیکھتے ہی رہ گئے۔زندگی میں پہلی بار ان لوگوں کی نظروں سے اتنا جامع الصفات انسان گزرا تھا۔عراق کے یہ اصحابِ رائے سال ڈیڑھ سال تک امام شافعیؒ کو فقہ کے معاملات میں پریشان کرتے رہے مگر جب امامؒ نے اپنی بے پناہ ذہانت سے ان رموز و نکات کو سمجھ لیا تو پھر کوئی اس قابل نہیں رہا کہ برسرِ مجلس فرزندِ قریش کو عاجز کر سکتا۔

اگر ہم امام شافعیؒ کی اس برتری کا تجزیہ کریں تو ایک عجیب و غریب حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرزندِ قریش دو نابغۂ روزگار انسانوں کی صفات کا مجموعہ تھے۔ ایک حضرت امام مالک بن انسؒ اور دوسرے امامِ اعظم ابو حنیفہؒ۔ امام مالکؒ کا بحرِ ناپیدا کنار کی طرح علمِ حدیث گریہ شبنم کی طرح عشق رسولؐ شمع حرم کی طرح گداز قلب امامِ مدینہؒ کی یہی وہ صفات عالیہ تھیں جو فرزندِ قریش میں منتقل ہو گئی تھیں۔ دوسری طرف امام اعظم ابو حنیفہؒ کی معاملہ فہمی مسائل کی گہرائی میں اتر جانے والی نظر اور وہ طرزِ استدلال جس کے ذریعے آپ پتھر کے ستون کو بھی سونے کا ثابت کر سکتے تھے۔ امام اعظمؒ کی یہ تمام خوبیاں امام شافعیؒ کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں اگرچہ امام شافعیؒ نے امامِ اعظمؒ کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی لیکن خدا نے فرزندِ قریش کو یہ صلاحیتِ خاص بخشی تھی کہ آپ صرف کتاب کے مطالعے سے صاحبِ تصنیف کے افکار کی روح کو سمجھ لیتے تھے۔ امام اعظمؒ کی کتابوں کے سلسلے میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ امام شافعیؒ نے حضرت ابو حنیفہؒ کی تصنیفات کو اس طرح سمجھا جیسے امامِ اعظمؒ بہ نفسِ نفیس درس دے رہے ہوں اور ایک ایک لفظ فرزندِ قریش کے ذہن میں اترتا جا رہا ہو۔ قلم کے اس لازوال رشتے میں امام شافعیؒ کی وہ عقیدت بھی شامل تھی جس کے زیرِ اثر آپ اکثر امام اعظمؒ کے مزار پر حاضر ہوتے تھے اور اس مردِ جلیل کی روح کو ایصال ثواب کرتے تھے۔ اس ذیل میں خود امام شافعیؒ کا قول ہے ''جب میں کسی مشکل مسئلے میں سلجھ جاتا تھا تو ابو حنیفہؒ کے وسیلے سے عقدہ کشائی کی دعا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ قدرت میری رہنمائی کرتی تھی اور مجھ پر بہت سے راز منکشف ہو جاتے تھے۔'' یہ وہی حسنِ عقیدت تھا جس نے امام شافعیؒ کو امام اعظمؒ کے افکار سے فیض یاب کیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ فرزندِ قریش کے ذہن رسا پر بیک وقت فقۂ حجاز و عراق سایہ فگن تھے۔ جب وہ مکاتبِ فکر کی روح ایک قالب میں ڈھل جائے تو پھر کون ہے جو اس شخص کے علم کی وسعتوں کا اندازہ کر سکے۔ یہی وہ راز ہے جس کا ادراک عام انسانوں کو نہیں ہوتا۔ اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ امام شافعیؒ حضرت امام مالکؒ اور حضرت ابو حنیفہؒ کی صفات کا مرکب تھے تو پھر یہ ممکن ہے کہ ہماری آنکھ کسی حد تک ان بلندیوں کو طرف دیکھنے کے قابل ہو جائے جس پر فرزندِ قریش جلوہ افروز تھے۔

☆☆☆

تین سال تک امام محمدؒ سے فقۂ عراق کا علم حاصل کرنے کے بعد حضرت امام شافعیؒ اپنے وطن مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل امام شافعیؒ نے ایک بار پھر اپنے استادِ گرامی امام محمدؒ کی علمی فضیلت اور اہلِ علم سے بے پناہ محبت کا فراخدلانہ اعتراف کیا۔



''امام محمدؒ کا مجھ پر احسانِ عظیم ہے میں نے حضرت ابو حنیفہؒ کے شاگردِ جلیل سے اتنی کتابیں نقل کیں جن کا وزن ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر ہے اگر حضرت امام محمدؒ نہ ہوتے تو مجھے علم سے کوئی مناسبت نہ ہوتی۔'' امام شافعیؒ کا یہ اعتراف ان تمام طالب علموں کے لیے ایک معیارِ ظرف ہے جو قیامت تک اس زمین پر آئیں گے اور تلاشِ علم میں اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ صحرائے افلاس میں بھٹکیں گے تو انہیں امام شافعیؒ کے الفاظ کی اہمیت کا اندازہ ہو گا۔ دل و دماغ اتنے کشادہ نہ ہوں تو علم کی وسعتیں کسی انسان کے قالب میں نہیں سما سکتیں جب تک دوسرے کا اعتراف اور اپنا انکار نہ ہو اس وقت تک طلبِ صادق نہیں ہوتی یہی علم کا پیمانہ ہے جو حضرت امام شافعیؒ نے بارہ سو اٹھارہ سال پہلے قائم کیا تھا جس نے اس پیمانے کو احترام سے بوسہ دیا اگر امام محمدؒ نہ ہوتے تو مجھے علم سے کوئی نسبت نہ ہوتی' تاریخِ علم کا عظیم الشان اعتراف ہے اسی اعتراف نے فرزندِ قریش کو ہوش و خرد کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچایا۔

امام شافعیؒ نے بغداد سے رخصت ہوتے وقت یہ بھی فرمایا ''سب لوگ علم میں اہلِ عراق کے دستِ نگر ہیں' اہلِ عراق، اہلِ کوفہ کے اور اہلِ کوفہ، حضرت امام ابو حنیفہؒ کے۔'' اس انداز سے کسی عظیم انسان کو خراجِ عقیدت پیش کرنا آسان نہیں اس مرحلے سے وہی شخص گزر سکتا ہے جس کے دل و دماغ میں آسمانوں جیسی بیکرانی ہو۔

امام شافعیؒ نے اہلِ دنیا پر اپنے استاد امام محمدؒ کے مرتبۂ علم کو ظاہر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ''میں تین سال تک حضرت امام محمدؒ کی مجلس میں بیٹھا اور میں نے ایک اونٹ کے برابر ان کے افاداتِ علمیہ تحریر کیے اگر وہ اپنی عقل و فہم کے اعتبار سے ہمیں درس دیتے...... تو ہم ان کے علوم کو سمجھ بھی نہیں سکتے تھے...... مگر وہ ہمیشہ ہمیں ہماری عقل کی رعایت سے سمجھاتے تھے اس لیے ہم نے فائدہ اٹھایا۔''

جس طرح فرزندِ قریش کو امام محمدؒ سے بے حد عقیدت تھی' اسی طرح حضرت امام محمدؒ بھی امام شافعیؒ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ابو الحسن زیادی کی روایت ہے ''میں نے اکثر اس کا مشاہدہ کیا جو سلوک امام محمدؒ کا امام شافعیؒ کے ساتھ ہے وہ کسی اور اہلِ علم کے ساتھ نہیں ہے۔''

وہ جلیل القدر آئمہ کے درمیان یہی وہ تعلق خاص تھا جس نے علمِ فقہ کو بے پناہ وسعتیں بخشیں۔ اب دنیا پرست اپنے مفاداتِ ظاہری کے لیے واقعات کو کتنا ہی مسخ کریں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ حضرت امام محمدؒ نے بڑی دریا دلی کے ساتھ اپنا سرمایہ علم اہلِ طلب میں لٹایا اور خصوصاً امام شافعیؒ کے

دامن کو امامِ اعظمؒ کے افکار سے بھر دیا۔ پھر جب فرزندِ قریش بغداد سے رخصت ہوئے تو امام محمدؒ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں سے دعا جاری تھی۔ ایک پرہیزگار انسان کی دعا، ایک خدا سے ڈرنے والے عالم کی دعا‘ امام محمدؒ رقت آمیز لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"اے علیم وخبیر! تو بہتر جانتا ہے کہ تیرے عاجز بندے محمد بن حسن نے تیرا بخشا ہوا علم مستحق افراد میں تقسیم کر دیا۔ تو شافعیؒ کے جسم وجاں کی حفاظت کر اور اس کے ذہن کو مزید کشادہ کر دے کہ اب یہی ہمارا اثاثہ ہے‘ یہی ہمارا وارث ہے اور یہی ہماری تکمیلِ آرزو ہے۔" پھر امام شافعیؒ کو گلے لگاتے ہوئے فرمایا "فرزند! مجھ سے علم کی جس قدر تواضع ممکن تھی وہ میں کر چکا اب بھی اگر تمہیں کوئی کوتاہی نظر آئے تو مجھے معاف کر دینا۔" یہ امام محمدؒ کو خوش خلقی اور انکسار کی انتہا تھی۔

امام شافعیؒ لہجے کے اس گداز کو برداشت نہ کر سکے اور بے اختیار رونے لگے "خدا کی قسم میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے علم کی تواضع کا حق ادا کر دیا اگر آپ ہماری طرف توجہ نہ کرتے تو ہم لبِ دریا پہنچ کر بھی پیاسے رہ جاتے۔ شافعیؒ آپ کے بارِ احسان سے سر نہیں اٹھا سکتا۔ اور ایک شافعیؒ ہی پر کیا منحصر ہے قیامت تک اہلِ علم کے جتنے قافلے ان راہوں سے گزریں گے وہ اپنی گردنوں پر امام محمدؒ کے احسانِ عظیم کا بوجھ محسوس کریں گے۔" پھر اس کے بعد امام شافعیؒ سرزمینِ بغداد سے اس طرح رخصت ہوئے کہ بے شمار یادوں کا غبار اٹھ رہا تھا۔ اور ہر یاد ایک مستقل آزار تھی‘ درد تھی‘ خلش تھی۔ علم، امامؒ کی زندگی تھی اور آج آپ ایک عظیم مجلسِ علم سے بچھڑ کر مکہ معظمہ کی طرف جا رہے تھے۔ یہ منزلِ فراق امامؒ کے دل پر شاق تھی مگر علم کی خاطر آپ کو سب کچھ گوارا تھا۔ وقت کا سفر جاری رہا علم کا مسافر قدم بہ قدم آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اہلِ نظر کا مرکز بغداد یادوں کا غبار میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

امام شافعیؒ ایک بار پھر حجازِ مقدس کی حدود میں داخل ہوئے۔ یہ واقعہ ۱۸۶ھ کے آخر یا ۱۸۷ھ کے شروع کا ہے۔ امامؒ نے حرمِ پاک میں اپنی مجلسِ درس قائم کی اور علم کے پیاسوں کو سیراب کرنے لگے۔ اس وقت امام شافعیؒ کی عمر چھتیس سال کے قریب تھی۔ لوگوں کا ایک ہجوم کثیر تھا جو ہر وقت آپ کو گھیرے رکھتا تھا مخلوق خدا اس نئے مرکزِ علم کی طرف قطار در قطار کھنچی چلی آ رہی تھی۔ امامؒ کی نظر کی گہرائی اور سوز وگداز میں ڈوبا ہوا اندازِ بیان دیکھنے والے حیران اور سننے والے سر بگریباں نظر آتے تھے اسی زمانے میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ بھی تحصیلِ حدیث کے لیے مکہ معظمہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ ایک



دن امام شافعیؒ محرابِ حرم کے نیچے تشریف فرما تھے اور انسانی ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے بلند آواز میں کہہ رہے تھے۔

"اے عراق والو! اے شام والو! اے حجاز والو! اگر تم کسی حدیث کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو تو مجھ سے دریافت کر لو۔" یہ وہی الفاظ تھے جو امام شافعیؒ نے تیرہ سال کی عمر میں اپنی زبان سے ادا کیے تھے اور جنہیں سن کر حضرت امام سفیان ثوریؒ نے فرمایا تھا کہ واللہ! اس بچے کی عقل نصف مخلوق کی عقل پر بھاری ہے‘ اب چھتیس سال کی عمر میں امامؒ کچھ رد وبدل کے ساتھ ان ہی الفاظ کو دہرا رہے تھے۔ اس مجمع میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور حضرت امام اسحٰقؒ بھی موجود تھے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے امام شافعیؒ کی پرسوز آواز سن کر امام اسحٰقؒ کی طرف دیکھا۔

"یہ نوجوان عجیب دعویٰ کر رہا ہے۔" امام احمد بن حنبلؒ کے لہجے سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا (یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جب امام احمد بن حنبلؒ پہلی بار امام شافعیؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے تو آپ کی عمر تیئیس سال تھی اور امام شافعیؒ کی چھتیس سال۔ اگرچہ تیرہ سال کا فرق نمایاں حیثیت رکھتا ہے لیکن کبھی کبھی جسمانی ساخت اس فرق کو مٹا دیتی ہے‘ امام شافعیؒ کے ساتھ بھی یہی صورتِ حال تھی۔ محنت وریاضت اور سادہ غذا نے آپ نے فربہی سے دور رکھا تھا جس کے نتیجے میں امامؒ بالکل نوجوان نظر آتے تھے۔ اسی بنیاد پر حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے امام اسحٰقؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "یہ نوجوان عجیب دعویٰ کر رہا ہے۔"

امام اسحٰقؒ نے ایک لمحے کے لیے فرزندِ قریش کی جانب دیکھا اور پھر حضرت احمد بن حنبلؒ سے مخاطب ہوئے "چلو! اس نوجوان سے رسول ﷺ کی ایک حدیث معلوم کرتے ہیں پھر اندازہ ہو جائے گا کہ آگہی کا دعویٰ حقیقت کے قریب تر ہے یا یہ محض جوشِ تقریر ہے؟" یہ کہہ کر حضرت امام اسحٰقؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ ہجوم کی پچھلی صفوں سے نکل کر آگے بڑھے اور امام شافعیؒ کے نزدیک پہنچ گئے‘ فرزندِ قریش کی تقریر جاری تھی۔ فصاحت وبلاغت کا سمندر موجزن تھا جس میں بڑے بڑے صاحبانِ نظر کے ہوش وادراک غرق ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد امامؒ کی تقریر ختم ہوئی‘ مجمع منتشر ہونے لگا اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہونے لگے اور امام احمد بن حنبلؒ نہایت ادب کے ساتھ آگے بڑھے اور امام شافعیؒ کی خدمت میں سلامِ عقیدت پیش کیا۔ امام شافعیؒ نے حدیث کے اس نوجوان طالب علم کی طرف دیکھا اور پھر آپ دیکھتے ہی رہ گئے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے لباس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ نوجوان

معاشی وسائل سے یکسر محروم ہے مگر چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ آنے والا غیرت مند بھی ہے اور اہلِ نظر بھی۔ امام شافعیؒ نے اپنی فراست سے احمد بن حنبلؒ کی شخصیت کی گہرائی کو سمجھ لیا تھا۔ اس لیے آپ پوری توجہ کے ساتھ اس نئے طالب علم سے مخاطب ہوئے۔

''نوجوان! کیا تم کوئی مسئلہ دریافت کرنا چاہتے ہو؟'' امام شافعیؒ کے لہجے سے محبت و انکسار کی واضح جھلک نمایاں تھی۔

حضرت احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ کے طرزِ کلام سے مزید متاثر ہوئے اور بہت آہستہ سے کہا ''میں آپ سے ایک حدیث پاک کی تشریح چاہتا ہوں۔''

''معلوم کرو۔ فرزندِ قریش کا لہجہ کچھ اور شیریں ہو گیا تھا ''محمد بن ادریسؒ کے ذہن کی جہاں تک رسائی ہے وہ تمہاری رہبری کرے گا۔ آگے خدا اپنے بندوں کا کفیل اور مددگار ہے۔''

''حضور اکرم ﷺ کی اس حدیثِ مقدسہ کا کیا مفہوم ہے؟

رات کے وقت پرندوں کو ان کے گھونسلوں سے نہ اڑاؤ۔''

احمد بن حنبلؒ کا سوال سن کر حضرت امام شافعیؒ نے ایک لمحے کے لیے بھی تامل نہیں فرمایا، آپ پُرسوز آواز میں کہنے لگے ''میرے آقاؐ کے ایک ایک کلمے میں ہزاروں حکمتیں پوشیدہ ہیں، اس حدیث میں رسالتِ مآبؐ نے عہدِ جاہلیت کی توہم پرستی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اہلِ عرب قبولِ اسلام سے پہلے جب رات کو سفر پر جاتے تھے تو پرندوں سے شگون لیتے تھے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ روانگی سے پہلے آشیانوں میں سوئے ہوئے پرندوں کو اڑا دیتے تھے اگر پرندہ اڑ کر دائیں جاتا تو وہ لوگ سمجھ لیتے کہ سفر کامیاب رہے گا اور اگر پرندے کا رخ بائیں جانب ہوتا تو وہ اپنا ارادہ ترک کر دیتے اور گھروں کو واپس چلے جاتے۔ اس توہم پرستی کے خاتمے کے لیے رسالت مآب ﷺ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا۔

''پرندوں کو رات کے وقت ان کے گھونسلوں سے نہ اڑاؤ۔''

میرے آقاؐ کے فرمانِ مقدس کا واضح مفہوم یہی ہے کہ انسان کو اپنے کاموں کی بنیاد طائروں کی پرواز نہیں رکھنا چاہئے۔ دنیا کی ہر کامیابی و ناکامی صرف خدا کی مرضی کی پابند ہے۔ زمانہ کفر کے یہ شگون ابنِ آدم کے مقدرات پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔''

جیسے ہی حضرت امام شافعیؒ نے اس حدیثِ پاک کی وضاحت کی امام اسحٰقؒ کی زبان سے اختیار نکلا ''ماشاء اللہ اس حدیث کی شرح و بسط کی خاطر اگر ہمارا سفر عراق سے حجاز تک ہوتا تو بے شک کامیاب



رہتا۔ یقیناً اس نوجون کا دعویٰ سچا ہے۔

اگر ہم امام اسحٰقؒ کے الفاظ پر غور کریں کہ ''یہ سفر عراق سے حجاز تک ہوتا'' تو ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب حضرت احمد بن حنبلؒ نے امام شافعیؒ سے مذکورہ حدیث کی تشریح چاہی تو آپ عراق میں کسی مقام پر موجود تھے۔ عراق سے حجاز تک کا سفر ظاہر کر رہا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ ان دنوں عراق میں قیام پذیر تھے اور اسی زمانے میں ان دونوں حضرات نے امام شافعیؒ سے اس حدیث کا مفہوم دریافت کیا تھا۔ لیکن جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو بعض معتبر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ سے امام احمد بن حنبلؒ کی پہلی ملاقات مکہ معظمہ میں ہوئی تھی اور فہم حدیث کا یہ واقعہ بھی اسی وقت پیش آیا تھا جب فرزندِ قریش محرابِ حرم کے نیچے تقریر کر رہے تھے، بہر حال کوئی بھی روایت درست ہو حقیقت صرف اتنی ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے پہلی بار امام شافعیؒ کو دیکھا تو فرزندِ قریش کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، پھر تقریر سنی تو حسنِ کلام میں کھو گئے یہاں تک کہ ذوقِ علم نے امام احمد بن حنبلؒ کو حضرت امام شافعیؒ کا شاگرد بنا دیا۔

☆☆☆

کچھ دن بعد ایک اور واقعہ پیش آیا جو امام شافعیؒ کی جلالتِ علمی پر ایک روشن دلیل ہے۔ حضرت اسحٰق بن راہویہؒ کا بیان ہے کہ ہم لوگ جلیل القدر محدث حضرت سفیان بن عینیہؒ سے حضرت عمرو بن دینارؒ کی روایت کردہ احادیث لکھا کرتے تھے۔ ایک روز احمد بن حنبلؒ تشریف لائے اور آتے ہی کہنے لگے ''اسحٰق! اٹھو میں تمہیں ایک ایسے شخص سے ملاتا ہوں کہ اس جیسا تم نے کوئی دوسرا نہ دیکھا ہو گا۔'' ہم سب احمد بن حنبلؒ کی گفتگو سن کر چونک اٹھے یہ بڑی عجیب بات تھی، یہ بڑا عجیب دعویٰ تھا۔ ہم سوچنے لگے کہ کیا حضرت سفیان بن عینیہؒ سے زیادہ عالم و فاضل شخص بھی مکہ معظمہ میں موجود ہے (یہ وہی حضرت سفیان بن عینیہؒ ہیں جو حضرت امام شافعیؒ کے استادِ گرامی ہیں اور جن کے بارے میں امامؒ نے فرمایا تھا کہ اگر حضرت امام مالک بن انسؒ اور حضرت سفیان بن عینیہؒ نہ ہوتے تو علم حجاز کی دنیا سے رخصت ہو جاتا) غرض ہم لوگ شدید حیرت میں ڈوبے ہوئے احمد بن حنبلؒ کے ساتھ ساتھ چل دیئے، راستے بھر ایک ہی خیال آتا رہا کہ آخر احمدؒ نے ایسے کس انسان کو تلاش کر لیا ہے جس سے ہم واقف نہیں اور جس کے بارے میں ان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ آج تک ہماری نظروں سے ایسا کوئی دوسرا شخص نہیں گزرا، بڑی پیچیدہ صورت حال تھی ہم قبل از وقت احمد بن حنبلؒ سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ آخر راستہ تمام ہوا اور ہم احمد بن حنبلؒ کے پیچھے

پیچھے زمزم کے احاطے میں پہنچے۔ وہاں ایک سفید پوش نوجوان بیٹھا تھا۔اس کی ظاہری شخصیت بڑی کشش انگیز تھی۔ دیکھنے والے پہلی ہی نظر میں اس کی وجاہت سے متاثر ہوتے تھے۔ گندمی رنگ' دلکش چہرہ' بلند پیشانی' آنکھیں گہری جن سے ذہانت وفراست آشکار۔

احمد بن حنبلؒ نے مجھے اس کے پہلو میں بٹھایا اور پھر اجنبی نوجوان سے میرا تعارف کراتے ہوئے بولے''ابوعبداللہ! یہ اسحٰق بن راہویہ حنظلی ہیں۔''(عرب میں عام رواج تھا کہ عرفیت یا کنیت کے طور پر کسی کو ابوعبداللہ کہہ کر پکارتے تھے۔ورنہ اگر یہ کہا جائے کہ امام شافعیؒ عبداللہ نام کے کسی بچے کے باپ تھے اور اسی رعایت سے احمد بن حنبلؒ نے آپ کو ابوعبداللہ کہہ کر پکارا تھا تو یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔اس وقت امام شافعیؒ کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی)

احمد بن حنبلؒ کے کہنے پر حضرت امام شافعیؒ نے اسحٰق بن راہویہؒ کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھا پھر آنے والوں کو نہایت پُرتپاک انداز میں خیر مقدم کیا اور بڑی خوش الحانی کے ساتھ اپنے مہمانوں کو مرحبا کہا''مجھ پر ابتدا ہی میں اس نوجوان کی گفتگو نے ایک خاص تاثر چھوڑا تھا۔ پھر میں نے مختلف موضوعات پر بات چیت کا آغاز کیا کچھ دیر تک بحث جاری رہی مگر جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کوئی عام نوجوان نہیں ہے۔اس شخص کے علم کی گہرائی نے ہمیں حیرت میں ڈال دیا۔فصاحت و بلاغت کا یہ حال تھا کہ اس کی تقریر کے سامنے حاضرین بولنے کی جرات نہیں کرسکتے تھے' پھر مجھے اس نوجوان کی غیر معمولی قوتِ حافظہ کا احساس ہوا' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ساری دنیا کا علم اس کے دماغ میں محفوظ ہے وہ بڑے سے بڑے مسئلے پر اتنی تیزی کے ساتھ تاریخی حوالے پیش کرتا تھا کہ ہم لوگ سوچتے ہی رہ جاتے تھے۔دورانِ گفتگو کئی بار ہمارے ذہنوں میں خیال ابھرا کیا اتنی نوعمری میں علم پر ایسی دسترس ممکن ہے؟''

آخر جب بہت دیر ہوگئی تو میں نے ابنِ حنبلؒ سے کہا۔ احمد! ہم اس نوجوان کی گفتگو سے بہت محظوظ ہوچکے۔اب تم ہمیں اس شخص کے پاس لے چلو جس کا ذکر کررہے تھے۔''

امام احمد بن حنبلؒ نے حیرت سے اسحٰق بن راہویہؒ کی طرف دیکھا''اس شخص سے تو تم ملاقات کرچکے!''

اسحٰق بن راہویہ حضرت احمد بن حنبلؒ کا جواب سن کر چونک اٹھے''ہم حضرت سفیان ابن عیینہؒ کی مجلسِ علم سے اٹھ کر سیدھے یہیں آرہے ہیں اس نوجوان کے علاوہ تو ہماری ملاقات کسی سے نہیں ہوئی ہے۔''اسحٰق بن راہویہؒ کے دوسرے ساتھی بھی حیرت سے احمد بن حنبلؒ کی طرف دیکھ رہے تھے۔



''یہی تو وہ صاحب ہیں۔'' احمد بن حنبلؒ نے حضرت امام شافعیؒ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی خوب رہی۔''اسحٰق بن راہویہؒ کی حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا''تم تو مجھے اس شخص کے حلقے سے اٹھا کر لائے تھے جو امام زہریؒ سے روایت کرتا تھا میں نے تو سوچا تھا کہ وہ امام زہریؒ جیسا یا ان کے علم کے قریب قریب ہوگا مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہم لوگوں کو ایک ایسے شخص کے پاس لے آئے جو ابھی نوجوان ہے۔''اسحٰق بن راہویہؒ تکلف سے کام لے رہے تھے اگر انہیں آدابِ مجلس کا خیال نہ ہوتا تو وہ صاف صاف کہہ دیتے کہ اس نوجوان کے علم کو دیگر آئمہ کے علم سے کیا نسبت ہے؟ اسحٰق بن راہویہؒ کا یہ سوچنا فطرتاً درست بھی تھا۔عام طور پر عمر کی پختگی کے ساتھ علم میں بھی وسعت و گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ اور جہاں تک حضرت امام شافعیؒ کی ظاہری شخصیت کا سوال تھا تو حضرت امام مالک بن انسؒ کے سوا کوئی بزرگ بھی چہرہ دیکھتے ہی فرزندِ قریش کی ذہانت وفراست کا اندازہ نہیں کرسکا تھا۔یا پھر دوسرے حضرت امام سفیان ثوریؒ تھے۔جنہوں نے صرف تیرہ سال کی عمر میں امام شافعیؒ کی عقل وذہانت پر گواہی دی تھی۔باقی بزرگ تو مسلسل مناظروں کے بعد ہی امامؒ کے فہم وادراک کے قائل ہوسکے تھے۔اسحٰق بن راہویہ حنظلیؒ بھی امام شافعیؒ کی وسعتِ علم کو تسلیم کرتے تھے مگر انہیں حدیث وفقہ میں کوئی درجۂ امتیاز دینے پر آمادہ نہیں تھے۔اسی وجہ سے امام اسحٰق نے حضرت احمد بن حنبلؒ سے نہایت تعجب کے ساتھ کہا تھا۔

''تم تو ہمیں اس نوجوان کے پاس لے آئے۔''

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے جواباً فرمایا''اسحٰقؒ! اس شخص سے جو کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو حاصل کرلو' اس جیسا صاحبِ کمال میری نظر سے آج تک نہیں گزرا۔''

یہ دونوں واقعات کس زمانے میں پیش آئے اس کا تعین مشکل ہے کسی تاریخی حوالے سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ امام احمد بن حنبلؒ اور امام اسحٰقؒ پہلی بار امام شافعیؒ سے کب ملے تھے۔ان دونوں ملاقاتوں میں تقدیم وتاخیر کا اندازہ بھی کیا جاسکتا۔تاہم اتنا ضرور ہے کہ جب حضرت احمد بن حنبلؒ حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ تشریف لائے تھے اس وقت حضرت امام شافعیؒ سے آپ کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔دوسری بار جب فرزندِ قریش نے بغداد کا سفر کیا تھا اس وقت امام احمد بن حنبلؒ ایک طویل عرصے تک اس مردِ جلیل کی علمی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے تھے۔

☆☆☆

حجازِ مقدس کے در و دیوار امام شافعیؒ کے پُرسوز لہجے سے گونج رہے تھے۔علم کا جو قافلہ بھی حرمِ پاک

کی طرف آتا' فرزندِ قریش کی آواز سن کر ٹھہر جاتا۔ پہلے سامعتیں اس آواز سے متاثر ہوتیں جو پتھروں کو پگھلانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ پھر یہی آواز دلوں میں اتر جاتی۔ یہاں تک کہ جن کے سروں پر دستارِ فضیلت نمایاں ہوتی' وہ بھی عقیدت سے اپنی گردنوں کو خم کر دیتے۔ وادیٔ علم کے تمام نشیب و فراز سے آشنا آنکھیں' امام شافعیؒ کی جوانی کو دیکھ کر متحیر ہو جاتیں۔ تجربات و مشاہدات کی دھوپ میں جلے ہوئے لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ محرابِ حرم کے سائے میں بیٹھ کر تقریر کرنے والا نوجوان انہیں بھی عاجز کر سکتا ہے جو زندگی کی آخری منزل کو چھو رہے تھے۔ پھر جیسے جیسے فصاحت و بلاغت کا نرم رو موجیں تند و پرشور ہوتیں۔ ہوش و خرد کی مضبوط چٹانیں بکھرنے لگتیں۔ آنکھوں کی حیرت برقرار رہتی مگر دلوں کو اعتبار آ جاتا کہ محمد بن ادریس شافعیؒ اپنی نوعمری کے باوجود مملکتِ علم کا تاجدار ہے۔ ایسا تاجدار جس کی شاہی کو قیامت تک اندیشہ زوال نہیں۔ اور یہ اقتدار اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک خدائے لازوال کی لامحدود رحمتیں کسی انسان پر سایہ فگن نہ ہوں۔

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ امام شافعیؒ کی مجلسِ علم کا ایک ایک گوشہ اہلِ طلب سے بھر گیا۔ بیٹھنے کو جگہ نہ رہی تو لوگ کھڑے ہو کر اس شعلہ بیاں امامؒ کا درس سننے لگے۔ اہلِ نظر محسوس کر رہے تھے کہ حضرت امام مالکؒ کے بعد ''حسنِ کلام'' اور ''وسعتِ علم'' پہلی بار کسی ایک ذات میں جمع ہوئے تھے۔ جب امام شافعیؒ عالمِ جذب میں فرماتے تھے۔ ''اے شام والو! اے عراق والو! جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو مجھ سے پوچھ لو۔'' تو بڑے بڑے دیدہ ور رونے لگتے اور پھر ان کے رقیق و نازک قلب اس نوجوان کے حضور جھک جاتے جو علم کی عظیم الشان سلطنت کا ناقابلِ تسخیر حکمراں تھا۔ یہ امامؒ کا کوئی دعویٰ نہ تھا حرفِ اشکبار نہ تھا مظاہرہ غرور نہ تھا۔ یہ ایک قلندر کا طرزِ کلام تھا جس کا حرف حرف آنچ دے رہا تھا اور لوگ بے اختیار اس آگ میں جل رہے تھے۔ یہ ایک جاں سوختہ عشق کا اضطراب تھا جو سینے کی قیود سے آزاد ہو کر زبانِ حال تک آ گیا تھا۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

ممکن ہے کہ شروع میں امام اسحٰقؒ نے حضرت احمد بن حنبلؒ کے الفاظ کو زیادہ اہمیت نہ دی مگر وہ وقت بہت جلد آ گیا جب مکے کی ایک ایک گلی سے یہ آواز ابھرنے لگی۔
''اس شخص سے جو کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو' حاصل کر لو۔ اس جیسا صاحبِ کمال آج تک ہماری نظر



سے نہیں گزرا۔''

پھر دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ اپنے قیامِ مکہ کے دوران حضرت امام احمد بن حنبلؒ پابندی کے ساتھ امام شافعیؒ کی درسگاہ میں حاضری دینے لگے۔ اگرچہ اس وقت ابنِ حنبلؒ کی عمر صرف تئیس چوبیس سال تھی لیکن علم حدیث میں آپ استادانہ نظر رکھتے تھے بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کو دس لاکھ احادیث یاد تھیں۔ اسی غیر معمولی صفت نے آپ کو نوعمری کے باوجود علمائے حدیث میں ایک ممتاز مقام تک پہنچا دیا تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ کے عقیدت مند خاموشی سے آپ کی اس نئی روش کو دیکھ رہے تھے حضرت ابنِ حنبلؒ کا یہ معمول بن گیا تھا کہ آپ صبح ہوتے ہی امام شافعیؒ کی مجلسِ درس میں چلے جاتے اور اس وقت تک دست بستہ بیٹھے رہتے جب تک کہ درس ختم نہ ہو جاتا۔ آپ کے حلقے کے لوگوں نے کچھ دن تک سکوت اختیار کیا مگر جب بارگاہِ شافعیؒ میں احمد بن حنبلؒ کی حاضری شدت اختیار کر گئی تو کچھ قریبی دوستوں نے دبے لہجے میں اعتراض کیا' حضرت امام حنبلؒ نے اس اشاراتی گفتگو کا کوئی جواب نہیں دیا اور اسی والہانہ انداز سے مجلسِ شافعیؒ میں حاضری دیتے رہے۔

پھر ایک دن کسی قریبی دوست نے ادب کے ساتھ کہا ''احمد! تم تو علمِ حدیث کے سلسلے میں بہت محتاط رویہ رکھتے ہو' اس شہرِ مقدس میں کئی اکابرِ علم موجود ہیں پھر تم نے ایک ایسے نوجوان کا انتخاب کیوں کیا جس کے تجربات و مشاہدات دوسرے لوگوں سے کم ہیں۔ آخر ہمیں بھی بتاؤ کہ تمہاری آنکھوں نے محمد بن ادریسؒ کی ذات میں کون سی خوبی دیکھی ہے جو تمہیں مستند درس گاہوں سے اٹھا کر اس مجلس کی طرف لے گئی ہے۔ جسے ابھی تک کوئی خاص درجۂ اعتبار حاصل نہیں ہو سکا ہے؟''

''ہر آنکھ اس نوجوان کی شخصیت کا جائزہ نہیں لے سکتی...... اور نہ ہر دماغ اس کا اہل ہے کہ وہ شافعیؒ کے علم کا احاطہ کر سکے۔'' حضرت احمد بن حنبلؒ نے مختصر جواب دیا اور خاموش ہو گئے۔

سورج کے طلوع و غروب کے ساتھ امام شافعیؒ کے حلقۂ درس میں امام بن حنبلؒ کی حاضری کا سلسلہ جاری رہا۔ احباب و عقیدت مند پھر کچھ دن تک امام حنبلؒ کے شوق و انہماک کو دیکھتے رہے۔ آپ کے ذہن پر امام شافعیؒ کے علمی اثرات روز بروز گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ آخر ایک بار پھر دوستوں نے امام احمد بن حنبلؒ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تم علمِ حدیث میں بڑے مرتبے کے مالک ہو مگر پھر بھی ایک نوجوان کی مجلسِ درس میں تسلسل کے ساتھ شرکت کرتے ہو۔'' آج نصیحت کرنے والے کے انداز میں زیادہ بے باکی تھی۔'' احمد تم جیسے عالمِ حدیث کے لیے شافعیؒ کی مجلس میں شرکت مناسب نہیں تمہیں اپنے

طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ (واضح رہے کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو حدیثِ رسولؐ سے اس قدر عشق تھا کہ آپ دنیا کے تمام علوم کو ارشاداتِ نبویؐ کے آئینے میں دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ تحصیلِ علم کے آغاز میں امام حنبلؒ نے فقہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ امام شافعیؒ پہلے شخص تھے جن کے علم کی وسعتوں سے متاثر ہو کر امام احمد بن حنبلؒ فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اسی باعث آپ کے دوستوں نے مجلسِ شافعیؒ میں شرکت پر اعتراض کیا تھا۔ دوسری وجہ امام شافعیؒ کی کم سنی تھی جس سے ظاہر بیں حضرات مغالطے کا شکار ہو جاتے تھے)

جب امام حنبلؒ کے دوستوں نے یہ اعتراض کیا تھا اس وقت طالبانِ حدیث کی ایک جماعت بھی موجود تھی ان میں سے بھی کچھ افراد نے امام احمد بن حنبلؒ پر یہی اعتراض کیا۔

حضرت امامؒ بہت دیر تک اپنے عمل پر دوسرے افراد کی تنقید سنتے رہے۔ جب وہ لوگ خاموش ہو گئے تو آپ نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا "ممکن ہے تمہارا یہ حسنِ ظن درست ہو کر میں علمِ حدیث میں بلند مقام رکھتا ہوں مگر تمہارے اس نظریے سے شافعیؒ کی عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ کسی کو کیا خبر کہ ہم لوگ احادیث کو حفظ کرتے ہیں اور صرف الفاظ آشنا ہیں۔ لیکن وہ نوجوان جو محرابِ حرم کے سائے میں بیٹھ کر اپنے علم کی دولت کو ضرورت مندوں میں تقسیم کر رہا ہے وہ قولِ رسولؐ کے معانی اور حقائق سے آگاہ ہے، میں ان ہی حقائق کو جاننے کے لیے اس کے در پر حاضری دیتا ہوں۔" یہ کہتے کہتے فرطِ عقیدت اور جوشِ جذبات سے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی آواز سے رقت جھلکنے لگی۔ حاضرین دم بخود تھے کس میں اتنی جرات تھی کہ احمد بن حنبلؒ کی بات جھٹلا سکے۔ آج پہلی بار ان لوگوں کو بھی امام شافعیؒ کی بلندیوں کا اندازہ ہو گیا تھا جو آپ کے حلقۂ اثر سے دور تھے۔

☆☆☆

فرزندِ قریش نے نو سال تک مکہ معظمہ میں درس دیا۔ حجازِ مقدس کے علاوہ دور دراز سے ہزاروں تشنگانِ علم آتے رہے اور اس چشمہ روحانیت سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔ جب بھی کوئی اہلِ طلب امامؒ کی مجلس سے رخصت ہوتا' اس کے ہونٹوں پر ایک ہی دعا ہوتی۔

"خدا شافعیؒ کو جزائے خیر دے کہ ان کے طفیل بے شمار گرہیں کھل گئیں اور ہمارے ذہن کشادہ ہو گئے۔"

اگر ہم اپنا واضح کرنے کے لیے مادی اور ظاہری تراکیب استعمال کریں تو بے دریغ کہا جا سکتا ہے



کہ امام شافعیؒ علم کا وہ سیلاب تھے جس کی شدت نے بڑے بڑے دریاؤں کا رخ موڑ دیا تھا جن کناروں کو بھاری پتھروں کے ذریعے مضبوطی بخشی گئی تھی وہ بھی اس پانی کی کاٹ کو نہیں روک سکتے تھے جس میں امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے بے مثال منطقیت اور امام مالک بن انسؒ کا روحانی جلال شامل تھا' اسی مجموعہ صفات کو دیکھ کر حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا تھا۔

"ایک حدیثِ رسولؐ کے مطابق شافعیؒ مجدد کی حیثیت رکھتے ہیں" حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے رسالت مآب ﷺ کے ایک قولِ مقدس سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ خدا اپنے دین کی حفاظت کرنے کے لیے ہر صدی کی ابتدا میں ایک ایسا شخص پیدا کرے گا جس کے ذریعے مذہبی احکام کی تجدید ہو گی۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا ارشاد ہے۔ "میرے نزدیک شافعیؒ مجدد ہیں۔ پہلی صدی ہجری کے مجدد عمر بن عبدالعزیزؒ تھے اور دوسرے صدی کی ابتدا امام شافعیؒ سے ہوئی ہے۔"

اسی انداز کی ایک روایت نامور صوفی امیر خورد نے اپنی مشہور کتاب "سیر الاولیا" میں حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کی زبانی بیان کی ہے۔ سیر الاولیا تصوف کی قدیم کتابوں میں ایک معتبر تصنیف ہے جسے پوری دیانت اور سچائی کے ساتھ اس شخص نے تحریر کیا ہے جو حضرت نظام الدین اولیاؒ کا تربیت یافتہ تھا۔

سلطان المشائخ' محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ ایک موقع پر اپنے شاگردوں کو درس دے رہے تھے۔ دورانِ تقریر آپ نے فرمایا "ایک شخص نے حضرت رسالت پناہ حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا پھر اس نے بڑے ادب سے عرض کیا' یا رسول اللہ مجھ گناہ گار تک آپ کا یہ قول مبارک پہنچا ہے کہ ہر زمانے میں کچھ ایسے مردانِ خدا ہوتے ہیں جن کی برکت سے دنیا قائم رہتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے سوال کی تصدیق فرمائی۔ پھر اس نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا۔ "اس زمانے میں وہ بابرکت انسان کون ہے؟" اس شخص کا سوال سن کر سرورِ کونینؐ نے فرمایا......

محمد بن ادریس شافعیؒ"

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی شرح حدیث کے بعد کسی اہلِ دل کو اس بات میں شک نہیں ہونا چاہیے کہ حضرت امام شافعیؒ دوسری صدی ہجری کے مجدد تھے۔ پھر حضرت نظام الدین اولیاؒ کا بیان کردہ خواب بھی حق پرستوں کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کوئی صحیح العقیدہ مسلمان اپنے خواب کو رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ مقدس سے اس طرح منسوب نہیں کر سکتا کہ وہ مبالغہ آمیزی یا دروغ گوئی سے کام لے رہا ہو۔

اس نے فی الواقع حضور اکرمؐ ہی کو خواب میں دیکھا تھا۔ اور سرورِ کائنات اپنی زبان مطہر سے حضرت امام شافعیؒ کی روحانی عظمت پر گواہی دے رہے تھے۔

☆☆☆

فرزندِ قریش کا درس جاری رہا۔ لوگ آتے رہے اور اس عظیم بارگاہِ علم سے فیض یاب ہوتے رہے یہاں تک کہ بے شمار انسانوں کے زنگ آلود دماغ صیقل ہو گئے اور دلوں کی سیاہیاں روشنی میں تبدیل ہو گئیں، کوئی چار پانچ سال بعد ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جس نے بڑے بڑے صاحبانِ علم کے دلوں پر حضرت امام شافعیؒ کی عظمتوں کے نقوش ثبت کر دیے۔ حضرت امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''مناقب الشافعیؒ'' میں تحریر کیا ہے کہ نامور فقیہہ و محدث حضرت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ نے امام شافعیؒ سے جوانی کے دور میں درخواست کی کہ وہ ان کے لیے ایک ایسی کتاب لکھ دیں جس میں قرآن، سنت اجماع اور قیاس سے استدلال کے شرائط درج ہوں۔ نیز یہ کہ اس میں ناسخ و منسوخ کا بیان بھی ہو۔''

امام رازیؒ کے بیان کے مطابق یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت امام شافعیؒ بغداد میں تھے اور آپ کا یہ پہلا سفرِ عراق تھا' نوجوانی کے ذکر سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں فرزندِ قریش' امام محمدؒ کے زیرِ تربیت تھے۔ اگر ہم ان حقائق کو پیشِ نظر رکھیں تو ایسا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ پہلے سفرِ بغداد کے دوران حضرت عبدالرحمٰن بن مہدی نے امام شافعیؒ سے ایسی کسی تصنیف کی درخواست کی تھی۔ البتہ جب امام شافعیؒ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور حرمِ پاک میں اپنی مجلسِ درس قائم کر لی اس وقت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ نے فرزندِ قریش کو ایک خط لکھ کر اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ اس وقت امام شافعیؒ کی عمر نوجوانی کی حدود سے نکل کر جوانی کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی، بعض معتبر روایات گواہ ہیں کہ جب عبدالرحمٰن بن مہدیؒ نے تصنیف کی درخواست کی تھی اس وقت امام شافعیؒ کا سن چالیس سال سے تجاوز کر چکا تھا بہر حال ان تمام باتوں سے قطع نظر حضرت امام شافعیؒ نے عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کے اصرار پر حجازِ مقدس میں بیٹھ کر یہ کتاب تصنیف کی اور اس کا نام ''الرسالہ'' رکھا۔ اور پھر اپنی اس علمی کاوش کو ابنِ مہدیؒ کے پاس عراق بھیج دیا۔

جب امام شافعیؒ کے تحریر کردہ یہ اوراق عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کے ہاتھ پہنچے تو اپنے وقت کا عظیم فقیہہ و محدث انہیں پڑھنے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ ابنِ مہدیؒ نے اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے ''الرسالہ''



کا مطالعہ شروع کر دیا۔ عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ آپ اپنے گردوپیش سے بے خبر ہو گئے تھے۔ فرزندِ قریش کی تحریر نے ابنِ مہدیؒ پر سحر سا کر دیا تھا۔ بالآخر جب کتاب ختم ہوئی تو عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

''میں اس کا وہم و گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ خدائے ذوالجلال نے ایسا بے مثال شخص بھی پیدا کیا ہے'' امام شافعیؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے وقت عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آپ عالمِ جذب میں ہوں اور بارگاہ فرزندِ قریش میں تعریف و تحسین کی نذر پیش کر رہے ہوں۔

کتاب ''الرسالہ'' کی تصنیف کے بعد عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کے علاوہ دوسرے اکابرِ علم میں امام شافعیؒ کی وسعتِ نظر پر حیران رہ گئے۔ اہلِ علم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ امام شافعیؒ کو ایک عظیم فقیہہ تصور کریں یا با کمال انشاء پرداز غالباً اسلامی دنیا میں پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ ایک شخص قرآن و حدیث کا بے مثال عالم بھی تھا اور دلوں کی تسخیر کرنے والا ادیب بھی۔ یہ دونوں صفات بیک وقت امام شافعیؒ کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں جس کا ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا کہ پورا عراق فرزندِ قریش کی شہرت کے زیرِ اثر آ گیا اور در و دیوار سے صدائیں بلند ہونے لگیں۔

''محمد بن ادریس شافعیؒ''

کتاب ''الرسالہ'' فرزندِ قریش کا وہ عظیم الشان تحریری کارنامہ ہے جسے دیکھ کر وہ لوگ بھی حیران رہ گئے تھے جو خود درجۂ امامت و اجتہاد پر فائز تھے۔ کسی غیر عربی داں کا تو ذکر ہی کیا۔ اہلِ زبان بھی امام شافعیؒ کی انشاء پردازی پر سر بہ گریباں تھے۔ وہ شدید حیرت و استعجاب کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور بہ آواز بلند کہا کرتے تھے۔

''محمد بن ادریس شافعیؒ حدیث و فقہ میں بے نظیر ہیں یا ادب و انشاء میں بے مثال؟'' یہ ایک ایسا سوال تھا جو برسوں انسانی ہونٹوں پر لرزتا رہا۔ پھر سوال کرنے والے خود ہی پکار اٹھے۔ ''شافعیؒ عظیم محدث و فقیہہ بھی ہیں اور عظیم ادیب و انشا پرداز بھی۔''

اور واقعہ بھی یہی ہے۔ حضرت امام شافعیؒ بڑے جامع الصفات انسان تھے۔ فرزندِ قریش کی ذات میں حسنِ ظاہری اور حسنِ باطنی کا ایسا عجیب و غریب اجتماع تھا کہ دیکھنے والی آنکھ حیرت زدہ رہ جاتی تھی اور سوچنے والا دماغ عاجز آ جاتا تھا۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی!

امامؒ کا اندازِ تحریر ایسا تھا جیسے کاغذ پر فصاحت و بلاغت کا سمندر موجزن ہو۔ الفاظ و معانی کی ایسی گلکاریاں تھیں۔ جیسے صفحہ قرطاس پر گلستاں مہک اٹھا ہو۔ اہلِ نظر نے فرزند قریش سے پہلے حدیث وفقہ کے مسائل پر بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں دیکھی تھیں۔ مگر امام شافعیؒ کی قوتِ اظہار سب سے منفرد تھی۔

''تاریخِ بغداد'' میں ابن ابی الجارود' فرزندِ قریش کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''میری نظر سے آج تک ایسا کوئی شخص نہیں گزرا کہ اس کی تصنیفات اس کے مشاہدے سے زیادہ اثر انگیز ہوں۔ بس محمد بن ادریس شافعیؒ ایک ایسے امام ہیں کہ ان کا بیان ان کی کتابوں سے زیادہ بلند مرتبہ رکھتا تھا۔'' ابی الجارود نے اپنے اس تبصرے میں حضرت امام شافعیؒ کی حسن تقریر سنی تو وہ حیران رہ گئے۔ یہ ایک اور خوبی تھی جو روزِ اول میں امامؒ کا مقدر کردی گئی تھی۔ اہلِ نظر کہتے ہیں کہ کاغذ پر فصاحت و بلاغت کا جو سمندر بہتا تھا وہ امامؒ کی مجلسِ درس میں آنے کے بعد مزید شدت اختیار کر لیتا تھا۔ امامؒ لب کشا ہوتے تو اہلِ مجلس کے ساتھ در و دیوار بھی ساکت ہو جاتے۔ سننے والوں نے اس سے پہلے نہ ایسا لہجہ دیکھا تھا اور نہ اس طرح لفظوں کا آہنگ محسوس کیا تھا۔ امامؒ چاہتے تو حاضرین کی سماعتوں میں شہد و شبنم کی لہریں اتار دیتے اور اگر امامؒ کی یہ خواہش ہوتی کہ لوگوں کے دل و دماغ میں پگھلی ہوئی آگ بھر جائے تو خدا نے آپ کو اس بات کی بھی قدرت بخشی تھی۔ امامؒ اس بات کو پسند کرتے کہ افسردہ و مغموم انسانوں کے ہونٹ تبسم آشنا ہو جائیں اور ان کے چہروں پر شگفتگی و شادابی نظر آنے لگے تو آپ کی زبان سے ادا ہونے والے چند الفاظ اس مشکل ترین کام کو اس طرح سرانجام دیتے کہ سوچنے والے سوچتے ہی رہ جاتے اور اگر امامؒ کو یہ منظور ہوتا کہ ہنستی ہوئی محفل ماتم کدہ بن جائے تو پھر کون سی آنکھ ہوتی جو اشکوں سے لبریز نہ ہو جاتی اور کون سی زبان ہوتی جو آمادہ آہ و فغان نہ ہو جاتی۔ یہ آسمان کا عطیہ خاص تھا جس سے زمین پر بسنے والے ایک مطلبی نوجوان کو سرفراز کیا گیا تھا۔ بے شک! امام شافعیؒ تحریر میں بھی یکتائے روزگار تھے اور تقریر میں بھی آپ کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں تھی۔

ایک بار حضرت امام شافعیؒ ایک مجلس میں جلوہ افروز تھے۔ اتفاق سے اس وقت حدیث وفقہ کا کوئی مسئلہ زیرِ بحث نہیں تھا بلکہ یہ ایک ایسی محفل تھی جس میں امام شافعیؒ کے احباب اور دیگر علماء ملاقات کی غرض سے جمع ہو گئے تھے۔ ایک صاحب نے جو خود بھی صاحبِ علم تھے اچانک ہذیل کے اشعار پڑھنے شروع کر دیے۔ اگرچہ یہ شعر خوانی کا موقع نہیں تھا لیکن وہ شخص آدابِ مجلس کے خلاف مسلسل شعر پڑھتا



رہا۔ واقعے کی نوعیت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ شخص حدیث وفقہ کے موضوع پر امام شافعیؒ کے سامنے عاجز تھا' اس لیے اپنی برتری ثابت کرنے کی غرض سے سخن شناسی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ حضرت امام شافعیؒ کو فطری طور پر نمود و نمائش سے کوئی رغبت نہیں تھی نتیجتاً آپ نے اس شخص کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ امامؒ کے اس طرزِ عمل کے بعد شعر پڑھنے والے کو خاموش ہو جانا چاہئے تھا مگر اس نے شاید یہ سوچ کر سکوت اختیار نہیں کیا کہ امام شافعیؒ شعر و ادب کا زیادہ علم نہیں رکھتے اس لیے یہی ایک موقع تھا جو فرزندِ قریش کو لاجواب کر سکتا تھا۔ یہ اس شخص کو بڑی بھول تھی' وہ حضرت امام شافعیؒ کے ذوقِ شعری سے واقف ہی نہیں تھا۔ بالآخر جب وہ براہِ راست امامؒ کو مخاطب کر کے شعر پڑھنے لگا تو اہلِ مجلس کو اندازہ ہو گیا کہ اسے شعر و ادب میں امامؒ کی آزمائش مقصود ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ فرزندِ قریش نے بہت دیر تک اس صورتِ حال کو نظر انداز کیا اور اپنی روایتی اعلیٰ ظرفی سے کام لیتے ہوئے بات کو ٹالنے کی کوشش کی مگر بولنے والا بولتا رہا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ امام شافعیؒ اس میدان میں اس کی ہمسری نہ کر سکیں گے۔ انسانی نفس کی سرکشی بڑا عجیب رخ اختیار کر گئی تھی وہ شخص اپنے جذبات کی تسکین کے لیے ایک ایسے انسان کو چھیڑنے کی کوشش کر رہا تھا جو عادتاً بڑا فراخ دل تھا' اور جس نے کبھی کسی آدم زاد کو شرمسار کرنے کی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ پھر وہ لمحہ آ ہی گیا جب حضرت امام شافعیؒ اس شخص کی طرف متوجہ ہو گئے اور آپ نے ہذیل کا شعر پڑھا۔

اہلِ مجلس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب یہ نشست کیا رنگ لانے والی ہے؟ حاضرین کی اکثریت اس حقیقت سے تو آگاہ تھی کہ امام شافعیؒ شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں مگر کوئی اس راز سے واقف نہیں تھا کہ فرزندِ قریش کو سخن فہمی میں بھی سند کا درجہ حاصل ہے۔ غرض اس شخص نے جواباً دوسرا شعر پڑھا۔ حضرت امام شافعیؒ بھی آہستہ آہستہ شعر پڑھتے رہے۔ ابھی آپ کے لہجے نے شدت اختیار نہیں کی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ اس شخص کا خیال تھا کہ امام شافعیؒ نے رسمِ زمانہ کے مطابق چند اشعار یاد کر لیے ہوں گے اس لیے کچھ دیر بعد ان کی یادداشتوں کا ذخیرہ ختم ہو جائے گا اور پھر برسرِ محفل امامؒ اس مقابلے میں شکست کھا جائیں گے۔ یہ اس شخص کا خیالِ خام تھا۔ اپنی اسی بدگمانی کے خمار میں وہ تھوڑی دیر تک پوری جوش و خروش سے ہذیل کے اشعار سناتا رہا۔ حضرت امام شافعیؒ دنیاداری کے کاموں میں کسی سے مقابلہ پسند نہیں کرتے تھے اس لیے آپ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے رہے۔ پھر جب وہ منزل آ گئی کہ امام کا مخاطب اپنے حافظے پر زور دے کر شعر یاد کرنے لگا تو فرزندِ قریش کا لہجہ یکسر بدل گیا۔ اب مجلس میں امام شافعیؒ کی

پُرجلال آواز گونج رہی تھی۔ اور آپ ہذیل کے وہ اشعار سنا رہے تھے جو اس شخص کی نظر سے بھی نہیں گزرے تھے۔ روایت ہے کہ امام شافعیؒ مسلسل کئی گھنٹے تک ایسے ایسے اشعار پڑھتے رہے کہ جن سے اہلِ مجلس کی سماعتیں تک آشنا نہیں تھیں۔ وہ شخص جسے حضرت امام شافعیؒ کی سخن شناسی کا امتحان منظور تھا کسی مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اب نہ اس کے لیے کلام کی کوئی گنجائش تھی اور نہ فرار کا کوئی راستہ' بس ایک عرقِ ندامت تھا جس نے اس کا پورا بدن بھگو دیا تھا۔ ایک تو امام کی بے پناہ قوتِ حافظہ دوسرے پُر سوز فصاحتِ زبان اور شعر کی ادائیگی کا ساحرانہ انداز' غرض ان تمام چیزوں نے مل کر حاضرین کو بے اختیار یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''واللہ! ہماری آنکھوں نے ایسی مجلسِ شعر آج تک نہیں دیکھی۔''

آخر جب امامؒ نے اپنے مخاطب کو سرنگوں دیکھا تو آپ خاموش ہو گئے۔ پھر چند لمحوں کے بعد آپ نے اس شخص سے فرمایا ''کیا ابھی شعر خوانی کا سلسلہ جاری رکھوں؟'' امامؒ کے لہجے میں نہ طنز کی آمیزش تھی اور نہ غرور و تکبر کا رنگ شامل تھا۔ وہی سینوں میں اتر جانے والی آواز تھی جو حریفوں کے دلوں کو دو نیم کر دیتی تھی۔

''بس امامؒ بس۔'' وہ شخص رقت آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''خدا کی قسم! اس فن میں بھی کوئی آپ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔''

''تم میرے بعد اہلِ حدیث میں ایسا کوئی دوسرا نہیں پاؤ گے۔'' امام شافعیؒ نے حاضرینِ مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ساری گردنیں خم تھیں اور تمام نظریں جھکی ہوئی تھیں' کون جواب دیتا؟ کس کی جرات تھی کہ فرمودہ امامؒ کی نفی کرتا؟ سب کے سب عاجز تھے۔ فرزندِ قریش نے دوبارہ فرمایا ''ویسے یہ لوگ (اہلِ حدیث) ان چیزوں سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے۔'' امامؒ ہمیشہ خود ستائی اور مبالغے سے گریز کرتے تھے۔ آپ کے یہاں اظہارِ ذات اور شخصی نمائش بھی کوئی پسندیدہ فعل نہیں تھا۔ پھر کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ امامؒ نے برسرِ مجلس اپنے بارے میں یہ دعویٰ کیوں کیا۔

''میرے بعد اہلِ حدیث میں ایسا کوئی دوسرا نہیں پاؤ گے۔''

ہمارے نزدیک یہ کسی دنیا پرست کا دعویٰ نہیں بلکہ ایک مردِ مومن کا اظہارِ حقیقت تھا۔ بالفرض اگر کچھ دیر کے لیے ہم امامؒ کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ کو کسی دعوے میں شمار کر لیں تو پھر اس روشن صداقت کو جھٹلانے کی کس میں ہمت ہے کہ قافلہ اہلِ حدیث میں امامؒ جیسا کوئی دوسرا موجود



تھا۔ جو لوگ محدثینِ عظام اور فقہیانِ کرام کی تاریخ سے واقف ہیں' انہیں بخوبی اندازہ ہے کہ اس طویل فہرست میں امام شافعیؒ کی طرح شعر و ادب پر عبور رکھنے والا کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ فرزندِ قریش نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

پھر بھی جو لوگ امامؒ کے اظہارِ حقیقت کو ایک دعوے کی حیثیت دیتے ہیں۔ انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ فرزندِ قریش جس زمانے میں شعور کی منزل تک پہنچے تھے وہ ایک پُر آشوب عہد تھا۔ خلافت' ملوکیت میں تبدیل ہو چکی تھی' چند لوگوں کے سوا مسلمانوں کی اکثریت حدیث و فقہ کی روح تک سے آشنا نہیں تھی۔ عہدِ جاہلیت کے علوم و فنون دوبارہ زندہ ہو رہے تھے محفلوں میں شعر و ادب کے چرچے عام تھے۔ یہاں تک کہ خلیفہ ہارون رشید کے دربار سے رقص و سرود کے بھی کچھ افسانے وابستہ ہو چکے تھے۔ لوگوں نے اہلِ علم کی عزت و تکریم کے بجائے صاحبانِ اقتدار کی خوشامد کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اس فضا میں حضرت امام شافعیؒ کا یہ دعویٰ کہ میرے بعد اہلِ حدیث میں ایسا کوئی دوسرا نہیں پاؤ گے۔ ماحول کے عین مطابق تھا۔ اگر ہم امام شافعیؒ کے الفاظ کی روح کو سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ جس شخص نے بھری محفل میں ہذیل کے شعر پڑھنے کی ابتدا کی تھی وہ در پردہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ محدثین و فقہا کی جماعت' قرآن و حدیث کے سوا دوسرے علم و فنون پر دسترس نہیں رکھتی۔ اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ شخص امامؒ کے علم کو محدود سمجھ رہا تھا اور یہی سوچ کر اس نے شعر خوانی کا سلسلہ شروع کیا تھا کہ امامؒ بالآخر عاجز آ جائیں گے اور پھر اہلِ دنیا کا جذبہ حسد تسکین پا جائے گا۔ اگر ہم موضوع سے ہٹ کر دورِ جدید پر نظر ڈالیں تو ہمارے یہاں بھی یہ بیماری عام پائی جاتی ہے۔ مذہبی علما کو عجیب عجیب انداز سے نشانہ تضحیک بنایا جاتا ہے بڑی دریدہ ذہنی کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہ ریش دراز رکھنے والے لوگ دیگر علوم سے قطعاً نا آشنا ہیں اگرچہ ہمارے بعض عالموں نے اپنے علم کی وسعت و گہرائی سے دنیا پرستوں کی زبان درازیوں کو مفلوج بنا دیا ہے لیکن پھر بھی طنز و اعتراض کی یہ روش ہنوز جاری ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کے عہد میں لوگ اتنے گستاخ و بے باک تو نہیں تھے مگر ایسے مواقع کی تلاش میں ضرور رہتے تھے کہ وہ اپنے سطحی علم کے ذریعے اہلِ حدیث پر غلبہ حاصل کر سکیں۔ ہذیل کے اشعار پڑھنے والے شخص کا بھی دلی مقصد یہی تھا کہ وہ کسی نہ کسی عنوان حضرت امام شافعیؒ کے سامنے نمایاں ہو جائے' لیکن فرزندِ قریش کے بے پناہ علم کی ایک ہی تند و تیز لہر نے اسے ہمیشہ کے لیے غرق کر دیا۔ وہ اہلِ نظر کی مجلس میں اہلِ حدیث کی آزمائش چاہتا تھا (ممکن ہے اس شخص نے کسی دوسرے کتبِ

فکر سے متعلق رکھنے والے لوگوں کے اشارے پر یہ حرکت کی ہو) مگر امامؒ آخر امامؒ تھے۔ آپ نے اس کے منصوبے کو اسی پر الٹ دیا اور اہلِ حدیث کے علم پر ایسی پر جوش و مدلل گواہی دی کہ مخالفین دم بخود رہ گئے۔

اگر ہم صورتِ حال کے تناظر میں امامؒ کے اس دعوے کو (میرے بعد اہلِ حدیث میں کوئی ایسا دوسرا نہیں پاؤ گے۔ ویسے یہ لوگ ان چیزوں سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے) سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ امامؒ نے اہلِ مجلس کے روبرو پہلے اپنی علمی حیثیت کا اظہار کیا اور پھر فوراً ہی جماعت اہلِ حدیث کے تبحرِ علمی پر شہادت پیش کی اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر امام اعظم ابوحنیفہؒ امام مالک بن انسؒ امام سفیان ثوریؒ امام اوزاعیؒ امام ابو یوسفؒ امام محمدؒ امام زفرؒ امام احمد بن حنبلؒ امام طحاویؒ امام اسمٰعیل بخاریؒ امام مسلم، امام ترمذیؒ، امام ابوداؤد اور امام نسائیؒ جیسے عظیم فقیہہ و محدث شعر و ادب کی طرف مائل ہو جاتے تو بے شمار مشہور سخنوروں اور انشاء پردازوں کو ادب کے صفحات پر منہ چھپانے کے لیے بھی جگہ نہیں ملتی۔ اور پھر کون جانے کہ شعر و انشا کی تاریخ کس انداز میں لکھی جاتی؟ حضرت امام شافعیؒ نے اہلِ حدیث کی اسی صلاحیت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

جو لوگ اپنی کم علمی اور تنگ نظری کے باوجود شعر و ادب میں حضرت امام شافعیؒ کی آزمائش چاہتے تھے دراصل انہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ فرزندِ قریش ادب و انشا میں کس مقام پر فائز تھے؟ عام شاعروں اور ادیبوں کا تو ذکر ہی کیا' عربی زبان کے اکابر بھی بارگاہِ شافعیؒ میں ہمیشہ خم نظر آتے تھے۔ تاریخ پر نگاہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ اصمعی کو عربی شعر و ادب میں بلند ترین درجہ حاصل ہے۔ یہ نادرِ روزگار شخص عربی لغت میں بھی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی اصمعی حضرت امام شافعیؒ کے بارے میں اس طرح رطب اللسان ہے۔

''میں ہذیل کے اشعار کی تصحیح قریش کے ایک نوجوان سے کرلیا کرتا ہوں جس کا نام محمد بن ادریسؒ ہے۔'' اصمعی کے اعتراف کے بعد اہلِ عرب میں ایسا کون شخص ہے جو شعر و ادب کے حوالے سے حضرت امام شافعیؒ کی گرد کو بھی چھو سکے۔

☆☆☆

شعر و ادب اور زبان و بیان کے علاوہ خدا نے امامؒ کو ایسی پرسوز آواز بھی عطا کی تھی کہ چند آسمانی حوالوں کے سوا کوئی دوسری مثال بہت مشکل سے ملے گی۔ حضرت امام مالک بن انسؒ کو قرآت کے سلسلے



میں خاص درجۂ امتیاز حاصل ہے مگر جب فرزندِ قریش نے امام مدینہؒ کے حضور پہلی بار موطا کی قرات کی تھی تو پوری مجلس پر وجد طاری ہو گیا تھا۔ خود امام مالکؒ کی یہ حالت تھی کہ آپ امام شافعیؒ کی اثر انگیز آواز میں گم ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ جب اپنے استادِ گرامی کے احترام کے پیشِ نظر فرزندِ قریش پڑھتے پڑھتے ٹھہر جاتے تھے تو امام مدینہؒ بے اختیار ہو کر فرماتے تھے۔

''محمد اور...... محمد اور'' یہ امام شافعیؒ کے حسنِ قرات پر ایک ایسی سند ہے کہ اس کے بعد کسی دوسری گواہی کی ضرورت نہیں رہتی مگر تاریخ اسلام نے اپنے دامن میں آنے والی نسلوں کے لیے ایسے کئی واقعات جمع کر لیے ہیں جنہیں پڑھ کر عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے روز و شب کے معمولات کچھ اس طرح تھے کہ صبح کی نماز کے بعد سے سورج نکلنے تک شاگردوں کو فقہ کا درس دیتے۔ اس کے بعد تعلیمِ حدیث کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ جب امامؒ اس کارِ مقدس سے فارغ ہو جاتے تو مجلسِ وعظ کا اہتمام ہوتا۔ فرزندِ قریش دنیا کے بے ثباتی اور آخرت کی ہولناکی کا ذکر اس طرح کرتے کہ سرکش و کثیف نفس رکھنے والے انسانوں کی بھی آنکھیں بھیگ جاتیں اور جب تک محفلِ وعظ قائم رہتی اس وقت تک اہلِ ظاہر کو دنیا اور اس کی دلفریبیوں سے شدید نفرت ہو جاتی۔ یہ امامؒ کا حسنِ بیان تھا کہ گم کردہ راہ لوگوں کے ذہنوں کو بھی زیر و زبر کر کے رکھ دیتا۔ مجلسِ وعظ کے اختتام پر دیگر علمی تذکرے ہوتے یہاں تک کہ ظہر کا وقت آ جاتا۔ پھر امامؒ بارہ گارہ خداوندی میں سجدہ ریز ہو جاتے۔ امامؒ کی نماز عجیب نماز تھی دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ خالقِ کائنات کے آگے ہاتھ باندھتے ہی امامؒ اپنے ہوش میں نہیں ہیں بلکہ کسی اور ہی عالم میں چلے گئے ہیں۔ مشہور بزرگ ابراہیم بن محمدؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعیؒ سے بہتر کسی کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ امامؒ کی نماز مسلم بن خالدؒ کی نماز کے مشابہ تھی اور خالدؒ کی نماز مسلم بن جریجؒ کی نماز کے مماثل تھی۔ مسلم بن جریجؒ کی نماز عطاؒ کی نماز سے عطاؒ کی نماز حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی نماز سے...... عبداللہ بن زبیرؓ کی نماز حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نماز سے اور صدیق اکبرؓ کی نماز رسالتِ مآب ﷺ کی نماز سے مشابہ تھی۔

نمازِ ظہر کے بعد مختصر سے وقت کے لیے شعر و ادب اور عروض و لغت پر بحث کرتے۔ اور پھر عصر تک آرام فرمانے کے لیے گھر تشریف لے جاتے۔ عصر سے مغرب تک صرف عبادت اور ذکرِ الٰہی کرتے۔

اوقاتِ شب کی تقسیم اس طرح تھی کہ ایک تہائی حصے میں عبادت کرتے دوسرے حصے میں اپنا تحریری کام سرانجام دیتے اور تیسرے حصے میں اتنا آرام کرتے کہ جس سے انسانی صحت برقرار رہ سکے۔ اکثر

لوگوں کی خواہش ہوتی کہ حضرت امام شافعیؒ نماز میں امامت کریں مگر آپ یہ کہہ کر انکار کر دیا کرتے تھے کہ جب مجھ سے بہتر لوگ موجود ہیں تو میری کیا ضرورت ہے؟ یہ بھی امامؒ کا ایک طرزِ انکسار تھا۔ ورنہ جہاں تک اس اعلیٰ منصب کا تعلق ہے تو حجازِ مقدس میں اس کارِ عظیم کے لیے حضرت امام شافعیؒ بہترین شخص تھے۔ اگرچہ امامؒ بیشتر مواقع پر امامت سے انکار کر دیتے تھے لیکن کبھی کبھی ایسے لمحات بھی آجاتے تھے کہ حاضرینِ مسجد کا اصرار بہت زیادہ شدت اختیار کر جاتا تھا اور پھر امامؒ مجبور ہو جاتے تھے۔

وہ عجیب منظر ہوتا تھا جب حضرت امام شافعیؒ نماز میں قران کریم کی تلاوت فرماتے تھے۔ جیسے ہی آپ کی پرسوز آواز بلند ہوتی۔ انسانی خیالات جو بشری تقاضوں کے سبب کبھی کبھی منتشر ہو جاتے ہیں۔ ایک لمحے میں یکسوئی حاصل کر لیتے اور سماعتیں امامؒ کی قرات پر مرکوز ہو جاتیں۔ پھر وہ آواز جو خدا کا ایک عطیہ خاص تھی آہستہ آہستہ دلوں میں اترنے لگتی۔ یہاں تک کہ قلب کی تمام سختیاں ختم ہو جاتیں اور اس قدر گداز پیدا ہوتا کہ سارے مقتدی رونے لگے۔ بعض نمازی اتنے مضطرب ہو جاتے کہ ان کی ہچکیاں سنائی دینے لگتیں۔ خود امامؒ کی آنکھیں بھی اشکبار ہوتیں' بعد میں کہنے والے کہتے کہ نماز کے دوران ایسی حضوری تو فرزندِ قریش کی امامت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ بے شک امام شافعیؒ ایسے ہی امام تھے مگر انسانی جذبات کا وہ لاوا جو آنکھوں کے ذریعے بہنے لگتا تھا' اس کے پگھلنے کا تعلق امامؒ کے حسنِ قرات سے تھا۔ وہ امام کی پُرسوز آواز ہی تھی جسے سن کر سنگ و آہن بھی رقیق سیال کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ پتھروں کو موم کر دینا امامؒ کی قرات کا کمال تھا۔ حضرت داؤدؑ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب آپ زبورِ مقدس کی تلاوت کیا کرتے تھے تو بہتے ہوئے دریا ساکت ہو جاتے تھے یہاں تک کہ نباتات و جمادات بھی حضرت داؤد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے تھے جس خدا نے اپنے برگزیدہ پیغمبرؑ کو ایسا اثر انگیز و بے مثال لحن بخشا تھا' وہی خدا محمد بن ادریس شافعیؒ کا بھی خالق تھا اور اسی خدا نے فرزندِ قریش کو ایسی پرسوز آواز بخشی تھی کہ جسے سن کر لوگوں کو اپنے دلوں پر قابو نہیں رہتا تھا اور وہ بے اختیار گریہ وزاری کرنے لگتے تھے۔ حضرت امام شافعیؒ کی قرات کا سلسلہ چار استادوں کے بعد مشہور صحابی حضرت ابی بن کعبؓ تک پہنچ جاتا ہے۔

تاریخ بغداد میں حضرت امام شافعیؒ کے ایک ہم عصر بزرگ کا ایک ایسا بیان موجود ہے جس سے فرزندِ قریش کے حسنِ قرات کا ایک عجیب و غریب پہلو سامنے آتا ہے۔ وہ بزرگ فرماتے ہیں۔ ”جب ہمارے سینوں میں یہ خواہش بیدار ہوتی کہ ہمارے دل پگھل جائیں اور آنکھیں اشک برسانے لگیں تو



ہم اپنے ساتھیوں سے کہتے۔ ”آؤ اس مطلبی نوجوان (شافعیؒ) کی طرف چلیں اور اس سے قرآن سنیں۔“ پھر ہم شافعیؒ کے پاس آتے اور ان سے درخواست کرتے کہ وہ قرآن کریم کی تلاوت کریں۔ شروع میں شافعیؒ ہماری بات فوراً مان لیا کرتے تھے مگر بعد میں انہیں معلوم ہو جاتا تھا کہ ہم کس مقصد کے لیے ان کے پاس آئے تھے؟ شافعیؒ نمائش کو سخت ناپسند کرتے تھے اس لیے ہماری درخواست کو ماننے میں انہیں تامل ہوتا تھا جب ہم انہیں گریزاں پاتے تو التجائیں کرنے لگتے۔ یہاں تک کہ شافعیؒ آمادہ ہو جاتے۔ پھر ان کی دلوں میں شگاف ڈالنے والی آواز بلند ہوتی۔ ایک تو وہ کلام جو پہاڑوں پر نازل کر دیا جاتا تو پہاڑ خوف سے ریزہ ریزہ ہو جاتے' دوسرے شافعیؒ کا لہجہ و آہنگ بس دلوں پر قیامت سی گزر جاتی۔ لوگ اپنی زندگی کا تمام کاروبار چھوڑ کر ان کے گرد جمع ہو جاتے۔ شافعیؒ آیاتِ مقدسہ کی تلاوت کرتے رہتے اور پھر وہ منزل آجاتی جب حاضرین کا اضطراب حد سے گزر جاتا' آنکھیں برسنے لگتیں اور ہر طرف ایسا شور برپا ہوتا جیسے لوگ ماتم کر رہے ہیں۔ شافعیؒ خود بھی مسلسل روتے رہتے جب مکے کی فضائیں آہ و فغاں سے معمور ہو جاتیں اور گریہ وزاری انتہائی شدت اختیار کر جاتی تو شافعیؒ خاموش ہو جاتے۔“

یہ کیسی صدا تھی؟ کیا آہنگ تھا؟ کیسا سوز تھا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے کیا علم حدیث، کیا فقہ، کیا تحریر' کیا تقریر امامؒ کی تو ذات ہی مجمع الصفات تھی۔ کس کے ذہن کی رسائی جو امامؒ کے قدموں سے اٹھنے والے غبار تک بھی پہنچ سکے کس کے قلم کو یارا ہے کہ وہ امامؒ کی شان میں کوئی قصیدہ تحریر کر سکے۔ کوئی کیا لکھے گا اور کیوں کر لکھے گا؟ تعصب و حسد کی آگ انسانی دل و دماغ کو جلا کر خاکستر کر دے تو الگ بات ہے ورنہ کوئی کسی بھی کوچہ علم میں چلا جائے وہ ہمیشہ فرزندِ قریش کا اسیر رہے گا۔ کوئی اپنی سماعتوں کے دروازے کسی بھی انداز میں مقفل کرے مگر امام شافعیؒ کی آواز ہر بندش سے گزر جائے گی۔

”تم میرے بعد اہلِ حدیث میں ایسا کوئی دوسرا نہیں پاؤ گے۔“

وہ کون ہے؟

جو دو سال کی عمر میں سینے پر داغِ یتیمی سجا کر گھر سے بے گھر ہوا
افلاس کی آغوش میں تربیت پائی دنیا کی ہر آسائش سے بے نیاز و بے خبر ہوا۔
شرر کی مانند اڑتے ہوئے خیالوں کو زنجیر کیا
ہڈیوں پر اپنا سبق تحریر کیا
پھر تیرہ سال کی عمر میں مسندِ علم پر نمودار ہوا

ذہن ایسا کہ مسائل کا مشکل کشا قرار پایا

حافظہ ایسا کہ اس کا دماغ کتب خانہ عظیم کہلایا

شاگرد ایسا کہ امام مالکؒ نے اپنا محبوب سمجھا

استاد ایسا کہ امام احمد بن حنبلؒ نے مخدوم کہہ کر پکارا

محدث ایسا کہ آنے والوں کے لیے معتبر ٹھہرا

فقیہہ ایسا کہ ہو گوشۂ زمیں اس کا حلقہ اثر ٹھہرا

خوش الحان ایسا کہ اس کی قرات سن کر دریا ساکت، شجر و حجر خاموش

اہلِ زبان ایسا کہ اس کے حضور عرب کے تمام ادیب و شاعر و اہل ہنر خاموش

شجاع ایسا کہ اس کے وجود سے مقتل کی زمیں لرزہ براندم

جری ایسا کہ دربارِ خلافت میں شمشیرِ بے نیام

صاحبِ عقل بھی، اہلِ دل بھی

مسافر بھی، منزل بھی

حاکم بھی، سپاہی بھی

گواہ بھی، گواہی بھی

ہاں وہ فرزندِ قریش ہی ہیں...... امام شافعیؒ کے سوا دوسرا کون ہو سکتا ہے؟ کوئی بھی نہیں

خود حضرت امام شافعیؒ اپنے بارے میں فرمایا کرتے تھے ''مجھے دو چیزوں کا بہت شوق ہے ایک علم کا اور دوسرے تیراندازی کا، میں نے تیراندازی کے فن میں تو واقعتاً کمال حاصل کر لیا۔ باقی رہا علم......''

اتنا کہہ کر امامؒ خاموش ہو جاتے تھے اور چہرے پر کچھ ایسا رنگ ابھر آتا تھا جیسے آپ کو اپنی محرومی یا تشنگی کا شدید احساس ہو۔ حاضرینِ مجلس اس موقعے پر مضطرب ہو جاتے اور نہایت جذباتی لہجے میں پکار اٹھتے۔

''خدا کی قسم! آپ کا علم تیراندازی کے فن سے بھی زیادہ کامل ہے۔''

حضرت امام شافعیؒ نے تیراندازی کا فن بہت نوعمری میں سیکھ لیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب امام نو دس سال کی عمر میں بادیہ پہنچ کر قبیلہ ہذیل سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ابنِ کثیر کی روایت ہے کہ حضرت امام شافعیؒ نے اہلِ بادیہ کی وہ تمام عادتیں اختیار کر لی تھیں۔ جو اپنی فطرت کے اعتبار سے بہتر نظر آتی تھیں۔ اسی زمانے میں امامؒ نے تیراندازی سیکھنی شروع کی یہاں تک کہ اس فن میں کمال حاصل



کر لیا۔

امام مزنیؒ کا بیان ہے کہ حضرت امام شافعیؒ صرف تیراندازی کے فن ہی میں یکتائے روزگار نہیں تھے بلکہ آپ کو شہسواری میں بھی مہارت حاصل تھی۔ اگر آپ کبھی گھوڑے پر سوار ہوتے اور کسی سے کوئی مقابلہ درپیش ہوتا تو پھر بڑے سے بڑا شہسوار بھی آپ کی گرد کو نہیں پا سکتا تھا۔ کبھی کبھی لوگ آزمائش کے لیے امامؒ کو سرکش اور منہ زور گھوڑے دیکر کہا کرتے تھے کہ اگر آپ ان پر قابو حاصل کر لیں تو ہم آپ کی شہسواری کے دل سے قائل ہو جائیں...... ایسے جانور فطرتاً آزاد اور جنگلی ہوتے تھے۔ ان کی وحشت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ اپنی پشت پر کسی آدم زاد کا بوجھ برداشت کرنا تو بڑی بات ہے انسانی سایہ دیکھ کر ہی بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ ایسے وحشی گھوڑوں کو مضبوط رسیوں سے باندھ کر لایا جاتا اور پھر امامؒ سے کہا جاتا کہ اپنی شہسواری کا ثبوت پیش کریں۔ امامؒ خاموشی سے آگے بڑھتے اور چند لمحوں بعد دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے ایک عجیب منظر ہوتا، وہ گھوڑے جو انسانی قربت کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے تھے اس طرح سر جھکا دیتے جیسے برسوں سے امامؒ کے اطاعت گزار ہوں، شہسواری سے بھرپور واقفیت رکھنے والے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس فن میں وہی شخص ماہر کہلا سکتا ہے جسے نہ صرف جانور کی نفسیات پر عبور حاصل ہو بلکہ وہ خود بھی نہایت شجاع ہو اور برق کی مانند تیز رفتار اور متحرک نظر آتا ہو۔ ان ہی صفات کا حامل انسان، سرکش گھوڑوں کو زیر کر سکتا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ میں یہ تمام خوبیاں موجود تھیں اس لیے آپ کے قریب آتے ہی بڑے سے بڑا منہ زور گھوڑا بھی اپنی وحشت کھو بیٹھتا تھا اور تماشائی بے اختیار چیخ اٹھتے تھے۔

''شہسواری میں بھی امام شافعیؒ کا کوئی حریف نہیں۔''

یہ امام ہی کی ذہانت کا ہلکا سا عکس تھا کہ آپ نے تیراندازی کے موضوع پر دنیا میں سب سے پہلے ایک باقاعدہ کتاب ''السبق الرمی'' تحریر فرمائی۔

حضرت امام شافعیؒ کو ان ہی بے شمار صفات کو دیکھ کر داؤد ظاہری نے کہا تھا ''شافعیؒ کی ذات ایسے گوناگوں فضائل کا مجموعہ تھی جو کسی دوسرے شخص کو میسر نہ تھے۔ شرفِ نسب، صحت، اعتقاد، سخاوتِ نفس، حدیثِ صحیح و سقیم اور ناسخ و منسوخ کی معرفت حفظ کتاب و سنت و سیرت خلفا اور حسنِ تصنیف ان کی جلوہ سامانیوں کے مختلف پہلو تھے۔''

ایک داؤد ظاہری پر کیا منحصر ہے اگر آنکھیں کھول کر دیکھا جائے تو سارا عالم ہی بارگاہِ شافعیؒ میں دست بستہ نظر آتا ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں ''اگر حضرت امام شافعیؒ پیدا نہ ہوتے تو ہم لوگ علم کے دروازے ہی پر کھڑے رہ جاتے' یہاں تک کہ مخلوقِ خدا پر فقہ کا در ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا۔ امامؒ اس دور میں اسلام کے سب سے بڑے محسن ہیں۔ وہ فقہ معانی اور علوم لغت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔'' ایک اور موقع پر حضرت احمد بن حنبلؒ نے فرمایا ''تیس سال سے میری کوئی رات ایسی نہیں گزری جس رات میں نے حضرت امام شافعیؒ کے لیے دعا نہ کی ہو۔''

زعفرانیؒ کا بیان ہے کہ جس طرح علمائے یہود میں عبداللہ بن سلام منفرد تھے اسی طرح علمائے اسلام میں امام شافعیؒ ممتاز ہیں۔

امام ابوداؤد کہتے ہیں۔ ''میں نے امام احمد بن حنبلؒ کو حضرت امام شافعیؒ سے زیادہ کسی اور شخص کی طرف مائل ہوتے نہیں دیکھا۔''

ابوعبیدؒ فرزندِ قریش کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام شافعیؒ سے زیادہ کسی شخص کو صاحب عمل نہیں پایا۔

ابو ثورؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک امام شافعیؒ کا کیا مرتبہ ہے؟ جواب میں آپ نے فرمایا ''جو شخص یہ کہے میں نے فصاحتِ بیان اور علم و فضل میں امام شافعیؒ سے بڑھ کر کسی شخص کو..... دیکھا ہے وہ اپنے قول میں جھوٹا ہے۔''

حضرت امام شافعیؒ کے ایک شاگرد کا بیان ہے ''جب امامؒ کتابِ الٰہی کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ نے اپنی آنکھوں سے قرآن کریم کو نازل ہوتے دیکھا ہے۔''

مشہور صوفی بزرگ حضرت بلال خواصؒ فرماتے ہیں ''ایک بار میری ملاقات حضرت خضرؑ سے ہوئی میں نے ان سے پوچھا کہ امام شافعیؒ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

جواباً حضرت خضرؑ نے فرمایا۔ شافعیؒ اوتاد کے درجے پر ہیں جس وقت وہ بچے تھے انہیں ہزار سالہ خلعت پہنادی گئی تھی۔'' (واضح رہے کہ اوتاد اور ہزار سالہ خلعت تصوف کی مشہور اصطلاحات ہیں)

حضرت عبداللہ انصاریؒ ایک موقع پر فرماتے ہیں ''اگرچہ میں نے فقہ میں شافعیؒ مسلک اختیار نہیں



کیا ہے لیکن پھر بھی امامؒ کو دوست رکھتا ہوں' اس لیے کہ میں نے جس مقام پر بھی نظر کی شافعیؒ کو اپنے سے آگے ہی پایا۔''

حضرت امام شافعیؒ کی ذاتِ جلیل پر ان بزرگوں کی گواہیاں ایک علیحدہ حیثیت رکھتی ہیں۔ بالفرض اگر یہ شہادتیں موجود نہ ہوتیں اور زمانے کا گرد و غبار انہیں گم کر دیتا تب بھی امامؒ کے درجاتِ عالیہ میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔ امام شافعیؒ تو وہ تھے کہ جن کی عظمت پر خود رسالت مآب ﷺ نے گواہی دی تھی۔ اور سرورِ کونین کی شہادت وہ شہادت ہے کہ جس کے بعد کسی شہادت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

فرزندِ قریش حضرت امام شافعیؒ کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے پیغمبرِ اسلام' رسالتِ پناہ احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا تھا ''اے اللہ! قریش کو ہدایت دے' بے شک! قریش کا ایک عالم تمام روئے زمین کو علم سے بھر دے گا۔''

حافظ ابونعیمؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں قریش کے جس عالم کی پیش گوئی کی گئی ہے وہ حضرت امام شافعیؒ ہیں۔ آئمہ کی ایک جماعت نے بھی پوری تحقیق اور ذمے داری سے یہ بات کہی ہے کہ رسول کریمؐ کے اس قول کے مطابق عالمِ قریش حضرت امام شافعیؒ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ خود حضرت امام احمد بن حنبلؒ جیسے عظیم محدث نے بھی فرمایا ہے کہ یہ عالمِ قریش حضرت امام شافعیؒ ہیں اور آپ ہی کی ذات سے علم کو تمام دنیا میں فروغ حاصل ہوا ہے مسلک کے اختلافات سے قطع نظر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آج دنیا کے اکثر علاقوں میں فقہ شافعیؒ پڑھائی جاتی ہے۔ امام شافعیؒ کے اجتہاد سے علم و حکمت کے جو چشمے پھوٹے تھے ان سے آج تک رسالت مآب ﷺ کی پوری امت سیراب ہو رہی ہے۔ مسلک شافعیؒ نے لاتعداد محدث، فقیہہ اور مفسر پیدا کیے جن کی علمی تحقیقات اور فکری کاوشوں سے بے شمار انسان استفادہ کر رہے ہیں۔

لاریب امام شافعیؒ ایسے ہی تھے کہ آپ نے دنیا کے گوشے گوشے کو علم سے بھر دیا اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ دنیا میں جس کی آمد کی خبر حدیث کے ذریعے دی گئی ہو اسے، اتنا ہی محترم ہونا چاہئے تھا۔ انسانی عقل قدرت کے رازوں کو سمجھنے سے عاجز ہے مگر پھر بھی خدا اپنے بندوں کے لیے نشانیاں مسلسل ظاہر کرتا رہتا ہے۔ اہلِ دل اچھی طرح جانتے ہیں کہ محدثین کرام کی جماعت میں حضرت امام مالک بن انسؒ کی طرح کوئی عاشقِ رسول ﷺ نہیں تھا۔ اس لیے امام شافعیؒ کو انتہائی بے سروسامانی کے باوجود امام مدینہؒ تک پہنچایا گیا۔ پھر امام مالکؒ نے فرزندِ قریش کو گلے سے لگا کر عشق کی وہ آگ اپنے وارث کو منتقل کر دی جس

سے یہ کائنات روشن ہے حضرت امام شافعیؒ کی زبان کا سوز بے سبب نہیں تھا۔ جب تک روح گہرائیوں میں عشقِ شرر فشاں نہ ہو اس وقت تک الفاظ آتشیں قبا نہیں پہن سکتے۔

زباں سے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل
دل ونگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

امامؒ کی صدائے اثر انگیز جسے سن کر انسانوں کی آنکھیں چھلک پڑتی تھیں وہ سینے میں دبی ہوئی اسی آگ کا نتیجہ تھی جو مختلف مرحلوں سے گزرتی ہوئی امام مدینہؒ کی آتشِ دل تک پہنچتی تھی پھر یہ آگ فرزندِ قریش کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ یہاں تک کہ امام شافعیؒ عشقِ رسول ﷺ سے سرشار ہو گئے کوئی کچھ بھی کہے مگر سچ تو یہ ہے کہ عشقِ رسول کے بغیر ایمان وعقائد کی کوئی داستان مکمل نہیں ہوتی نہ اس کا کوئی آغاز ہوتا ہے اور نہ کوئی انجام۔ بقول علامہ اقبالؒ

ے عشق اگر ترا نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

عشقِ رسول ﷺ ہی شافعیؒ کی نماز کا امام تھا۔ اس لیے آپ کا قیام بھی حضوری تھا اور سجود بھی۔ عشقِ رسول ﷺ ہی نے امامؒ کے دل ونگاہ پر ہر شے کو بے حجاب کر دیا تھا اور یہ عشقِ رسول ﷺ ہی کا اثر تھا کہ جس نماز کی امامت شافعیؒ کرتے تھے اس نماز میں ایک عام مقتدی کو بھی حضوری کا شرف حاصل ہو جاتا تھا۔ اس سے بہتر قیام اور کیا ہوگا کہ بندہ، خدا کے سامنے کھڑے ہو کر گریہ وزاری کرنے لگے اور اس سے اعلیٰ مقامِ سجود کیا ہوگا کہ اللہ کی کبریائی بیان کرتے وقت زمین انسانی آنسوؤں سے تر ہو جائے۔ یہ امامؒ کے عشقِ سوزاں ہی کا اثر تھا کہ وہ مسجد ہو یا مجلس، حاضرینِ عالم وارفتگی میں ہر شے سے بے نیاز ہو کر گریباں چاک کر لیا کرتے تھے اور اس طرح شور فغاں برپا ہو جاتا تھا جیسے اہلِ ایمان کو دنیا میں رونے کے سوا کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہے۔

یہ عشقِ رسول ﷺ ہی تھا کہ جس نے امام شافعیؒ کو رسالت کے ہر تعلق اور ہر حوالے سے عشق کرنا سکھا دیا تھا۔ ایک بار حضرت امام شافعیؒ درس دے رہے تھے' اس وقت مجلس میں عام طالبِ علموں کے علاوہ کئی نامور محدثین وفقیہہ بھی موجود تھے۔ امامؒ کی زبان سے علم وحکمت کا آبشار جاری تھا اور اہلِ مجلس اپنی سانسیں روکے ہوئے فرزندِ قریش کا درس سن رہے تھے۔ اچانک امام شافعیؒ خاموش ہو گئے اور ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ امامؒ اپنی نشست پر کھڑے ہو گئے تھے اور آپ کی



ظاہری حالت نہایت مودبانہ نظر آ رہی تھی۔ یہ ایک لمحاتی عمل تھا۔ چند ساعتیں گزرنے کے بعد امامؒ دوبارہ بیٹھ گئے اور حاضرینِ امامؒ کے اس تغیر کا سبب سمجھنے سے قاصر رہے۔ درس ایک بار پھر جاری ہو گیا۔ امامؒ کی شعلہ بیانی سے لوگوں کے دل ودماغ جلنے لگے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ امامؒ دوسری مرتبہ اپنی نشست پر کھڑے ہو گئے یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ حاضرین میں سے ایک ایک فرد اپنی جگہ چونک اٹھا مگر کسی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ امامؒ سے اس اضطراری عمل کی وجہ دریافت کر سکے چند لمحے گزرنے کے بعد امامؒ دوبارہ تشریف فرما ہوئے اور حسبِ معمول درس دینے لگے پھر حضرت امام شافعیؒ نے وقفے وقفے سے یہی عمل دس بار دہرایا۔ آپ اچانک کھڑے ہو جاتے اور کچھ دیر بعد اس طرح بیٹھ جاتے کہ آپ کے چہرہ مبارک پر عجیب وغریب کیفیت نمایاں ہو جاتی۔ اہلِ مجلس کے ذہن منتشر ہو چکے تھے لیکن کوئی شخص بھی آدابِ درس کے خلاف درمیان میں بول نہیں سکتا تھا۔ شرکائے مجلس نے اپنی زندگی میں پہلی بار یہ انقلاب دیکھا تھا۔ ورنہ امام شافعیؒ کی تو یہ عادت تھی کہ جب آپ تقریر شروع کرتے تو مسلسل کئی گھنٹے بولتے رہتے۔ پھر یہ کیسی تبدیلی تھی؟ امامؒ بار بار کیوں اٹھتے تھے؟ چند لمحوں کے لیے آپ کی ظاہری حالت کیوں بدل جاتی تھی؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جو ہر ذہن کی سطح پر ابھر رہا تھا مگر جواب نامعلوم ...... حاضرین زیادہ سے زیادہ بس اتنا سمجھ سکے تھے کہ امامؒ کسی اندرونی کرب یا تکلیف کا شکار تھے جسے آپ اہلِ مجلس پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔

آخر درس ختم ہوا تو حاضرین کی قوتِ برداشت جواب دے گئی' ایک شاگرد نے برسرِ مجلس اٹھ کر کہا "امامؒ آپ کی طبیعت تو ناساز نہیں؟" شاگرد کے لہجے سے دلی اضطراب نمایاں تھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ میں پوری طرح صحت مند ہوں۔" حضرت امام شافعیؒ نے اس طرح جواب دیا کہ آپ کے الفاظ سے شگفتگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"پھر یہ تغیر کیسا تھا؟ آپ کے چہرے کا رنگ کیوں بدل جاتا تھا؟" شاگرد، امام کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا وہ روز وشب کی خدمت گزاری کے بعد امامؒ کے مزاج سے آشنا ہو چکا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر دل پر قیامت بھی گزر جائے تو امامؒ کی غیرتِ اظہارِ حال کو گوارا نہیں کرتی...... "ہم نے آپ کو کبھی اس حالت میں نہیں پایا' یہ اضطراب بے سبب نہیں تھا۔" شاگرد اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا حدودِ ادب نے اسے خاموش کر دیا تھا۔

امامؒ نے اہلِ مجلس پر نظر ڈالی۔ فرزندِ قریش کے جلالِ معرفت نے لوگوں کے ہونٹوں پر مہرِ سکوت

ثبت کردی تھی مگر آنکھوں میں وہی ایک سوال تھا کہ آخر یہ سب کچھ ہوا کیوں؟ حضرت امام شافعیؒ نے جب انسانی فطرت کو بہت زیادہ متجسس پایا تو فرمانے لگے"لوگو! ہر غلام پر فرض ہے کہ وہ اپنے آقا کا احترام کرے اگر کسی نفس کی سرکشی ان قوانین کو پامال کر دیتی ہے تو پھر غلام حلقۂ ادب سے خارج ہو جاتا ہے خدا کی زمین بہت وسیع ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو کہیں گم کر دے۔ غلام تو اسی وقت تک غلام رہتا ہے جب تک وہ آقا کے احترام کی زنجیروں میں جکڑا رہے محمد بن ادریس شافعیؒ بھی سرورِ کونینؐ کا غلامِ ازلی ہے۔" امام ایک عجیب عالمِ جذب میں بول رہے تھے۔ یہاں تک کہ شدتِ جذبات سے آپ کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں...... "تم نے نہیں دیکھا کہ درس کے دوران ایک علوی زادہ میرے سامنے سے گزر جاتا تھا۔ پھر شافعیؒ کی کیا مجال کہ وہ اس کے احترام میں کھڑا نہ ہو۔" واقعہ یہ تھا کہ حضرت علیؓ کے خاندان کا ایک بچہ امام شافعیؒ کی مجلسِ درس کے سامنے اپنے کھیل میں مصروف تھا جب وہ کھیلتا ہوا عین امامؒ کے سامنے آتا تو آپ فرطِ ادب سے کھڑے ہو جاتے۔ پھر جب وہ بچہ امامؒ کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو آپ بیٹھ جاتے اور دوبارہ درس دینے لگتے اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ وہ علوی زادہ دس مرتبہ امام شافعیؒ کے سامنے سے گزرا اور امامؒ ہر بار بچے کے احترام میں اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے واقعتاً کوئی غلام استادہ ہو اپنی اسی جذباتی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے امامؒ نے فرمایا.............."اگر وہ فرزندِ سادات سو مرتبہ میرے سامنے سے گزرتا تو میں اسی طرح دست بستہ کھڑا ہو جاتا۔ یہاں تک کہ دن تمام ہو جاتا اور پوری رات ختم ہو جاتی۔ شافعیؒ کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک علوی زادہ اس کے روبرو ہو اور وہ اپنی نشست پر بیٹھا رہے۔ مجھے اپنے آقا رسالت مآب ﷺ سے شرم آتی ہے۔"

اسی عشقِ رسولؐ کے باعث کچھ متعصب اور تنگ نظر افراد نے حضرت امام شافعیؒ کو بڑے آزار پہنچائے تھے جو لوگ امام کی بے پناہ شہرت اور علمی مرتبے سے حسد رکھتے تھے انہوں نے علوی زادے کے احترام کو بنیاد بنا کر بڑی خوفناک جارحیت کا مظاہرہ کیا۔ خاندانِ سادات سے محبت ایک خاص قلبی کیفیت کا نام ہے جس سے ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق دوچار ہوتا ہے اور پھر اسی کیفیت کو اپنے عمل سے ظاہر کرتا ہے حضرت امام شافعیؒ بھی فطری طور پر اسی عشق کے اسیر تھے اور جب ثبوتِ عشق کی ساعت آئی تو امام نے پوری سچائی اور بے باکی کے ساتھ اپنے جذبات کو عمل کا لباس پہنا دیا' مخالفین بہت دن سے کسی موقعے کی جستجو میں تھے۔ اور ایسا بہانہ تلاش کر رہے تھے جس سے ہنگامہ آرائی کا جواز پیدا ہو سکے قدرت کا یہ عجیب دستور ہے کہ وہ کج رو انسانوں کے ایسے مواقع فراہم کرتی ہے جس سے ان کے دلوں



کی ٹیڑھ کو دنیا کے سامنے بے نقاب کیا جا سکے۔ حضرت امام شافعیؒ کے مخالفین بھی آزمائش کے اسی آفاقی اصول سے گزارے گئے ان لوگوں نے ایک رسمِ عشق کی نفی کرنے کے لیے امامؒ کے پورے کردار و علم کو پسِ پشت ڈال دیا۔ پھر سینوں میں پوشیدہ جذبات چہروں پر بکھر گئے اور زبانیں بے لگام ہو گئیں علم کے وارثوں نے ادب کی تمام قیود کو پامال کر ڈالا اور بے احتیاطی کی آخری حد کو چھو لیا۔

بڑی بے رحمی کے ساتھ کہا گیا کہ امام شافعی "رافضی" ہیں۔ یہ ایک خوفناک بہتان تھا' یہ ایک ہولناک تہمت تھی۔ مخالفین اپنے ہوش میں نہیں رہے تھے اور امام شافعیؒ جیسے مردِ جلیل کے خلاف ایک ایسا طوفان کھڑا کر دیا گیا تھا جس کی بنیادیں حسد و تعصب کے خمیر سے اٹھائی گئی تھیں۔ الزام تراشی کرنے والوں کا خیال تھا کہ امامؒ اس تشہیر سے خوفزدہ ہو جائیں گے مگر انہیں فرزندِ قریش کی فطرتِ بے باکی کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ امام شافعیؒ تو وہ تھے کہ ہلاکت کا اندیشہ بھی آپ کو دل کی بات کہنے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ اگر صدائے حق بلند کرنے کے لیے امامؒ کو وادئ مرگ سے بھی گزرنا پڑتا تو آپ اس سبک رفتاری کے ساتھ گزر جاتے کہ عقلِ انسانی ٹھوکریں کھاتی رہتی اور فہم و ادراک سوچتے سوچتے عاجز آ جاتے کہ یہ کون جانباز تھا جو اس طرح نذرانۂ جاں پیش کر کے چلا گیا۔

امام شافعیؒ نے اتمامِ حجت کے لیے کچھ دن تک ان تہمتوں کو برداشت کیا اور بہتان طرازوں کے حق میں دعائے خیر کی' خدا انہیں ہدایت دے مگر جب مخالفین کے دل کثافتوں سے بھر گئے اور زبانیں نفرتوں کے زہر سے نیلگوں ہو گئیں تو امامؒ نے بھی اپنے جذبوں کے اظہار میں شدت اختیار کر لی۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری نے اپنی کتاب 'آثارِ امام شافعیؒ' میں فرزندِ قریش کا یہ شعر درج کیا ہے جس کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔

"اگر آلِ محمد کی محبت، رفض ہے تو جن و بشر کو چاہیے کہ میرے رافضی ہونے کی گواہی دیں۔"

بدخواہوں کا خیال تھا کہ مخالفت کے اس سیلاب سے گھبرا کر امامؒ اپنی شخصیت کو بچانے کی کوشش کریں گے اور پھر اپنے نظریات کی تاویلات پیش کرتے کرتے تھک جائیں گے مگر امام شافعیؒ نے فرمایا۔ "ہاں! میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فضل کا بھی معترف ہوں۔" اس اعلان کے بعد مخالفت کا ایک اور طوفان اٹھ کھڑا ہوا جو لوگ آلِ محمدؐ کی محبت کے اعتراف پر امامؒ کو رافضی کہہ رہے تھے وہی اب آپ کو ناصبی (اہلِ بیت نبوی کا دشمن) کہہ کر پکارنے لگے۔ اہلِ دنیا کی عجیب روش تھی۔ کوئی زبان خوفِ خدا سے نہیں لڑکھڑائی اور کسی دل پر خشیتِ الٰہی سے لرزہ طاری نہیں ہوا۔ بس لوگ مذہب و انسانیت کے

تمام آداب سے بے نیاز ہو کر بولتے رہے۔ انہیں گمان تھا کہ امام طنز و اعتراض کی اس بارش سے بچنے کے لیے کوئی سائبان تلاش کریں گے مگر یہ مخالفین کی خام خیالی تھی۔ امامؒ نے اپنے اسی پُرسوز پر جلال لہجے میں علی الاعلان کہتے رہے۔

"میں ابوبکر صدیقؓ سے بھی محبت کرتا ہوں اور علیؓ ابن ابی طالب سے بھی۔" اور سچ تو یہ ہے کہ امام شافعیؒ نے ہر اس شخص سے محبت کی جس سے رسولِ کریمؐ محبت فرماتے تھے۔ دراصل اسی کو عشقِ صادق کہتے ہیں کہ محبوب کی ہر نسبت، ہر تعلق اور ہر حوالے سے عشق کیا جائے۔

حضرت امام شافعیؒ عشقِ رسولؐ میں اس قدر وارفتہ تھے کہ سرورِ کونینؐ کا نام سن کر ہی لرز جاتے تھے ایک بار آپ کی مجلسِ درس آراستہ تھی حاضرین میں سے ایک شخص امامؒ سے کوئی مسئلہ دریافت کر رہا تھا اور آپ اسے حدیث کے نکات و رموز سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے اچانک اس شخص نے دوران گفتگو تیز آواز میں کہا۔

"امامؒ! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، رسول کریم ﷺ سے تو اس طرح روایت ہے......"

یہ سنتے ہی حضرت امام شافعیؒ کانپنے لگے، جسم کی لرزش اس حد تک بڑھی کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور حالت اتنی متغیر ہو گئی کہ امامؒ برسوں کے بیمار نظر آنے لگے۔ پوری مجلس کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ امامؒ اس شخص کی بات کے جواب میں کچھ کہنا چاہتے تھے مگر زبان آپ کے ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ انتہائی کوشش کے باوجود صرف امامؒ کے ہونٹ کانپ کر رہ جاتے تھے بہت دیر تک یہی حال رہا پھر امامؒ نے بمشکل تمام اپنے شکستہ اعصاب پر قابو پایا اور اہلِ مجلس کو مخاطب کر تے ہوئے نہایت رقت آمیز لہجے میں یہ اشعار پڑھے۔

"کون زمین مجھے پناہ دے گی
اور کون آسمان مجھے اپنے زیرِ سایہ رکھے گا
اگر میرے سامنے رسول ﷺ کی حدیث بیان کی جائے
اور میں یہ نہ کہوں کہ ہاں بے شک! میرے سر آنکھوں پر۔"

حضرت امام شافعیؒ کے شاگرد ربیع بن سلیمانؒ کی روایت ہے میں نے اکثر امامؒ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ "دنیا میں صرف قول وہی ہے جو رسالتِ مآب ﷺ کا قول ہے معاذ اللہ! شافعیؒ کون ہے جو قولِ رسولؐ میں زیر زبر کا بھی فرق کر دے۔ پھر اس کا دنیا و آخرت میں کہاں ٹھکانہ ہوگا۔"



یہ عشقِ رسولؐ ہی تھا کہ جس کے سبب حضرت امام شافعیؒ اپنے شاگردوں کا بھی احترام کرتے تھے۔ آپ نے بارہا بر سرِ مجلس حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو مخاطب کر کے فرمایا "احمد! احادیث میں تمہاری نظر مجھ سے زیادہ ہے اگر تمہیں میرے قول کے خلاف کوئی حدیث یاد ہو تو بلا تکلف مجھے آگاہ کر دینا، تاکہ میں اپنی بات کو فوراً ترک کر دوں اور قولِ رسولؐ پر عمل پیرا ہو جاؤں۔"

یہ عشقِ رسولؐ ہی ہے جو ایک مسلمان کے کردار کی صحیح تعمیر کرتا ہے مگر کسی کے سامنے رسالتِ مآب کا مقدس عمل نہ ہو تو پھر یہ کس طرح طے ہوگا کہ حق کیا ہے اور باطل کسے کہتے ہیں؟ سرورِ کونینؐ کی سیرت اہلِ ایمان کو قانونِ الٰہی کے تابع کرتی ہے اور عشقِ رسولؐ اہلِ دل کی سرفروشی کا سبق دیتا ہے حضرت امام شافعیؒ کو عشقِ رسولؐ ہی نے جانبازی کا حوصلہ عظیم بخشا تھا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک انسان کو آگ کے دریا سے گزارا جائے اور اس کا لباس شعلوں کے اثر سے محفوظ رہے۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خدا کے فضل سے میں کبھی گناہِ کبیرہ کا مرتکب نہیں ہوا۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور کبھی غسلِ جمعہ ترک نہیں کیا۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا "خداوندِ ذوالجلال نے اپنے بندے شافعیؒ کو ہمیشہ رزقِ حلال عطا کیا۔ پوری زندگی میں میری زبان ایک لقمہ حرام کی لذت سے بھی آشنا نہیں ہوئی۔"

ایک بار حضرت امام شافعیؒ حالتِ اضطرار میں کسی لشکری کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے، بعد میں آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بے قرار ہو کر فرمانے لگے "مجھ سے یہ کیسا گناہ سرزد ہو گیا۔" پھر امامؒ نے اپنے اس گناہ کا کفارہ اس طرح ادا کیا کہ چالیس دن تک ساری ساری رات نماز میں کھڑے رہے۔ پھر فرمایا کہ میرے نفس کی سزا مکمل ہو گئی۔

ایک بار کسی رئیس نے کچھ رقم اہلِ تقویٰ میں تقسیم کرنے کے لیے مکہ معظمہ ارسال کی۔ رقم بھیجتے وقت اس امیر شخص نے یہ شرط عائد کی تھی کہ ساری دولت ان لوگوں میں مساوی طور پر بانٹ دی جائے جو اپنے کردار کے لحاظ سے نہایت متقی اور پرہیزگار ہوں اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے درویشی اختیار کر لی ہو۔ امیر کی حسبِ ہدایت منتظمین نے ان حضرات کی تلاش شروع کر دی جو اس شرط پر پورے اترتے تھے۔ بالآخر کچھ لوگ فرزندِ قریش حضرت امام شافعیؒ کے پاس بھی حاضر ہوئے۔

"امامؒ! یہ فلاں شخص کی طرف سے نذر ہے، اسے قبول فرما لیجئے۔" آنے والوں نے ادب و احترام کے ساتھ کہا۔

"یہ کس کی رقم ہے اور کس غرض سے بھیجی گئی ہے؟" حضرت امام شافعیؒ نے آنے والوں سے دریافت کیا۔

"یہ ایک ایسے شخص کی طرف سے ہے جو اہلِ تقویٰ کی مدد کرنا چاہتا ہے۔" منتظمین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رقم ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو متقی ہونے کے ساتھ ساتھ درویش بھی ہیں۔"

"پھر تم غلط مقام پر آگئے۔" امامؒ نے نہایت بے باکی سے فرمایا۔ "حدودِ حرم میں ایسے کئی افراد موجود ہیں جنہیں خداوندِ ذوالجلال نے زہد وتقویٰ بھی بخشا ہے اور درویشی کی نعمت سے بھی سرفراز کیا ہے۔ ان لوگوں کے حضور جاؤ اور درخواست کرو شاید وہ اس رقم کو قبول کر لیں اور امیر کو اس کے حسنِ نیت کا صلہ مل جائے۔"

"ہمارے نزدیک آپ متقی بھی ہیں اور درویش بھی۔" کہنے والوں نے کہا "براہِ کرم اس میں سے کچھ حصہ قبول فرمالیجیے۔"

"ہرگز نہیں......" امامؒ نے اس طرح انکار کر دیا کہ وہ لوگ آپ کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ "میں اس رقم کو کیسے قبول کر سکتا ہوں جب کہ میرا شمار اہلِ تقویٰ میں نہیں ہوتا اور درویشی بھی میرا شعار نہیں پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں تمھاری بات مان لوں۔"

"خدا کی قسم! اگر آپ متقی نہیں ہیں تو پھر ہم تقویٰ کی مثال کہاں ڈھونڈیں؟ اور اگر آپ درویش نہیں ہیں تو پھر ہم کسے درویش کہہ کر پکاریں؟" آنے والے بہت دیر تک التجائیں کرتے رہے مگر ان کی درخواست پر ایک لمحے کے لیے بھی توجہ نہیں دی۔ یہاں تک کہ وہ لوگ مایوس ہو کر امامؒ کی مجلس سے اٹھ کھڑے ہو گئے۔

جب وہ واپس جانے لگے تو امامؒ نے ایک بار پھر انہیں مخاطب کر کے فرمایا۔ "اگر میں تمہاری بات مان لوں تو پھر خدا کے وہ برگزیدہ بندے اپنے حقوق سے محروم رہ جائیں گے جو واقعتاً اہلِ تقویٰ میں سے ہیں اور انہیں درویشی کا شرف بھی حاصل ہے مجھے یہ گوارا ہے کہ تم محمد بن ادریسؒ سے خفا ہو جاؤ مگر میرے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہے کہ جب سرِ محشر شافعیؒ کو خدا کے روبرو پیش کیا جائے تو وہ حقوقِ العباد کا غاصب کہلائے خدا تمہیں تمہاری اس خوش گمانی پر اجرِ عظیم دے کہ تم نے مجھے متقی اور درویش سمجھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ شافعیؒ متقی ہے اور نہ درویش۔"



جانے والے چلے گئے اور اہلِ مجلس سوچتے رہ گئے کہ عجز وانکسار کی یہ کون سی منزل ہے؟

خوفِ خدا سے عشقِ رسولؐ پیدا ہوتا ہے اور عشقِ رسولؐ کا صلہ گدازِ قلب ہے اور گدازِ قلب انسان کو تقوے کی انتہائی منزلوں تک پہنچا دیتا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ بھی تسلیم و رضا کے ان ہی مراحل سے گزرے تھے اور پھر تصوف کی اصطلاح کے مطابق آپ کی زندگی نے قلندرانہ رنگ اختیار کر لیا تھا۔ آپ کے استادِ گرامی امام مالک بن انسؒ جب تک حیات رہے بیش بہا خلعتیں بھیجتے رہے مگر فرزندِ قریش نے کبھی ان قیمتی قباؤں کو اپنے جسم کی زینت نہیں بنایا۔ ہمیشہ درویشانہ لباس پہنتے۔ امام مدینہؒ کے وصال کے بعد خود آپ کی ذاتی شہرت نے جزیرۃ العرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا جس کے سبب عقیدت مندوں کا ہجوم قطار در قطار امامؒ کی مجلسِ درس کی طرف کھنچا چلا آتا تھا۔ اہلِ ثروت بے شمار تحائف پیش کرتے تھے لیکن کسی شخص نے امام شافعیؒ کے طرزِ زندگی کو بدلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہی معمولی غذا، وہی سادہ لباس، وہی امرائے وقت سے بے رخی، وہی آسائشِ دنیا سے بے نیازی پھر اسی ضبطِ نفس نے امامؒ کے سینے میں فقر کا شعلہ روشن کیا۔ یہ وہی فقر ہے جس کے بارے میں سرورِ کونینؐ حضور اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے۔

"الفقر فخری" (فقر ہی میرا فخر ہے) اسی فقر کی کیفیت کو علامہ اقبال نے بھی اپنے شعر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

ے اے مرے فقرِ غیور' فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعت انگریز' یا پیرہن چاک چاک

حضرت امام شافعیؒ کو بھی خلیفۂ وقت اور امرائے عرب نے قبائے زرنگار پیش کی مگر آپ نے عبائے تارتار کو اپنے جسم پر سجا لیا اور تقلیدِ رسولؐ میں کبھی قاقم وسنجاب (نہایت قیمتی کپڑے) کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

اسی فقرِ رسالتؐ کے تصور نے امامؒ کے سینے میں غیرت وخودی کی آگ روشن کی۔ یہاں تک کہ آپ نے دنیا کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ فرزندِ قریش کی زندگی میں بے شمار مواقع ایسے آئے جب دنیا کو آراستہ کر کے آپ کے سامنے پیش کیا گیا مگر امام شافعیؒ ہمیشہ یہی فرماتے رہے۔

"اگر دنیا ایک روٹی کے عوض بھی ملے تو مہنگی ہے۔ دوسروں کو علم سکھانا فخر ہے کوئی اس بات پر فخر نہ کرے کہ فلاں شخص اپنے پیچھے اتنا مال چھوڑ گیا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کتنی عبادت کر کے دنیا سے رخصت

ہوا ہے۔''

اسی فقرِ غیور نے امام شافعیؒ کو 'صادق القول' کے درجۂ عظیم تک پہنچایا تھا۔ آپ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی جھوٹی یا سچی قسم نہیں کھائی۔ امام یحییٰ بن معینؒ اپنے وقت کے عظیم محدث وفقیہہ تھے حضرت امام احمد بن حنبلؒ جیسے بزرگ بھی آپ کا بے حد احترام فرماتے تھے۔ ابنِ کثیر نے ان ہی یحییٰ بن معینؒ کی ایک روایت بیان کی ہے۔ آپ فرزندِ قریش کے بارے میں برملا فرماتے تھے۔

''اگر شافعیؒ کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہوتا تب بھی ان کی مروت انہیں جھوٹ بولنے نہیں دیتی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ انسانی کردار کی کون سی منزل تھی؟''

ایک بار کسی شخص نے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ حضرت امام شافعیؒ بیٹھے رہے اس شخص نے دوبارہ پوچھا۔ جواباً امامؒ نے فرمایا ''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس وقت مسئلہ بتانے کی فضیلت ہے یا سکوت کی؟''

اس فقرِ غیور نے امامؒ کو حرص وطمع' نام ونمود اور دنیا کی ہر آسودگی سے بے نیاز کر دیا تھا۔ فرزندِ قریش کے بارے میں اکثر بزرگوں کا قول ہے۔ ''امام شافعیؒ کا شمار ان چند انسانوں میں ہوتا ہے جو صرف اللہ کے لیے علم حاصل کرتے ہیں اور اللہ ہی کی خوشنودی کے لیے اپنے علم کو مخلوقِ خدا میں تقسیم کرتے ہیں۔''

خود حضرت امام شافعیؒ برسرِ مجلس فرمایا کرتے تھے۔ ''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ لوگ علم حاصل کریں۔ مجھے ستائش کی تمنا نہیں کہ لوگ میری شان میں قصائد پڑھیں۔ اور نہ میری یہ آرزو ہے کہ میں علم کو حصولِ دولت وشہرت کا ذریعہ بناؤں۔''

اسی فقر وقناعت نے امام شافعیؒ کے پیکرِ ذات کو عجیب تزئین وآرائش بخشی تھی۔ ایک بار حضرت امام شافعیؒ حرم کعبہ میں موجود تھے۔ اس روز مکمل چاندنی رات تھی۔ امامؒ چاند کی روشنی میں کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ لوگ آتے اور جاتے رہے امامؒ کو کتاب کے اوراق میں غرق دیکھ کر کسی نے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک اور شخص بھی بیت اللہ میں مصروفِ عبادت تھا۔ وہ وقفے وقفے سے فرزندِ قریش کی طرف دیکھتا مگر امامؒ نے انہماک میں کوئی کمی نہ پاتا۔ اسے اپنی زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ علم ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو اپنے گردوپیش سے بھی بے خبر بنا دیتا ہے آخر جب وہ شخص اپنی عبادت سے فارغ ہو چکا تو امامؒ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اس کا خیال تھا کہ اس کے قدموں کی چاپ سن کر امامؒ کے مطالعے کے تسلسل میں فرق آ جائے گا مگر امامؒ کو محسوس بھی نہیں ہوا کہ فرشِ حرم پر کون چل رہا ہے؟ وہ شخص بہت دیر تک اس بات کا منتظر رہا کہ کب امام اس کی موجودگی کا احساس کریں اور پھر اس کی جانب نظر اٹھا



کر دیکھیں؟ وقت گزرتا رہا لیکن امام شافعیؒ کی نگاہیں اوراق پر اس طرح مرکوز ہیں جیسے دنیا میں کسی دوسری شے کا وجود ہی نہیں ہے۔

مجبوراً اس شخص نے خود ہی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے امامؒ کی خدمتِ عالیہ میں سلام پیش کیا۔ امامؒ کسی اجنبی کی آواز سن کر چونک اٹھے اور پھر جواباً فرمایا ''اے شخص! تجھ پر بھی اللہ کی سلامتی ہو۔''

''امامؒ! میں بہت دیر سے چاند کی روشنی میں آپ کو مصروفِ مطالعہ دیکھ رہا ہوں' کیا یہ روشنی آپ کے لیے کافی ہے؟'' اس شخص کے لہجے سے بیک وقت عقیدت اور ہمدردی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''روشنی کم ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ میرے مطالعے میں حارج ہو۔'' امامؒ اس اجنبی شخص سے گفتگو کا سلسلہ ختم کرنا چاہتے تھے مگر اس طرح بھی نہیں کہ چہرے سے ناگواری کے تاثرات کا اظہار ہو۔

'اگر آپ کو کتاب پڑھنے میں کوئی دشواری پیش آ رہی ہے تو اندر تشریف کیوں نہیں لے جاتے؟ وہاں شمع کی روشنی کافی تیز ہے۔'' اس شخص نے امام شافعیؒ کی آسانی کے لیے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

اگرچہ امامؒ بھی اس حقیقت سے باخبر تھے لیکن وہ شخص امامؒ کے جذبے سے ناآشنا تھا۔ ''تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ روشنی صرف بیت اللہ کے لیے مخصوص ہے۔'' حضرت امام شافعیؒ نے آہستہ سے کہا ''اس روشنی میں مطالعہ کرنا میرے لیے جائز نہیں۔'' یہ کہہ کر امامؒ دوبارہ حرف ومعنی کی دنیا میں گم ہو گئے اور وہ شخص سوچتا رہ گیا کہ اہلِ تقویٰ کو زندگی کے کیسے کیسے خارزاروں سے گزرنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

یہ فقرِ غیور ہی تھا جس نے ایک طرف امام شافعیؒ کو صاحبانِ سیم وزر سے بے نیاز کر دیا تھا اور دوسری طرف آپ کے قلبِ نازک کو اس قدر حساس بنا دیا تھا کہ کسی شخص کو ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ بے شمار روایتوں سے ثابت ہے کہ امام کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے والا کبھی ناکام ونامراد واپس نہیں جاتا تھا۔ سخاوت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو گی کہ اگر امام شافعیؒ اپنے ذاتی سرمائے سے کسی سائل کی حاجت روائی نہیں کر سکتے تھے تو پھر کسی شناسا یا دوست سے قرض لے کر مانگنے والے کی ضرورت پوری کر دیا کرتے تھے۔

امام شافعیؒ کے معاصرین نے آپ کی سیرت وکردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''امام شافعیؒ فطرتاً نہایت کریم النفس اور فیاض تھے۔ ہمیشہ اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیا کرتے تھے' بے حد غیور اور خوددار تھے۔ اہلِ جاہ وحشم اور اربابِ ثروت واقتدار سے کبھی کسی چیز کی طمع نہیں رکھتے

تھے۔ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ ایسے بے نیاز افراد کا طرزِ عمل خشک اور لہجہ تلخ ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس حضرت امام شافعیؒ نہایت بامروت اور خلیق انسان تھے۔ اگر کبھی کوئی شخص محبت وعقیدت سے کوئی نذر پیش کرتا تو قبول کر لیتے مگر اسے ایک بارِ گراں سمجھتے ہوئے فوراً ہی ضرورت مندوں میں لٹا دیتے۔

بارہا ایسا ہوا کہ حضرت امامؒ ہارون رشید کی دعوت پر دربارِ خلافت میں گئے۔ عباسی حکمراں نے اشرفیوں سے بھری تھیلیاں نذر کیں مگر امامؒ واپسی میں دونوں ہاتھوں سے اشرفیاں تقسیم کرتے ہوئے چلتے۔ یہاں تک کہ جب تک گھر پہنچتے تو آپ کے پاس ان ہزاروں طلائی سکوں میں سے ایک درہم بھی نہ ہوتا۔

حمیدی کی روایت ہے کہ جب امام شافعیؒ صنعا سے مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ کے پاس دس ہزار دینار تھے۔ آپ نے ایک خیمہ نصب کر کے قیام فرمایا۔ لوگوں کو پتا چلا تو گردونواح سے بے شمار افراد شرفِ ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ مشتاقانِ دید میں سے بیشتر لوگ ضرورت مند بھی تھے۔ بالآخر جب ملاقات کا سلسلہ ختم ہوا تو امام شافعیؒ کے پاس ایک دینار بھی باقی نہیں رہا تھا۔

حضرت امام شافعیؒ کے شاگرد ربیع بن سلمانؒ کہتے ہیں کہ ایک روز میرے استادِ گرامی امام شافعیؒ کے پاس صرف ایک دینار تھا اچانک ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی ضرورت بیان کرنے لگا۔ حضرت امامؒ نے ایک لمحہ سوچے بغیر وہ دینار اٹھا کر اس شخص کو دے دیا۔ جب وہ سائل چلا گیا تو لوگوں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''امامؒ! بس یہی ایک دینار آپ کی متاعِ کل تھی۔ پھر آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس شخص کو ایک یا دو درہم بھی دیے جاسکتے تھے۔ باقی آپ کی ضرورت میں کام آجاتے۔''

امامؒ نے جواباً فرمایا۔ ''کوئی شخص ایسی چیز کا سوال کرے جو میرے پاس ہو اور میں اسے نہ دوں تو اس تصور ہی سے مجھے شرم آتی ہے۔''

حضرت امام شافعیؒ کے ایک دوسرے شاگرد امام مزنیؒ فرماتے ہیں۔ ''میں نے اپنی زندگی میں امام شافعیؒ سے بڑھ کر کسی شخص کو فیاض نہیں پایا۔ ایک رات میں مسجد سے امام کے ساتھ ان کے گھر تک آیا۔ مجھے ایک شرعی مسئلے میں کوئی الجھن درپیش تھی میں اسی موضوع پر امامؒ سے گفتگو کر رہا تھا اتنے میں ایک غلام آیا اور بڑی عاجزی سے کہنے لگا ''میرے آقا نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ تھیلی بطور نذر پیش کی ہے۔''

امامؒ نے وہ تھیلی رکھ لی اور دوبارہ اس مسئلے کی تشریح فرمانے لگے...... ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک دوسرا شخص آیا اور بڑی شکستہ آواز میں اپنی ضرورت بیان کرنے لگا ''امامؒ! ہم مفلس ونادار لوگ ہیں میری بیوی کے بچہ ہونے والا ہے اور اتفاق سے اس وقت ہمارے پاس ایک درہم بھی موجود نہیں ہے۔''



ابھی اس شخص کے الفاظ کی بازگشت بھی ختم نہیں ہوتی تھی کہ امامؒ کا دستِ کرم بلند ہوا اور آپ نے وہ تھیلی اس ضرورت مند انسان کو دے دی پھر فرمایا ''غربت وافلاس سے خائف نہیں ہونا چاہیے۔ خدا ہر حال میں اپنے بندوں کا کفیل ہے۔''

امام مزنیؒ کی دوسری روایت ہے کہ میں نے امام شافعیؒ سے زیادہ کسی شخص کو کریم نہیں دیکھا۔ ایک بار امام گھوڑے پر سوار تھے اتفاقاً آپ کے ہاتھ سے چابک (کوڑا) چھوٹ کر زمین پر گر گیا قریب ہی ایک اور شخص بھی موجود تھا اس نے دوڑ کر چابک اٹھا لیا اور بہت احترام کے ساتھ امام شافعیؒ کو پیش کر دیا۔ امامؒ کی غیرت اس بارِ احسان کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ نتیجتاً آپ نے اپنے ایک خادم کو حکم دیا ''جو کچھ اس وقت موجود ہے وہ اس شخص کو دے دیا جائے'' خادم فوراً ہی امام کے حکم پر عمل پیرا ہوا بعد میں کسی نے خادم سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ساٹھ اشرفیاں تھیں۔

ایک بار امامؒ کے شاگرد ربیع بن سلمانؒ آپ کے ہمراہ تھے اتفاقاً امامؒ کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ گیا کسی شخص نے عقیدت واحترام کی خاطر امامؒ کے جوتے کو درست کر دیا۔ جب وہ شخص جانے لگا تو امام شافعیؒ نے اسے پکارا۔ ''ٹھہرو اپنی اجرت لیتے جاؤ'' اس شخص نے انکار کیا مگر امام شافعیؒ بضد ہو گئے اور پلٹ کر ربیعؒ سے دریافت کیا ''آپ کے پاس ہماری کچھ رقم موجود ہے؟''

ربیعؒ نے جواباً کہا ''سات اشرفیاں ہیں۔''

امام نے فرمایا ''وہ سب اس شخص کو دے دو۔''

کون ہے جو اس مردِ سخی کی کرم نوازیوں کو دائرۂ تحریر میں لائے؟ اگر کسی طرح یہ دفتر ترتیب پا جائے تو یقیناً حاتم طائی کی سخاوتوں کے افسانے بھی اپنی دلکشی سے محروم ہو جائیں گے۔

یحییٰ بن علیؒ امام شافعیؒ سے روایت کرتے ہیں ''امام فرمایا کرتے تھے اگر کوئی انسان شدید گمراہی میں مبتلا نہ ہو تو کرم وسخاوت، دنیا اور آخرت دونوں میں اس کے عیوب کی پردہ پوشی کریں گے۔''

یہی فقرِ غیور اور یہی بے مثال سخاوت امامؒ کے کردار کی بنیاد ہے فقر نے امامؒ کو خدا کے سوا ہر شے سے بے نیاز کیا اور سخاوت نے اس قدر رقیق القلب بنا دیا کہ آپ ہر وقت خوفِ خدا سے لرزتے رہتے تھے۔

ایک بار کوئی شخص امام کے سامنے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کر رہا تھا۔

''یہ وہ دن ہے کہ لوگ بات تک نہ کر سکیں گے
اور انہیں کوئی عذر پیش کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔''

جب امام شافعیؒ نے یہ آیت سنی تو آپ کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا' جسم کانپنے لگا اور پھر ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ اہلِ مجلس نے آج تک امام کو اس کیفیت سے دوچار ہوتے نہیں دیکھا تھا قیامت کا ذکر تو سب سنتے تھے مگر امامؒ کے قلبِ مضطرب نے یومِ حساب کا کچھ اور ہی تاثر قبول کیا تھا بہت دیر تک آپ پر غشی کی کیفیت طاری رہی۔ جب ہوش آیا تو پورا بدن خوف سے لرز رہا تھا آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور زبان مبارک پر یہ کلمات جاری تھے۔

''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں
جھوٹوں کے مقام سے' جاہلوں کی قربت سے
اے اللہ! تو مجھے اپنی رحمت سے سرفراز کر اور میری پردہ پوشی فرما
اور محض اپنے کرم سے معاف فرما دے
اور مجھے غیر کے حوالے نہ کر اور اپنے فضل سے مایوس نہ فرما۔''

امامؒ بہت دیر تک اپنے رب کی پناہ مانگتے رہے اور اہلِ مجلس کو یہ محسوس ہونے لگا جیسے قیامت کا نزول شروع ہو چکا ہے اور مخلوق اپنے خالق کے حضور جمع ہو رہی ہے یہ امامؒ کے زہد و تقویٰ اور لحنِ پُرسوز کا اثر تھا کہ حاضرین کے دل دنیا کے پرفریب طلسم سے آزاد ہو کر حقیقتِ منتظر کی طرف رجوع ہو چکے تھے۔

☆☆☆

تقریباً نو سال تک حضرت امام شافعیؒ مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ حدودِ حرم میں رہ کر آپ نے تشنہ حال علم کی پیاس بجھائی جو ذہن سو چکے تھے انہیں اپنی منطق و استدلال سے بیدار کیا۔ جو یقین و تشکیک کے دوراہے پر پہنچ کر لڑکھڑا رہے تھے انہیں اپنے مشاہدات سے استقامت بخشی۔ جو دل مردہ ہو چکے تھے انہیں اپنے سوزِ دروں سے زندگی کی حرارت عطا کی جو روحیں سنگلاخ زمینوں کی طرح بنجر ہو چکی تھیں ان میں اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی جو ہوسِ زر میں برفاب ہو چکے تھے انہیں اپنی آتشِ فقر سے پگھلایا' غلاموں کو آزادی کا درس دیا اور شاہوں کو علم کا احترام سکھایا۔ پھر یہ مردِ جلیل فکر و آگہی کا سرمایہ عظیم لے کر ۱۹۵ھ میں دوبارہ بغداد پہنچا۔

یہ عباسی خلیفہ ہارون رشید کی حکومت کا آخری زمانہ تھا۔ امام شافعیؒ کے استادِ گرامی امام محمدؒ چھ سال قبل ۱۸۹ میں انتقال فرما چکے تھے جب فرزندِ قریش نے دوبارہ سرزمینِ بغداد پر قدم رکھا تو آپ کو امام محمدؒ کی بے پناہ نوازشات یاد آئیں اور گزری ہوئی صحبتیں آنکھوں میں گھوم گئیں۔ دل پر ایک چوٹ سی پڑی



پھر علم کی روشن و تابناک مجلسیں ذہن میں اس شدت کے ساتھ ابھر آئیں کہ امام شافعیؒ اشک بار ہو گئے۔ حضرت امام محمدؒ کو رے میں دفن کیا گیا تھا۔ اس لیے امام شافعیؒ ان کی قبرِ مبارک پر تو حاضر نہ ہو سکے لیکن اکثر اپنے استاد کے حق میں دعائے خیر فرماتے تھے۔

''اے اللہ! تو ہر شے پر قادر ہے اپنی اسی قدرت کے طفیل میرے استاد محمد بن حسن شیبانیؒ کی قبر کو کشادہ کر دے اور اپنے اس نور سے ان کی لحد کو بھر دے جس سے ارض و سما روشن ہیں۔ امامؒ کی مغفرت فرما اور ان پر اپنی رحمتیں نازل کر وہ دنیا میں تیرے بندے محمد بن ادریس شافعیؒ کے محسن تھے تو آخرت میں ان پر احسان فرما اور بلند درجات سے سرفراز کر کہ تیرے کرم کے سوا کوئی دستگیر نہیں ہے کوئی مشکل کشا نہیں۔''

امام شافعیؒ کے دل پر امام محمدؒ کی جدائی بہت شاق گزری تھی مگر آپ زندگی کا ایک مقصدِ عظیم رکھتے تھے۔ اس لیے ماضی کے یہ زخم بھی آہستہ آہستہ بھر گئے اور امام شافعیؒ کچھ دن بعد ہی پُرسکون نظر آنے لگے۔ امام شافعیؒ کا دوسرا سفرِ بغداد تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ امامؒ نے قیامِ مکہ کے دوران فقہ جدید کے جو اصول مرتب کیے تھے انہیں آپ فقہیانِ عراق کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ امام مالکؒ کی وفات کے بعد مدینے میں فقہ کی گرم بازاری تقریباً سرد ہو چکی تھی اب سرزمینِ عراق ہی اہلِ علم کا مرکز تھی اور اسی مقام پر ہر مکتبِ خیال کے فقہا موجود تھے۔ یہاں اہلِ رائے بھی تھے اور اہلِ حدیث بھی نتیجتاً امام شافعیؒ مکے سے نکل کر سیدھے بغداد پہنچے۔

روایت ہے کہ جب حضرت امام شافعیؒ دوبارہ بغداد میں داخل ہوئے تھے تو ان کے ہمراہ صرف چھ اصحاب تھے لیکن جب امامؒ نے جامع مسجد میں قدم رکھا اور آپ کی مجلسِ درس آراستہ ہوئی تو پھر ساری مجلسیں بجھ کر رہ گئیں اور تمام حلقے ویران ہو گئے کیا علماء کیا طالبانِ فقہ' کیا اہلِ حدیث اور کیا اہلِ رائے سب نے امام شافعیؒ کو اپنے حصار میں لے لیا۔ بغداد کا قریہ قریہ' کوچہ کوچہ امامؒ کی تحسین کے کلمات سے گونج رہا تھا۔

''شافعیؒ دیارِ حرم سے نعمتِ عظیم لے کر آئے ہیں۔ لوگو! جلدی کرو اور علم کے ذخیرے سے اپنا حصہ حاصل کر لو ورنہ کسے خبر ہے کہ ''مردِ جلیل'' یہاں سے کب چلا جائے اور تم دریا کے قریب پہنچ کر بھی پیاسے رہ جاؤ۔''

اب امام شافعیؒ کے اعجازِ نطق کے آگے تمام زبانیں گنگ تھیں۔ آپ کی شدتِ گفتار نے لوگوں کو

عاجز کردیا تھا بے مثال قوتِ حافظہ' آسمانوں جیسی فکر بلند اور شعلوں جیسی طرزِ تکلم، کون امام کے مقابل ہوسکتا تھا؟ کوئی بھی نہیں۔

حضرت امام شافعیؒ کے عزیز ترین شاگرد محمد بن عبداللہ بن حکمؒ کا بیان ہے کہ امام شافعیؒ مناظرے کے وقت خونخوار شیر کی طرح ہیبت ناک نظر آتے تھے۔

اگرچہ امام شافعیؒ ذاتی طور پر مناظرے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن جب مجبور ہو جاتے تو مقابل کو اپنی منطق واستدلال کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ لیتے جیسے تارِ عنکبوت میں کوئی مچھر یا حقیر کیڑا الجھ کر رہ جائے۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ ایک طرف علما کی پوری جماعت ہوتی اور دوسری طرف تنہا امام شافعیؒ۔ لیکن پھر بھی غلبہ فرزند قریش ہی کو حاصل ہوتا۔ اہلِ دنیا یقیناً ایسی فتوحات پر نازاں ہوتے مگر امامؒ ایسے غلبہ و نصرت کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اس بیزاری کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مناظرہ کوئی مستحسن فعل نہیں تھا۔

یحییٰ بن سعید کی روایت کے مطابق حضرت عمر بن العزیزؒ فرماتے تھے کہ جو کوئی اپنے دین کو بحث کا نشانہ بناتا ہے اس کا اعتقاد بھی متزلزل رہتا ہے۔

امام اوزاعیؒ کا بیان ہے ''حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے تھے کہ جب تم لوگوں کو دیکھو کہ عوام سے چھپ کر دین کے معاملے میں سرگوشیاں کر رہے ہیں تو سمجھ لو کہ وہ گمراہی پھیلانے کی فکر میں ہیں۔''

فرازی سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے جنگ صفین کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا ''جب خدا نے صفین کے خون سے میرے ہاتھوں کو رنگین نہیں ہونے دیا تو پھر میں اپنی زبان کو اس خون سے کیوں رنگین کروں؟''

امام اوزاعیؒ کہا کرتے تھے۔ ''میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ جب خدا کسی قوم کی برائی چاہتا ہے تو اس میں بحث وجدل کی گرم بازاری ہو جاتی ہے اور عمل کا ولولہ جاتا رہتا ہے۔''

''معاویہ بن عمرؒ کا قول ہے کہ بحث سے دور رہو۔ اس سے عمل گم ہو جاتا ہے۔''

محمد بن خنیفہؒ فرمایا کرتے تھے ''دنیا اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک لوگ اپنے خدا کے بارے میں بحث نہ کرنے لگیں'' (یہی مفہوم ایک حدیث کا بھی ہے)

ہثیم بن جمیلؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار حضرت امام مالک بن انسؒ سے پوچھا ''کیا کسی محدث کو حمایت میں مناظرہ کرنا چاہئے۔'' جواباً امام مدینہ نے فرمایا ''ہرگز نہیں محدث کو چاہئے کہ صرف حدیث



سنادے۔ اگر لوگ قبول نہ کریں تو خاموش ہو جائے۔''

مغیرہ بن ابراہیم کہتے ہیں کہ اگلے بزرگ، دین کے معاملے، میں تلون (اضطراب وانتشار) کو ناپسند کرتے تھے۔

مصعب بن عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے اسحٰق بن اسرائیلؒ سے مباحثہ کرنا چاہا تو فرمانے لگے۔ ''مجھے اپنے مسلک میں کوئی شک نہیں ہے لیکن وہی کہوں گا جو بزرگوں سے ثابت ہے اور جو ثابت نہیں اس پر سلف صالحین کی طرح خاموش رہوں گا۔''

مصعب بن عبداللہ کی دوسری روایت ہے کہ حضرت امام ملک بن انسؓ فرمایا کرتے تھے ''دین کے اندر مجھے گفتگو پسند نہیں میں اسی کلام کو پسند کرتا ہوں جس کا نتیجہ عمل ہو۔ دینِ الٰہی اور ذاتِ خداوندی میں مجھے بحث نہیں سکوت پسند ہے۔ میں نے اپنے شہر کے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ دینِ الٰہی میں قیل وقال سے روکتے تھے۔''

ابوعمرؒ کہتے ہیں۔ ''امام مالکؒ کے قول سے واضح ہو گیا کہ ان کے اور دیگر علمائے مدینہ کے نزدیک وہی گفتگو مباح ہے جس کا نتیجہ عمل ہو۔ امام مالکؒ نے جو کچھ فرمایا ہے ہر زمانے کے فقہا اور علمائے حق کا وہی مسلک رہا ہے۔ معتزلہ اور بدعتی فرقوں کے علاوہ اہلِ سنت میں سے کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ اگر کوئی ایسی ہی مجبوری آپڑے اور لوگوں کے عام گمراہی میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو بقدرِ ضرورت اس قسم کی گفتگو جائز ہے۔''

حضرت امام مالکؒ کا دوسرا قول ہے کہ یہ حجتی جب بھی بڑے بڑے حجتیوں سے ہارتے جائیں گے تو کیا اپنا دین چھوڑ کر نئے نئے دین قبول کرتے رہیں گے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے ''علم کلام والا کبھی فلاح نہیں پا سکتا جس کسی کو علم کلام میں تھوڑا سا بھی دخل ہے اس کے دل میں تم ضرور کھوٹ پاؤ گے۔''

ابوعبداللہ محمد بن اسحٰق مصری نے اپنی کتاب ''الاجارات'' میں وضاحت کی ہے کہ حضرت امام مالک بن انسؒ اور تمام اصحاب مالکیہ کے نزدیک اہلِ کلام بدعتی ہیں۔ خواہ وہ اشعری ہو یا معتزلی یا کوئی اور۔ اسلام میں ان کی شہادت مقبول نہیں۔''

حضرت امام حسن بصریؒ فرماتے تھے۔ ''نہ اہلِ بدعت کی صحبت اختیار کرو نہ ان سے بحث کرو اور نہ حدیث سنو۔''

سعید بن جبیرؒ کا قول ہے۔ ''جو بات اصحاب بدر کو معلوم نہیں وہ دین میں بھی نہیں۔''

حضرت امام حسن بصریؒ کی مجلس میں صحابہ کرام کا تذکرہ ہوا تو آپ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا ''تم انہیں جانتے بھی ہو؟ امت میں سب سے بہتر دل رکھنے والے سب سے زیادہ گہرا علم جاننے والے اور سب سے کم بناوٹ کرنے والے لوگ تھے۔ خدا نے انہیں اپنے نبی ﷺ کی صحبت و رفاقت کے لیے منتخب کیا تھا۔ تم بھی ان کی طرح اپنے اخلاق سنوارو اور ان کے طریقوں پر چلنے کی کوشش کرو۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ رب کعبہ کی قسم! وہ سراسر ہدایت پر گامزن تھے۔''

ابراہیمؒ اہلِ مجلس سے کہا کرتے تھے ''تم ایسے کہاں کے برگزیدہ ہو کہ خدا نے اپنے رسولؐ کے ساتھیوں سے علم چھپا کر تمہارے لیے اٹھا رکھا تھا۔

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔ ''ہدایت پا جانے کے بعد وہی گمراہ ہوتے ہیں جنہیں بحث و جدال میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، اس کے بعد سرورِ کونینؐ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

''انہوں نے یہ مثال کٹ حجتی سے پیش کی ہے یہ لوگ بڑے جھگڑالو ہیں۔''

ابو عمرؒ کہتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے علم فقہ میں بحث و مناظرہ کیا ہے لیکن عقائد کے سلسلے میں اس قسم کی گفتگو سے منع فرمایا ہے وہ اس لیے کہ عقائد میں مباحثہ' آدمی کو دین سے خارج کر دیتا ہے۔ ایک شخص نے مناظرے کے دوران قران کریم کی یہ تلاوت کی۔

''تین آدمی راز کی باتیں کرتے ہیں تو چوتھا ان کے ساتھ خدا ہوتا ہے۔''

وہ شخص ہر جگہ خدا کے موجود ہونے کی دلیل پیش کر رہا تھا جواب میں اس کے حریف نے کہنا شروع کر دیا ''اگر یہی بات ہے تو پھر خدا تمہاری ٹوپی کے نیچے تمہارے باغ کی چار دیواری کے اندر اور تمہارے گدھے کی کھال کی پیچھے بھی چھپا بیٹھا ہوگا'' معاذ اللہ! وکیع بن جراح (عراق کے مشہور محدث) نے اس واقعے کو بیان کیا ہے۔ حالانکہ خدا کی قسم! میرے نزدیک ان لوگوں کی گفتگو نقل کرنا بھی بے حد ناپسندیدہ فعل ہے۔ علما نے اس قسم کی باتوں سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔

ایک عربی شاعر نے مناظرے کے متعلق عجیب و غریب اشعار کہے ہیں۔

''کریدتے کریدتے آخر لوگوں نے دین میں ایسی بدعتیں نکال دیں۔

جنہیں پیغمبر اپنے ساتھ نہیں لائے تھے



آخر دین ایک مضحکہ خیز شے بن کر رہ گیا

حالانکہ حقیقی دین میں کافی مشغولیت تھی۔''

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے ٹھہر ٹھہر کر تین بار فرمایا ''کریدنے والے ہلاک ہوگئے کریدنے والے ہلاک ہوگئے کریدنے والے ہلاک ہوگئے۔''

حضرت امام حسنؓ کے پوتے حضرت عبداللہ بن حسنؒ فرمایا کرتے تھے ''بحث سے پرانی دوستیاں غارت ہو جاتی ہیں اور محبت کی گرہیں کھل کر بغض و عداوت کی گرہیں پڑ جاتی ہیں مباحثے کا کم سے کم نقصان یہ ہے کہ ہر فریق غالب آنے کی خواہش رکھتا ہے اور اس خواہش سے بڑھ کر پھوٹ ڈالنے والی کوئی چیز نہیں۔''

عظیم محدث حضرت مسعر بن کدامؒ نے اپنے بیٹے کو اس طرح نصیحت فرمائی تھی۔ ''فرزند! میری نصیحت تیرے سامنے ہے اپنے باپ کی بات غور سے سن۔ تمسخر اور بحث سے دور یہ خصلتیں میں کسی کے لیے پسند نہیں کرتا میں ان دونوں کو خوب آزما چکا ہوں نہ یہ میرے ہمسائے کے لیے پسندیدہ ہیں اور نہ ساتھی کے لیے۔''

امام شافعیؒ کے استاد حضرت سفیان بن عیینہؒ ایک مناظرے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''میں نے جابر جعفیؒ کی زبان سے ایسی گفتگو سنی کہ میں لرز کر رہ گیا اور مجھے خوف پیدا ہوا کہ کہیں ہم پر چھت نہ ٹوٹ پڑے۔''

حضرت امام شافعیؒ کے سامنے حضور اکرام ﷺ صحابہ کرام اور دیگر محدثین کے فکرِ و عمل کے روشن نمونے موجود تھے۔ اس لیے آپ صفاتِ الٰہی اور دیگر مذہبی عقائد کے سلسلے میں مناظرے سے سخت گریز کرتے تھے۔

یونس بن عبدالاعلیٰؒ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب حضرت امام شافعیؒ اور حفص الفرد میں مناظرہ ہوا تو امامؒ نے مجھ سے فرمایا ''یونس! شرک کے علاوہ بندہ کسی بھی گناہ میں مبتلا ہو جائے مگر ''کلام'' کے گناہ سے آلودہ ہو کر اپنے رب کے حضور نہ جائے میں نے حفص کے منہ سے ایسی گفتگو سنی ہے جسے دہرانے کی مجھ میں جرات نہیں۔''

امام شافعیؒ کا مشہور قول ہے۔ ''اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ علمِ کلام میں کیسی کیسی گمراہیاں ہیں تو وہ اس سے اس طرح بھاگنے لگیں گے جیسے کوئی شخص شیر کو دیکھ کر بھاگتا ہے۔''

پھر ایک اور موقعے پر حضرت امام شافعیؒ نے نہایت غضب ناک لہجے میں فرمایا۔

''اہلِ کلام کے بارے میں میرا فتویٰ یہ ہے کہ ان لوگوں کو کھجور کی قمچیوں سے خوب پیٹا جائے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر اونٹوں پر ڈال دیا جائے۔ پھر انہیں قبائل میں گشت کرایا جائے اور علی الاعلان کہا جائے کہ یہ ان لوگوں کا انجام ہے جو کتاب وسنت کو ترک کر کے علمِ کلام پر جھک پڑے تھے۔''

ایک دوسرے موقع پر حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اہلِ کلام ایک دوسرے پر کفر کا الزام عائد کرتے ہیں اور اہلِ حدیث ایک دوسرے کی غلطیاں پکڑتے ہیں ظاہر ہے کہ غلطیوں کی گرفت کرنا، کافر بنانے کے مقابلے میں ہلکا جرم ہے۔''

اگرچہ خود امام شافعیؒ علمِ کلام کے رموز ونکات سے بخوبی واقف تھے لیکن قلبی طور پر آپ کو اس فن سے شدید نفرت تھی حضرت امام شافعیؒ کے شاگرد امام مزنیؒ کا بیان ہے کہ ایک بار ہم لوگ امام شافعیؒ کے گھر پر موجود تھے اور علمِ کلام کے بارے میں ایک دوسرے سے مناظرہ کر رہے تھے۔ اتنے میں حضرت امام شافعیؒ تشریف لائے اور ہماری بعض باتیں سن لیں پھر آپ فوراً ہی واپس چلے گئے تھوڑی دیر کے بعد آپ دوبارہ تشریف لائے اور فرمانے لگے۔

''میں اس لیے واپس چلا گیا تھا کہ تم لوگ علم کلام کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اسے سخت ناپسند کرتا ہوں؟ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں اس علم سے ناواقف ہوں؟ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو غور سے سنو کہ میں علمِ کلام سے بخوبی واقف ہوں۔ میں نے اسے اچھی طرح حاصل کیا ہے مگر بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس علم کا کوئی مقصد نہیں ہے تم بحث کے دوران اپنے حریف کو غلطی کا مرتکب تو کہہ سکتے ہو لیکن اس پر کفر کا فتویٰ نہیں لگا سکتے۔'' علمِ کلام کی یہی ہولناکی تھی کہ لوگ اپنے دلائل کے جوش میں ایک دوسرے کو کافر کہنے لگتے تھے اسی وجہ سے حضرت امام شافعیؒ نے شدت کے ساتھ علمِ کلام کو ناپسند کیا اور اپنے شاگردوں کو بھی گریز کی تلقین کی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے کہ ''جو شخص علم کے ساتھ مناظرہ کرتا ہے وہ اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے۔'' حضرت امام شافعیؒ بھی بزرگانِ سلف کے اسی نظریے پر کاربند رہے آپ نے قرآن وحدیث کے کسی موضوع پر کبھی مناظرہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ آپ مجبور نہ کر دیئے گئے ہوں۔ اگر کبھی اتفاق سے ایسی کوئی صورتِ حال پیش آ گئی تو امامؒ تائید غیبی کے سبب اس معرکہ آرائی میں بھی سرخرو ہوئے۔ اور جہاں تک فقہ اور دیگر علوم وفنون کا تعلق ہے تو امامؒ کا کوئی حریف ہی نہیں تھا۔ بے مثال فصاحت و بلاغت،



شعر وادب کا انتہائی ادراک، زبان وقواعد پر مکمل عبور اور پھر پُرجلال و پُرسوز آواز، یہی وہ غیر معمولی اسلحہ تھا جس سے امام شافعیؒ ہر وقت آراستہ رہتے تھے پھر کون علم وفن کی جنگ میں امامؒ کا مقابل ہوتا؟ اگر ہوتا بھی تو فتح ونصرت بالآخر امام ہی کے نام سے منسوب ہوتی۔

امام شافعیؒ کی یہی وہ صفاتِ عالیہ تھیں جنہیں دیکھ کر آپ کے استادِ گرامی حضرت امام محمدؒ نے فرمایا تھا ''اگر کسی روز اصحابِ حدیث کلام کریں گے تو شافعیؒ کی زبان میں۔''

☆☆☆

جب قیامِ بغداد کے دوران ہر طرف امام شافعیؒ کی آواز گونج رہی تھی اور تمام علمائے عراق فرزندِ قریش کے گرد جمع ہو گئے تھے اس وقت ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ حاکمِ روم کچھ سالانہ رقم خلیفہ ہارون رشید کو دیا کرتا تھا بعض روایتوں میں ہے کہ یہ رقم بطور جزیہ پیش کی جاتی تھی ایک دن اچانک اس کی ذہنی رو بدل گئی اور وہ عباسی حکمراں کے حلقۂ اثر سے نکلنے کی تدبیریں کرنے لگا۔ حاکمِ روم نے اپنے ملک کے تمام دانشوروں کو جمع کیا اور پھر ان سے اس طرح مخاطب ہوا۔

''ہم میدان جنگ میں مسلمانوں سے شکست کھا چکے ہیں اور کسی نہ کسی طرح ہم نے اس صدمے کو برداشت بھی کر لیا لیکن اقتصادی بوجھ نے ہماری کمر توڑ رکھی ہے۔ اہلِ روم جلتی ہوئی دھوپ میں پسینہ بہاتے ہیں اور اس کی کمائی مسلمانوں کے خزانے میں جمع ہو جاتی ہے۔ ہم بے سکون و بے آرام ہیں اور دشمن ہمارے سرمائے سے دنیا کے عیش ونشاط خرید رہا ہے کیا تم بساطِ سیاست پر ایسی کوئی چال نہیں چل سکتے کہ ہماری دولت محفوظ ہو جائے؟''

''بظاہر تو یہی ایک صورت ہے کہ آپ اپنے عہدے سے منحرف ہو جائیں۔'' بیشتر دانشوروں نے حاکمِ روم کو مشورہ دیا۔

عہد شکنی سے خلیفہ کی شدتِ غضب اور پھر محاذ آرائی کا خطرہ ہے'' حاکم نے اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا ''فی الحال ہماری مملکت جنگ وجدل کی متحمل نہیں ہو سکتی۔''

حاکمِ روم کا جواب سن کر تمام اہلِ دانش غور وفکر میں ڈوب گئے اور پھر طویل بحث کے بعد ایک نکتے پر اتفاقِ رائے ہو گیا۔ اب حاکمِ روم مطمئن تھا دوسرے دن پورے ملک سے سات راہبوں کو دربار میں جمع کیا گیا۔ انہیں ساری صورتِ حال سمجھائی گئی اور صاف صاف کہہ دیا گیا کہ وہ کسی طرح بھی مسلمان علما کی طرف سے پیش کیے جانے والے دلائل کو تسلیم نہیں کریں گے۔

اس مرحلے سے گزر کر حاکمِ روم نے خلیفہ ہارون رشید کو ایک خط لکھا جس کی عبادت کچھ اس طرح تھی۔

''مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا مذہب آخری مذہب ہے اور تمام مذہبی نظریات منسوخ ہو چکے ہیں ہم اس دعوے کو اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک کوئی دلیل روشن نہیں ہو جائے گی۔ اب اس کا یہی ایک طریقہ ہے کہ ہم آپ کے دربار میں سات راہبوں کو بھیج رہے ہیں۔ یہ ہمارے مذہب کے زبردست عالم ہیں ان کی زبانوں کو تلوار سے خاموش کیا جا سکتا ہے۔ جبراً حکومت بھی کی جا سکتی ہے مگر جب علم کا تعلق ہے تو یہ مسلمان علماء سے شکست نہیں کھا سکتے۔ اگر آپ مناظرے کے ذریعے ہمارے راہبوں کو قائل کر دیں گے تو میں آخری سانس تک مقرر کردہ رقم بھیجتا ہوں گا۔ اور اگر ہمارے مذہبی رہنما اس بحث میں غالب رہے تو پھر میں معذرت خواہ ہوں۔ ترسیلِ زر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔''

کچھ دن بعد یہ ساتویں راہب حاکمِ روم کا خط لے کر خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں حاضر ہوئے عباسی حکمراں نے جزیہ گزار حاکم کا مکتوب پڑھا اور اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا اور جب وہ آخری الفاظ تک پہنچا تو شدتِ غیظ سے جسم میں ہلکی سی لرزش نمایاں ہوئی اور چہرہ سرخ ہو گیا۔

''یہ کھلی ہوئی بدعہدی ہے۔'' ہارون رشید کی پر جلال آواز دربار میں گونج رہی تھی۔ ''یہ ہمارے حضور صریح گستاخی ہے۔''

''دنیا کے ہر قانون نے عہد توڑ دینے والوں کے لیے سنگین سزا تجویز کی ہے۔'' خلیفہ کا مقربِ خاص بولا'' آپ بھی رومیوں پر یلغار کا حکم دیجیے تاکہ اس سرکش و نافرمان قوم کو ہمیشہ کے لیے پامال کر دیا جائے۔'' پورے دربار میں رومیوں کی سرتابی پر ایک آگ سی لگ گئی تھی۔

''یہ بات تو ہم لوگ پہلے ہی جانتے تھے کہ ہمارے علم' نظریات اور عقائد کو طاقت سے کچل دیا جائے گا۔'' ایک راہب نے نہایت پرسکون لہجے میں کہا جیسے وہ فاتح حکمراں کے دربار میں نہیں اپنے کسی عبادت کدے میں کھڑا ہو۔

''ہاں خدا نے ہمیں طاقت کے استعمال پر قدرت بخشی ہے۔'' ہارون رشید کا غصہ کم ہو گیا تھا لیکن آواز بھی ابھی تک وہی غضب ناک تھی ''عہد شکنی کی یہی سزا ہوتی ہے کہ جو ہاتھ بلند ہو قطع کر دیا جائے جو زبان دراز ہو، اس کا طول کم کر دیا جائے اور جو ذہن دریدہ ہوں انہیں آگ کے شعلوں سے جھلسا دیا جائے مگر ہم نافرمان رومیوں کو زندگی کا ایک اور موقع فراہم کریں گے ہمیں خبر ہے کہ تمہارا منصوبہ کیا ہے؟



مناظرے کا اہتمام تو ایک آڑ ہے' بہانہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم حیلہ سازی کے ذریعے جزیے کی رقم سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتے ہو لیکن تمہاری اس عیاری کو کہیں پناہ نہ مل سکے گی۔'' یہ کہہ کر ہارون رشید اپنے درباری علماء سے مخاطب ہوا۔ ''انہیں اپنے مذہبی عقائد کی صحت پر یقینِ کامل ہے تم رومی راہبوں کے سامنے پیغمبر آخرالزماں ﷺ کا وہ پیغام پیش کرو جس کے سامنے اب کسی دوسرے پیغام کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی ہے۔''

دوسرے دن دربارِ خلافت میں مناظرے کا اہتمام کیا گیا۔ خلیفہ ہارون رشید نے رومی راہبوں کو عزت و احترام کے ساتھ مسند پر بٹھایا۔ دوسری طرف مسلمان علماء کی جماعت تھی بالآخر مناظرہ شروع ہوا روم کے وہ راہب جو ترکِ دنیا کر چکے تھے اپنے لباسوں اور چہروں سے عجیب الخلقت انسان نظر آ رہے تھے' اس کے برعکس مسلمان علماء کی قبائیں سادہ تھیں اور چہروں پر اسلامی شریعت کا نور صاف نظر آ رہا تھا جب مناظرے کا آغاز ہوا تو رومی راہبوں نے یکے بعد دیگرے اپنے عقائد کی درستی کے بارے میں دلائل پیش کیے جواباً مسلمانوں نے اپنے حریفوں کی منطق کو مسترد کرنا چاہا مگر راہبوں نے دوسرے مسائل کھڑے کر دیے۔ یہاں تک کہ پورا دن تمام ہو گیا مگر اس مذہبی بحث کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

پھر کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ عراقی علماء میں بہترین فقیہہ موجود تھے۔ ان کا طرزِ استدلال بھی اس قدر قوی تھا کہ مقابل زیادہ دیر تک منطق اور گرم گفتاری کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا لیکن رومی راہب تو ایک طے شدہ منصوبے کے تحت بغداد آئے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں بند کر لی تھیں۔ سماعتیں مقفل کر لی تھیں اور عقل کے دروازوں پر پہرے بٹھا دیے تھے۔ نتیجتاً مسلمان علما کی ایک دلیل بھی کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ یہ رومی راہبوں کی طرف سے محض ایک کٹ حجتی نہیں تھی بلکہ وہ خود بھی اپنے مذہب کا وسیع علم رکھتے تھے دوسرے یہ کہ سخت مجاہدات نے ان کے لہجوں کو بھی اثر انگیز بنا دیا تھا۔ اب یہ ایک اتفاق ہے کہ مسلمان علما ان کے سامنے کوئی ایسی دلیل پیش نہ کر سکے جو انہیں عاجز کر دیتی۔

ایسے موقع پر اہلِ بغداد کو امام محمد حسن شیبانیؒ یاد آئے۔ امام محمدؒ امامِ اعظمؒ کے شاگرد ہونے کے سبب بہت زیادہ قوی الحجت تھے اور اکثر مناظروں میں اپنے حریفوں کو لاجواب کر دیا کرتے تھے۔ آج جب رومی راہبوں کی سرکشی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی تو مسلمانوں کو امام محمدؒ بہت شدت سے یاد آ رہے تھے۔ آخر بحث کے دوران ایک شخص نے کھڑے ہو کر ہارون رشید سے صاف کہہ دیا

"یہ کٹ حجت لوگ ہیں اگر امام محمدؒ زندہ ہوتے تو ان کج بحث افراد کو قائل کر دیتے۔"

"امام محمدؒ تو دنیا سے چلے گئے۔" ہارون رشید کے چہرے پر شکستگی کے آثار نظر آنے لگے تھے اگر وہ زندہ نہیں تو کیا دنیائے اسلام میں ان راہبوں کو جواب دینے والا بھی کوئی باقی نہیں رہا۔ افسوس! میری مملکت میں بھی قحط الرجال شروع ہو گیا۔" عباسی حکمراں کو رومی راہبوں سے ندامت سی محسوس ہو رہی تھی۔

"نہیں، جب تک شافعیؒ زندہ ہیں۔ اس وقت تک قحط الرجال کا لفظ اپنا مفہوم نہیں رکھتا" ایک دوسرے فقیہہ نے سرِ دربار ہارون رشید کے دعوے کی تردید کی۔

"کہاں ہیں شافعیؒ؟" ہارون رشید اچانک مضطرب نظر آنے لگا۔ جب یہ مناظرہ اس قدر اہم تھا تو شافعیؒ دربار میں کیوں حاضر نہیں ہوئے؟" اگرچہ ہارون رشید کا لہجہ خوشگوار تھا لیکن پھر بھی اس کے طرزِ گفتگو سے جلال اقتدار ظاہر ہو رہا تھا۔

"امیر المومنین اچھی طرح جانتے ہیں کہ شافعیؒ دربارِ خلافت سے کچھ زیادہ رغبت نہیں رکھتے۔" عراقی فقیہہ نے امامؒ کی بے نیازی کا ذکر کرتے ہوئے کہا "وہ ایک مردِ آزاد ہیں اور آزاد فضا میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ یہ اہلِ بغداد کی خوش نصیبی ہے کہ شافعیؒ دوبارہ یہاں تشریف لائیں جامع مسجد میں ان کا حلقہ درس قائم ہے اور وہ اہلِ طلب میں مسلسل علم کی دولت تقسیم کر رہے ہیں۔"

ہارون رشید کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھر آیا۔ جیسے وہ دلی طمانیت محسوس کر رہا ہو۔ "پھر شافعیؒ کو ہماری طرف سے دعوت دو کہ وہ دربار میں آئیں اور رومی راہبوں کے نظریات پر اسلامی عقائد کی برتری ثابت کر دیں۔" اس کے ساتھ ہی دربار دوسرے روز تک کے لیے برخاست ہو گیا۔

رومی راہب بظاہر بہت مطمئن نظر آ رہے تھے اب تک ان کا منصوبہ بحسن وخوبی تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا پھر بھی امام شافعیؒ کا ذکر سن کر ان کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہو چلی تھی۔ وہ ذاتی طور پر امام شافعیؒ سے واقف نہیں تھے لیکن جس طرح سرِ دربار ان کا نام لیا گیا تھا۔ اس سے رومی راہبوں کو کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ شافعیؒ مسلمانوں کے بڑے امام ہیں۔ یہ حاکم روم کے قاصدوں کے لیے فکر انگیز لمحات تھے مگر کچھ دیر بعد ہی وہ لوگ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دینے لگے۔

"جب ہم مسلمانوں کی پیش کردہ کسی دلیل کو ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں تو پھر امام شافعیؒ کہاں تک بولیں گے؟"

دوسرے دن تمام راہب اور مسلمان علما دربارِ خلافت میں جمع ہوئے۔ امام شافعیؒ ابھی تک مناظرہ



گاہ میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ "کیا شافعیؒ کو اطلاع دے دی گئی ہے؟" ہارون رشید نے قدرے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں، امام شافعیؒ امیر المومنین کے حکم سے باخبر ہو چکے ہیں۔" ایک مقرب درباری نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

دربار پر سناٹا چھایا ہوا تھا ہر شخص امام شافعیؒ کی آمد اور رومی راہبوں کی شکست کا منتظر تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ پھر اہلِ دربار نے امام شافعیؒ کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا "اسلام علیکم" امامؒ کی پرسوز آواز گونجی۔ یہ سلام خلیفہ ہارون رشید کے لیے مخصوص نہیں تھا بلکہ اللہ کی سلامتی تمام حاضر مسلمانوں پر تھی امامؒ کا یہ خاص انداز تھا کہ کبھی کسی امیر یا خلیفہ کو مخاطب کر کے سلام نہیں کرتے تھے۔ آپ کا سلام تمام حاضرینِ دربار کے لیے عام ہوتا تھا۔ یہی امامؒ کی قلندرانہ شان تھی۔ آج پھر آپ نے اسی رسم کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ امامؒ کے آتے ہی ہارون رشید اور دیگر اہلِ دربار کے چہرے شاداب ہو گئے مگر رومی راہب اچانک بے چین نظر آنے لگے تھے۔ اگرچہ امام شافعیؒ کا لباس بہت معمولی تھا لیکن جس شانِ بے نیازی کے ساتھ آپ دربارِ خلافت میں داخل ہوئے تھے اس نے رومی راہبوں کے دل پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔

"یقیناً یہ ان کا بڑا امام ہے۔" وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔" اس کے چہرے پر وہی جلال ہے جس کے بارے میں ماضی کی شہادتیں موجود ہیں اب ہمیں غیر معمولی استقامت اور احتیاط سے کام لینا ہوگا۔" رومی راہبوں نے فوری طور پر نئی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔

ابھی راہبوں کی سرگوشیاں جاری تھیں کہ امام شافعیؒ کی پرسوز پرجلال آواز سرِ دربار گونجنے لگی "امیر المومنین میرے مناظرے کا طریقہ کار جدا ہے۔ اگر ہمارے محترم مہمان پسند کریں تو دریائے دجلہ کے کنارے تشریف لے چلیں۔ وہاں پہنچ کر انشاء اللہ ثابت ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کس نے باطل کو اپنا شعار بنا لیا ہے؟" امام کی عجیب وغریب تجویز تھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ خود ہارون رشید بھی شدید حیرت کے عالم میں امام شافعیؒ کے رخِ تابناک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ راہب کس طرح انکار کرتے؟ انہیں تو ہر حال میں مناظرے کے لیے تیار ہونا تھا۔ اس لیے وہ فوراً ہی آمادہ ہو گئے مگر امام کے اس طریقہ کار کو سمجھنے سے عاجز رہے۔

کچھ دیر بعد یہ قافلہ دریائے دجلہ کی جانب روانہ ہوا اگرچہ ہارون رشید بھی اس قافلے کا ایک مسافر

تھا لیکن آج اس نے شاہی رسوم و تکلفات کو ترک کر دیا تھا۔ امرائے دربار بھی موجود تھے اور فوج کے سپہ سالار بھی لیکن اس طرح کہ خواص و عوام میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

آخر کنارہ دجلہ تمام لوگ جمع ہوئے۔ حاضرین کا اضطراب نقطہ عروج پر تھا مسلسل کئی دن تک ذہنی کشمکش کا شکار رہنے کے بعد تمام لوگ شدت سے اس بات کے منتظر تھے کہ کوئی شخص آئے اور ان کٹ حجت کے ذہنوں کو درست کر دے۔

اب جب کہ امام شافعیؒ تشریف لے آئے تھے حاضرین کو یقین ہو چلا تھا کہ رومی راہب شکست کھا جائیں گے مگر اس کے ساتھ ہی علمائے بغداد میں چند ایسے افراد بھی موجود تھے جو امام شافعیؒ سے حسد رکھتے تھے ان کی دلی خواہش تھی کہ جب وہ مناظرے کے دوران سرخرو نہ ہو سکے تو پھر امام شافعیؒ بھی اس اعزاز سے محروم رہیں غرض عجیب ماحول تھا اور امام شافعیؒ کی آمد کے ساتھ ہی فضا یکسر بدل گئی تھی۔

راہبوں نے اپنی ذہنی برتری ثابت کرنے کے لیے پرزور لہجے میں ہارون رشید سے مناظرے کے آغاز کی درخواست کی۔ شروع میں وہ حضرت امام شافعیؒ کی پرجلال شخصیت سے کچھ خائف نظر آتے تھے مگر ایک رات گزرتے ہی راہبوں نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا اور ان تمام دلائل پر غور کر لیا تھا جو امکانی طور پر امام شافعیؒ کی جانب سے پیش کیے جا سکتے تھے۔ اب ان کے چہروں پر اطمینان تھا اور ہونٹوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ۔ جیسے مسلمانوں کی طرف سے آنے والا نمائندہ بھی دلائل کی جنگ میں انہیں زیر نہ کر سکے گا۔

راہبوں کی طرف مناظرے کے آغاز کی درخواست پا کر ہارون رشید نے حضرت امام شافعیؒ کی جانب دیکھا۔ فرزندِ قریش راہبوں سے بھی زیادہ مطمئن نظر آ رہے تھے آپ نے اپنے حریفوں کی جماعت پر ایک ہلکی سی نظر ڈالی اور پھر عباسی حکمراں سے مخاطب ہوئے۔

''امیر المومنین! جب انسانی ذہن توہمات اور گمراہی کے اندھیروں میں غرق ہو جاتا ہے تو پھر عقل کی کوئی روشن دلیل کارگر نہیں ہوتی۔ میں پہلی ہی نظر میں اندازہ کر چکا ہوں کہ ہمارے مہمان ایک خاص منصوبے کے ساتھ بغداد آئے ہیں۔ یقیناً علمائے عراق نے بہترین دلائل پیش کیے ہوں گے مگر میں جانتا ہوں کہ یہ کج بحث لوگ کسی روشنی، کسی منطق اور کسی حقیقت کو تسلیم نہیں کریں گے۔ مملکتِ اسلامیہ قحط الرجال کا شکار نہیں ان لوگوں کے ذہن بنجر ہیں۔ پھر ہمارے فقیہہ کہاں بیج بوئیں اور کیسے فصل کاٹیں؟''

یہ کہہ کر امام شافعیؒ راہبوں کی طرف مڑے جو بے نیازی کے ساتھ دریا کے کنارے بیٹھے تھے اور ان کے



چہروں پر اس قدر اطمینان ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے روئے زمین پر انہیں کوئی جھٹلانے والا نہ ہو۔

''اے عیسائی راہبو! حق تو ظاہر ہو چکا مگر یہ تمہارے دلوں کا ٹیڑھ ہے تم نے روشنی کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور جنگل جنگل چیختے پھر رہے ہو کہ دنیا میں اندھیرا ہے تمہیں حضرت عیسیٰؑ نے واضح الفاظ میں خبر دی کہ سچائی کی روح فارقلیط آنے والا ہے تم اس کی پیروی کرنا۔ لیکن تمہارے فطری حسد اور ازلی تعصب نے اپنے پیغمبرِ جلیل کی خبر کو غبارِ ہوس میں گم کر دیا۔ اپنی کتابِ مقدس سے وہ اوراق حذف کر دیے جن میں فارقلیط (حضرت محمد ﷺ) کا ذکرِ جمیل ہے۔ اس بدترین خیانت کے بعد تمہارے کثیف دل و دماغ اس امانت کا بارِ گراں کس طرح اٹھا سکیں گے جسے قبول کرنے سے پہاڑ بھی عاجز رہے۔'' حضرت امام شافعیؒ کی پرسوز آواز گونج رہی تھی اور حاضرین کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دجلہ کا پانی اچانک بہتے بہتے رک گیا ہو۔ ''میں تم سے منطق و استدلال کے پیرائے میں بات نہیں کروں گا کہ تم الفاظ و معانی کی حدود سے گزر چکے ہو۔ لفظوں کی حرارت سے پتھروں کو پگھلایا جا سکتا ہے، معانی کی آگ سے آہن و فولاد کو نرم کیا جا سکتا ہے، مگر جو اپنے رب سے بدعہدی کے مرتکب ہوئے ہیں ان پر کوئی کلام اثر انداز نہیں ہو سکتا۔'' یہ کہہ کر حضرت امام شافعیؒ خاموش ہو گئے اور آپ نے آنکھیں بند کر لیں پھر کچھ دیر بعد امامِ عالم جذب بولنے لگے۔

''اے عزیز و جلیل! اپنے بندے شافعیؒ کو معاف فرما تیری کبریائی کی قسم! یہ محمد بن ادریس کا اظہارِ ذات نہیں، یہ نمائشِ عمل نہیں، یہ نمودِ علم نہیں۔ بس تیرے دین کی برتری ثابت کرنے کے لیے ایک حقیر سی کوشش ہے۔ مجھ ناتواں کو استقامت دے کہ تیری تائید کے بغیر ہر دعویٰ باطل ہے۔''

پھر امامؒ دوبارہ رومی راہبوں سے مخاطب ہوئے ''آیئے! میں آپ کو دریائے دجلہ کے بہتے ہوئے پانی میں دعوتِ مناظرہ دیتا ہوں'' یہ کہہ کر امام شافعیؒ نے اپنے کاندھے پر پڑا ہوا رومال اتارا جو سفر میں مصلے کا کام دیتا تھا پھر اس رومال کو بہتے ہوئے پانی پر بچھایا خلیفہ ہارون رشید اور دوسرے حاضرین دم بخود تھے خود عیسائی راہبوں کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پتھرائی ہوئی نظر آ رہی تھیں، دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ دریائے دجلہ کا پانی اپنی پوری رفتار سے بہہ رہا تھا لیکن امام شافعیؒ کا بچھایا ہوا رومال سطحِ آب پر نہ صرف ساکن تھا بلکہ نمی سے بھی مکمل طور پر محفوظ تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی جس نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ رومی راہبوں کو بھی حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اور یہ حیرت اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب حضرت امام شافعیؒ مصلے پر اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے آپ کے قدم فرشِ خاک پر ہوں۔

"اہلِ روم! آؤ میری طرف آؤ۔" فرزندِ قریش اپنے حریف راہبوں کو پکار رہے تھے۔ "یہاں آ کر مجھ سے مناظرہ کرو۔ اہلِ یقین کے لیے زمین ہو یا ہوا' آگ ہو یا پانی' سب برابر ہیں۔"

رومی راہبوں کو سکتہ سا ہو گیا تھا کچھ دیر تک وہ اپنی بینائی پر شک کرتے رہے مگر امام شافعیؒ انہیں نہایت پُرجلال لہجے میں مسلسل دعوتِ مناظرہ دے رہے تھے اور یہ ایک زندہ حقیقت تھی نظر کہاں تک فریب کھاتی؟ بالآخر رومیوں کو اعتبار آ گیا کہ امام شافعیؒ سطحِ آب پر کھڑے ہیں۔

"تم میری طرف آتے کیوں نہیں؟" حضرت امام شافعیؒ نے راہبوں کو دوبارہ پکارا' "وہ کیا چیز ہے جو تمہیں یہاں آنے سے روک رہی ہے؟"

"ہماری عبادت و ریاضت ابھی درجے تک نہیں پہنچی کہ دریائے دجلہ ہمارے لیے گزرگاہ بن جائے۔" ساتوں راہبوں نے بیک وقت جواب دیا۔

"عبادت و ریاضت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" امامؒ پر ایک کیفیت خاص طاری تھی۔ "یہ تو محض یقین کی آزمائش ہے میں جس خدا کی بندگی کا اقرار کرتا ہوں وہ ہر شے پر قادر ہے اگر تمہارے ذہن کے دروازے بند نہ ہوئے ہوں تو یاد کرو کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ کے لیے قلزم کو پایاب کر دیا تھا اور پھر اسی دریا نے فرعون اور آلِ فرعون کو نگل لیا تھا۔ آج بھی اسی خدا کا حکم ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ دریائے دجلہ اگر محمد بن ادریس کو گزر جانے کے لیے راستہ دے سکتا ہے تو پھر تم کیوں خوفزدہ ہو؟"

"امام! ہم اس قابل نہیں۔" رومی راہب چیخنے لگے "بے شک! ہم شدید گمراہی میں مبتلا تھے خدا کے لیے ہمیں ان اندھیروں سے نجات دو' آج ہمارا علم ہماری کفالت نہیں کرتا۔ ہمارے مجاہدات نے ہمیں بھٹکنے کے لیے جہل کے صحرا میں تنہا چھوڑ دیا۔ ہمیں اس منزلِ عشق کا پتا دو جس کے تم ایک جانباز مسافر ہو' وہ مسافر جو آگ سے ہراساں ہے نہ پانی سے خوفزدہ' جو ہوا سے پریشان ہے نہ خاک سے متاثر۔ آج ہم ان سارے عقائد سے تائب ہوتے ہیں جو ہمارے بزرگوں نے وراثت میں چھوڑے تھے۔" یہ کہتے کہتے تمام راہب گریہ وزاری کرنے لگے۔

حاکمِ روم کے شکست خوردہ سفیروں کا یہ حال دیکھ کر حضرت امام شافعیؒ دریا سے باہر آ گئے۔ عیسائی راہبوں کی ہر ایک منطق تباہ ہو چکی تھی اور ان کے علم نے انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد حاضرین کی نگاہوں کے سامنے یہ جانفزا منظر ابھر رہا تھا کہ عیسائیت کے فروغ کے لیے اپنے جسموں کو آزار پہنچانے والے، خدا کی وحدانیت اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر گواہی دے رہے تھے۔ یہ



حضرت امام شافعیؒ کا پہلا اور آخری مناظرہ تھا جس میں اہلِ دنیا نے آپ کے روحانی جلال کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی تھی۔

بعد میں حاکمِ روم کو یہ خبر پہنچی تو اس نے شکر ادا کرتے ہوئے کہا' "اگر سات راہبوں کی قربانی دے کر عیسائیت کو بچا لیا جائے تو یقیناً یہ بڑی کامیابی ہے۔"

اہلِ دربار اپنے حاکم کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے۔ "آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" کسی شخص نے سوال کیا۔

"مجھے مسلسل یہ خبریں مل رہی تھیں کہ مسلمانوں کا ایک امام بڑا قوی الحجت ہے۔ اس کے روبرو اہلِ علم کی زبانیں گنگ اور ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنے راہبوں کو بھیج کر اسے آزمانے کی کوشش کی تھی۔ تم اس حقیقت کو کیوں فراموش کرتے ہو کہ جن مذہبی رہنماؤں کو مناظرے کے لیے بھیجا گیا تھا وہ تمہارے بہترین عالم تھے جب وہی معتبر عیسائی اس شخص سے مل کر اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ بیٹھے تو پھر تمہارا کیا حشر ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم کس کیفیت سے دوچار ہوتے؟ مسیحؑ کی قسم! اگر مسلمانوں کا وہ امامؒ یہاں آ جاتا تو روم کے در و دیوار بھی محمدؐ کا کلمہ پڑھنے لگتے۔"

اس واقعے کو عظیم صوفی شاعر حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ نے اپنے مشہور تصنیف "تزکرۃ الاولیاء" میں بیان کیا ہے اور یہ وہی عطارؒ ہیں جن کی بارگاہِ معرفت میں علامہ اقبالؒ بھی خم نظر آتے ہیں

؎ عطار ہو' رومی ہو' رازی ہو' غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی !!

اہلِ نظر اس واقعے کی کوئی بھی توجیہہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ حضرت امام شافعیؒ ایک باکرامت امامؒ تھے۔ اگرچہ آپ نے دیگر صوفیائے کرام کی طرح کشف و کرامت کو اپنی روحانیت کے اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا لیکن پھر بھی فرزندِ قریش معرفت کے اس مقام پر فائز تھے جہاں پہنچ کر نظر کے سامنے بے شمار حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ اسی باعث مشہور بزرگ حضرت بلال خواص نے فرمایا تھا کہ جب شافعیؒ چار سال کے تھے تو اسی کم سنی میں آپ کو ہزار سالہ خلعت پہنا دی گئی تھی۔ رومی راہبوں کو اس طرح عاجز کر دینا بھی حضرت امام شافعیؒ کے روحانی کمالات کا ایک ہلکا سا عکس تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ آئمہ کرام کی زندگی کی اساس صرف عمل پر تھی ایسا عمل جسے دنیا کے سامنے ایک دلیل بنا کر پیش کیا جائے۔ ورنہ جہاں تک روایتی کشف و کرامت کا تعلق ہے تو یہ مردانِ جلیل معرفت کے ان رموز و

نکات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ہمارے نزدیک محدثین وفقہا اور صوفیائے کرام کے کشف وکرامت میں وہی فرق ہے جو رسالت مآب ﷺ اور دیگر انبیائے کرام کے معجزات میں فرق تھا۔ سرور کونین ﷺ کی ذات اقدس سے غیر ارادی طور پر کسی معجزے کا ظہور ہوتا تھا لیکن دیگر انبیائے کرام کو حق کی نشانی کے طور پر معجزات بخشے گئے تھے اور انہیں حکم بھی دیا گیا تھا کہ جب منکرین کی سرکشی حد سے گزر جائے تو وہ اپنی بات کو سمجھانے کے لیے زمین پر اللہ کی دی ہوئی نشانیوں کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس رسالت مآبﷺ سے ایک بار بھی نہیں کہا گیا کہ آپ اپنے دلائل کو تقویت دینے کے لیے کسی معجزے کا سہارا لیں۔ اس حقیقت کے باوجود کتب احادیث میں حضور اکرم ﷺ کے جن معجزات کا ذکر آتا ہے ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے سورج طلوع ہوتا ہے تو روشنی خود بہ خود پھیلتی ہے۔ حضرت امام مالکؒ بن انسؒ کی زندگی میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا کہ جسے دیکھ کر اہل مدینہ حیرت زدہ رہ گئے تھے۔

اس واقعے کی تفصیل یوں ہے کہ جب حضرت امام مالکؒ نے مجموعہ احادیث ''موطا'' کو تصنیف کرنا شروع کیا تو بعض افراد نے اس کا سبب پوچھا۔ جواب میں حضرت امام مالکؒ نے فرمایا میرے آقا کے جو فرمودات مجھ تک پہنچے ہیں ان کا تحریر کے دائرے میں آنا بے حد ضروری ہے۔ حافظے کا کوئی بھروسا نہیں۔ انسانی ذہن کسی وقت بھی نسیان کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ کیسا نقصان عظیم ہوگا جو احادیث مبارکہ میرے علم میں ہیں وہ دوسروں کو منتقل نہ ہو سکیں۔''

لوگ خاموش ہو گئے پھر کچھ دن تصنیف موطا کی خبریں عام ہوتی چلی گئیں جس سے متاثر ہو کر دوسرے محدثین نے بھی تحریری کام کا آغاز کر دیا۔ اس سلسلے میں دیگر محدثین کے جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ روز وشب تصنیفی کاموں میں غرق رہتے تھے اور ان کی تحریری رفتار بھی حضرت امام مالکؒ کے مقابلے میں بہت زیادہ تیز تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر امام مدینہؒ کی صحبت میں بیٹھنے والے کچھ ہمدرد افراد نے عرض کیا ''امامؒ آپ اس تصنیفی کام کی وجہ سے کیوں زحمت اٹھا رہے ہیں؟ آخر دوسرے اہل حدیث بھی تو اس کار عظیم میں مصروف ہیں اس مرحلہ شوق سے ان ہی کو گزر جانے دیجیے۔'' مشورہ دینے والے امام مالکؒ کو زیادہ مشقت سے بچانا چاہتے تھے یا ممکن ہے کسی شخص کے ذہن میں یہ اندیشہ بھی موجود ہو کہ امام مدینہ کو تحریر و تصنیف سے فطری شغف نہیں۔ اس لیے کہیں آپ کی یہ محنت دیگر محدثین کے مقابلے میں زیادہ اثر انگیز ثابت نہ ہو۔

حضرت امام مالکؒ بن انسؒ نے ان لوگوں کے مشورے کو بہت تحمل سے سنا اور پھر نہایت آہستہ سے فرمایا۔ ''میرے کام کو نام و نمود سے کوئی نسبت نہیں۔ میں یہ کام صرف اللہ کے لیے کر رہا ہوں۔''



''دوسرے لوگوں کے قدم بھی اللہ ہی کے راستے میں اٹھ رہے ہیں۔'' کہنے والوں نے کہا۔

''عنقریب لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ کس کا کام محض اللہ کے لیے ہے۔'' اتنا کہہ کر حضرت امام مالک بن انسؒ خاموش ہو گئے بعد میں بھی کچھ لوگوں نے اسی قسم کے سوالات اٹھائے۔ مگر امام مدینہؒ نے کوئی جواب نہ دیا۔

جب موطا کی تصنیف کا کام مکمل ہو گیا تو حضرت امام مالکؒ نے ایک بڑا سا طشت منگایا جو پانی سے لبریز تھا تمام اہل مجلس حیران تھے کہ آخر امام کو اس پانی کی کیا ضرورت ہے؟ اس وقت آپ کی مجلس میں وہ لوگ موجود تھے جو امام مدینہؒ کو موطا کی تصنیف سے باز رہنے کے مشورے دیتے تھے سب لوگوں کی نظریں امامؒ کے چہرہ مبارک پر مرکوز تھیں پھر اچانک امام مالکؒ نے اپنے تحریر کردہ تمام مسودات ہاتھ میں اٹھا لیے اور بڑے رقت انگیز لہجے میں فرمایا۔

''اے اللہ! میں نے یہ صفحات محض تیری رضا کے لیے تحریر کیے ہیں' میں گواہی دیتا ہوں کہ تو علیم و خبیر ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کا حال خوب جانتا ہے'' اس اقرار کے بعد حضرت امام مالکؒ نے اہل مجلس کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

''اگر ان میں سے کوئی ورق بھی بھیگ گیا تو مجھے اس کی ضرورت نہیں۔''

اہل مجلس سناٹے میں آ گئے۔ امام مدینہؒ کی خواہش بڑی عجیب خواہش تھی لوگ پانی کی فطرت سے واقف تھے کہ اس کا کام بھگونے کے سوا کچھ نہیں۔ پھر موطا کے یہ اوراق نم ہونے سے کس طرح بچ سکیں گے؟ حاضرین مجلس منتشر ذہنوں کے ساتھ سوچ رہے تھے اور امام مالکؒ کی تحریریں سطح آب پر تیر رہی تھیں۔

کچھ دیر گزر جانے کے بعد حضرت امام مالکؒ نے تمام اوراق پانی کے طشت سے نکال لیے۔ دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے پانی کی فطرت بھی بدل سکتی ہے مگر خورشید کی روشنی میں کس کی مجال ہے کہ ظلمت شب کا اقرار کرے ''موطا'' کے مسودات کا پانی سے محفوظ رہنا بھی ایک ایسا ہی عمل تھا کہ کسی شخص کے لیے جرأت انکار ممکن نہیں تھی۔ امامؒ کے حلقۂ درس میں موجود ہر فرد نے بار بار دیکھا مگر ''موطا'' کا ایک ورق بھی پانی سے نم نہیں ہو سکا تھا۔

یقین کی یہی وہ منزل تھی کہ جب تمام حاضرین مجلس بے اختیار پکار اٹھے تھے۔

''لاریب! امام مالکؒ کا یہ کام اللہ ہی کے لیے ہے۔''

امام شافعیؒ بھی حضرت امام مالکؒ ہی کے شاگرد تھے۔ ایسے شاگرد کہ امام مدینہؒ آپ کو فرزند کہہ کر پکارتے تھے تاریخ گواہ ہے کہ امام مالکؒ نے امام شافعیؒ کو بے شمار مواقع پر گلے لگایا تھا اور پھر اپنے عشقِ سوزاں کی حرارت فرزندِ قریش کے سینے میں منتقل کر دی تھی۔ یہ آگ کتابوں میں روشن نہیں ہوتی' اس آگ کا تعلق صرف دل سے ہے سارا عالم جانتا ہے کہ حضرت امام مالکؒ کی متاعِ قلب کے وارث صرف امام شافعیؒ تھے پھر اگر رومی راہبوں سے مناظرہ کرتے وقت امام شافعیؒ کا مصلہ پانی کی نمی سے محفوظ رہا تو لوگوں کو حیرت کیوں ہے؟

☆☆☆

اسی زمانے میں امام احمد بن حنبلؒ دوبارہ امام شافعیؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور پوری یکسوئی کے ساتھ علمِ فقہ کی تکمیل کی۔ ایک دن حضرت احمد بن حنبلؒ فرزندِ قریش کی بارگاہ میں حاضر تھے اور فقہ کے مختلف مسائل پر بحث جاری تھی۔ دورانِ گفتگو حضرت امام شافعیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا۔

''احمد! تمہارے نزدیک قصداً نماز ترک کر دینے والا کافر ہوتا ہے۔ پھر اس کے مسلمان ہونے کی کیا صورت ہے؟''

''نماز ادا کرے۔'' حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے جواب دیا۔ ''نماز ہی مومن کی پہچان ہے۔''

''بے شک! نماز ہی مومن کی نشانی ہے مگر وہ شخص تو تمہارے بقول کافر ہو گیا پھر ایک کافر کی نماز کس طرح درست ہو سکتی ہے؟'' حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا۔

امام احمد بن حنبلؒ یہ سن کر ساکت رہ گئے پھر نہایت عقیدت واحترام سے فرمانے لگے۔ ''آخر آپ امام ہیں ہم لوگ آپ کی نظر کی گہرائیوں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں؟''

اسی طرح ایک بار حضرت امام شافعیؒ اور حضرت احمد بن حنبلؒ جامع مسجد بغداد میں تشریف فرما تھے کہ اسی دوران ایک اجنبی شخص آیا اور نماز میں مشغول ہو گیا۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی نظر پڑی آپ نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ آدمی اپنے پیشے کے اعتبار سے لوہار معلوم ہوتا ہے۔''

امام احمد بن حنبلؒ کی بات سن کر حضرت امام شافعیؒ نے بھی اس اجنبی پر نگاہ کی۔ پھر فوراً ہی ارشاد فرمایا ''احمد! تمہاری بات بھی درست ہے مگر یہ شخص لکڑی کا کام کرتا ہے۔''

''امامؒ! یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں دونوں باتیں درست ثابت ہوں؟'' حضرت احمد بن حنبلؒ نے آہستگی کے ساتھ کہا۔



''میرا اندازہ ہی غلط تھا۔'' احترامِ استاد میں حضرت احمد بن حنبلؒ نے اپنے الفاظ واپس لے لیے۔

''کبھی کبھی وہ مقام بھی آجاتا ہے جہاں بیک وقت دونوں قیاس آرائیاں صحیح ثابت ہوتی ہے۔'' حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا۔ ''ذرا اس شخص کو نماز سے فارغ ہو جانے دو۔ پھر یہ عقدہ بھی حل ہو جائے گا۔''

کچھ دیر بعد جب وہ شخص نماز ادا کر کے جانے لگا تو حضرت امام شافعیؒ نے اسے اپنے پاس بلا کر پوچھا۔ ''تم کیا کام کرتے ہو؟''

''میں پیشے کے اعتبار سے بڑھئی ہوں۔'' اس شخص نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اس سے پہلے کیا کام کرتے تھے؟'' حضرت امام شافعیؒ نے اجنبی سے دوسرا سوال کیا۔

''ایک سال قبل لوہے کا کام کرتا تھا مگر بعض مجبوریوں کے سبب مجھے وہ پیشہ ترک کر دینا پڑا۔'' یہ کہہ کر اس شخص نے حضرت امام شافعیؒ سے اجازت لی اور مسجد سے نکل کر چلا گیا۔

''امامؒ! آپ کی فراستِ نظر کو کون پہنچ سکتا ہے؟ ہم سب تو راستے ہی میں رہ جانے والے ہیں' خدا آپ کو یونہی ہمارے درمیان رکھے کہ آپ کی موجودگی میں ہم اکثر مسائل سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔'' یہ کہتے کہتے فرطِ عقیدت سے امام احمد بن حنبلؒ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

حضرت امام شافعیؒ کے قیامِ بغداد کے دوران ہی ایک دن حضرت احمد بن حنبلؒ کی صاحبزادی نے سوال کیا ''آپ کے نزدیک امام شافعیؒ کا کیا مقام ہے۔''

جواب دینے سے پہلے امام احمد بن حنبلؒ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور آپ جذباتی کیفیت سے سرشار ہو کر فرمانے لگے ''میں کیا بتاؤں کہ امام کون ہیں؟ پہلے وہ نظر تو حاصل کر لوں جو ان کے چہرے کی طرف دیکھ سکے اور ان کی عظیم شخصیت کا جائزہ لے سکے۔''

صاحبزادی مسلسل اصرار کرتی رہیں۔ ''اگر آپ ہی امامؒ کی عظمت بیان نہ کریں گے تو پھر آنے والی نسلیں ان کے درجات کا تعین کس طرح کر سکیں گی؟''

''وہ مردِ جلیل دنیا میں سورج کی مانند ہے اور تمام جسموں کے لیے عافیت کا پیغام'' حضرت امام احمد بن حنبلؒ اپنے استادِ گرامی کو اس طرح خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے کہ بارِ عقیدت سے آپ کا سر جھکا ہوا تھا ''اگر وہ دنیا سے رخصت ہو گیا تو پھر اس کے پیچھے کون باقی رہ جائے گا؟''

ایک اور موقعے پر امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا۔ ''دنیا میں ایسا کوئی محدث نہیں ہے جس نے دوات و

قلم کو ہاتھ لگایا ہو اور اس کی گردن پر شافعیؒ کا احسان نہ ہو۔ ہمیں مجمل، مفسر اور ناسخ و منسوخ احادیث کا علم اس وقت تک نہیں ہوا۔ جب تک ہم شافعیؒ کی مجلس میں نہ بیٹھے۔'' (یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت امام شافعیؒ کے جس احسان کا ذکر کیا ہے اس کا اطلاق محدثین پر ہوتا ہے جو فرزندِ قریش کے براہِ راست شاگرد تھے یا آپ کے زمانے میں موجود تھے یا پھر بعد میں آنے والے تھے)

واقعتاً امام شافعیؒ ایسے ہی تھے اگر کوئی ذہن حسد و تعصب کے زنگ سے آلودہ نہ ہو تو پھر وہ کون ہے جو امام شافعیؒ کی بارگاہِ علم میں دست بستہ حاضر نہ ہوا ہو؟ امامؒ کی اسی جلالت اور کردار کی اسی بلندی نے خاص و عام کو فرزندِ قریش کی ذات کا اسیر بنا دیا تھا۔ آپ جہاں جاتے انسانی محفلیں شدتِ احترام سے ساکت ہو جاتیں اور محلات امراء کے در و دیوار پائے امامؒ کی جانب جھکے نظر آتے۔

ایک بار حضرت امام شافعیؒ اپنے ایک دوست کے مہمان ہوئے۔ امام کا دوست آج بے حد خوش تھا بار بار اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا تھا ''اگر آج خلیفہ وقت بھی میرے مکان پر قیام کرتا تو مجھے اتنی خوشی حاصل نہ ہوتی۔'' پھر وہ امام شافعیؒ سے اجازت لے کر جانے لگا اور اس کے ساتھ ہی اپنی کنیز کو کھانوں کی فہرست دے کر ہدایت کی ''آج دنیا کے سب سے بڑے انسان نے مجھے شرفِ مہمان نوازی بخشا ہے اس لیے تجھ پر بھی لازم ہے کہ بہترین کھانے تیار کر اور مجھے امامؒ کے سامنے سرخرو ہونے کا موقع دے۔''

اپنے آقا کے جاتے ہی کنیز امام شافعیؒ کے روبرو حاضر ہوئی ادب سے سلام کیا اور کہنے لگی ''ہر میزبان اپنے طور پر مہمان کی خاطر کرتا ہے مگر اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مہمان کو کیا چیز پسند ہے؟ آپ ہم پر کرم کریں اور اس فہرست میں اپنے پسندیدہ کھانوں کا اضافہ فرمائیں۔''

حضرت امام شافعیؒ بے حد سادہ غذا استعمال کرتے تھے۔ آپ کو پر تکلف کھانوں سے فطرتاً کوئی رغبت نہیں تھی۔ مگر کنیز کے اظہار سے مجبور ہو کر آپ نے قلم اٹھایا اور اس کی دل جوئی کے لیے رسمی طور پر فہرست میں چند کھانوں کا اضافہ کر دیا۔

کچھ دیر بعد حضرت امام شافعیؒ کا میزبان دوست واپس آیا اور اس نے کنیز کو دستر خوان سجانے کا حکم دیا جب تمام کھانے رکھے جا چکے تو میزبان کو حیرت ہوئی کھانے اس کی تیار کردہ فہرست سے زیادہ نظر آرہے تھے میزبان نے فوراً ہی کنیز کو خلوت میں طلب کیا اور ذرا سخت لہجے میں باز پرس کی ''تم نے میری



ہدایت کی مطابق دعوت کا اہتمام کیوں نہیں کیا؟ یہ کھانے اس فہرست سے مختلف کیوں ہیں جو میں نے تیار کی تھی؟''

''میں نے آپ کی ہدایت پر پورا عمل کیا ہے۔'' کنیز نے ادب سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''پھر یہ اضافی کھانے کیوں ہیں؟'' میزبان نے دوسرا سوال کیا۔

''مہمان کی خواہش کا احترام بھی ضروری ہے۔'' یہ کہہ کر کنیز نے وہ فہرست پیش کر دی جس میں حضرت امام شافعیؒ نے اپنے قلم سے کچھ کھانوں کا اضافہ کیا تھا۔

کاغذ دیکھتے ہی میزبان کا چہرہ بے پناہ خوشی کے جذبات سے چمکنے لگا۔ ''میں خود امامؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی اور عرض کیا تھا کہ آپ ہمیں اپنی پسند سے سرفراز فرمائیں۔'' کنیز آہستہ آہستہ بول رہی تھی اور اس کا آقا اپنے خیالات میں گم ہو گیا۔

''بے شک! تمہاری ذہانت و خدمت نے مجھے امامؒ کے سامنے سرخرو کر دیا۔ میں تمہارا ممنونِ احسان ہوں۔'' میزبان کے لہجے سے عجیب وارفتگی کا اظہار ہو رہا تھا ''آج کے بعد تم پر کوئی پابندی نہیں میں نے امام شافعیؒ کے صدقے میں تمہیں غلامی کی زنجیروں سے آزاد کیا۔''

ایک طرف فرزندِ قریش کے لیے لوگوں کے دلوں میں یہ ادب و احترام تھا اور دوسری جانب بعض علماء بھی حضرت امام شافعیؒ کے بارے میں اذیت ناک رویہ رکھتے تھے۔ ابنِ معینؒ اگرچہ خود بہت بڑے محدث و فقیہہ تھے لیکن ان کی سخت گوئی سے بہت کم لوگ ہی محفوظ رہ سکے تھے ایک بار ابنِ معینؒ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی مجلس میں موجود تھے اور مختلف لوگوں کو اپنے جارحانہ تبصرے کا ہدف بنا رہے تھے انہوں نے عبدالملک بن مروان کے بارے میں کہا ''وہ گندہ ذہن تھا اس کے منہ سے بو آتی تھی اور وہ بدترین انسان تھا۔'' پھر ابو عثمان نہدی کے متعلق کہا ''وہ کوتوال تھا۔'' مشہور تابعی حضرت طاؤسؒ پر اس طرح رائے زنی کی ''وہ شیعہ تھا'' حضرت امام احمد بن حنبلؒ بڑے صبر و ضبط کے ساتھ ان لوگوں کے بارے میں ابنِ معینؒ کی رائے سنتے رہے جو دنیا سے گزر چکے تھے (ممکن ہے حضرت امامؒ کی خاموشی اس لیے ہو کہ وہ مذکورہ شخصیات کے بارے میں تحقیقی علم نہ رکھتے ہوں) آخر میں ابنِ معینؒ نے امام شافعیؒ کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا ''وہ معتبر نہیں۔''

حضرت امام احمد بن حنبلؒ اپنے استادِ گرامی کے متعلق اس بے سروپا گفتگو کو برداشت نہ کر سکے اور نہایت سخت لہجے میں ابنِ معینؒ کو سرزنش کرتے ہوئے فرمایا ''خاموش رہو تمہاری ان آنکھوں نے شافعیؒ

جیسا انسان دیکھا بھی ہے؟''

ابو عمرؒ کہتے ہیں۔''امام ابوحنیفہؒ،امام مالکؒ جیسے جلیل القدر آئمہ کی شان میں جس کسی نے بدگوئی کی ہے اس پر اعشیٰ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

''کوہستانی بکرے نے چٹان کو توڑنے کے لیے ٹکر ماری مگر چٹان کا کچھ نہ بگڑا۔ یہاں تک کہ خود اس نے اپنا سینگ توڑ لیا۔''

ایک بار مشہور محدث حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے کہا گیا کہ فلاں شخص حضرت امام ابوحنیفہؒ کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے جواب میں عربی کا یہ اثر انگیز شعر پڑھا۔

''تجھ پر لوگ اس لیے حسد کرتے ہیں کہ خدا نے تجھے نیکیوں سے فضیلت بخشی ہے۔''

حضرت امام شافعیؒ کے ساتھ بھی مسلسل یہی صورتِ حال پیش آتی تھی مگر آپ ایک شان بے نیازی کے ساتھ مخالفین کے ان حاسدانہ مظاہروں کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ لوگوں نے نفرت و تعصب کی انتہا کر دی۔ تاریخ کے اوراق میں یہ کیسا اذیت ناک نسانی عمل محفوظ ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کی قدر و منزلت اور علمی برتری دیکھ کر بہت سے لوگ آپ کی موت کی تمنا کرنے لگے تھے۔ حاسدین کے اس گروہ میں کچھ ایسے افراد بھی شامل تھے جو ہر مقام پر مذہبی عالم ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ وہ اس زمین کے لیے قہرناک لمحات ہوں گے جب اہلِ علم کے ہونٹوں پر یہ کلمات لرزتے ہوں گے۔

''شافعیؒ کو موت آجائے۔''

عقل حیران ہے کہ ان لوگوں نے باخبر ہوتے ہوئے بھی امام شافعیؒ کے حق میں مسلسل بددعائیں کی۔ وہ عالم تھے مگر رسالت مآب ﷺ کے اس عملِ مقدس سے نا آشنا تھے کہ مسلمان کے لیے دشمن کے حق میں بددعا جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ سرورِ کونینؐ کے ضابطۂ اخلاق کی حدود سے نکل جاتا ہے۔ وہ حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے لیکن حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا یہ قول یاد نہیں تھا کہ اگر امام شافعیؒ دنیا سے اٹھ گئے تو پھر ان کے پیچھے کون باقی رہ جائے گا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کیسی بے خبری تھی، یہ کیسی جارحیت تھی؟

جب امام شافعیؒ کو اپنے حریفوں کے اس شدتِ جذبات کا علم ہوا تو آپ نے وہی اشعار پڑھے جو



اموی خلیفہ یزید بن عبدالملک نے بسترِ مرگ پر لیٹے لیٹے پڑھے تھے۔ اس واقعے کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ جب یزید عبدالملک مرض الموت میں مبتلا تھا تو کسی نے خبر دی تھی کہ ہشام اس کی جان لیوا بیماری سے بہت خوش ہے جواب میں یزید نے موت کی ازلی اور آفاقی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے چند اثر انگیز اشعار کا سہارا لیا تھا۔ اسی طرح جب امام شافعیؒ سے کہا گیا کہ لوگ آپ کی موت کی دعائیں مانگتے ہیں تو فرزندِ قریش نے بے ساختہ وہی اشعار پڑھے جو آخری لمحات میں خلیفہ یزید بن عبدالملک کی زبان پر تھے۔

''لوگ میری موت کی آرزو کرتے ہیں
اگر میں مر گیا تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہوگی
کیونکہ میں اس راستے میں اکیلا نہیں
جو قدرت کے اس قانونِ ازلی کی مخالفت چاہتا ہے
اس سے کہہ دو کہ وہ بھی اسی سلوک کے لیے تیار رہے
اس طرح کہ جیسے موت ابھی آجائے گی۔''

یہ اشعار پڑھ کر امامؒ نے فرمایا''لوگ اپنی جانوں کو اس قدر اضطراب میں کیوں مبتلا رکھتے ہیں؟ دنیا سے شافعیؒ کا جانا مقدر ٹھہرا ہے۔ آج نہیں تو کل ضرور چلا جائے گا ان سے کہو کہ اپنی زبانوں کو کیوں آلودہ کرتے ہیں؟ محمد بن ادریس کی زندگی کا سفر ختم ہونے ہی والا ہے۔'' امامؒ کا یہ جواب سن کر آپ کے عقیدت مندوں پر گریہ طاری ہو گیا۔

لوگوں کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا۔ وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگے''خدا انہیں دنیا سے کیوں نہیں اٹھا لیتا؟ وہ پہلے ہی زمین کے لیے ایک بوجھ ہیں۔''

ابھی لوگوں کا یہ جوابی مظاہرہ مزید شدت اختیار کرتا کہ حضرت امام شافعیؒ نے تند و تیز لہجے میں فرمایا''تم بھی برائی کا بدلہ برائی سے دے رہے ہو' جو زبان اپنے بھائی کی غیبت سے آلودہ ہو وہ کسی انسان کی زبان نہیں ہو سکتی۔ خبردار میری محبت میں اپنے نفس کے غلام نہ ہو جانا۔ اگر تم نے مجھ سے اظہارِ عقیدت کے لیے دوسروں سے نفرت کی تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ اپنے دل کشادہ رکھو۔'' امام کی پُرسوز تقریر سے نفرتوں کا جوابی طوفان تھم تو گیا مگر دلوں میں ایک عجیب سی خلش باقی رہی اور کیوں نہ رہتی؟ لوگ ایسے شخص کی موت کی دعائیں کر رہے تھے جس نے لاکھوں مردہ جسموں میں نئی

روح پھونکی تھی اور پھر انہیں ابدی زندگی سے ہمکنار کر دیا تھا۔

حضرت امام شافعیؒ بھی آخر انسان تھے۔ رحمت اللعالمین کی پیروی میں اپنے کسی حریف کو بد دعا تو نہ دے سکے مگر لوگوں کی اس اذیت ناک روش سے آپ کے قلبِ حساس کی شدید ٹھیس پہنچتی تھی۔ ایسے جارحانہ انداز میں کسی شیشے پر سنگ باری کرنا سراسر ایک وحشیانہ فعل تھا۔ امامؒ نے شکستہ ہو کر بھی اپنی قبائلی شجاعت کا مظاہرہ کیا اور کسی صورت بھی اپنے اسلامی کردار کی قبا کی داغ دار نہیں ہونے دیا لیکن بشری تقاضوں کے سبب آپ اداس ضرور ہو گئے تھے شاید اسی واقعے سے متاثر ہو کر حضرت امام شافعیؒ نے یہ جاں گداز اشعار کہے تھے۔

"کیا میں چوپایوں (حیوانوں) میں موتی بکھیروں
اور جانوروں کے لیے ہار گوندھنے لگوں
تم دیکھتے نہیں کہ میں بدترین آبادی میں ضائع ہو رہا ہوں
تو پھر کیوں ان لوگوں میں اپنے جواہرِ حکمت برباد کروں
جب خدائے رحیم مجھے اس مصیبت سے نجات دے دے گا
اور علم و حکمت کے اہل بھی دستیاب ہو جائیں گے
تو میں جواہر ریزے بکھیر کر ان کی محبت حاصل کروں گا۔
ورنہ تمام علم میرے پاس اسی طرح جمع اور پوشیدہ رہے گا۔"

حضرت امام شافعیؒ نے اپنے جس کرب کو اشعار میں بیان کیا ہے اسے سمجھنا آسان نہیں۔ بس اتنا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امامؒ جس دور میں پیدا ہوئے تھے وہ واقعتاً علم دوستی کا دور تھا۔ اس وقت اکابر فقیہہ بھی موجود تھے اور عظیم محدث بھی علم کی روشن مجلسیں بھی موجود تھیں اور اہلِ ذوق سامعین بھی قدم قدم پر فکر کے مظاہرے بھی تھے اور اہلِ زر کی نوازشیں بھی۔ گداز قلب بھی تھے اور نمناک آنکھوں والے بھی۔ اس کے باوجود حضرت امام شافعیؒ کو شکوہ تھا کہ

؎ "میں بدترین آبادی میں ضائع ہو رہا ہوں۔"

یہ کیسا سوز تھا؟ یہ کیسی خلش تھی؟ یہ کیسا اضطراب تھا؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم کہ جنہیں عقل چھو کر بھی نہیں گزری اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ حضرت امام شافعیؒ جیسے جامع الصفات انسان علم کی اس کشادہ فضا کو بھی اپنے لیے ایک حصار سمجھتے تھے۔ امامؒ کی قوت بال و پر کچھ اور تھی فضا کچھ اور، امام تو ایسے



جانباز تھے کہ تمام عمر آہنی قفس کے لے کر پرواز کرتے رہے جب اہلِ دنیا کے کھینچے ہوئے دائرے سے آگے نہیں جا سکتے تھے تو پھر اپنی محرومی کا گلہ کرنے لگتے تھے۔

"کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے"

مگر یہی امامؒ کا مقدر تھا کہ اسی زمین پر رہیں اور اسی آبادی سے خطاب کریں۔ دو سال تک امامؒ نے اہلِ بغداد میں علم کی دولت اس طرح تقسیم کی کہ اپنے دامن کا ایک ایک گوشہ خالی کر دیا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس سرمایہ عظیم سے کس کو کیا ملا؟ جہاں تک امامؒ کی ذات کا تعلق ہے تو آپ مادی اسباب کی طرح علمی وسائل میں بھی مرد سخی تھے۔ آپ نے بے شمار تہمتیں برداشت کر کے بھی اپنے دستِ سخاوت کو دراز ہی رکھا اور الفاظ و معانی کے انبار کو بے دریغ لٹاتے رہے۔

☆☆☆

حضرت امام شافعیؒ تیسری بار ۱۹۸ھ میں بغداد تشریف لائے مگر اس مرتبہ آپ کا قیام بہت مختصر تھا۔ صرف ایک ماہ ٹھہرے اور پھر مصر چلے گئے علمی اعتبار سے بغداد اور مصر کا کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ بغداد تمام علمائے اسلام کا مرکز تھا اور یہاں امام شافعیؒ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ اصولی طور پر امام شافعیؒ کو بغداد ہی میں ٹھہرنا چاہئے تھا کیونکہ جس شخص کی زندگی کا مقصد ہی تبلیغ و اشاعتِ علم قرار پایا ہو وہ کس طرح ایک سرسبز و شاداب علاقے کو چھوڑ کر نسبتاً ویران مقام کا انتخاب کر سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جس سے دلوں میں خلش پیدا ہوتی ہے اور ذہن پریشان ہونے لگتے ہیں' آخر وہ کیا صورتِ حال تھی جس نے امام شافعیؒ جیسے یکتائے روزگار کو بغداد چھوڑنے پر مجبور کر دیا؟ کیا امامؒ پر در پردہ کوئی جبر کیا گیا تھا کہ جس سے گھبرا کر امامؒ نے مرکزِ علم سے منہ موڑ لیا اور مصر چلے گئے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر سنجیدگی کے ساتھ غور تو کیا جا سکتا ہے مگر اس کا جواب اثبات میں برآمد نہیں ہو سکتا جن لوگوں نے حضرت امام شافعیؒ کے سیرت و کردار کا سرسری مطالعہ کیا ہے وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرزندِ قریش مصائب و مسائل کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے انسان نہیں تھے جس مردِ قلندر نے "ضرورتِ شکم" اور "آرائشِ بدن" کو ایک لمحے کے لیے بھی لائقِ التفات نہ سمجھا ہو اس کے سامنے شورِ اقتدار اور آہنگِ زر کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ ہارون رشید کے قائم کردہ مقتل میں شمشیرِ اختیار جس کی پلکیں تک نہ جھپکا سکی ہو اس کے جسم پر جبر کا کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔ جو مسلسل پچاس سال تک مکتب میں حلقۂ درس میں، وادی میں، صحرا میں، سازش کے زنداں میں، نفس کے مقتل میں سر بکف پھرتا رہا ہو اسے

اقتدارِ عارضی کے چند کوچہ گرد چند خانہ بدوش کس طرح خوف زدہ کر سکتے تھے؟ اس نے تو بارگاہِ ذوالجلال میں عہد کیا تھا کہ میں تیرا بندہ ہوں اور اس اقرار کے بعد ایک بندہ دوسرے بندے خائف نہیں ہو سکتا۔ امام شافعیؒ بھی بندگی کے اس مقام پر تھے جہاں اقتدارِ آسمانی کے سوا ہر اقتدار کی نفی ہو جاتی ہے انسانی کردار کی اس روشنی میں امام شافعیؒ کا اعلیٰ ظرف دشمن بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ امامؒ کسی جبر و تشدد کے خوف سے بغداد چھوڑ کر تشریف لے گئے تھے۔

پھر وہ کیا اسباب تھا کہ اچانک امام شافعیؒ کی رہ گزر بدل گئی؟ غیر جانبدار مورخین نے اپنے طور پر اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جس سے اہلِ نظر بڑی حد تک مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ان تاریخ نویسوں کے خیال میں ہارون رشید کا انتقال ہی امام شافعیؒ کے ترکِ بغداد کا بنیادی سبب تھا۔ ہارون رشید کی موت کے بعد اس کے دونوں بیٹے خلافتِ عباسیہ کے دعویدار تھے۔ ایک طرف امین تھا جو زبیدہ خاتون کے بطن سے تھا۔ دوسری جانب مامون رشید تھا جو ایک بادغیسیہ کنیز کی اولاد تھا۔ اس طرح شرافتِ نسبی کے اعتبار سے امین صحیح النسل عرب تھا اور اسے مامون رشید پر خاندانی برتری حاصل تھی، یہی وجہ ہے کہ ہارون رشید نے اپنی زندگی ہی میں امین کو ولی عہد نامزد کر دیا تھا۔ نتیجتاً باپ کے رخصت ہوتے ہی اقتدارِ اعلیٰ امین کو منتقل ہو گیا مگر یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ وہ مامون کے حسد کا شکار ہوا اور پھر دونوں بھائی اپنی اپنی قسمتوں کا فیصلہ کرنے کے لیے میدان جنگ میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اگر وسعتِ نظر کے ساتھ اس معرکہ آرائی کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ مذکورہ جنگ 'عرب اور ایران کی جنگ تھی' امین کی حمایت میں عرب شمشیریں بے نیام ہوئی تھیں اور مامون رشید کی پشت پر اہلِ فارس متحرک تھے۔ بالآخر امین اپنے خون میں نہا گیا اور مامون نے بھائی کی لاش پر قصرِ خلافت کی نئی بنیاد رکھ دی۔ اگر اس جنگ کے نتائج کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو واضح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عرب شکست کھا گئے اور اہلِ ایران فتح سے ہم کنار ہوئے۔

سیاسی اعتبار سے یہ سود تھا یا زیاں؟ ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں چاہتے مگر اتنا ضرور ہے کہ مامون کی سر خروئی سے مذہب کی عمارت میں شگاف ڈالنے والوں کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔ وہ فتنہ پرواز جو سناٹے اور اندھیرے میں لشکرِ اسلام پر شب خون مارا کرتے تھے۔ اب برسرِ عام مذہبی عقائد میں خلل انداز ہونے لگے' یہ معتزلہ کی جماعت تھی جو ہارون رشید کے عہدِ حکومت تک منہ چھپائے پھرتی تھی' مامون کے اقتدار میں آتے ہی سر اٹھا کر شاہراہوں پر چلنے لگی پھر دیکھتے ہی دیکھتے معتزلہ نے مامون کا اس قدر قرب



حاصل کر لیا کہ وہ اس کے ہوش و حواس پر چھا گئے۔ اس گروہ کے سردار ابوداؤد نے تو یہاں تک عروج حاصل کر لیا کہ کبھی کبھی تو یہ گمان ہوتا تھا جیسے زمامِ کار مامون رشید کے بجائے ابوداؤد کے ہاتھوں میں ہے۔

یہ صورتِ حال حضرت امام شافعیؒ کے لیے سخت ناپسندیدہ تھی۔ آپ معتزلہ اور ان کے طریقۂ بحث سے شدید نفرت کرتے تھے۔ امامؒ کے نزدیک ہر وہ شخص سزا کا مستحق تھا جو معتزلہ کا انداز فکر رکھتا ہو ان کی زبان میں بولتا ہو اور عقائد کے سلسلے میں ان کے راستے پر چلتا ہو۔ حضرت امام شافعیؒ کی فراستِ نظر مذہب کے افق پر نئے فتنوں کو طلوع ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اس لیے آپ ایک ماہ تک ناقابلِ بیان کرب میں مبتلا رہے اور پھر انتہائی مایوسی کے عالم میں رختِ سفر باندھنے لگے۔

مصر روانگی سے پہلے خلیفہ مامون رشید نے ایک بار امام شافعیؒ کو دربار میں طلب کیا تھا۔ بظاہر بہت عزت و احترام سے پیش آیا تھا اور پھر اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا ''امامؒ! میں چاہتا ہوں کہ آپ منصبِ قضا قبول کر لیں میری نظر میں اس عہدے کے لیے آپ مناسب ترین شخص ہیں۔''

حضرت امامؒ نے جواباً فرمایا تھا۔ ''یہ امیر المومنین کا حسنِ ظن ہے جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں' ورنہ حقیقتاً میں اپنے آپ کو اس منصب کا اہل نہیں پاتا۔''

امامؒ کی معذرت کے بعد مامون نے اصرار نہیں کیا تھا اور اگر کرتا بھی تو امامؒ بہر حال اپنا دامن چھڑا لیتے یا اس طرح کنارہ کشی ممکن نہ ہوتی تو پھر امامؒ کو یقیناً جبر و تشدد کے سخت مراحل سے گزرنا پڑتا۔ منصب قضا سے امامؒ کا انکار آپ کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ جب ہارون رشید جیسے علم دوست اور صحیح العقیدہ حکمراں کے دور میں امام شافعیؒ نے یہ عہدہ قبول نہیں کیا تو پھر مامون کے زمانے میں کس طرح قبول کر لیتے جبکہ اس کی عقل ابوداؤد جیسے مفسد کے یہاں رہن رکھی ہوئی تھی اگر معتزلہ کو مامون کے دربار میں عروج حاصل نہ ہوتا تو شاید امام، خلیفہؒ کی پیش کش پر غور کرتے مگر ابوداؤد کی موجودگی میں منصبِ قضا کے بارے میں سوچنا بھی امام شافعیؒ کے لیے حرام تھا۔

اسی دوران والیٔ مصر عباس بن عبداللہ نے حضرت امام شافعیؒ کو قیامِ مصر کی دعوت دی۔ یہ شخص خود بھی ہاشمی النسل تھا اس لیے امامؒ کی اعلیٰ نسبی سے بخوبی واقف تھا۔ نتیجتاً فرزندِ قریش نے سامانِ سفر باندھا اور مصر کی جانب روانہ ہو گئے سرزمینِ بغداد کو الوداع کہتے وقت حضرت امام شافعیؒ بہت اداس تھے اس سوگواری کا اندازہ امامؒ کے ان دو شعروں سے ہوتا ہے جو بغداد سے عین روانگی کے وقت کہے گئے تھے

”میں مصر جا رہا ہوں‘ میدانوں اور گھاٹیوں کو طے کرتا ہوا
خدا کی قسم! میں نہیں جانتا کہ یہ نصرت و کامرانی ہے یا قبر کی کشش ہے جو مجھے مصر لیے جا رہی ہے۔“

☆☆☆

حضرت امام شافعیؒ نے مصر میں چار سال تک قیام فرمایا۔ اس دوران آپ نے تین ہزار صفحات تحریر کیے اور اپنی بعض کتابوں پر نظر ثانی کی۔ امامؒ کا طریقہ تصنیف یہ تھا کہ آپ مسجد میں بھی تحریری کام کیا کرتے تھے اور اندرون خانہ بھی۔ حرملہ سے روایت ہے ”حضرت امام شافعیؒ مسجد کے ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔ یہاں آپ کے لیے ایک بستر بچھا دیا جاتا اور پھر امامؒ لکھنا شروع کر دیتے۔“

قیامِ مصر سے پہلے آپ کے طریقۂ تصنیف کے بارے میں ربیع بن سلیمانؒ کا بیان ہے۔” حضرت امام شافعیؒ کی خدمت کے لیے ایک سیاہ فام باندی مامور تھی۔ جب آپ کچھ لکھنا چاہتے آواز دیتے۔

”اے جاریہ! اٹھ اور چراغ جلا دے۔“

باندی حکم پاتے ہی اٹھ جاتی اور چراغ روشن کر دیتی۔ پھر جب تک آپ کا دل چاہتا بیٹھے ہوئے لکھتے رہتے۔ ہمیشہ آپ کا یہی معمول ہوتا‘ کام ختم کرنے کے بعد حضرت امامؒ خود ہی چراغ بجھا دیتے۔ میں نے ایک بار پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ جواباً امام نے فرمایا” چراغ کی روشنی میں خیالات یکسو نہیں رہتے۔“

ابھی امامؒ کا یہ تصنیفی مشغلہ جاری تھا کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے تاریخ پر بڑے اندوہناک اثرات مرتب کیے۔ امام شافعیؒ بہت دن تک شدید اذیت ناک کیفیت سے دوچار رہے اور پھر آپ اپنے استادِ گرامی حضرت امام مالک بن انسؒ کے خلاف کتاب لکھنے پر مجبور ہو گئے‘ واقعہ یہ تھا کہ کچھ لوگ حضرت امام مالکؒ کی عقیدت میں اس قدر غرق ہو چکے تھے کہ امام مدینہؒ کی باتوں کو قولِ رسولؐ کا درجہ دینے لگے تھے۔ پہلے مسلمانوں کا عام طریقہ یہی تھا کہ حدیث بیان کرتے ہوئے کہتے۔

”رسالت مآب ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔“

مگر بعد میں ایسے افراد بھی پیدا ہو گئے جو برملا کہا کرتے تھے ”امام مالکؒ نے یہ فرمایا ہے“ قیامِ مصر کے دوران جب حضرت امام شافعیؒ نے لوگوں کا یہ طرزِ گفتگو دیکھا تو آپ کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ شب و روز بس ایک ہی بات سوچتے رہتے کہ آخر عقیدت کا یہ سیلاب کہاں جا کر تھمے گا؟ امام مالکؒ بھی بہر حال



انسان تھے۔ ان سے بھی غلطی کا ارتکاب ہو سکتا تھا۔

امام شافعیؒ مسلسل غور و فکر میں ڈوبے ہوئے تھے اور اس سنگین مسئلے کا حل تلاش کر رہے تھے کہ ان ہی دنوں امامؒ کو ایک اور خبر ملی۔ بتانے والوں نے بتایا کہ اندلس میں حضرت امام مالکؒ کی ایک ٹوپی ہے جس سے عام لوگ برکت حاصل کرتے ہیں عقیدت کی یہ وہی لہر تھی جو مختلف رنگ اختیار کرتی جا رہی تھی۔

انجام کار امام شافعیؒ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ آپ کو بعض امور میں اپنے استادِ گرامی سے اختلاف کرنا چاہیے۔

امام شافعیؒ جیسے شاگردِ جلیل کے لیے یہ بڑا تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ خود امامؒ اپنی اس اذیت ناک کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ”لوگوں کو کیا معلوم کہ اس عرصے میں میرے دل پر کیا گزری ہے؟ میں سال بھر تک اپنے اللہ سے استخارہ کرتا رہا ہوں‘ تب کہیں جا کر یہ جرات کی ہے۔“ ایک دوسرے موقع پر نہایت رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔” خدا کی قسم! میں نہایت مجبور ہو گیا تھا۔“

حضرت امام شافعیؒ کا لقب ”ناصر الحدیث“ تھا۔ ------------- پھر ایک ایسے شخص کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ لوگ امام مالکؒ کی محبت میں حدیثِ رسولؐ کے تقدس کو مجروح کریں اور ”ناصر الحدیث“ خاموش تماشائی بن کر ایک گوشے میں بیٹھا رہے۔ امامؒ کی تو پوری زندگی کتاب و سنت کے لیے اہلِ زمین سے جنگ کرتے گزری تھی۔ پھر اس نازک ترین مرحلے میں آپ کے ہونٹوں پر کس طرح مہرِ سکوت قائم رہتی؟ بالآخر امام شافعیؒ لب کشا ہوئے مگر اس طرح کہ اب بھی آپ کی گردن فرطِ ادب سے بارگاہِ مالکؒ میں جھکی ہوئی تھی۔

جب حضرت امام شافعیؒ کی کتاب منظر عام پر آئی تو مصر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ یہ پورا علاقہ حضرت امام مالک بن انسؒ کے زیر اثر تھا۔ اب یہ ایک فطری بات تھی کہ جہاں امامِ مدینہؒ کے لباس تک کو تقدس کا درجہ حاصل ہو وہاں امامؒ کی شخصیت کے خلاف ایک لفظ بھی کس طرح سنا جا سکتا تھا۔ کسی نے یہ سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی کہ حضرت امام شافعیؒ کو اپنے استادِ گرامی سے کیا اختلاف ہے؟ جب انسانی جذبات کا یہ حال ہو تو پھر کہاں کی عقل اور کیسے دلائل؟ عقیدت نے ایک ایک لفظ کو جھٹلا دیا‘ عوام کا تو ذکر ہی کیا‘ وہ لوگ جو صاحبِ ہوش تھے انہیں بھی عقیدت کی راہ میں بے خبر ہو جانا پڑا۔ اہلِ علم کا یہ گروہ اچھی طرح جانتا تھا کہ حضرت امام مالک بن انسؒ کو حضرت امام شافعیؒ سے ایک نسبت خاص تھی مگر آج ذہن

اس قدر منتشر ہو چکے تھے کہ کسی کو ماضی کا ایک نقش بھی یاد نہیں تھا۔

کسی کی یادداشت میں وہ واقعہ بھی محفوظ نہیں تھا کہ جب امام شافعیؒ حضرت مالک بن انسؒ کی خدمت میں آخری بار حاضر ہوئے تو اس وقت امامِ مدینہؒ کی عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ ان دنوں حضرت امام شافعیؒ کا ایک ہی کام تھا کہ آپ امام مدینہؒ کی درس گاہ کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے تھے اور جو شخص بھی حضرت امام مالکؒ سے کسی فتوے پر دستخط لے کر نکلتا' آپ اس کا بغور مطالعہ کرتے۔ اگر جواب مکمل ہوتا تو سوال کرنے والے کو رخصت کر دیتے اور اگر کسی کے جواب میں کوئی کمی باقی رہ جاتی تو دوبارہ امام مالکؒ کی خدمت میں بھیج دیتے۔ امام شافعیؒ کا یہ طرزِ عمل معاذ اللہ اپنے استاد پر تنقیص و تنقید کے زمرے میں نہیں آتا۔ حضرت امام مالکؒ ضعیفی کی جس منزل سے گزر رہے تھے اس کا فطری تقاضا تھا کہ انسانی ذہن کسی سہو کا شکار ہو سکتا ہے۔ امام شافعیؒ کا بھی یہی اندازہ تھا جس کے سبب حضرت امام مالکؒ کے بعض جوابات پر نسیان کا اثر صاف نظر آتا تھا۔ امام شافعیؒ بڑے ادب کے ساتھ اس کمی کی طرف اشارہ کر دیتے اور امامِ مدینہؒ فوراً ہی اس خامی کو دور کر کے مکمل جواب لکھ دیتے۔ نہ یہ کوئی عام شاگردی تھی اور نہ عام استادی۔ یہ علم کا ایک مخصوص رشتہ تھا جو محض خدا اور رسولؐ کی محبت کی بنیادوں پر قائم ہوا تھا۔ نتیجتاً جب حضرت امام شافعیؒ کسی نامکمل فتوے کو دوبارہ بارگاہ مالکؒ میں بھیج دیتے تو امامِ مدینہؒ برا ماننے کے بجائے محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر تمام لوگوں کے سامنے فرماتے۔

''میرا فرزند ایسا ہی ذکی و فہیم ہے جب مالک کسی کوتاہی کا مرتکب ہو جاتا ہے تو محمدؒ اس کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔''

لوگوں کو وہ منظر بھی یاد نہیں رہا جب حضرت امام شافعیؒ ''موطا'' کی قرات کرتے کرتے ٹھہر جاتے تو امام مالکؒ نہایت جذب واثر کے لہجے میں فرماتے ''فرزند اور۔ فرزند اور۔''

اہلِ مصر نے امام مدینہ کا وہ قول مبارک بھی فراموش کر دیا' جب حضرت امام مالکؒ نے برسرِ مجلس فرمایا تھا ''میرے پاس علم حاصل کرنے والوں میں محمد بن ادریس شافعیؒ سے بڑھ کر کوئی ذہین شخص نہیں آیا۔''

لوگوں نے محبت والتفات کے وہ مناظر بھی بھلا دیئے جب امام مدینہؒ مسلسل گیارہ سال تک فرزندِ قریش کو گیارہ ہزار دینار بھیجتے رہے۔

اگر آج ان کا حافظہ ساتھ چھوڑ گیا تھا اور وہ اس وقت کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ حضرت امام مالک بن



انسؒ اور حضرت امام شافعیؒ میں کیا تعلق خاص تھا تو کم سے کم اس کتاب کی وجہ تصنیف ہی جان لی ہوتی مگر آج کوئی اپنے ہوش میں نہیں تھا' کسی نے امام شافعیؒ کے خلوص کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ حضرت امامِ اعظم ابو حنیفہؒ سے ان کے شاگردانِ جلیل ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے بھی اختلاف کیا تھا لیکن اس وقت سر زمینِ عراق پر کوئی ہنگامہ آرائی نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک امام شافعیؒ تھے جن کے اظہارِ اختلاف کے سبب دیارِ مصر پر قیامت سی نازل ہو گئی تھی۔

وہ مصر' جہاں قیام کر کے امام شافعیؒ نے اہلِ مصر کو شرف بخشا تھا' آج اسی مصر کے در و دیوار سے فرزندِ قریش کے خلاف آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ایسی آوازیں جن میں تردید و احتجاج نہیں' نفرت و غضب کا اظہار تھا۔ پھر یہی لوگ گروہ در گروہ والئ مصر کے دربار میں پہنچے اور جارحانہ انداز میں مطالبہ کرنے لگے۔

خود والئ مصر کی دعوت پر حضرت امام شافعیؒ یہاں تشریف لائے تھے۔ پھر وہ کس بنیاد پر امامؒ کو مصر بدر کر دیتا؟ اس نے بڑے تحمل سے مالکی حضرات کا مطالبہ سنا اور جواباً ان سے پوچھا۔ ''آخر امامؒ کا کیا قصور ہے؟''

''اس نے حضرت امام مالکؒ کے خلاف کتاب تحریر کی ہے۔'' آج عقیدت مندوں کا ہجوم گفتگو کے آداب بھی بھول گیا تھا لوگوں کو اپنے لہجوں پر قابو نہیں رہا تھا اور وہ یہ فراموش کر بیٹھے تھے کہ ان کی زبانیں کس عظیم محدث و فقیہہ کی شان میں گستاخی کی مرتکب ہو رہی ہیں۔

''یہ تو محض ایک علمی معاملہ ہے' تحقیقی مسئلہ ہے' آپ حضرات بھی امام شافعیؒ کی تصنیف کے جواب میں کوئی کتاب تحریر کر دیں۔ اہلِ علم خود اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ امام مالکؒ سے کوئی سہو ہوا ہے یا امام شافعیؒ سے کوئی کوتاہی ہو رہی ہے۔ یہ جرم اتنا سنگین تو نہیں کہ اس شخص کو حدودِ مصر سے خارج کر دیا جائے جس کی قربت کے لیے ملتِ اسلامیہ ترستی رہتی ہے۔'' والئ مصر کا طرزِ عمل جانبدارانہ نہیں تھا بلکہ وہ مشتعل لوگوں کے سامنے ایک زندہ حقیقت بیان کر رہا تھا۔ ''پھر تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تمام انسانوں سے زیادہ امام مالکؒ' امام شافعیؒ پر مہربان تھے۔ میری رائے یہی ہے کہ اس تعلق خاص کو سمجھنے کی کوشش کرو اور پھر امام شافعیؒ کی کتاب کو فراخدلی سے پڑھو کہ آخر وہ اپنے استادِ گرامی سے کیوں اختلاف کر رہے ہیں۔''

والئ مصر نے نہایت مدبرانہ انداز میں اس سنگین صورت حال کا سامنا کیا اور مالکیوں کے ہجوم کو خاموش کر کے واپس لوٹا دیا۔

حضرت امام شافعیؒ کے مصر سے اخراج کا مطالبہ کرنے والے بظاہر خاموشی کے ساتھ لوٹ آئے تھے مگر اب ان کے دل و دماغ میں ایک شور برپا تھا۔ خوف اقتدار سے لوگوں کی آوازیں تو بلند نہیں ہو سکی تھیں لیکن پھر بھی سرگوشیاں جاری تھیں۔ والی مصر پر امام شافعیؒ کے بے جا حمایت کا الزام عائد کیا جارہا تھا۔ بالآخر جب یہ مالکی حضرات امام شافعیؒ کو مصر سے نکالنے کی کوششوں میں ناکام ہو گئے تو ایک اور منصوبہ تیار کیا گیا۔ یہ منصوبہ حضرت امام شافعیؒ کی توہین واہانت پر مشتمل تھا۔ یہ جذباتی لوگ امامؒ کی مجلس درس میں جاتے اور نہایت گستاخانہ انداز میں آپ سے مناظرہ کرتے، مگر امام شافعیؒ نہ مشتعل ہوتے اور نہ اپنی زبان کو کسی غیر سنجیدہ لفظ سے آلودہ کرتے۔

پھر ایک دن بڑا اذیت ناک واقعہ پیش آیا۔ حضرت امام مالک بن انسؒ کے شاگردوں میں سے ایک شخص مصر میں رہتا تھا جسے لوگ ''جوان'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اس کے مزاج کی تیزی اور غصے کی زیادتی دور دور تک مشہور تھی۔ وہ بہت معمولی باتوں پر مشتعل ہو کر اخلاقیات کی تمام حدود سے گزر جاتا تھا۔ مالکی حضرات نے اسی ''جوان'' کو حضرت امام شافعیؒ سے مناظرے کے لیے تیار کیا تھا۔ وہ نہایت غیر مہذب انداز میں امامؒ سے بحث کرتا اور اس کے دوسرے ہم نوا اس مناظرے سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔ یہ سلسلہ بہت دن سے جاری تھا مگر امام شافعیؒ نے ایک بار بھی اس کی گستاخیوں کے سامنے اپنی بیزاری کا اظہار نہیں کیا تھا۔ آخر ایک روز ''جوان'' نے محفل حدیث وفقہ کے تقدس کو پامال کر ڈالا۔ یہ مناظرے کے دوران ''جوان'' برانگیختہ ہو گیا اور اس نے حضرت امام شافعیؒ کو بڑی بے ہودہ گالی دی۔ یہ ایک ایسا حرف بد تھا کہ جس کے آگے تمام دشنام طرازیاں ہیچ تھیں۔ حاضرین مجلس کا خیال تھا کہ امامؒ اس ذلت آمیز طرز کلام کو برداشت نہ کر سکیں گے لیکن اس وقت سب لوگ حیران رہ گئے جب امامؒ کے ماتھے پر نہ کوئی شکن نمودار ہوئی اور نہ چہرے پر نفرت وانتقام کوئی رنگ ابھرا۔ آپ نے بے مثال متانت وسنجیدگی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ مخالفین کی بڑی تعداد جو امام شافعیؒ کی مجلس درس میں موجود تھی ''جوان'' کے غیر انسانی عمل سے لطف اندوز ہوتی رہی اور امام شافعیؒ اتمام حجت کے لیے آخری وقت تک اسی انداز میں مناظرہ کرتے رہے جیسے مجلس میں کوئی ناگوار واقعہ پیش ہی نہ آیا ہو۔ پھر مجلس ختم ہو گئی اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جب مالکی جماعت رخصت ہوئی تو ''جوان'' ان کے درمیان یوں چل رہا تھا جیسے وہ کسی اقلیم کا فاتح ہو۔

دوسرے دن کسی شخص نے والی مصر کو اس کربناک سانحے کی اطلاع دے دی۔ اس نے فوراً ہی اپنے



کچھ سپاہیوں کو بھیج کر حضرت امام شافعیؒ سے درخواست کی ''میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا مگر امورِ سلطنت کے ہجوم میں فراغت کے چند لمحات بھی میسر نہیں۔ اس لیے آپ ہی کو زحمت دے رہا ہوں کہ تشریف لا کر مجھے سعادتِ عظیم بخشیں۔''

حضرت امام شافعیؒ سپاہیوں کے ہمراہ دربار میں پہنچے تو والیٔ مصر احتراماً کھڑا ہو گیا پھر اس نے ''جوان'' کی بے ہودگیوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت امام شافعیؒ سے واقعے کی تفصیل معلوم کی۔ امامؒ نے بے کم وکاست پورا واقعہ سنا دیا۔ اس کے بعد والیٔ مصر نے چند اور معتبر لوگوں کی گواہیاں طلب کیں جو اس وقت امامؒ کی مجلس درس میں موجود تھے۔ ان حضرات نے بھی ''جوان'' کے ناشائستہ سلوک کی تصدیق کر دی۔ اس کارروائی کے دوران والیٔ مصر کا چہرہ بار بار متغیر ہو جاتا تھا۔ جب ضروری شہادتیں تکمیل پا چکیں تو والی مصر کی جذبات بے قابو ہو گئے۔ اہلِ دربار کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''خدا کی قسم! اگر امام شافعیؒ جیسے کسی دوسرے محترم انسان نے بھی یہی گواہی دی ہوتی تو میں اس شخص کے قتل کا حکم صادر کر دیتا۔''

پھر اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ''جوان'' کو کوڑے لگائے جائیں اور اونٹ پر بٹھا کر سارے شہر میں اس کی تشہیر کی جائے۔ کچھ دیر بعد مقامی باشندوں نے یہ لرزہ خیز منظر دیکھا کہ اس دریدہ دہن کے جسم پر تازیانے برس رہے تھے پھر وہ زخموں سے نڈھال ہو گیا تو اسے اونٹ پر بیٹھا کر تمام گلی کوچوں میں پھرایا گیا۔ ہر موڑ پر ایک سپاہی بلند آواز میں پکار کر کہتا تھا۔

''اے بنی نوع آدم! غور سے دیکھو۔ یہ اس انسان کی سزا ہے جو رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کو اپنی دشنام طرازی کا ہدف بناتا ہے۔''

اگرچہ حضرت امام شافعیؒ نے سزا دیے جانے سے پہلے اپنے طور پر ''جوان'' کو معاف کر دیا تھا لیکن والیٔ مصر نے اس ذیل میں شدت اختیار کر لی تھی اور امامؒ سے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا ''اگر میں اس گستاخ کو سزا کے بغیر چھوڑ دوں تو دوسرے کم ظرفوں کے حوصلے بھی بلند ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ پھر کسی اہلِ علم کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔''

والیٔ مصر کے جذبات اپنی جگہ حقیقت پسندانہ تھے لیکن اس کی عقیدت نے بالآخر پوری زمین کے علم کے خون سے سرخ کر دیا۔ ''جوان'' کو تو اخلاق سوزی کی سزا مل چکی تھی اور لہو کی چھینٹوں سے وقتی طور پر اس کی نفرتوں کے شعلے سرد ہو گئے تھے مگر اس کے حامیوں میں غیظ وغضب کی نئی آگ بھڑک اٹھی تھی پھر

بڑی رازداری کے ساتھ ایک خونین منصوبہ ترتیب دیا گیا۔

فرزندِ قریش کے درس کا آغاز ہوا۔ تشنگانِ علم، فکرو آگہی کے سمندر کے کنارے جمع ہونے لگے۔

کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ حدیث وفقہ کی محفل میں قاتلوں کا گزر بھی ہوسکتا ہے اور کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ اہلِ تقویٰ کے لبادوں میں خنجر بھی پوشیدہ ہوسکتے ہیں۔ کون جانتا تھا کہ آج دنیا سے رسمِ اعتبار اٹھنے والی ہے اور کسے خبر تھی کہ آج امام مالکؒ کے روحانی فرزند ناصر الحدیث، محمد بن ادریس شافعیؒ کو ان کی خدمات جلیلہ کا صلہ ملنے والا ہے۔

آج امامؒ کا لہجہ معمول سے زیادہ شرربار تھا اور آواز گزرے دنوں سے زیادہ پرسوز تھی۔ اہلِ مجلس کے دلوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور آنکھیں اشک برسا رہی تھیں۔ آتش وشبنم کا عجیب امتزاج تھا۔ امامؒ بہت دیر تک بولتے رہے۔ بے شمار مسائل حل کیے، ذہنوں کو کشادگی عطا کی، قلوب کا زنگ دور کیا اور پھر امامؒ کی مجلسِ درس ختم ہوگئی۔ تمام عقیدت مند رخصت ہوگئے مگر وہ لوگ بیٹھے رہے جن کی آستینوں میں زہرآلود نشتر چھپے ہوئے تھے۔ امامؒ بھی گھر جانے کے لیے اٹھنے ہی والے تھے کہ مفسدوں کی جماعت نے یکایک آپ پر حملہ کردیا۔ اس کے بعد درندگی کے وہ مظاہرہ کیے گئے کہ انسانیت حشر تک ان آدم زادوں سے شرم سار رہے گی۔ امامؒ کے جسم ناتواں پر وہ مشقِ ستم ہوئی کہ ضربات شدید سے آپ بے ہوش ہوگئے۔ کون جانے کتنی دیر تک اس "عالمِ قریش" کا لہو زمین میں جذب ہوتا رہا جس کی آمد کی خبر حدیث رسولؐ کے ذریعے دی گئی تھی۔ تاریخ تو بس اتنا پتا دیتی ہے کہ جب ناصر الحدیث کو مکان پر پہنچایا گیا تو یہ نابغہ روزگار اپنے خون میں نہایا ہوا تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آج فرزندِ قریش سرخ لباس پہنے ہوئے تھے اور داستانِ حرم ایک بار پھر رنگین ہوگئی تھی۔

خون اس قدر بہہ چکا تھا کہ امام شافعیؒ بسترِ مرگ پر دراز ہوگئے۔ اسی حالت میں امامؒ کے عزیز ترین شاگرد محمد بن حکمؒ عیادت کے لیے آئے۔ یہ وہی محمد بن حکمؒ ہیں کہ اہلِ مصر ان کے آگے تمام علما کو ہیچ سمجھتے تھے۔ امام مزنیؒ کا بیان ہے کہ جب حضرت امام شافعیؒ نے محمد بن حکمؒ کو پہلی بار دیکھا تو بڑے حسرت زدہ لہجے میں فرمایا۔

"کاش! میرا بھی ایسا ہی فرزند ہوتا۔"

ابوطالب نے اپنی کتاب قوت القلوب میں تحریر کیا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ نے محمد بن حکم مصریؒ کو اپنا بھائی بنالیا تھا۔ آپ محمدؒ سے غیر معمولی محبت کرتے تھے اور اکثر فرمایا کرتے تھے "میں مصر.... سے چلا



جاتا مگر محمد بن حکمؒ کی محبت نے میرے پیروں میں زنجیر ڈال دی ہے۔" ایک بار محمدؒ بیمار پڑے اور حضرت امام شافعیؒ انہیں دیکھنے کے لیے گئے تو آپ کی زبان پر یہ اشعار تھے۔

"میرا حبیب بیمار پڑ گیا اور میں اس کی عیادت کے لیے گیا
یہاں تک کہ اس کی بیماری کے صدمے نے خود مجھے بیمار ڈال دیا
پھر میرا حبیب میری عیادت کے لیے میرے پاس آیا
اور جیسے ہی میں نے اسے دیکھا، فوراً تندرست ہوگیا۔"

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کسی معتبر تاریخ میں حضرت امام شافعیؒ کی شادی کا ذکر نہیں ملتا۔ صرف شیخ فریدالدین عطارؒ نے اپنی مشہور تصنیف "تذکرۃ الاولیا" میں ایک عجیب وغریب واقعے کا ذکر کیا ہے۔ عطارؒ کی روایت کے مطابق حضرت امام شافعیؒ کے سامنے ایک حسین عورت کے چہرے کی دلکشی کا ذکر اتنی بار ہوا کہ امامؒ بھی غائبانہ طور پر اس سے متاثر ہوگئے اور پھر یہی تاثر نادیدہ عورت کی محبت میں تبدیل ہوگیا۔ یہاں تک کہ آپ نے اسے شادی کا پیغام بھیجا۔ وہ عورت بھی رضامند ہوگئی اور پھر نکاح ہوگیا۔ حضرت امام شافعیؒ نے جائز طور پر اس چہرے کو دیکھا جس کی دل فریبیوں کے بہت سے افسانے مشہور تھے۔ یہ ایک لمحاتی تعلق تھا۔ امامؒ نے چہرہ دیکھنے کے فوراً بعد ہی اس عورت کو طلاق دے دی اور مہر ادا کرکے رخصت ہوگئے۔ بعد میں کسی نے امامؒ سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ جواب میں امامؒ نے فرمایا۔ "شاعر اس کے ذکر سے باز نہیں آتے تھے اور پھر میرا نفس بھی سرکشی اختیار کرتا جارہا تھا۔ آخر اس طرح میں نے اپنے نفس کو نافرمانی کی سزا دے دی۔" تاریخِ تصوف میں ایسے بے شمار واقعات نظر آتے ہیں کہ خدا کے برگزیدہ بندوں نے اپنے نفس کے خلاف عجیب عجیب انداز سے جہاد کیا ہے۔ مثلاً انہیں پیاس محسوس ہوئی تو دریا کے کنارے جاکر پانی پیے بغیر واپس لوٹ آئے۔ بھوک کی خواہش بیدار ہوئی تو روٹی حاصل کی اور اپنے شکم کی آگ بجھائے بغیر وہ روٹی کسی اور کو دے دی۔ یہ نفس کشی کا مشکل ترین مقام ہے۔ ممکن ہے حضرت امام شافعیؒ نے بھی اپنے جذباتی تقاضوں کو اس طرح جھٹلانے کی کوشش کی ہو۔ یہ واقعہ درست ہے یا غلط، ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔ حاصلِ گفتگو صرف یہ ہے کہ معتبر تاریخی حوالوں سے حضرت امام شافعیؒ کی شادی کا کوئی پتا نہیں چلتا۔

یہی وجہ ہے کہ محمد بن حکمؒ کو دیکھتے ہی آپ نے بے قرار ہوکر فرمایا تھا "کاش! میرا بھی ایک ایسا ہی فرزند ہوتا۔" پھر یہی محمد بن حکمؒ، امام شافعیؒ پر قاتلانہ حملے کے بعد عیادت کے لیے آئے۔ اس قدر جریانِ

خون ہو چکا تھا کہ لوگ امامؒ کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ ایسی سنگین اور اذیت ناک فضا میں جہاں اہلِ علم کو فرزند قریش کی دائمی جدائی کا اندیشہ تھا وہاں اس بات کی بھی فکر تھی کہ امامؒ کے بعد آپ کا جانشین کون ہوگا؟ اگرچہ باشندگانِ مصر کو یقین کامل تھا کہ حضرت امام شافعیؒ، محمد بن حکمؒ ہی کو اپنا جانشین بنائیں گے لیکن پھر بھی حاضرین نے یہ سوال کر ہی ڈالا۔

''امامؒ! آپ کی وفات کے بعد ہم کس کی بارگاہ میں حاضر ہوا کریں؟ صاحبِ حلقہ کون ہوگا؟''

اس وقت محمد بھی حکمؒ، امام شافعیؒ کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ چند لمحوں کے بعد ہی حضرت امام شافعیؒ، محمدؒ کی خلافت کا اعلان کر دیں گے مگر جب امامؒ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی تو حاضرین دم بخود رہ گئے۔ حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا۔

''سبحان اللہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ میر جانشین ابو یعقوب بویطیؒ کے سوا کون ہوسکتا ہے۔''

محمد بن حکمؒ کو یہ بات بہت گراں گزری مگر ادب و احترام کے پیشِ نظر انہوں نے امامؒ کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا۔ محمد بن حکمؒ علم شافعیؒ اور فقہ شافعیؒ کے عامل تھے۔ اسی لیے انہوں نے حضرت امام مالکؒ کا مسلک ترک کر دیا تھا۔

امام شافعیؒ کے اس اعلان کے بعد ہی لوگ ابو یعقوب بویطیؒ کی طرف رجوع ہونے لگے۔ ابو یعقوبؒ نہایت متقی اور پرہیزگار شخص تھے۔ اپنے زہد و اتقا کے سبب وہ محمد بن حکمؒ پر فضیلت رکھتے تھے۔ ابو یعقوبؒ کے کردار کی عظمت کا یہ حال تھا کہ جب مامون رشید کے دورِ خلافت میں ''خلق قرآن'' کا فتنہ کھڑا ہوا تو اس مردِ جلیل نے طاقت و اقتدار کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ ابو یعقوبؒ زنداں کے حوالے کر دیئے گئے۔ آپ نے قید کے اندھیروں میں بڑے مصائب برداشت کیے مگر قرآن کو مخلوق نہیں کہا۔ اگرچہ یہ تمام واقعات حضرت امام شافعیؒ کے وصال کے بعد پیش آئے تھے لیکن امامؒ اپنی فراستِ نظر کے سبب اس راز سے آگاہ تھے کہ آزمائش کی کسی منزل پر ابو یعقوبؒ کے قدم نہیں لڑکھڑائیں گے۔ اسی لیے امامؒ نے بستر مرگ پر لیٹے لیٹے فرمایا تھا۔

''ابو یعقوبؒ کے سوا میرا جانشین کون ہوسکتا ہے؟''

امامؒ کے اس اعلان سے محمد بن حکمؒ کو بڑا قلق تھا مگر امامؒ نے خدا کے راستے میں تمام قربتوں کو سارے رشتوں کو جھٹلا دیا۔ شافعیؒ کا دل کیسا تھا کہ آخری سانس تک محمدؒ کو اپنا محبوبؒ، اپنا فرزند، اپنا بھائی کہہ کر



پکارتے رہے لیکن جب علم کی وراثت منتقل کرنے کا وقت آیا تو امامؒ نے کسی تعلق، کسی جذبے کی آواز نہیں سنی۔ اور یہ گراں بہا اعزاز اسی شخص کو بخشا جو اس کا سب سے زیادہ مستحق تھا۔

اس واقعے کے بعد اہلِ نظر کو یقین آجانا چاہئے کہ امام شافعیؒ اپنی ذاتی خواہشات اور دنیا کی تمام مصلحتوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی پر بے دریغ قربان کر دیا کرتے تھے۔ اپنے استادِ گرامی حضرت امام مالک بن انسؒ سے اختلاف کرنے میں بھی آپ کا یہی جذبہ کارفرما تھا۔ پھر یہی اختلاف امامؒ کے جسم پر جراحتوں کے ایسے نشان چھوڑ گیا کہ آپ وادیٔ مرگ تک جا پہنچے لیکن ستمگروں سے کبھی اس کا شکوہ نہیں کیا۔

والیٔ مصر کے حکم پر بہترین طبیب امامؒ کا علاج کر رہے تھے مگر خون اس قدر بہہ چکا تھا کہ اب ساری تدبیریں بے سود نظر آرہی تھیں۔ اسی دور کے ایک مشہور بزرگ ربیع خثیمؒ ارشاد فرماتے ہیں ''میں نے حضرت امام شافعیؒ کی وفات سے چند روز قبل ایک خواب دیکھا کہ حضرت آدمؑ کا انتقال ہوگیا ہے اور مخلوقِ خدا کا ایک ہجوم اس بات کا ارادہ کر رہا ہے کہ جنازے کو اٹھا کر باہر لائیں۔ جب میں بیدار ہوا تو ایک بزرگ سے اپنے خواب کی تعبیر معلوم کی، بزرگ نے جواب میں بتایا کہ اس وقت جو روئے زمین پر سب سے بڑا عالم ہے اس کی موت قریب ہے۔''

ربیع خثیمؒ کے خواب کے بعد ہی حضرت امام شافعیؒ کی حالت زیادہ بگڑنے لگی۔ محمد بن حکمؒ سوگوار تھے۔ امام مزنیؒ اور ابو یعقوب بویطیؒ زار و قطار رو رہے تھے اور تمام اہلِ دل جو اس وقت امامؒ کے قریب تھے ان پر بھی شدتِ غم سے نزع کی سی کیفیت طاری تھی۔ جوشِ گریہ بڑھا تو امامؒ نے انتہائی نقاہت کے باوجود رونے والوں سے پوچھا۔

''تم لوگ کیوں روتے ہو؟'' اب کمزوری حد سے بڑھ چکی تھی اور امامؒ کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

''ہمارے اشک اس لیے بہتے ہیں کہ ہم آپ کے بعد لاوارث ہو جائیں گے۔'' امام مزنیؒ اور ابو یعقوبؒ بمشکل اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کر سکے۔

''جن کے وارث خدا اور رسولؐ ہوں وہ کس طرح لاوارث ہوسکتے ہیں۔'' حضرت امام شافعیؒ نے ضعف کے سبب نہایت شکستہ لہجے میں فرمایا۔ ''لاوارث تو وہ ہوتے ہیں کہ جو کتاب و سنت کو چھوڑ دیتے ہیں۔'' اس کے بعد کچھ دیر کے لیے امامؒ خاموش ہو گئے پھر ایک شخص کا نام لیتے ہوئے فرمایا ''اس سے

کہہ دینا کہ وہ مجھے غسل دے دے۔" اس کے ساتھ ہی آپ نے کانپتے ہاتھوں سے ایک کاغذ پر کچھ تحریر کیا۔ پھر اسے لفافے میں بند کر کے ابو یعقوبؒ کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا "جب وہ شخص آئے تو اسے میری یہ وصیت پہنچا دینا۔"

اب لوگوں کو یقین ہو چلا تھا امامؒ دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔ شاگردوں اور عقیدت مندوں نے وہ دن اس طرح گزارا کہ بار بار زندہ ہوئے اور بار بار ان پر موت کا سا سکوت طاری ہوا۔ پھر سورج غروب ہو گیا۔ ابھی امام شافعیؒ ہوش میں تھے آپ نے اشاروں سے مغرب کی نماز ادا کی۔ پھر اچانک فرزندِ قریش کی حالت بگڑنے لگی۔ اسی دوران امام مزنیؒ نے رقت آمیز لہجے میں کہا "اس وقت آپ کیا کیفیت محسوس کر رہے ہیں؟"

جواباً حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا۔ "دنیا سے رخصت اور احباب سے جدائی کا وقت آپہنچا ہے۔ موت کا پیالہ پیش ہوا چاہتا ہے اور محمد بن ادریس کے اعمال کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ عنقریب اللہ کے دربار میں حاضری ہو گی۔ کون جانے کہ میری روح جنت کی طرف روانہ ہو گی جس پر میں اسے مبارکباد دوں یا دوزخ کی جانب جس پر میں اس سے تعزیت کروں۔" اتنا کہہ کر امامؒ پر گریہ طاری ہو گیا ریش مبارک آنسوؤں سے تر تھی اور آپ حالتِ وجد میں بار بار یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

"یقیناً میرے گناہ بہت بڑے ہیں لیکن جب میں تیری رحمت پر نظر کرتا ہوں تو وہ میرے گناہوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔"

پھر امام شافعیؒ خدا کی اس رحمت کے تصور میں ہمیشہ کے لیے گم ہو گئے۔ روح نے جسم سے رشتہ توڑ لیا مگر جانے والا اہلِ علم سے وہ رشتہ قائم کر گیا کہ اسے قیامت تک توڑنے والا کوئی نہیں۔ ہڈیوں پر اپنا سبق تحریر کرنے والا، پیوندِ خاک ہو گیا لیکن جاتے جاتے اس نے لوحِ کائنات پر وہ عبارت ثبت کر دی ہے کہ جسے ایک نظر دیکھ لینا بھی انسانیت کے لیے شرف عظیم ہے۔

وہ ماہ رجب ۲۵۴ھ کی آخری رات تھی جب سفیر حرم اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد عالمِ بالا کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت فرزندِ قریش کی عمر چون سال تھی۔

انتقال کے بعد امامؒ کی وصیت کے مطابق اس شخص کو تلاش کیا گیا جس کو امامؒ نے اپنے غسل کی ذمے داریاں سونپی تھیں۔ لوگ اس کی جستجو میں ادھر ادھر روانہ ہوئے مگر وہ شخص مصر سے باہر کسی نامعلوم مقام پر گیا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال میں امام شافعیؒ کے تمام شاگردوں اور عقیدت مندوں کو



شدید پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ آخر مجبور ہو کر امامؒ کی وصیت کے خلاف فیصلہ کیا گیا اور پھر کسی دوسرے شخص نے فرزندِ قریش کو غسل دیا۔

"الرسالہ" اور "کتاب الام" جیسی عظیم و جلیل تحریروں میں مصنفؒ مناظرے کے وقت شیر کی مانند نظر آنے والا شعلہ بار مقرر، دنیا کا بے مثال تیرانداز و شہسوار، فصاحت و بلاغت کا مجسمہ، دریاؤں کی رفتار چھین لینے والا قاری، ادبِ عالیہ کا پیکر، شعر و لغت کا بلند ترین مینار زہد و اتقا کی روشن دلیل، امام مالکؒ کا شاگردِ جلیل، اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ مصر کے کوچے نوحہ خواں تھے اور گلیوں نے ماتمی لباس پہن لیا تھا۔

پھر ناصر الحدیث کو قبر میں اتار دیا گیا۔ کیسی عجیب موت تھی کہ حدیث ہی کی نصرت کے لیے اس نے خونیں قبا پہن لی۔

وقت گزرتا رہا۔ فراق کے زخم آہستہ آہستہ بھرتے جا رہے تھے لیکن شاگردانِ امامؒ کے سینوں پر ابھی ایک داغ روشن تھا۔ بس یہی ایک خلش باقی تھی کہ امامؒ کو آپ کی وصیت کے مطابق غسل نہیں دیا جا سکا تھا پھر ایک دن اچانک وہ شخص مصر میں داخل ہوا، لوگوں نے اسے گھیر لیا اور امامؒ کی آخری وصیت اس کے گوش گزار کر دی، وہ شخص مضطرب ہو کر رونے لگا۔

"افسوس! یہ کیسی بدنصیبی ہے کہ میں اس سعادت سے محروم ہو گیا۔" پھر وہ چاک گریباں امامؒ کے حلقۂ درس میں پہنچا۔ بہت دیر تک اشک ریزی کرتا رہا اور جب ہوش و حواس بحال ہوئے تو امام شافعیؒ کے شاگردوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "کیا امامؒ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس غلام کو کوئی اور حکم تو نہیں دیا تھا؟" شدتِ غم کے سبب اس کی زبان سے ادا ہونے والے لفظ ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔ اجنبی کا یہ حال دیکھ کر ایک بار پھر مرگِ شافعیؒ کا زخم ہرا ہو گیا اور اس کی کسک سے پوری مجلس پر رقت طاری ہو گئی کچھ دیر بعد جذبات کا یہ سیلاب ٹھہرا تو ابو یعقوبؒ نے ایک سربمہر الفافہ اس شخص کے حوالے کر دیا۔ یہ امام شافعیؒ کا وصیت نامہ تھا۔

اجنبی نے دیوانہ وار اس خط کو چاک کیا اور امامؒ کی آخری تحریر پڑھنے لگا۔ عبارت ختم ہوئی تو بہت دیر تک امام شافعیؒ کے مکتوب کو آنکھوں سے لگائے روتا رہا۔ پھر شدید وارفتگی کے عالم میں بہ آواز بلند کہنے لگا۔

"خدا کی قسم! مجھے یقین تھا کہ امامؒ اپنے خادم کو اس سعادت سے محروم نہیں کریں گے۔" یہ کہہ کر

اجنبی نے امامؒ کا وصیت نامہ ابو یعقوبؒ کو واپس کر دیا۔ تمام حاضرینِ مجلس اپنے امامؒ کی آخری تحریر دیکھنے کے لیے ابو یعقوبؒ کے گرد جمع ہو گئے۔ امامؒ نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''میں ستر ہزار دینار کا مقروض ہوں۔ تم مجھے غسل دے دو۔'' غسل سے امامؒ کی مراد یہی قرض کی ادائیگی تھی۔

وہ مصر کا ایک امیر و کبیر شخص تھا اور امام شافعیؒ سے اسے اس قدر عقیدت تھی کہ خود کو امامؒ کا ادنیٰ ترین خادم کہتے ہوئے افسوس کرتا تھا۔ وصیت نامہ پڑھ کر اجنبی مجلسِ درس سے اٹھا اور پھر قرض ادا کر کے امام شافعیؒ کی قبر پر پہنچا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا وہ شخص رو رو کر کہہ رہا تھا۔

''امامؒ! علم و فضل تو آپ پر تمام ہو ہی چکا لیکن سخاوت میں بھی یہ دنیا آپ کے بعد کوئی ایسا دوسرا شخص تلاش نہ کر سکے گی۔''

☆☆☆



# سفیرِ حرم

## امام احمد بن حنبلؒ

### بغداد۔ ۲۴۱ھ

اہلِ دل کے لیے قیامت سے پہلے قیامت نازل ہو گئی تھی۔ لوگ دیوانہ وار اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ کسی نے ان کے کانوں میں کہہ دیا تھا کہ تمہارے محبوب کو زنجیریں پہنا کر شاہراہوں پر کھینچا جا رہا ہے۔ عقیدت مندوں نے مکانوں کے دروازے کھلے چھوڑ دیے تھے اور انسانی ہجوم رہ گزارِ خاص کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر ان کی آنکھوں نے ایک دردناک منظر دیکھا۔ جو تپتے ہوئے صحراؤں میں ابرِ کرم کی مانند برستا تھا، جس نے گناہ گاروں کے دلوں کی سیاہیاں دھوتے دھوتے اپنے ہاتھ شل کر لیے تھے۔ آج اسی ذاتِ گرامی کو اقتدار کی بیڑیاں اپنے آہنی حلقوں میں جکڑ کر خلیفہ کے دربار کی جانب لیے جا رہی تھیں۔ شمشیر بکف سپاہیوں کی گردنیں اس طرح جھکی ہوئی تھیں جیسے ان سے عالمِ جبر میں گناہِ عظیم سرزد ہو گیا ہو۔ ہجوم عاشقاں، مسکنِ خلافت تک جانا چاہتا تھا مگر طاقت کے مظاہرے نے انہیں روکنے کے لیے دور تک ایک آتشیں لکیر کھینچ دی تھی۔ لوگ مجبور کر دیے گئے تھے پھر بھی ان کی آوازوں کو دبایا نہ

جاسکا۔ وہ دل کے زور سے چیخ رہے تھے۔

''تو آج بھی سرفراز ہے کل بھی سربلند رہے گا۔ تیرے ایک قصرِ کمال کو لاکھوں سلاطین جابر مل کر بھی مسمار نہیں کر سکتے تو علم کا وارث ہے۔ واللہ تجھے موت نہیں آئے گی۔ تجھے اسیر کرنے والے خود زنداں کی طرف جا رہے ہیں۔ عنقریب وہ اپنے قتل نامے پر دستخط کر دیں گے۔ بے شک! ہم آزمائش کی راہ میں تیرے دوش بدوش نہ چل سکے مگر ہمارے دل تیرے ساتھ ہیں۔ تو جسموں کا نہیں جذبوں کا تاجدار ہے۔ وقت کی چند ساعتوں پر قبضہ کرنے والے تیرے ابدی جلال سے ناآشنا ہیں۔''

قیدی چلتے چلتے اچانک رک گیا۔ اس نے چیختے ہوئے انسانوں کی طرف بڑے صبر وسکون سے دیکھا پھر اس نے اگلی قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا ''تم میں سے جن کے کانوں تک میری آواز پہنچ رہی ہے ان پر فرض ہے کہ وہ دوسروں کو بھی میرا پیغام پہنچا دیں۔ میں ان کلمات کی نفی کرتا ہوں جو تم نے میرے نام کے ساتھ منسوب کر دیے ہیں۔ غور سے میری طرف دیکھو۔ میں ایک مشتِ غبار ہوں جو ہوا کے دوش پر اڑتا پھر رہا ہے۔ اس سے میری حقیقت کا اندازہ کرو۔ میں نے جن سے سیکھا ہے وہ بھی خاک میں مل گئے۔ سب کچھ فنا ہو جانے والا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میرے مرنے کے بعد اپنے گھروں کو ماتم کدہ بنا ڈالو مگر ایک بات جس کا پہلے دن اقرار کیا تھا اسی پر آخری سانس تک اصرار کرتا رہوں گا۔ اگر تمہاری ساعتوں میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا تو پھر سن لو کہ خدا کی طرح اس کا کلام بھی لافانی ہے.....'' وہ اسیر شاید ابھی کچھ اور کہتا لیکن نمک خوار سپاہیوں نے اپنی فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے دوبارہ کھینچنا شروع کر دیا۔ ان احمقوں کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایک درویشِ بے مایہ کے لفظوں کی حرارت سے بغاوت کے شعلے نہ بھڑک اٹھیں۔ تاریخ کا یہ عجیب وغریب انداز ہے کہ جب بھی مرہم کی تلاش میں کسی فقیر راہ نشین کے گرد زخم خوردہ انسانوں کی بھیڑ لگی ہے، ایوانِ حکومت میں زلزلہ آ گیا ہے اور فوری طور پر یہ تاثر لیا گیا ہے کہ حاکمِ وقت کے خلاف منصوبہ سازی کی جا رہی ہے۔ آج پھر اسی انداز میں یہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔

آج جس شخص کو پابۂ زنجیر کیا گیا تھا اسے لوگ دیوانگی کی حد تک چاہتے تھے۔ جب انہیں خبر ہوئی کہ ان کا پسندیدہ انسان اپنی حق گوئی کے جرم میں خلیفۂ وقت کے ظلم وستم کا نشانہ بننے والا ہے تو وہ دنیا کے سارے کام چھوڑ کر اس حالت میں نکل آئے کہ ان کی آنکھیں اشکبار تھیں اور چہرے حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ خلیفہ کے حاشیہ برداروں کو قیدی کی عظمت و ہر دل عزیزی کا اندازہ نہ تھا۔ وہ



اسے محض ایک فاقہ کش عبادت گزار سمجھتے تھے مگر آج ایک گوشہ نشین مفلس کے نام لیواؤں کا ہجوم دیکھ کر ان پر دہشت طاری ہو گئی تھی۔ انجام کار خلیفہ کے مسلح سپاہیوں نے انسانوں کے سیلاب کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

اب وہ نسبتاً ایک پُرسکون شاہراہ سے گزر رہے تھے۔ اچانک ایک قیدی نے دوسرے قیدی کو دیکھا۔ اسے بھی چند سپاہی کھینچتے ہوئے لیے جا رہے تھے۔ دونوں قیدی تھے مگر ان کی منزلیں مختلف تھیں۔ ایک کو دربارِ خلافت میں پیش ہونا تھا اور دوسرے کو عدالت میں۔ ناگہاں دوسرا قیدی چیخا ''رک جاؤ، مجھے اس شخص سے ایک ضروری کام ہے۔'' سپاہی ٹھہر گئے۔ چند لمحوں بعد پہلا قیدی نزدیک آ گیا۔ دوسرے قیدی نے سپاہیوں سے درخواست کرتے ہوئے کہا ''میں اس کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میری طرح یہ بھی مجرم ہے لیکن میرے اور اس کے جرم میں بڑا فرق ہے۔''

سپاہیوں نے اسے غور سے دیکھا ''کیا تو اس شخص کو جانتا ہے؟''

لہجہ انتہائی تحقیر آمیز تھا ''یہ خلیفہ کا معتوب ہے۔ اس کے ساتھ کوئی محبت سے پیش نہیں آ سکتا۔''

''اسے کون نہیں جانتا؟'' دوسرے قیدی نے کہا ''ہم سب اس کے علم کے سائے میں جیتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ مڑا ''میں آپ کے مقدس ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہتا ہوں مگر قانون کے محافظوں کی نظر میں میرے ہونٹ اس قابل نہیں۔''

پہلے قیدی نے اپنے مخاطب پر نظر ڈالی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے محروم تھا ''آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں بغداد کا مشہور ڈاکو ابوالہیثم ہوں۔ میری پیٹھ پر بے شمار کوڑوں کے نشانات ہیں۔ میرے دونوں ہاتھ کاٹ دیے گئے ہیں اور میں جرم کی زندہ علامت بن کر رہ گیا ہوں۔ میری سیاہ بختی کا یہ عالم ہے کہ مجھے دیکھتے ہی لوگ میرے گناہوں کی حقیقت جان لیتے ہیں۔ قانون چاہتا ہے کہ میں آئندہ کے لیے توبہ کر کے عام انسانوں کی قطار میں شامل ہو جاؤں لیکن مجھے انفرادیت کی زندگی پسند ہے اگر یہ لوگ میرے دونوں پاؤں بھی جسم سے علیحدہ کر دیں تو میں بستر پر لیٹے لیٹے یہ تمنا کرتا رہوں گا کہ کاش میں اس قابل ہوتا اور ایک بار پھر جرم کر سکتا۔'' اتنا کہہ کر ابوالہیثم نے اس قیدی کی طرف دیکھا جس کی گرفتاری پر حکومتِ وقت نے اپنی پوری توانائی صرف کر دی تھی۔

''میری یہ استقامت شیطان کی راہ میں ہے مگر آپ منزلِ حق کے مسافر ہیں۔ میں نے صرف اپنی ذات کو ہلاک کیا ہے لیکن آپ کی لغزش ساری دنیا کو تباہ کر ڈالے گی۔ خدا آپ کے قدموں کو آزمائش

کے راستے میں جمادے کہ آپ اہلِ دل کی آخری امید ہیں۔'' جوشِ جذبات میں ابوالہیشم کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ سپاہیوں نے اسے جھٹکا دے کر کھینچا۔ زنجیریں بج اٹھیں۔ ابوالہیشم جاتے جاتے مڑا

''امام! خدا حافظ۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

بغداد کا رسوائے زمانہ قزاق جا چکا تھا مگر فضا میں اس کے الفاظ کی گونج اب بھی باقی تھی۔ قیدی کے چہرے پر کئی رنگ ابھر کر ڈوب چکے تھے اور اب وہ پہلے سے زیادہ پرسکون نظر آرہا تھا۔ سپاہیوں کو بھی ایک ڈاکو کی جرات کا مظاہرہ دیکھ کر شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا مگر وہ خلیفہ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں بہرحال اس شخص کو زنجیریں پہنا کر دربار میں حاضر کرنا ہی تھا جس نے ایک آمر کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

آخر وہ سنگین لمحہ آ پہنچا۔ دربار میں بیڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ خلیفہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ قیدی سامنے کھڑا تھا۔ سپاہیوں کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی جیسے وہ کسی ناقابلِ تسخیر دشمن کو شکست دے کر لوٹے ہوں۔

''بے خبر عوام تمہیں اپنے روحانی پیشوا کا درجہ دیتے ہیں مگر تم مذہبی آداب سے اس حد تک ناآشنا ہو کہ اپنے امیر کو سلام تک نہیں کیا۔'' خلیفہ نے قیدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ طنز کا نشتر تھا۔

''سلام ایک کلمۂ خیر ہے۔'' قیدی نے باوقار لہجے میں جواب دیا'' میں ظلم اور جہل پر سلامتی نہیں بھیج سکتا۔''

اقتدار کی پیشانی پر ابھرنے والی شکن گہری ہو چلی تھی مگر خلیفہ نے بڑی ہوشیاری سے جذبات پر قابو پالیا۔ وہ اپنے فیصلے کو منطقی انجام تک پہنچانا چاہتا تھا'' دربار کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ تمہیں خلیفہ کے احترام کو ملحوظ رکھنا چاہیے تھا۔'' اس نے دوسرے انداز سے گرفت کی۔

''سر جھکانے کو احترام نہیں کہتے۔'' قیدی کے لہجے کی بے باکی بدستور تھی'' وہ جو شہنشاہوں کا شہنشاہ تھا اس نے بھی ایسے کافرانہ احترام کا حکم نہیں دیا۔ پھر میں کون ہوں کہ اس بدعت کو جائز قرار دوں۔''

''ہمیں تمہاری یہ گستاخیاں بھی گوارا ہیں اگر تم قرآن کو مخلوق تسلیم کرلو۔'' خلیفہ اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا رہا تھا مگر اس نے اتمامِ حجت کی خاطر اپنی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا تھا

''خالق کا کلام مخلوق کس طرح ہو سکتا ہے؟'' قیدی نے اپنی دلیل پیش کر دی۔



''یہ سب علم وفضل کی آخری منزل تک پہنچ چکے ہیں۔'' خلیفہ نے ان علماء کی طرف اشارہ کیا جو اس کے عقیدے کو تسلیم کر چکے تھے اور نتیجتاً دربار کی آراستہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

قیدی نے ان فاضل شخصیتوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی جن کا خلیفہ نے حوالہ دیا تھا۔

''جب یہ قرآن کو علی الاعلان مخلوق کہتے ہیں تو پھر تمہارے علم کا کس دنیا سے تعلق ہے؟ کیا ان کی رائے سند کا درجہ نہیں رکھتی؟'' خلیفہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اب آہستہ آہستہ اس کے ارادے بے نقاب ہوتے جا رہے تھے۔

''مجھے ان حضرات کی علمی فضیلت پر کوئی شک نہیں۔'' قیدی کا تحمل قابلِ دید تھا۔ ''مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ میں دنیا میں سب سے کم علم انسان ہوں مگر قرآن کو مخلوق تسلیم نہیں کر سکتا۔ وہ حی وقیوم کا کلام ہے اسے کسی حال میں بھی موت نہیں چھو سکتی۔'' بالآخر قیدی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس نے کسی عالم کی تضحیک نہیں کی تھی۔ بس اپنا نقطہ نظر واضح الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔

''میں تم پر اپنے بیٹے سے زیادہ مہربان ہوں، اگر تم قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کرلو۔'' خلیفہ نے قیدی کو اسیر کرنے کے لیے نیا دام پھیلایا تھا۔ اس جال کے پھندے بظاہر ریشم سے بھی زیادہ نرم تھے مگر حقیقت میں ان کی سختی کے آگے آہنی حلقے بھی ہیچ تھے۔'' میں اپنے ہاتھ سے تمہاری بیڑیاں کاٹوں گا۔'' خلیفہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا'' پھر تم مملکتِ اسلامیہ کی سب سے محترم شخصیت بن جاؤ گے۔'' اقتدار نے ایک بوریا نشین کو سب سے بڑی پیش کش کر دی تھی۔

''مجھے اپنی حیثیت کا اندازہ ہے۔ میں اس قدر عزت افزائی کو کس طرح برداشت کرسکوں گا؟'' قیدی نے بے نیازی کے ساتھ تمام عنایات کو ٹھکرا دیا۔

''پھر ایسے عاقبت نااندیش کو ہلاکت سے کون بچا سکتا تھا۔'' خلیفہ کے چہرے پر پڑا ہوا تہذیب واخلاق کا خول اتر گیا۔ اس نے شدید غصے میں تازہ دم جلادوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ طاقت ور بازو بلند ہوئے۔ سفاکی کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا گیا۔ دربار کی ساکت فضا کوڑوں کی آواز سے لرز اٹھی۔ قیدی کی پشت پر تازیانے برس رہے تھے۔

''اے دلوں کے تھامنے والے تو نے اپنے بندوں سے اسی دن کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر۔ میری دستگیری فرما۔ میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ آج کے دن مجھے تنہا نہ چھوڑ۔'' کوڑوں کی خوف ناک آوازوں میں قیدی کی صدائیں شامل تھیں جس کی تمام عمر پرستش کی تھی آج وہ اسی ذات کو

پکار رہا تھا۔ مزاج شاہی اور برہم ہو گیا۔ تشدد کی لے اور تیز ہو گئی۔

خلیفہ کا خیال تھا کہ وہ مسلسل ضربوں کی تاب نہ لا کر سر جھکا دے گا مگر قیدی ایک بار پھر اپنے معبود سے سرگوشیاں کر رہا تھا ''زمین و آسمان فانی، مکین و مکان فانی، تو باقی تیرا کلام باقی۔ تو بھی جلیل و جمیل، وہ بھی جلیل و جمیل۔'' آمرِ وقت ان کلمات کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر انسانی قہر و غضب نے وحشت کا رنگ اختیار کر لیا اور جبر و ستم حد سے گزر گئے۔ جلادوں نے اپنے فن کے مظاہرے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ قیدی اپنے خون میں نہا چکا تھا۔ تشدد میں کمی نہیں آئی۔ قیمتی پتھروں پر انسان کا ارزاں لہو بہہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے قدموں پر کھڑا رہا مگر کب تک؟ توانائی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ قوت ارادی زائل ہونے لگی۔ بالآخر وہ سرِ دربار بے ہوش ہو گیا۔

خلیفہ کو یقین تھا کہ قیدی اب زیادہ دیر تک ثابت قدم نہیں رہ سکے گا۔ جلاد اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ خلیفہ کے اشارے پر اس کے سامنے پانی سے بھرا ہوا برتن پیش کیا گیا۔ پیاس کی شدت سے قیدی کی زبان خشک ہو چکی تھی۔ اس نے پانی کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر دوسرے ہی لمحے ہاتھ کھینچ لیا۔ ''میں روزے سے ہوں۔'' دربار میں زخمی کی باوقار آواز گونجی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ زمین سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خلیفہ کی جانب بے نیازانہ دیکھا۔ اہلِ دربار کی کیفیات کا جائزہ لیا پھر جلادوں سے پوچھا ''کیا وقت ہوا ہے؟''

''ظہر کا۔'' جواباً کہا گیا۔

''مجھے نماز کی مہلت دی جائے۔'' قیدی نے درخواست کی۔ اس موقع پر اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔ خلیفہ نے اجازت دی۔ زخمی نے اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لی۔ وہ عام دنوں میں بہت سکون سے اپنے خالق کی عبادت کیا کرتا تھا مگر آج اس کی جسمانی حرکات میں اضطراری کیفیت تھی۔ عملِ نماز معمول سے نسبتاً تیز تھا۔ شاید اس خیال سے کہ کہیں خلیفہ اور درباری اس کے صبر و سکون کو تاخیری حربوں کا نام نہ دیں، اس لیے وہ اپنی فطرت کے خلاف جلد بازی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ قیدی نے نماز ختم کی۔ بہت مختصر دعا مانگی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سجدے کے بعد فرش پر ہاتھوں کے خوں رنگ نشانات ابھر آئے تھے۔

''تم لوگ اپنا کام جاری رکھو۔'' قیدی جلادوں سے مخاطب ہوا ''میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں۔ تم بھی اپنا فرض پورا کرو۔ فرض کی تکمیل ہی اقرارِ بندگی ہے۔''

اس سے پہلے کہ خلیفہ جلادوں کے لیے مشقِ ستم کا نیا حکم جاری کرتا، ایک درباری عالم درمیان میں



بول پڑا ''جب تمہاری نماز ہی ادا نہیں ہوئی تو پھر فرض کی ادائیگی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟'' بغداد کا مشہور فقیہہ ایک لہولہان قیدی سے مخاطب تھا۔ ''تم نے اس وقت نماز ادا کی جب تمہارے پورے بدن سے خون بہہ رہا تھا۔ شرعی مسئلے کے اعتبار سے نہ تمہارا وضو قرار رہا اور نہ جسمانی طہارت پھر یہ کیسی نماز تھی۔''

خلیفہ اور دیگر اکابرین دربار، قیدی کی اس گرفت پر مسکرانے لگے۔ ان کے خیال میں وہ موت کے خوف سے بدحواس ہو گیا تھا اور پھر اس نے اسی دہشت کے عالم میں نماز ادا کر لی تھی۔ قیدی کی اس غلطی نے خلیفہ کے کام کو مزید آسان بنا دیا تھا۔

''میں فقہ کے مسائل نہیں جانتا۔'' قیدی کی آواز بدستور پرسکون تھی۔

''پھر تمہیں کس نے مسندِ امامت پر بٹھایا ہے؟'' دوسرا فقیہہ تیز لہجے میں بولا۔

''میں آج تک کسی مسند پر نہیں بیٹھا۔'' قیدی نے اب تک روایتی تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا ''میں صرف ایک خاک نشین ہوں اور خاک ہی میری مسند ہے۔''

''چرب زبانی تمہاری غلطی کی پردہ پوشی نہیں کر سکتی۔'' پہلے فقیہہ نے قیدی کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا اور پھر فوراً ہی اپنی اس نکتہ طرازی کی داد پانے کے لیے خلیفہ کی طرف دیکھا۔ آمرِ وقت اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ قیدی کے زخمی جسم پر لپٹی ہوئی زنجیروں کے آہنی حلقے اور بھی تنگ ہوتے جا رہے تھے۔

''تمہیں اس کا پورا اختیار ہے کہ تم میرے ہر فعل میں خامیاں تلاش کرو۔'' قیدی کا لہجہ تلخیوں اور نفرتوں سے پاک تھا۔ ''میں اپنے عمل کی وضاحت کرنے سے قاصر ہوں مگر میں نے وہی کیا جس کا سبق مجھے فاروقِ اعظمؓ نے دیا۔ میرا امیر نمازِ فجر کے دوران زخمی ہوا اور اسی حالت میں اپنے فرض کو تکمیل تک پہنچایا۔'' قیدی نے اپنی نماز کو درست ثابت کرنے کے لیے حضرت عمرؓ کے لازوال عمل کا سہارا لیا تھا۔ جب دلیلِ آفتاب روشن ہوئی تو سطحی علم کے سارے چراغ بجھ گئے۔ خلیفہ حیران و پریشان تھا اور درباری فقیہوں کے چہرے مسخ ہو کر رہ گئے تھے۔

وہ آمرِ وقت خلیفہ معتصم باللہ تھا۔ اور قیدی حضرت امام بن حنبلؒ تھے جن کے خون سے تاریخِ اسلام کا اہم ترین باب لکھا گیا۔

☆☆☆

حضرت امامؒ ربیع الاول ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ بعض تاریخ نویسوں کا خیال ہے کہ آپ کی

ولادت مرو میں ہوئی لیکن معتبر روایت ہے کہ حضرت امام احمدؒ بغداد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی محمد بن حنبل تھا اور دادا کا نام حنبل بن بلال۔ اکثر لوگ آپ کو حنبل کا بیٹا سمجھتے ہیں لیکن یہ حضرت امام کے دادا کا نام تھا جو آپ کے نام کے ساتھ قیامت تک کے لیے وابستہ ہوگیا ہے۔ نسبی اعتبار سے حضرت امامؒ خالص عرب تھے۔ آپ کے والد اور والدہ دونوں شیبانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ شیبان بھی عدنانی قبیلے کا دوسرا نام ہے جو معد بن عدنان کے واسطے سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتا ہے۔ اس قبیلے کو اپنی شجاعت اور عزت کے سبب تمام عرب قبائل میں ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ عہدِ جاہلیت میں یہ خاندان عراق کے نزدیک آباد ہوگیا تھا۔ جب فاروقِ اعظمؓ نے شہر بصرہ کی تعمیر کی تو شیبان نے اس صحرائی علاقے میں سکونت اختیار کرلی۔ مشہور روایت ہے کہ جب حضرت امامؒ بصرہ تشریف لائے تو بنو شیبان کی ایک شاخ مازن کی مسجد میں نماز ادا کرتے تھے۔ حضرت امامؒ سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ یہ میری آبائی مسجد ہے۔

تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ حضرت امامؒ کا خاندان مستقل طور پر بصرے میں مقیم نہیں رہا۔ آپ کے دادا خراسان منتقل ہوگئے تھے اور انہیں اموی عہدِ حکومت میں سرخس کا گورنر بنادیا گیا تھا۔ پھر بساطِ سیاست پر عباسی خاندان ابھرا تو انہوں نے انقلابیوں کا ساتھ دیا جس کے نتیجے میں حضرت امامؒ کے دادا کو سخت اذیتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ آپ کے والد محمد بن حنبل کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ وہ ایک سپاہی تھے لیکن ابنِ جوزی نے تحریر کیا ہے کہ اس زمانے میں عربوں کی ایک مخصوص عادت تھی کہ وہ لوگ کاشت کاری اور دوسرے ہنرمندانہ پیشوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہیں صرف اپنی جنگ جوئی اور سپاہ گری پر ناز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت امامؒ کے والد بھی وقتی تقاضوں کے زیرِ اثر فوج میں شامل ہوئے تھے لیکن اپنے باپ حنبل بن بلال کی طرح انہیں کوئی مخصوص عہدہ حاصل نہیں ہوسکا تھا۔

حضرت امامؒ کے دادا نے اگرچہ عباسی حکومت کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور اس راہ میں تکلیفیں بھی برداشت کی تھیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس وفاداری کے صلے میں خاندان کے کسی فرد کو شاہانہ انداز سے نہیں نوازا گیا۔ البتہ حضرت امامؒ کے چچا کو حکومت سے تھوڑی بہت قربت حاصل تھی۔ جب خلیفہ، بغداد سے باہر ہوتا تو وہ بعض حکام کو تازہ ترین حالات سے باخبر رکھتے۔ یہی ان کی ذمے داری تھی اور اسی وجہ سے وہ سرکاری حلقوں میں کسی حد تک اثر و رسوخ رکھتے تھے۔



حضرت امامؒ بچپن ہی سے ایسے کاموں میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔ ایک بار کسی حاکم نے آپ کے چچا سے پوچھا ”تم نے آج کی خبریں کیوں نہیں بھیجیں؟ میں امیرالمومنین کو ایک ایک لمحے کی خبر دینا چاہتا ہوں۔ پھر تم نے غفلت شعاری کا یہ مظاہرہ کیوں کیا؟“

”میں اپنے بھتیجے احمد کے ہاتھ ساری خبریں آپ کی خدمت میں ارسال کرچکا ہوں۔ تعجب ہے کہ وہ آپ تک کیوں نہیں پہنچیں؟“ چچا کو شدید حیرت تھی اور ساتھ ہی شرمندگی کا احساس بھی۔

تھوڑی دیر بعد حضرت امامؒ کو حاکم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس وقت آپ بہت نوعمر تھے۔

”کیا میں نے تمہیں خبریں دینے کے بعد یہ نہیں کہا تھا کہ انہیں حاکم تک پہنچادو؟“ چچا نے بھتیجے سے سوال کیا۔

”ہاں، آپ نے مجھے خبریں دی تھیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ میں انہیں حاکم کی خدمت میں پیش کردوں۔“ حضرت امامؒ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”پھر تم نے نافرمانی کیوں کی؟“ چچا نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا ”کہاں ہیں وہ خبریں؟“

”میں نے انہیں پانی میں پھینک دیا۔“ حضرت امام نے اس طرح کہا جیسے وہ کوئی فضول سی شے تھی اور اسے پانی میں غرق کردینا ہی بہتر تھا۔

حاکم اور آپ کے چچا دونوں یہ جواب سن کر حیران رہ گئے۔ کچھ دیر کے لیے ان پر سکتہ طاری ہوگیا۔ پھر حاکم نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا ”یہ بہت برا ہوا مگر میں اس لڑکے پر سختی بھی نہیں کرسکتا۔“ حضرت امامؒ کی بے باکی نے اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اس واقعے سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ دربارِ خلافت اور حکامِ وقت سے آپ کے خاندان کے مسلسل تعلقات رہے لیکن حضرت امامؒ کو بچپن ہی سے یہ روش پسند نہیں تھی۔ آپ حیرت انگیز طور پر بااثر لوگوں سے دور رہتے تھے اور آپ کی اسی عادت کو دیکھ کر بعض اہلِ نظر نے سمجھ لیا تھا کہ مستقبل میں یہ لڑکا کسی نہ کسی عنوانِ اسلامی تاریخ پر اثر انداز ہوگا۔

حضرت امام احمدؒ کے نانا بنو شیبان کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ نہایت خلیق، سخی اور حوصلہ مند انسان تھے۔ عربوں کے لیے ان کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ اکثر عرب قبائل ان کے گھر مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا کرتے تھے۔ وہ اس قدر متواضع انسان تھے کہ اپنے مہمانوں کے لیے پرتکلف دعوتوں کا اہتمام کرتے اور میزبانی کے فرائض انجام دیتے وقت کبھی ماتھے پر شکن تک نہ آتی۔ اسی طرح حضرت

امامؒ کے دادا کو بھی دنیاوی عزت وآسائش حاصل تھی۔ وہ بنوامیہ کے دورِ حکومت میں گورنر کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا لیکن جب خاندانِ عباسیہ ایک نئی دعوت لے کر سیاست کے افق پر طلوع ہوا تو انہوں نے دل وجان سے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ عہدے سے بھی محروم ہوئے اور بے شمار آلام ومصائب بھی برداشت کیے۔ اگرچہ بعد میں خلافتِ عباسیہ ایک مستقل آزار بن کر رہ گئی تھی لیکن شروع میں حضرت امامؒ کے دادا اسے حق پر سمجھتے تھے، اس لیے آخری سانس تک تعاون کرتے رہے۔ نسلی غیرت نے انہیں کسی کے سامنے جھکنے نہیں دیا۔ حضرت امامؒ کے والد کا بھی یہی حال تھا۔ وہ غیرت وشجاعت کا بہترین نمونہ تھے۔ ہر وقت مجاہدوں کے لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ کئی بار میدان جنگ کا رخ کیا اور ہر مرتبہ فتح ونصرت نے ان کے قدم چومے۔ بالآخر اسی مجاہدانہ پیرہن کو اپنے جسم پر سجا کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ حضرت امام احمدؒ ان ہی غیرت مند بزرگوں کی اولاد تھے۔

☆☆☆

آپ ابھی عہدِ طفلی سے گزر رہے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مادرِ مہربان پہلے ہی نہایت شفقت سے پیش آتی تھیں، اب داغِ یتیمی کے بعد ان کی محبتوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد بہت مختصر تھی۔ صرف بغداد میں ایک مکان تھا یا اتنی زمین کہ جس سے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی چنانچہ حضرت امامؒ نے فقر وقناعت کے ماحول میں پرورش پائی۔ مفلسی کی اس فضا میں یقیناً آپ کے بہت سے جذبے ناآسودہ رہ گئے تھے مگر غربت نے حضرت امام احمدؒ کو صابر وشاکر انسان بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

آپ نے سب سے پہلے اسلامی معاشرے کی رسم کے مطابق حفظِ قرآن کی طرف توجہ دی۔ اپنے اس تعلیمی دور کے متعلق حضرت امامؒ خود فرماتے ہیں ''میں ابھی بالکل بچہ ہی تھا کہ حفظِ قرآن کی سعادت سے سرفراز ہوا۔ چودہ سال کی عمر کو پہنچا تو تحریر وکتابت کی مشق کرنے لگا۔'' یہ آپ کی ذہانت کا روشن ثبوت تھا کہ اس قدر نوعمری میں وہ مشکل مراحل طے کر لیے جن سے اکثر انسان جوانی میں بھی نہیں گزر پاتے۔ اسی زمانے کا ایک مشہور واقعہ اس طرح ہے کہ اسلامی لشکر کے سپاہی اپنی بیویوں کو خطوط لکھا کرتے تھے۔ یہ تمام خواتین حضرت امامؒ سے اپنے ذاتی خطوط پڑھواتی تھیں اور جب انہیں جواب دینا ہوتا تو آپ کے سامنے بلا تکلف اپنے جذبات اور مقاصد بیان کر دیتیں۔ حضرت امام احمدؒ عورتوں کے جذبات کو حرف بہ حرف کاغذ پر منتقل کر دیتے۔ آپ کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر فوجی کہا کرتے تھے۔



''یہ لڑکا کم سنی کے باوجود ایک شخص کا راز دوسرے سے نہیں کہتا۔ خط وکتابت میں اس نے اپنی طرف سے ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں کی۔ یہ کتنا بڑا امانت دار ہے۔''

اسلامی لشکر کا ایک اعلیٰ افسر رشید کہا کرتا تھا ''میں نے اپنے لڑکے کی تعلیم پر کافی دولت خرچ کی۔ اسے کئی نامور استادوں کے حوالے کیا مگر کوئی نتیجہ نہیں ہوا اور احمد بن حنبل کو دیکھو۔ یہ یتیم بچہ اپنے حسن وادب اور ذہانت کے باعث کیسی ناقابلِ رشک شخصیت بن گیا ہے۔''

عام طور پر دنیا والے مادی وسائل کو سب کچھ تصور کرتے ہیں اور اس آفاقی اصول کو بھی بھول جاتے ہیں۔

میری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو!
کہ فطرت آپ کر لیتی ہے لالے کی حنا بندی

قدرت اپنے اسی قانون کے مطابق اس لالہ صحرائی کی حنا بندی کر رہی تھی جو بچپن میں یتیم ہو گیا تھا اور جنہیں دنیا کی تمام سہولتیں میسر تھیں وہ اس دوڑ میں امام احمد بن حنبلؒ سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ آپ کی ان ہی خوبیوں کو دیکھ کر ایک معروف شخص ہشیم بن جمیل نے کہا تھا۔

''اگر یہ لڑکا زندہ رہا تو اہلِ زمانہ کے لیے حجت ثابت ہو گا۔''

ابتدائی تعلیم سے فراغت پا کر حضرت امامؒ علم حدیث کی طرف راغب ہوئے۔ اس ذیل میں آپ نے سب سے پہلے قاضی ابو یوسفؒ کی درسگاہ کا رخ کیا۔ قاضی ابو یوسفؒ حضرت امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید تھے اور انہیں اپنے دور کے فقہیوں میں بلند ترین مقام حاصل تھا۔ حضرت امام احمدؒ بھی ان کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے اور یہی تاثر انہیں قاضی ابو یوسفؒ کی بارگاہ میں لے گیا تھا۔ آپ اکثر فرماتے تھے ''میں نے حدیث کا پہلا سبق ابو یوسفؒ ہی سے لیا تھا۔'' مگر یہ سلسلہ زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا۔ کچھ عرصے بعد ذہنی انقلاب نے آپ کو فقہیوں کے حلقے سے دور کر دیا۔ اب محدثین کی مجلسیں آپ کا مرکزِ نظر تھیں۔

حضرت امامؒ علمِ فقہ کے منکر نہیں تھے لیکن ہر حال میں حدیث مبارک ہی کے ذریعے تمام مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ اس نقطہ نظر نے آپ کو محدثین کرام سے قریب تر کر دیا تھا۔ نتیجتاً آپ قاضی ابو یوسفؒ کی مجلس سے نکل کر بغداد کے نامور امام حدیث حضرت ہشیم بن بشیرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر سولہ سال تھی۔ حضرت امام احمدؒ نے ہشیم کے علاوہ عمیر بن عبداللہؒ اور

عبدالرحمٰن بن مہدیؒ سے بھی حدیثیں سنیں مگر بنیادی طور پر آپ ہشیمؒ ہی کے زیر اثر تھے۔ چار سال تک درس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر جب ہشیمؒ کا انتقال ہو گیا تو آپ بغداد کی حدود سے نکلے اور طلبِ حدیث کے سلسلے میں اپنے طویل سفر کا آغاز کیا۔ حضرت امامؒ سب سے پہلے بصرہ تشریف لے گئے۔ پھر حجازِ مقدس کی جانب روانہ ہوئے۔ اس کے بعد منزلیں طے کرتے ہوئے یمن پہنچے۔ کوفے میں بھی قیام کیا۔ آپ کی دلی تمنا تھی کہ رے بھی تشریف لے جائیں تاکہ جریر بن عبدالحمیدؒ سے حدیثوں کی سماعت کر سکیں۔ آپ ان بزرگ سے بغداد میں فیض یاب نہیں ہو سکے تھے۔ اگرچہ آپ اس ملاقات کی شدید خواہش رکھتے تھے لیکن گردشِ حالات کے باعث اپنے ارادوں کو تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ اقتصادی بدحالی نے آپ کو اس سفر کا موقع فراہم نہیں کیا۔ کوفہ، بغداد سے بہت قریب تھا مگر وہاں بھی آپ کی زندگی مشکلات و مصائب سے دوچار رہی۔ حضرت امامؒ فرماتے ہیں ''جب میں گھر میں سوتا تھا تو سر کے نیچے تکیے کی جگہ اینٹ رکھ لیا کرتا تھا۔'' اسی طرح رے کے سفر کے متعلق آپ ہی کا بیان ہے ''اگر میرے پاس چند درہم ہوتے تو میں بھوکا رہ کر بھی رے کا سفر ضرور اختیار کرتا اور جریر بن عبدالحمیدؒ کے نورِ علم سے اپنے دل دماغ کو ضرور روشن کرتا لیکن اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔'' ان مسلسل واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت امامؒ علم کے راستے میں تکلیفیں برداشت کرنے کے لیے کس قدر پُرجوش نظر آتے تھے۔ اگر کبھی آپ بالکل بے دست و پا ہو جاتے تو پھر جذبات کی تڑپ ناقابلِ بیان ہوتی تھی۔

آپ نے طلبِ حدیث میں پانچ بار حجازِ مقدس کا سفر کیا اور اتنی ہی مرتبہ آپ کو حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت امام احمدؒ فرماتے ہیں ''میں نے پانچ میں سے تین حج پاپیادہ کیے۔ میں ایک حج پر صرف تین درہم خرچ کر سکا۔ ایک بار میں راستہ بھول گیا۔ کئی دن تک پیدل سفر کرتا رہا۔ آخر میں نے پکارنا شروع کر دیا۔ خدا کے بندو! مجھے راہ پر لگا دو۔ یہاں تک کہ میں صحیح راستے پر ہو لیا۔'' علم کی خاطر حضرت امامؒ کی یہ قربانیاں ایک ایسا کارنامہ ہیں جن کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں بہت کم نظر آئیں گی۔

حضرت امامؒ حج سے فارغ ہو کر صنعا (یمن) تشریف لے گئے۔ اس سفر کی روداد اتنی اثر انگیز ہے کہ اسے پڑھ کر دل پگھلنے لگتا ہے۔ راستے میں آپ کا مختصر سا اثاثہ ختم ہو گیا تو بار برداروں کے گروہ میں شامل ہو گئے اور اس وقت تک مزدوری کرتے رہے جب تک زادِ راہ کے لیے کچھ رقم جمع نہیں ہو گئی۔ کتنی مشقتیں اٹھائیں، کتنے فاقے کیے، اس کا حساب خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بالآخر صنعا پہنچے۔ امام



عبدالرزاقؒ نے آپ کی مدد کے خیال سے دیناروں کی ایک تھیلی سامنے رکھ دی اور انتہائی محبت آمیز لہجے میں کہا ''احمد! اسے قبول کر لو۔ یہ تمہاری ذات کے لیے نہیں علم کی خاطر ایک حقیر سا تحفہ ہے۔''

''میری پرسشِ حال پر خدا تمہیں جزائے خیر دے لیکن میں جس حال میں ہوں ٹھیک ہوں۔'' حضرت امامؒ نے بے نیازانہ جواب دیا اور اٹھ کر چلے آئے۔

صنعا میں دو سال تک آپ کا قیام رہا۔ اس طویل عرصے میں آپ پر کیا گزری، ان کیفیات کو بیان کرنے کے لیے الفاظ کا سہارا ناکافی ہے۔ حضرت امامؒ نے کسی قسم کی استعانت قبول کیے بغیر مسلسل آزار جھیلے اور امام زہریؒ کے طریقے پر حدیث کی سماعت کی۔

ایک بار حضرت امامؒ کے ایک شناسا نے آپ کو حالتِ سفر میں دیکھ کر اعتراض کیا ''اس قدر حفظ کر لیا، اتنی روایت کر لی مگر پھر بھی حالت یہ ہے کہ آج کوفے کا سفر درپیش ہے تو کل بصرے کی طرف گامزن ہو۔ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟''

حدیث کی طلب اور روایت میں حضرت امام احمدؒ کی کوشش و جستجو کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہاں تک کہ جب آپ درجۂ امامت پر پہنچ گئے تو ایک ہم عصر عالم نے آپ کو مسلسل لکھتے دیکھ کر کہا ''احمد! تمہیں دنیا امام المسلمین کہہ کر پکارتی ہے مگر یہ سب کچھ کیا ہے؟''

حضرت امامؒ نے اس شخص کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ''دنیا اپنے کام میں مصروف ہے، مجھے میرا کام کرنے دو جب تک قبر میں نہ پہنچ جاؤں، قلم دوات کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔''

☆☆☆

حضرت امام احمدؒ کو علمِ حدیث و فقہ کی چند برگزیدہ شخصیات سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ ان نامور ہستیوں میں حضرت امام مالکؒ سرفہرست تھے۔ آپ کو حضرت حماد بن زیدؒ سے بھی ملاقات کا ایک بڑا ارمان تھا مگر زمان و مکان کے فرق نے حضرت امامؒ کو علم کے ان سمندروں کو پہنچنے نہیں دیا۔ حضرت حماد بن زیدؒ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے استادِ محترم تھے جو حضرت امام احمدؒ کی پیدائش سے بہت پہلے انتقال فرما چکے تھے۔ اسی طرح حضرت امام مالکؒ بھی حضرت امام احمدؒ کی دنیا میں آمد سے قبل ہی وفات پا گئے تھے یا پھر وہ آپ کا عالمِ شیر خواری ہو گا۔ بہرحال امام احمدؒ ان دونوں عظیم بزرگوں کا زمانۂ حیات نہ پا سکے اور تمام عمر اپنی اس محرومی پر افسوس کرتے رہے۔ عبداللہ مبارکؒ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے شاگردِ خاص تھے مگر آپ ان سے بھی ملاقات نہ کر سکے۔ جب حضرت امام احمدؒ نے سولہ سال کی عمر میں حدیث لکھنا شروع کیا تو

عبداللہ بن مبارکؒ بغداد سے طرطوس جا چکے تھے پھر واپس لوٹ کر نہیں آئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۱ ہجری میں ہیت کے مقام پر انتقال فرمایا۔ حضرت امام احمدؒ کو عبداللہ بن مبارکؒ سے نہ ملنے پر ساری زندگی قلق رہا۔ بے شک یہ امامؒ کی محرومیاں تھیں مگر ان محرومیوں میں آپ کے ارادوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ اگر آپ کسی طرح حضرت حمادؒ یا حضرت امام مالکؒ کی قربت پا سکتے تو شاید اپنی جان دے کر بھی علم و عمل کی ان عظیم درسگاہوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ بظاہر یہ وہ نقصان تھا جس کی تلافی کسی طرح بھی ممکن نہ تھی مگر قدرتِ الٰہی کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ اس نے عجیب انداز میں آپ کی محرومیوں کا ازالہ کر دیا۔ آخری عمر میں حضرت امامؒ خود فرمایا کرتے تھے "میں حضرت حمادؒ کے حضور نہ پہنچ سکا لیکن خدا نے مجھے ان کے بجائے اسمٰعیل بن علیہ سے استفادہ کا موقع عنایت فرمایا۔ میں حضرت امام مالکؒ کے علم سے فیض یاب نہ ہو سکا مگر اللہ نے میرے لیے سفیان بن عیینہؒ کا دروازہ کھول دیا۔"

☆☆☆

علمِ حدیث کی تکمیل کے بعد حضرت امام احمدؒ فقہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ آپ علمِ فقہ کو اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن یہ محض قیاس آرائی ہے۔ حضرت امامؒ فقہ کو پسند فرماتے تھے مگر قرآن و حدیث کی طلب کے بعد آپ کو اس طرف توجہ دینے کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔ نتیجتاً یہ غلط بات مشہور ہو گئی کہ حضرت امام احمدؒ فقہ کے منکر تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر آپ حضرت امام شافعیؒ کی شاگردی کیوں اختیار کرتے جو واقعتاً ایک بہت بڑے فقیہہ تھے۔ اس سلسلے میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کا مشہور قول ہے۔

"جو حدیث سیکھتا ہے، فقہ نہیں جانتا، اس شخص کی مثال اس دواساز کی سی ہے جو دوائیں تو جمع کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ کون سی دوا کس مرض میں کام آئے گی؟ یہاں تک کہ طبیب آتا ہے اور دواؤں کے استعمال کا طریقہ بتاتا ہے۔ اسی طرح طالبِ حدیث ہے جو حدیثیں یاد کر لیتا ہے مگر اس کی ماہیت سے ناواقف ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ فقیہہ آتا ہے اور حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔" ممکن ہے حضرت امام احمدؒ کی نظر سے ابو حنیفہ کا یہ قول گزرا ہو یا پھر آپ نے خود اس علم کی ضرورت محسوس کی ہو، بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آپ نے حضرت امام شافعیؒ کی صحبت اختیار کی اور علم و فقہ کے رموز و نکات کو سمجھا۔

آپ امام شافعیؒ سے ایک خاص عقیدت رکھتے تھے۔ ایک بار حدیث کی خصوصی مجلس آراستہ تھی۔ سفیان بن عیینہؒ کی بیان کردہ احادیث تحریر کی جا رہی تھیں کہ اتنے میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ تشریف



لائے اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "ابو یعقوب اٹھو، میں تمہیں ایسا شخص دکھاؤں جسے تمہاری آنکھوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔"

حضرت امامؒ کی بات سن کر تمام ساتھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے جو عمر کے اعتبار سے نوجوان تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس، روشن و تابناک چہرہ، آنکھوں میں ذہانت و فراست کا سمندر موجزن، یہ تھا اس شخصیت کا مختصر خاکہ۔ جب تمام لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تو حضرت امام احمدؒ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا "ابو یعقوب! اس سے فیض حاصل کرو کہ میں نے آج تک ایسا کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھا۔" حاضرینِ مجلس اس نوجوان کی شکل دیکھ کر حیرت زدہ تھے جسے آج ساری دنیا امام شافعیؒ کے نام سے جانتی ہے۔

ایک اور موقع پر حضرت امام احمدؒ نے اپنے استاد حضرت امام شافعیؒ کے بارے میں اس طرح رائے ظاہر کی "رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میری امت کے لیے خداوند ذوالجلال ہر صدی کے شروع میں ایک ایسا شخص پیدا کرے گا جو دین کے بگڑے ہوئے امور کو سلجھایا کرے گا۔ اسی قولِ رسول کریمؐ کے مطابق حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اس صدی کے مجدد تھے اور میرا خیال ہے کہ امام شافعیؒ اس صدی کے مجدد ہیں۔" ان واضح مثالوں سے ایک طالبعلم بھی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت امام احمدؒ کے دل و دماغ پر امام شافعیؒ کے کس قدر گہرے اثرات تھے۔ جب صورتحال یہ ہو تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ امام احمدؒ فقہ کے قائل نہیں تھے۔ آپ نے اپنے زمانے کے کم و بیش تمام مروجہ علوم حاصل کیے مگر انہیں آپ نے مذہبی جہاد کی بنیاد نہیں بنایا۔

☆☆☆

یوں تو دنیا کا ہر مسلمان پیغمبرِ اسلامؐ کا نام لیوا ہے مگر کچھ لوگ جانثاروں کی صف میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا اسمِ گرامی بھی ان ہی سرفروشانِ رسولؐ میں شامل ہے جو سرورِ کونینؐ کی ہر سنت کو زندہ کرنے کے لیے اپنے نفس کے ساتھ ساتھ شاہانِ وقت سے بھی جنگ کرتے رہے۔ رسالت مآبؐ سے آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اپنی ایک ایک سانس کو مزاجِ نبوت کے تابع کرنے کی کوشش کرتے۔ حضرت امامؒ کو یہ روایت معلوم تھی کہ حضور اکرمؐ ایک باندی رکھتے تھے، چنانچہ آپ نے بھی اس سنت پر عمل کرنے کے لیے ایک باندی کا انتظام کیا۔ حالانکہ حضرت امامؒ کو باندیوں سے فطری طور پر کوئی رغبت نہیں تھی۔ اگر کسی کام کے صلے میں رسول خداؐ نے کسی شخص کو ایک دینار عطا کیا تھا تو حضرت

امامؒ بھی وہ کام ضرور کرتے اور اجر کے طور پر ایک ہی دینار دیتے۔ خواہ اس روز آپ کو فاقہ کرنا پڑ جاتا۔ غرض انسانی حد تک جس قدر اتباعِ سنت ممکن تھا، حضرت امام احمدؒ نے اس کا عملی مظاہرہ کیا۔

عشق رسولؐ کی یہ کیفیت تھی کہ آپ احادیث مبارکہ کے علاوہ کسی بھی تقریر و تحریر کی تربیت و تدوین کو ناجائز سمجھتے تھے۔ حضرت امامؒ کو سب سے زیادہ یہ بات ناگوار تھی کہ لوگ آپ کے دیے ہوئے فتووں کو جمع کریں۔ اگر کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ آپ کے علم میں آجاتا تو صاف انکار فرما دیتے کہ ”اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“ ایک بار خراسان کا رہنے والا ایک شخص حضرت امامؒ کے پاس کچھ کتابیں لے کر آیا۔ ایک کتاب پر نظر پڑی تو اس میں آپ کا کلام درج تھا۔ یہ دیکھ کر آپ سخت غضب ناک ہو گئے اور وہ کتاب اٹھا کر پھینک دی۔ پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا ”آپ لوگ گواہ رہیں کہ اس کتاب کو مجھ سے کوئی نسبت نہیں۔“

ایک بار کسی شخص نے سوال کیا ”کیا میں فقہ حنفیہ کی کتابیں تحریر کر سکتا ہوں؟“

”ہر گز نہیں۔“ امام احمدؒ نے نہایت بے باکی سے جواب دیا۔

”لیکن ابن مبارکؒ تو لکھ لیا کرتے تھے۔“ اس شخص نے مثال پیش کی۔

”ابن مبارکؒ آسمان سے نہیں اترتے تھے۔ ہمیں تو حکم ہے کہ ہم آسمان سے علم حاصل کیا کریں۔“ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے بے جھجک ہو کر فرمایا حالانکہ یہ وہی ابن مبارکؒ تھے جن سے ملاقات نہ ہونے پر آپ تمام عمر افسوس کیا کرتے تھے۔ لیکن جب عقائد کا مسئلہ سامنے آتا تو آپ سارے تکلفات کو بالائے طاق رکھ دیتے اور وہی بات کہتے جسے حق سمجھتے۔

حضرت امام احمدؒ کی قوتِ حافظہ بے مثال تھی لیکن پھر بھی حدیثِ رسولؐ کے سلسلے میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک لفظ تحریر کراتے اور بعد میں کاتب کے املا کو بغور ملاحظہ فرماتے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوتا کہ زیر و زبر کی غلطی کا بھی امکان باقی نہ رہے پھر جب کبھی حدیث بیان کرنے کا مرحلہ درپیش ہوتا تو آپ اسی کتاب کا سہارا لیتے۔ حضرت امامؒ کے صاحب زادے عبداللہ فرماتے ہیں۔

”میں نے اپنے والدِ محترم کو کتاب کے بغیر صرف یادداشت کی بنیاد پر حدیث بیان کرتے نہیں دیکھا۔ اگرچہ مخالفین بھی آپ کی قوتِ حافظہ کے قائل تھے لیکن آپ نے آخری سانس تک احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

امام حافظ علیؒ بھی یہی فرمایا کرتے تھے ”میرے سردار امام احمد بن حنبلؒ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں



کتاب دیکھے بغیر روایت حدیث نہ کروں۔“ امام علیؒ کا یہ قول بھی مشہور ہے کہ ”ہم لوگوں میں امام احمد بن حنبلؒ سے زیادہ قوی الحافظہ کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔“

حضرت امامؒ کی زندگی میں عشق رسولؐ کی ایک روشن مثال یہ بھی نظر آتی ہے کہ آپ چالیس سال کی عمر سے پہلے مسندِ درس پر جلوہ افروز نہیں ہوئے۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہِ خداوندی سے چالیس برس کی عمر میں نبوت عطا ہوئی تھی۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اپنے کارِ منصبی کے آغاز کے لیے اسی وقت کا انتخاب کیا۔

☆☆☆

حضرت امامؒ کے حلقۂ درس میں تقریباً پانچ ہزار افراد شریک ہوتے تھے۔ شروع میں تو یہ تعداد کم تھی لیکن جیسے جیسے تشنگانِ معرفت میں اضافہ ہوتا گیا جگہ کی قلت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے انسانوں کا کسی ایک مکان میں سمانا غیر ممکن تھا۔ اس لیے حضرت امامؒ نے جامع مسجد بغداد کو اپنا مقامِ درس بنایا۔ یہاں عصر سے مغرب تک لوگوں کا اجتماع ہوتا۔ حضرت امامؒ بڑے والہانہ انداز میں درسِ حدیث دیتے۔ اس طرح کہ جیسے کوئی ادنیٰ ترین غلام، شہنشاہِ عالم کا فرمان پڑھ کر سنا رہا ہو۔ اس کے بعد آپ لوگوں کے شرعی مسائل سنتے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں فتوے دیتے۔ مروزی حضرت امام احمدؒ کے ساتھی تھے۔ وہ آپ کی مجلسِ درس کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

”امام احمدؒ کی محفل میں ہر فقیر لائق احترام اور ہر مفلس عزت دار تھا۔ میں نے آج تک ایسی کوئی مجلس نہیں دیکھی جہاں مفلوک الحال انسانوں کو اس قدر قابلِ التفات سمجھا جاتا ہو۔“

دوسری مجلسِ درس حضرت امامؒ کے گھر پر منعقد ہوتی تھی جس میں آپ کے فرزند اور خاص خاص شاگرد شریک ہوتے تھے۔ آپ کے ایک ہم عصر امام بھی اکثر درس میں تشریف لے جاتے تھے۔ ان کا بیان ہے ”میں بارہ سال تک احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں حاضر رہا۔ وہ اپنی اولاد کو مسند کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ میں نے اس میں سے ایک حدیث بھی نہیں لکھی مگر مجھے جو چیز احمدؒ کی مجلس میں کھینچ کر لے جاتی تھی وہ ان کے اخلاق و آداب اور سیرت و کردار تھے۔“

حضرت امامؒ کے حلقۂ درس کا نمایاں پہلو غیرتِ نفس اور وقارِ ذات تھا۔ وہ نجی محفل ہو یا مجلسِ علمی دونوں صورتوں میں آپ کا طرزِ سلوک یکساں ہوتا۔ حضرت امامؒ نہ خود کسی سے مذاق فرماتے تھے اور نہ کسی دوسرے کو یہ اجازت دیتے تھے کہ وہ آپ کے حضور بے سروپا باتیں کرے۔ ابو نعیم کی روایت ہے

کہ ہم یزید بن ہارون کی مجلس میں حاضر تھے۔ یزید اپنے شاگردوں کو املا کرا رہے تھے کہ ان کے منہ سے کوئی ہنسی کی بات نکل گئی۔ احمد بن حنبلؒ بھی وہاں موجود تھے۔ وہ اس موقع پر صرف کھنکار کر رہ گئے۔ یزید نے جیسے ہی ان کی آواز سنی، اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا اور شاگردوں سے کہا ''نادانو! تم نے بتایا کیوں نہیں کہ امام احمدؒ بھی یہاں موجود ہیں۔ اگر مجھے خبر ہوتی تو میں تم سے مذاق کی بات کیوں کرتا؟'' یہ غیر کی مجلس کا حال تھا۔ خود اپنی محفل میں تو حاضرین کی سانسیں بھی رکتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ انتہا یہ ہے کہ حضرت امامؒ کے اساتذہ بھی آپ کی اس عادت سے واقف تھے اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ کوئی بات مزاج کے خلاف نہ ہو۔

☆☆☆

حضرت امام احمدؒ کی پیدائش سے کچھ پہلے ہی عربوں پر فارسی عناصر کے غلبے کا آغاز ہو چکا تھا اس لیے آپ نے مذہبی علم کے سلسلے میں بہت زیادہ سختی اختیار کی۔ حضرت امامؒ ہر اس بات کو بے دریغ مسترد کر دیا کرتے تھے جس کا ثبوت صحابہؓ یا تابعین کی زندگی سے نہیں ملتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے علم فقہ کو اس کی افادیت کے باوجود نظر انداز کر دیا۔ یہاں تک کہ حضرت امامؒ نے وہی علم سیکھا جس کا تعلق بزرگانِ اسلاف سے تھا اور پھر وہی علم دوسروں کو منتقل کیا جس کا عملی نمونہ اصحاب رسولؐ کی سنتِ پاک میں نظر آتا تھا۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا طرز تعلیم نہایت سادہ اور آسان تھا۔ آپ اپنی مادری زبان کے علاوہ فارسی پر بھی دسترس رکھتے تھے مگر ہمیشہ تشبیہات واستعارات سے گریز کرتے۔ اپنی بات کو سمجھانے کے لیے وہی اندازِ گفتگو اختیار کرتے جو قرآن وحدیث کے شایانِ شان ہوتا۔ ایک بار آپ کے صاحب زادے حضرت عبداللہؒ یہ حدیث بیان فرما رہے تھے ''خدا نے حضرت آدم علیہ السلام کا خمیر اپنے ہاتھ سے گوندھا'' اس کی تشریح کرتے وقت حضرت عبداللہ نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کر دیا۔ حضرت امامؒ نے انہیں فوراً ٹوکا ''یداللہ کا مفہوم بیان کرتے وقت اپنا ہاتھ دراز نہ کیا کرو۔ حدیث میں یہ لفظ صرف انسانوں کو سمجھانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ویسے اللہ کا کوئی ہاتھ نہیں۔ وہ جسمِ ظاہری سے بے نیاز ہے۔''

☆☆☆

جس انسان نے شدید گرمی میں اپنا پسینہ بہا کر چند درہم مزدوری کی ہو اور پھر اپنے شکم کو خالی رکھنے کے بعد وہ رقم علم کے راستے میں خرچ کر دی ہو، اس کے تقوے کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ حضرت امامؒ



کے دوسرے صاحب زادے حضرت صالحؒ اصفہان کے قاضی تھے۔ ایک بار آپ کے خادم نے حضرت صالحؒ کے مطبخ سے خمیر لے کر روٹی تیار کی۔ جب روٹی حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے پہنچی تو آپ نے خادم سے سوال کیا۔

''آج یہ روٹی اس قدر گداز کیوں ہے؟ میں نے اپنی ساری زندگی میں اتنی نرم غذا استعمال نہیں کی۔''

''حضور! میں نے اس خیال سے کہ آپ کو اپنے صاحب زادے کی چیز کے استعمال پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ تھوڑا سا خمیر لے کر آٹے میں ملا دیا تھا۔'' خادم نے قدرے ڈرتے ڈرتے پوری کیفیت بیان کر دی ''خشک اور سخت روٹیاں کھاتے کھاتے آپ کو زمانہ گزر گیا ہے۔ اب مجھ سے آپ کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔''

''خدا تمہیں جزائے خیر دے کہ تم مجھ جیسے فقیر کا اتنا خیال رکھتے ہو۔'' حضرت امامؒ بڑے صبر وتحمل سے فرمایا ''تمہارا جذبۂ محبت اپنی جگہ مگر یہ روٹیاں میرے استعمال کے قابل نہیں۔ جو شخص اصفہان کا قاضی رہ چکا ہو اس کے یہاں کا خمیر میرے حلق سے نیچے نہیں اتر سکتا اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو پھر جسم کے اندر بڑا فساد برپا ہو جائے۔'' یہ کہہ آپ نے خادم کو حکم دیا۔ ''روٹیاں اٹھا کر رکھ دو۔ اگر کوئی بھوکا ادھر آئے تو اسے پیش کر دینا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی بتا دینا کہ روٹیوں میں خمیر صالح کا ہے اور آٹا احمد بن حنبل کا۔'' گفتگو کرتے وقت آپ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا تھا۔ خادم اپنی اس حرکت پر سخت نادم تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے تمام روٹیاں اٹھائیں اور انہیں ایک جگہ محفوظ کر دیا۔

کئی دن گزر گئے مگر امام احمدؒ کے دروازے پر کوئی سائل نہیں آیا۔ یہاں تک کہ خمیر کی وجہ سے روٹیوں میں بو پیدا ہو گئی۔ خادم نے آپ کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

حضرت امامؒ نے جواباً فرمایا ''تم نے دیکھا؟ روزانہ کوئی نہ کوئی سائل ادھر سے گزرتا تھا لیکن اب ایک ہفتے سے کسی نے اس طرف کا رخ بھی نہیں کیا۔ جب کوئی فقیر ان روٹیوں کو کھانے کے لیے آمادہ نہیں تو پھر احمد انہیں اپنی غذا کیسے بنا سکتا ہے؟'' یہ کہہ کر آپ نے خادم کو حکم دیا ''تمام روٹیاں دریائے دجلہ میں ڈال دو۔'' اس کے بعد حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے کئی سال تک دریائے دجلہ کی مچھلی نہیں کھائی محض اس خیال سے کہ وہ روٹیاں مچھلیوں کی خوراک بن گئی ہوں گی اور ان کے گوشت میں اسی کے خمیر کا اثر آ گیا ہوگا۔ یہ تقوے کی آخری منزل ہے۔ جس پر حضرت احمد بن حنبلؒ جیسے عاشقِ رسولؐ اور جاں

شارِ شریعت ہی گامزن ہوسکتے تھے۔

حضرت امام اپنے شاگردوں کو روحانی تربیت کا سبق دیتے ہوئے فرمایا کرتے تھے ''جس شخص کے پاس چاندی کی سرمہ دانی ہو اس کے پاس بھی مت بیٹھو۔'' حضرت امامؒ کے اس قولِ مبارک کی عملی تشریح مذکورہ بالا واقعہ ہے کہ آپ نے اپنے نیک بیٹے کے گھر کا خمیر صرف اس لیے قبول نہیں کیا کہ وہ حکومتِ وقت کے اہم عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔

☆☆☆

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے علمِ حدیث کی تکمیل کے سلسلے میں جو آلام و مصائب برداشت کیے ہیں، وہ قیامت تک کے لیے اہلِ طلب کا سرمایہ ہیں۔ آپ امام سفیان بن عیینہؒ کو امام مالکؒ کا بدل سمجھتے تھے مگر مکہ معظمہ میں سکونت پذیر ہونے کے باعث ان سے ملنا کارِ دشوار تھا۔ حضرت امامؒ اپنی اقتصادی بدحالی کے سبب اس طویل سفر کے قابل نہیں تھے۔ کچھ دنوں تک حالات کی بہتری کا انتظار کرتے رہے لیکن جب کوئی انتظام نہ ہوسکا تو پیدل ہی حج کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں آپ پر جو کچھ گزری اس کے تصور ہی سے ایک عام انسان لرز کر رہ جاتا ہے لیکن حضرت امام احمدؒ اس لیے مطمئن تھے کہ یہ سب کچھ خدا کی راہ میں تھا۔ غرض آپ حج سے فارغ ہو کر امام سفیان بن عیینہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ قیامِ مکہ کے دوران میں آپ کا یہ روزانہ کا معمول تھا کہ بیشتر وقت امام سفیانؒ کی صحبت میں گزارتے۔ ایک دن امام احمدؒ درس میں تشریف نہیں لائے تو حضرت سفیانؒ نے اپنے ایک خادم کو خیریت معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ جب خادم حضرت امامؒ کی قیام گاہ پر پہنچا تو اس نے وہاں عجیب منظر دیکھا۔ آپ کے بدن پر ایک مختصر سا کپڑا لپٹا ہوا تھا اور باقی پورا جسم برہنہ تھا۔ خادم نے حضرت سفیانؒ کا پیغام گوش گزار کیا۔ جواباً حضرت امامؒ نے فرمایا ''بھائی میرے پاس کپڑوں کا ایک ہی جوڑا تھا جسے میں نے زیادہ میلا ہونے کے سبب آج ہی دھوبی کو دے دیا۔ وہ دو تین دن میں آنے کا وعدہ کر گیا ہے۔ میں امام صاحب کے درس میں جانے کے لیے بے چین تھا مگر کیا کرتا؟ میری اتنی استطاعت نہیں کہ نیا کپڑا خرید سکوں اگر کسی قابل بھی ہوتا تو اس حالت میں بازار کس طرح جاتا۔ بس کسی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب تم آ گئے تو خدا نے میری مشکل آسان کر دی۔''

حضرت امامؒ کی یہ حالت دیکھ کر خادم پر کچھ دیر سکتہ طاری رہا پھر بڑے ادب سے عرض کرنے لگا کہ اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو مجھ سے کچھ رقم لے کر اپنے لباس کا انتظام فرما لیجیے۔



امام احمدؒ نے خادم کا شکریہ ادا کیا اور پھر اسے ایک کتاب دیتے ہوئے فرمایا ''یہ میرے ہاتھ کی تحریر کردہ کتاب ہے، اسے بازار میں جا کر فروخت کر دو اور جتنی رقم ملے اس میں سے دس گز ٹاٹ خرید لاؤ۔''

خادم نے کتاب لے لی اور جاتے جاتے دوبارہ عرض کیا ''اگر اجازت ہو تو کتان (نسبتاً بہتر کپڑا) خرید لوں؟''

حضرت امام نے انکار کر دیا ''نہیں ٹاٹ کافی ہے۔''

خادم کتاب لے کر بازار جانے کے بجائے سیدھا حضرت سفیانؒ کی درس گاہ چلا گیا اور انہیں سارا واقعہ سنا دیا۔

حاضرینِ مجلس امام احمدؒ کے افلاس کا ذکر سن کر سناٹے میں آ گئے۔ بعض آسودہ حال لوگ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت سفیانؒ سے مشورہ کرنے لگے کہ وہ امام احمدؒ کی ضروریات کو پورا کر دیں۔

حضرت سفیانؒ نے ان لوگوں کو جواب دیتے ہوئے فرمایا ''تم لوگوں کی بہ نسبت میرے لیے یہ بات زیادہ آسان ہے کہ میں احمد بن حنبلؒ کی خبر گیری کروں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرا حکم نہیں ٹالے گا مگر تم نہیں جانتے کہ وہ کتنا غیور ہے۔ میں اس کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا اور شاید تمہیں بھی یہ نہیں معلوم کہ وہ کتنی دور سے پیدل چل کر یہاں تک آیا ہے۔'' ان لوگوں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو امام سفیانؒ نے کہہ دیا ''جاؤ کوشش کر دیکھو۔''

مکہ معظمہ کے وہ آسودہ حال، علم دوست انسان، حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے ''ہم بہت شرمندہ ہیں کہ ایک معزز مہمان کا حال نہ پوچھ سکے۔'' سب لوگوں نے بیک زبان کہا ''ہمیں تھوڑی بہت خدمت کا موقع دیجیے۔''

حضرت امامؒ نے حضرت سفیان عیینہؒ کے خادم کی طرف دیکھا جو ان لوگوں کے ساتھ واپس آ گیا تھا ''میں تمہیں معاف کرتا ہوں کہ تم نے کسی بری نیت سے میرا راز فاش نہیں کیا۔'' پھر دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ''ویسے تو ساری زمین اللہ کی ہے اور تمام مخلوق اسی کی مہمان ہے مگر یہ مقامِ خاص ہے جہاں اللہ کا گھر موجود ہے، اس طرح میں بھی اس کا مہمانِ خصوصی ہوں۔ وہی میرا دستگیر ہے، وہی میرا کفیل ہے۔ آپ حضرات نے میری خاطر اتنی زحمت گوارا کی۔ خدا آپ پر اپنے رحم و کرم کی بارش فرمائے۔'' یہ کہہ کر آپ خادم سے دوبارہ مخاطب ہوئے ''بھائی تم وہی کرو جو میں نے تم سے کہا ہے۔ اللہ کے قانون کے مطابق ہر شخص کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ اگر میں باہر جانے کے قابل ہوتا تو تمہیں ہرگز

"یہ تکلیف نہ دیتا۔" خادم نے آپ سے معافی مانگی اور باہر چلا گیا۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی رخصت ہو گئے مگر اس طرح کہ ان کے چہروں پر دلی رنج کے اثرات نمایاں تھے۔

دوسرے دن آپ وہی ٹاٹ کا لباس پہن کر امام سفیان بن عینیہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے جس نے اس طالب علم کو دیکھا لرز گیا، جس کی نظر پڑی اداس ہو گیا۔ یہاں تک کہ امام سفیانؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دارا وسکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی نواؤں میں بُوئے اسد اللہی

☆☆☆

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی زندگی کا سرمایہ ہی عشقِ رسولؐ تھا اور اسی عشق نے آپ کی روحانی تربیت کی۔ عزتِ نفس، قوتِ برداشت، تحقیق و جستجو، یہ سب کچھ اسی عشق کا نتیجہ تھا۔ تحصیلِ علم حدیث میں جہاں آپ نے بے مثال مشقتیں برداشت کیں، وہاں ادب کا لازوال نمونہ بھی پیش کیا۔ احترامِ رسولؐ کا یہ عالم تھا کہ آپ کلام رسولؐ بھی کھڑے ہو کر سنا کرتے تھے۔ حضرت امامؒ کے دل میں محدثین کرام کی اس قدر عظمت و توقیر تھی کہ دنیا کا کوئی فرماں بردار غلام بھی اپنے آقا کی اتنی عزت نہیں کرے گا۔ حضرت یحییٰ بن سعید القطانؒ امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے شاگردِ خاص تھے۔ یہ وہی یحییٰؒ ہیں جن کے بارے میں احمد بن حنبلؒ کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے یحییٰؒ کے مثل کوئی شخص نہیں دیکھا اور ان ہی یحییٰ کی مجلسِ درس میں حضرت امامؒ عصر سے مغرب تک دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔

☆☆☆

رسول کریمؐ کی مشہور حدیث ہے کہ "مزدور کو پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کر دو۔" دنیا کے ہر مسلمان نے اپنے اپنے طور پر اس حدیث پاک کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی ہے مگر جو بزرگانِ دین خود بھی مزدوری کر چکے ہیں وہ قول رسولؐ کی حقیقت کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے زندگی میں کئی بار محنت و مشقت کے یہ مرحلے طے کیے تھے۔ اس لیے آپ کو بخوبی اندازہ تھا کہ مزدور کے جسم سے بہنے والا پسینہ کیا ہوتا ہے اور اس کے خشک ہونے تک مزدور کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ حضرت امام فطرتاً نہایت نرم دل انسان تھے۔ پیغمبر اسلامؐ کی محبت نے گدازِ قلب میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ ایک مزدور جب آپ کے یہاں کام ختم کر کے شام کو گھر جانے لگا تو آپ نے شاگرد سے فرمایا کہ



اسے مزدوری سے کچھ زیادہ رقم دے دو۔

"وہ پہلے ہی انکار کر چکا ہے۔" شاگرد نے ادب سے عرض کیا "اب بھی شاید نہیں مانے گا۔"

"تم کہہ کر تو دیکھو۔" حضرت امامؒ نے دوبارہ فرمایا "اسے اس وقت زیادہ کا لالچ نہیں تھا۔ ممکن ہے اب کوئی نئی ضرورت پیش آ گئی ہو۔"

حضرت امامؒ کو دوسروں کی محنت اور تکلیف کا اس قدر احساس رہتا تھا مگر خود بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی عقیدت مند اپنی جائز کمائی سے بھی کچھ رقم بطور نذر پیش کرتا تو اسے قبول نہ فرماتے۔ محمد بن موسیٰؒ کی روایت ہے کہ حضرت امامؒ کے ایک عقیدت مند حسن بن عبدالعزیز کو میراث میں ایک لاکھ دینار ملے۔ حسن نے وہ تمام رقم بصد احترام آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا "یہ سب کچھ مجھے وراثت سے حاصل ہوا ہے۔ میں اسے جائز اور حلال سمجھتا ہوں۔ براہِ کرم اسے قبول فرما کر اپنے استعمال میں لائیے اور مجھے حقیر سی خدمت کا موقع دیجیے۔"

حضرت امام بن حنبلؒ، حسن بن عبدالعزیز کی محبت سے بہت خوش ہوئے اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہوئے فرمایا "دو خشک روٹیاں جس کے شکم کی آگ بجھا دیتی ہوں، اسے سونے کے نوالوں کی کیا ضرورت ہے؟ ایک انسان جب ٹاٹ سے اپنا جسم ڈھانپ سکتا ہے تو پھر حریر و دیبا کی تلاش عبث ہے۔"

حسن بن عبدالعزیز یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ تمام عمر اس حسرت میں زندہ رہے کہ شاید حضرت امامؒ کسی خدمت کا موقع عنایت فرمائیں، مگر آپ نے غیر تو غیر، اپنی اولاد کو بھی ذاتی سلسلے میں کوئی زحمت نہیں دی۔

حضرت امامؒ کے صاحبزادے صالح بن احمدؒ اصفہان میں ایک سال تک قاضی رہے۔ ان کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ دن کو روزہ رکھ کر عدالت کے فرائض انجام دیتے اور رات کو اپنے اللہ کے آگے سربسجود رہتے۔ مشکل سے دو گھنٹے سوتے اور باقی وقت یادِ الٰہی میں گزار دیتے۔ اپنے مکان پر ایک عام نشست گاہ بنائی ہوئی تھی۔ شب و روز اس کا دروازہ کھلا رکھتے کہ جس وقت بھی جو ضرورت مند آئے اس کی حاجت پوری کی جا سکے۔ مختصر یہ کہ حضرت صالحؒ پرہیزگاری میں اپنے والد ہی کے نقشِ قدم پر چلا کرتے تھے مگر حضرت امامؒ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایسے عابد و زاہد بیٹے کے یہاں سے روٹی کا خمیر تک لینا گوارا نہ کیا۔ حضرت صالحؒ اپنے غیرت مند باپ کی صفاتِ عالیہ بیان کرتے ہوئے کہتے تھے کہ جب

آپ مکان پر تشریف لے جاتے تو اپنی نظریں اوپر نہ اٹھاتے۔ آپ کی شرم وحیا، ادب، انکسار اور تواضع مثالی تھی۔ آپ کبھی کسی سے وضو کا پانی بھی طلب نہ کرتے، ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کنویں میں ڈول ڈالتے، اگر وہ بھرا ہوا نکلتا تو الحمدللہ فرماتے۔ یہاں تک کہ حکومتِ وقت کی طرف سے دی جانے والی مسلسل سزاؤں اور بیماریوں نے آپ کو تھکا دیا تو مجبور ہو گئے مگر اس حالت میں یہی دعا وردِ زبان رہتی "اے قاضی الحاجات! مجھے اپنے سوا کسی کا محتاج نہ کر۔" یہ غیرتِ نفس اور پرہیزگاری کا عظیم الشان مظاہرہ تھا۔ حضرت امامؒ نے اس راستے میں کسی رشتے، کسی موسم اور کسی طاقت کو تسلیم نہیں کیا۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت امامؒ نے اس راستے میں کسی رشتے، کسی موسم اور کسی طاقت کو تسلیم نہیں کیا۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب حضرت امامؒ مشہور بزرگ عبدالرزاق بن ہمامؒ سے علمِ حدیث حاصل کرنے کے لیے یمن تشریف لے جا رہے تھے۔ خلیفہ امین نے آپ کے استاد حضرت امام شافعیؒ کو اس کام پر مامور کیا تھا کہ وہ یمن کے لیے کسی قاضی کا انتخاب کریں۔ امام شافعیؒ آپ کے حالات سے واقف تھے کہ اکثر اوقات پیسے کی کمی کے باعث کیسی کیسی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ امام شافعیؒ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور سوچا کہ اگر امام احمد بن حنبلؒ کو یمن کا قاضی مقرر کر دیا جائے تو ان کی مالی پریشانیاں ختم ہو جائیں گی اور وہ اطمینانِ قلب کے ساتھ عبدالرزاق بن ہمامؒ سے حدیث کی سماعت کر سکیں گے مگر جب استاد کی طرف سے یہ پیشکش ہوئی تو آپ نے ادب کے ساتھ انکار کر دیا...... امام شافعیؒ وقتی طور پر خاموش ہو گئے لیکن کچھ دن بعد دوبارہ کہا "احمد! اسے قبول کر لو۔" اب کی مرتبہ امام شافعیؒ نے بہت اصرار کے ساتھ پیشکش کی تھی۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے نہایت احترام سے عرض کیا "شیخ عالی مقام! مادرِ گرامی کے بعد روئے زمین پر آپ مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ میں آپ کے حکم پر شدید اذیتیں برداشت کر سکتا ہوں لیکن اس سلسلے میں خادم کی معذرت قبول فرمائیں۔ اگر آئندہ آپ نے یہی پیشکش کی تو پھر مجھے کبھی اپنی بارگاہ میں حاضر ہوتے نہیں دیکھیں گے۔"

امام شافعیؒ آپ کا جواب سن کر حیران رہ گئے۔ انہیں اپنے شاگردِ جلیل کی ظاہری حالت دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا تھا مگر وہ اس مردِ قلندر کو راہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆



حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی شدتِ احساس کا یہ عالم تھا کہ آپ ایک ایک حرف سے سبق حاصل کرتے تھے اور ایک ایک لفظ سے عبرت پکڑتے۔ یہ حضرت امامؒ کی نوجوانی کا واقعہ ہے، آپ اپنے استاد حضرت امام شافعیؒ کی خدمت میں حاضر تھے کہ مشہور بزرگ شیبان راعیؒ تشریف لائے آپ نے حضرت امام شافعیؒ سے سرگوشی کے انداز میں کہا "میں چاہتا ہوں شیبانؒ کو ان کی کم علمی سے آگاہ کروں تاکہ یہ بھی تحصیلِ علم کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی مذہبی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔"

امام شافعیؒ نے منع کیا مگر آپ نہیں مانے اور بے اختیار حضرت شیبان راعیؒ سے سوال کر بیٹھے "اگر کسی شخص کی پانچ نمازوں میں سے ایک نماز قضا ہو جائے یا یاد نہ رہے کہ کون سی نماز قضا ہوئی ہے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟"

حضرت شیبان راعیؒ چند لمحوں تک امام احمد بن حنبلؒ کی طرف دیکھتے رہے اور پھر جذب و مستی کی کیفیت سے سرشار ہو کر فرمایا "احمد! ایسے شخص کا دل اللہ کی یاد سے غافل ہے۔ لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے دل کو سزا دے پھر اسے چاہیے کہ پانچوں نمازیں ادا کرے۔"

شیبان راعیؒ کے لہجے میں اس قدر جلال تھا کہ امام احمدؒ کا پورا جسم لرزنے لگا اور پھر خوفِ خدا کی شدت سے آپ بے ہوش ہو گئے۔ اسی دوران حضرت شیبان راعیؒ اٹھے اور امام شافعیؒ کی مجلسِ درس سے نکل کر چلے گئے۔

جب امام احمد بن حنبلؒ کو ہوش آیا تو حضرت شافعیؒ نے فرمایا "میں تم سے نہیں کہتا تھا کہ شیبانؒ کو مت چھیڑو۔ یہ منزلِ عشق کے مسافر ہیں، ان کی بات ہی جدا ہے۔"

دوسری بار بھی ایک ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ حضرت امامؒ نے شیبان راعیؒ سے پوچھا "زکوٰۃ، مال و متاع کی کس مقدار پر واجب ہو جاتی ہے؟"

حضرت شیبان راعیؒ نے جواباً فرمایا "تمہارے مذہب میں اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کی اس مقدار پر، کھیتوں اور پھل دار درختوں کی اس مقدار پر، سونے اور چاندی کی اس مقدار پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے مگر میرے مذہب میں تو سب کچھ زکوٰۃ کے لیے ہے۔"

شیبان راعیؒ کے الفاظ کیا تھے، ایک زلزلہ تھا جس نے امام احمد بن حنبلؒ کے دل کی دنیا کو زیروزبر کر کے رکھ دیا تھا آپ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ روتے روتے بے ہوش ہو گئے۔

ان واقعات کے بعد حضرت امامؒ نے شیبان راعیؒ سے پھر کبھی علمی بحث نہیں کی، یہاں تک کہ آپ مستقل طور پر ایک ایسے بزرگ کی خدمت میں حاضری دینے لگے جو ہمہ وقت یادِ الٰہی میں غرق رہتے تھے۔ حضرت امام طبیعت کے اس انقلاب کو دیکھ کر ایک عالم و فاضل دوست نے کہا "احمد! تم ایک ایسے شخص کے پاس جا کر اپنا وقت کیوں برباد کرتے ہو جو نہ فقیہہ ہے نہ محدث؟"

حضرت امامؒ نے فرمایا "تم اس راز سے بے خبر ہو۔ علم کا جسم میرے پاس ہے مگر روح ان بزرگ کے قبضے میں ہے۔ میں اسی روح کی تلاش میں وہاں جاتا ہوں اور روح، معرفتِ الٰہی کے سوا کچھ نہیں۔"

☆☆☆

حضرت بشر حافیؒ اسی زمانے میں بہت مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت امام احمدؒ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ جب کوئی شخص آپ سے علمی سوالات کرتا تو آپ فرماتے "شرعی مسائل لے کر میرے پاس آیا کرو۔ اگر کسی کو طریقت کے معاملات سے دلچسپی ہے تو اسے لازم ہے کہ وہ بشر حافیؒ کی خدمت میں حاضر ہو۔"

ایک بار کسی نے حضرت امامؒ سے محبت کا مفہوم پوچھا تو آپ نے فرمایا "اے شخص تو محبت کی زبانی تشریح چاہتا ہے یا عملی؟"

"میری دیرینہ آرزو ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے محبت کی جیتی جاگتی مثال دیکھوں۔" اس شخص نے بڑے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔

"تو پھر بشیر حافیؒ کو دیکھو۔" حضرت امامؒ نے نہایت عقیدت سے فرمایا "جب تک وہ زندہ ہیں کسی کو مجھ سے محبت کا مفہوم پوچھنے کی ضرورت نہیں۔"

یہی بشر حافیؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے "امام احمدؒ مجھ سے بدرجہا افضل ہیں۔ میں تو صرف اپنی ہی ذات کے لیے جائز روزی تلاش کرتا ہوں مگر وہ اپنے اہل و عیال کے لیے بھی رزقِ حلال کی کوشش کرتے ہیں۔"

مشہور امام حضرت اسحٰق بن راہویہؒ کا قول مبارک ہے کہ "حضرت امام احمد بن حنبلؒ اس زمین پر اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان حجت کے طور پر موجود ہیں۔"

آپ کے استاد حضرت امام شافعیؒ کا ارشادِ گرامی ہے "میں بغداد سے نکلا تو میں نے اس شہر میں امام احمد حنبلؒ سے زیادہ فقیہہ، عالم اور متقی نہیں چھوڑا۔"



نامور بزرگ حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا کہ معتزلہ نے امام احمد بن حنبلؒ پر جس قدر الزام تراشیاں کی تھیں آپ ان عیبوں سے پاک تھے۔ حضرت داؤد سجستانیؒ کا بیان ہے کہ امام احمد حنبلؒ کی مجلس، آخرت کی مجلس تھی، آپ دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا سے بہت دور تھے۔

☆☆☆

حضرت امامؒ اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے "میں ایک بار جنگل میں راستہ بھٹک گیا۔ بہت دیر ادھر ادھر گھومتا رہا مگر راہِ راست پر نہ آسکا۔ یہاں تک کہ جس قدر کوشش کرتا تھا، اتنا ہی الجھتا چلا جاتا تھا۔ بالآخر تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا اور تائیدِ غیبی کا انتظار کرنے لگا۔ اس طرح کافی وقت گزر گیا۔ میں دوبارہ راستہ تلاش کرنے کے خیال سے اٹھا۔ ابھی چند قدم کا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ سامنے سے ایک اعرابی میری طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ مجھے اس شخص کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ جب وہ میرے قریب آ گیا تو میں نے سلام کرنے کے بعد اس سے راستہ معلوم کیا۔ میری بات سنتے ہی وہ اعرابی چیخیں مار کر رونے لگا۔ میں نے اس کی گریہ وزاری دیکھ کر یہی سمجھا کہ وہ بھوک کی شدت سے بے قرار ہے۔ میرے پاس سفر کے لیے چند سوکھی روٹیاں موجود تھیں۔

میں نے فوراً اس سے کہا کہ اگر وہ بھوکا ہے تو روٹی کھا لے۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی روٹیاں اس کی طرف بڑھا دیں۔ چند لمحے پہلے وہ دردناک آواز میں رو رہا تھا مگر میری آواز سنتے ہی وہ خاموش ہو گیا پھر غضب ناک آواز میں بولا "اے امام حنبل! کیا تو آخرت کے حساب سے نہیں ڈرتا جو خدا کی طرح مجھے رزق دینا چاہتا ہے؟ میری بھوک کے متعلق بعد میں سوچنا۔ تُو تو خود گم کردہ راہ ہے۔" میں اعرابی کی روشن ضمیری دیکھ کر حیران رہ گیا اور خدا کی قدرت کے بارے میں سوچنے لگا کہ اس نے اپنے پسندیدہ بندوں کو کہاں چھپا رکھا ہے اور انہیں کیسی کیسی روحانی قوتیں دے رکھی ہیں؟ خدا نے اعرابی پر میرے دل کی بات روشن کر دی۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولا "خدا کے بندے تو ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ اشارا کریں تو ساری زمین سونے کی ہو جائے۔" اعرابی کے الفاظ کی گونج ابھی باقی تھی کہ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو جنگل کے تمام سرسبز درخت سنہری ہو گئے تھے۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی ہر چیز سونے کا ڈھیر معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس اجنبی سے کچھ معلوم کرنا چاہا تو وہ غائب ہو گیا۔ اعرابی کے روپوش ہوتے ہی مجھے راستہ مل گیا اور بہت دور تک ایک غیبی آواز سنائی دیتی۔

"یہ ہمارا محبوب بندہ ہے۔ اگر یہ کہہ دے تو ہم سارے عالم کو زیروزبر کر دیں۔ احمد! تجھے ہمارا شکر

گزار ہونا چاہیے کہ ہم نے تیری ملاقات ایک ایسے بندے سے کرائی جو ہماری بارگاہ میں نہایت پسندیدہ ہے۔ بے شک ہم اپنی راہ میں کوشش کرنے والوں کو ایسی ہی نشانیاں دکھاتے ہیں۔'' حضرت امام بن حنبلؒ کبھی کبھی فرماتے تھے کہ اللہ نے عجیب انداز سے مجھے تنبیہہ کی ہے اور حیران کن طریقوں سے میری دستگیری فرمائی ہے۔ اگر وہ مجھ عاجز و ناتواں کا ہاتھ نہ تھامتا تو میں کبھی کا ہلاک ہو چکا ہوتا۔

☆☆☆

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو اپنی زندگی میں تین قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ پہلا طبقہ غریب عوام کا تھا۔ حضرت امامؒ معاشرے کے ستائے ہوئے انسانوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ اگر آپ کی مجلس میں کوئی مفلوک الحال شخص شریک ہوتا تو اس طرح پیش آتے جیسے وہ دنیا کا مالدار ترین آدمی ہے۔ دوسرا طبقہ حکمرانوں، وزیروں اور امیروں کا تھا۔ حضرت امامؒ اس قبیل کے افراد سے ملنا تو درکنار ان کی شکلیں دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ اگر ذی حیثیت انسان آپ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا تو خاموش رہتے لیکن جب آپ کو مالی استعانت کی پیش کش کرتا تو انتہائی حقارت سے ٹھکرا دیتے۔ تیسرا طبقہ اہلِ علم کا تھا جس سے حضرت امامؒ کی محبت قابلِ دید تھی۔ خصوصاً جن علما نے احادیث رسولؐ کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیا تھا، وہ تمام حضرات امام احمد بن حنبلؒ کے محبوب تھے۔ ان کی مجلسوں میں اس طرح بیٹھتے تھے کہ ایک غلام بھی اس ادب و احترام کا نمونہ پیش کرنے سے قاصر رہتا۔ ساری زندگی ایسے لوگوں کی تلاش میں کوچہ بہ کوچہ قریہ بہ قریہ اور شہر بہ شہر بھٹکے۔ اگر کسی سے ملاقات ہو جاتی تو خدا کا شکر ادا کرتے جیسے نعمتِ عظمیٰ ہاتھ آ گئی ہو۔ اگر کسی کے فیضِ صحبت سے محروم رہتے تو ایسا محسوس کرتے جیسے سرمایہ حیات لٹ گیا ہو۔

مشہور صوفی شاعر حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ اپنی کتاب تذکرۃ الاولیاء میں اس طرح رقمطراز ہیں۔ ''امام احمد بن حنبلؒ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے شرفِ نیاز حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اتفاق سے ابن مبارکؒ ایک دن خود ہی آپ کے یہاں تشریف لے آئے۔ جب صاحبزادے نے ان کی آمد کی اطلاع دی تو آپ خاموش ہو گئے اور ملاقات کے لیے باہر نہ نکلے۔ ابن مبارکؒ واپس چلے گئے تو حضرت امام احمدؒ کے فرزند نے ادب سے سوال کیا ''آپ ابن مبارکؒ سے ملنے کے لیے ہمیشہ بے چین رہتے تھے مگر جب وہ خود چل کر آپ کے گھر تک آئے تو آپ نے ملنے سے انکار کر دیا۔ آخر اس بے توجہی کا کیا سبب ہے؟''



حضرت امامؒ نے بڑے غم زدہ لہجے میں فرمایا ''مجھے خوف تھا کہ ابنِ مبارکؒ سے ملاقات کے بعد شاید ان کی جدائی برداشت نہ کر سکوں اس لیے اب یہ طے کیا ہے کہ ان سے ایسی جگہ ملوں گا جہاں فراق کا امکان باقی نہ رہے۔''

اس سلسلے میں حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ زیادہ تحقیق سے کام نہ لے سکے۔ تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے ملنے کے لیے بے حد آرزو مند تھے لیکن دونوں بزرگ ایک دوسرے سے ملاقات نہیں کر سکے تھے۔ غالباً یہ کسی اور امام کا واقعہ ہے جس کا ذکر حضرت عطارؒ نے کیا ہے۔ تحقیق کی بے احتیاطی اپنی جگہ مگر یہ سچ ہے کہ جب امام احمد بن حنبلؒ کسی بزرگ سے مل کر بچھڑتے تھے تو آپ کے دل پر قیامت گزر جاتی تھی اور بے پناہ محبت صرف بلند کرداری اور علمی فضیلت کی بنا پر تھی۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی علم دوستی کا یہ حال تھا کہ آپ پیشہ ور اور زمانہ ساز عالموں کو بھی برا نہیں کہتے تھے۔ اگر کوئی اس قسم کے علما پر نکتہ چینی کرتا تو آپ اعتراض کرنے والے کو سختی سے ٹوک دیتے۔ ایک بار حضرت امامؒ سے سوال کیا گیا ''جاہل قسم کے جو صوفیا مسجدوں میں متوکل بن کر بیٹھ جاتے ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

جواباً امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا ''ایسے لوگوں کو غنیمت سمجھو کیونکہ علم کی وجہ سے انہوں نے توکل اختیار کیا ہے۔''

''یہ تو محض روٹیاں حاصل کرنے کا ایک بہانہ ہے۔'' کسی دوسرے شخص نے اعتراض کیا۔

''دنیا میں کوئی جماعت بھی روٹیوں سے بے نیاز نہیں۔'' حضرت امامؒ نے آخر تک اہلِ علم کا دفاع کیا۔ یہ انسانی حوصلہ مندی، روشن خیالی اور پاک باطنی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

☆☆☆

خدا اور رسولؐ سے عشقِ لازوال، قرآن و سنت پر مسلسل عمل، تحصیلِ علم کی راہ میں ناقابلِ بیان تڑپ، طاغوتی قوتوں سے تنہا جہاد، فقرِ غیور، جذبہ سرفروشی، فغانِ نیم شبہ و سحر گاہی نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو اکسیر بنا دیا تھا۔ آپ کے قدموں سے اٹھنے والے غبار کے چند ذرے کسی پتھر پر بھی پڑ جاتے تو وہ سونے کا ڈھیر بن جاتا۔

ایک بار حضرت امامؒ دریائے دجلہ کے کنارے وضو فرما رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک اور شخص بھی

موجود تھا۔ وہ قدرے بلندی پر بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ اچانک اس نے حضرت امامؒ کو دیکھا اور فوراً نیچے اتر کر آ گیا اس نے اپنا وضو نامکمل چھوڑ دیا تھا اور اب وہ دریا کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ آخر تھوڑی دور جا کر وہ ایک نشیبی مقام پر بیٹھ گیا اور دوبارہ وضو کرنے لگا۔ اس واقعے کے ایک سال بعد وہ شخص بیمار ہوا اور پھر اس کا انتقال ہو گیا۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے بے شمار مخالفین تھے۔ انہی میں سے ایک دنیادار عالم نے مرنے والے شخص کو خواب میں دیکھا جو بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ حضرت امامؒ کے مخالف مولوی نے اس شخص سے پوچھا ''تو کس حال میں ہے؟''

''میں رحمتِ خداوندی کے سائے میں ہوں۔'' مرنے والے نے جواب دیا ''میرے سارے عمل برباد ہو چکے تھے اور میں جہنم کا ایندھن بننے ہی والا ہوں کہ میری ایک فراموش کردہ نیکی کام آ گئی۔ اللہ نے مجھے یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ تو ہمارے محبوب احمد بن حنبلؒ کے احترام میں وضو کرتے وقت نیچے اتر آیا تھا اس لیے آج تیرا درجہ بلند کیا جاتا ہے۔''

جیسے ہی خواب ختم ہوا دنیادار عالم کی آنکھ کھل گئی۔ غیبی تنبیہہ نے اس کے جسم پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ وہ بدحواسی کی کیفیت میں اٹھا اور حضرت امامؒ کے سامنے جا کر زار و قطار رونے لگا۔ ''مجھے معاف فرما دیجئے کہ میں آپ کے مقام سے بے خبر تھا۔''

''میں نے تو تمہیں اسی وقت معاف کر دیا تھا جب تم نے پہلی بار میری مخالفت کی تھی۔'' یہ کہتے وقت حضرت امام کے ہونٹوں پر وہی دل نواز تبسم ابھر آیا تھا۔ جو شدید اذیت کے لمحوں میں آپ کی شخصیت کی روشن علامت تھی۔

ظاہر پرست لوگ کل بھی حضرت امامؒ کی زندگی میں کشف و کرامت کی تلاش کرتے رہتے تھے اور آج بھی ان لوگوں کا یہی حال ہے کہ کسی نہ کسی طرح کوئی محیر العقول کارنامہ احمد بن حنبلؒ کے نام سے وابستہ کر دیا جائے خواہ اس کا تعلق امامؒ کی ذات سے ہو یا نہ ہو۔ بیشتر انسانوں نے کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ حضرت امامؒ کی ایک ایک سانس کرامت کا اظہار تھی۔ اگر دنیا حیران کن واقعات ہی کو کرامت کا درجہ دیتی ہے تو پھر جابر حکمرانوں کے سامنے حضرت امامؒ کا اعلانِ حق کیا تھا؟ ایسے حیرت انگیز واقعات تو پوری تاریخ کائنات میں چند ہی نظر آتے ہیں اور اگر کسی انسان کی حاجت روائی کا نام کرامت ہے تو کبھی کبھی حضرت امامؒ کی ذات سے غیر ارادی طور پر ایسی روشنی پھوٹنے لگتی تھی جسے دیکھ کر عقل و خرد کی آنکھیں خیرہ ہونے لگتی تھیں۔



ایک بار بغداد میں کسی بوڑھی عورت پر فالج کا شدید حملہ ہوا جس کے نتیجے میں اس کے دست و پا شل ہو کر رہ گئے۔ ہر ممکن علاج کیا گیا مگر سارے طبیب عورت کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔ آخر عورت نے اپنے نوجوان بیٹے سے کہا ''اب بغداد میں بس ایک ہی طبیب رہ گیا۔ اللہ اس کی دوا سے مجھے یقیناً صحت بخش دے گا۔'' بیٹا ماں کی اس خواہش پر حیران رہ گیا۔

''مادرِ گرامی! مجھ جیسا غریب انسان شاہی طبیب کے دروازے تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی خدمات صرف خلیفہ کے اہلِ خاندان کے لیے وقف ہیں۔'' بیٹے کے چہرے پر حسرت و یاس کے گہرے سائے لرز رہے تھے اور وہ بے چارگی کے عالم میں کفِ افسوس مل رہا تھا۔ ''مادرِ گرامی! یہ ممکن نہیں۔''

ماں کے بے جان اور خشک ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا ''بیٹے! میرا طبیب دربارِ خلافت سے تعلق نہیں رکھتا۔ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ فاقہ کش ہے۔ تم اس کے پاس ایک بار جا کر تو دیکھو وہ تو مریضوں کا حال سن کر آدھی رات کو بھی دوڑا چلا آتا ہے، اس کا دروازہ کبھی بند نہیں تھا۔ خدا کی اس طویل و عریض زمین پر ایک وہی تو ہے جس کے یہاں مفلس و نادار بھی محترم سمجھے جاتے ہیں۔''

بیٹا حیرت سے اپنی ماں کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اسے شک ہو چلا تھا کہ شاید مرض کی شدت نے بوڑھی عورت کے ہوش و حواس چھین لیے ہیں۔

''دیر نہ کرو۔ فوراً چلے چلو۔'' ماں نے بیٹے کو تذبذب کا شکار ہوتے دیکھ کر کہا ''تم امام احمدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر میرا اسلام کہنا اور پھر جس طرح تمہارا دل چاہے میری کیفیت بیان کر دینا، جلدی کرو۔'' عورت نے نحیف آواز میں کہا۔ اب نوجوان حقیقت کو سمجھ چکا تھا، وہ تیزی کے ساتھ گھر سے نکلا اور حضرت امامؒ کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہی نوجوان حضرت امامؒ کی خدمت میں بیٹھا ہوا رو رو کر اپنی ماں کی حالتِ زار بیان کر رہا تھا۔ آپ بہت غور سے اس کی گفتگو سن رہے تھے پھر وضو کیا اور نوجوان سے فرمایا ''تم گھر جاؤ اور اللہ سے اس کی مسیحائی طلب کرو۔ وہ انسانی تصورات سے زیادہ رحیم ہے۔'' اس کے بعد نماز میں مشغول ہو گئے۔ نوجوان کچھ دیر بیٹھا رہا پھر شدید مایوسی کے عالم میں اٹھ کر چلا گیا۔ ماں نے جس عقیدت سے اسے حضرت امامؒ کے پاس بھیجا تھا وہ توقعات یہاں پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دل و دماغ پر غبار سا چھا گیا۔ ذہن میں عجیب عجیب خیالات ابھرنے لگے۔ ''یہ کیسا مسیحا ہے؟ اس کا طریقہ علاج کیا ہے؟ اگر خدا سے رجوع کرنا ہی چارہ گری ہے تو پھر اس کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ کو کسی بھی مقام پر پکارا جا سکتا ہے، پھر یہ کون شخص ہے جسے اس کی ماں غریبوں کا سب سے بڑا ہمدرد سمجھتی ہے؟ آخر اس کی

ہمدردیاں ایک بیمار کے کیا کام آئیں؟" غرض سرکش جذبوں کا ایک طوفان تھا جو اس کے سینے میں اٹھ رہا تھا۔

حضرت امامؒ نماز سے فارغ ہوئے اور دونوں ہاتھوں کو کسی گداگر کی مانند اپنے خدا کے سامنے پھیلا دیا۔ "اے حی وقیوم! تیرا گناہ گنار عاجز بندہ! احمد بن حنبلؒ تجھ سے تیرے فضل وکرم کی بھیک مانگتا ہے وہ نوجوان میرے پاس حسنِ ظن لے کر آیا تھا کہ مجھے تیری ذات سے نسبت ہے۔ اے مالکِ عرب وشرق! میں اس قابل نہیں ہوں مگر تو اپنی قدرتِ کاملہ سے لوگوں کے حسن وظن کو برقرار رکھ۔ اے غفار مجھے بخش دے۔ اے ستار! میرے عیبوں کی پردہ پوشی کر۔" دعا ختم ہوئی اور امام دوبارہ عبادت وریاضت میں مشغول ہوگئے۔

نوجوان پراگندہ خیالات میں الجھا ہوا اپنے گھر پہنچا مگر وہ اندر داخل نہ ہوسکا۔ اس کے قدم زمین پر جم کر رہ گئے۔ اس کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں جہاں ایک بوڑھی ماں کھڑی ہوئی اپنے بیٹے کا انتظار کر رہی تھی اور ایک بوسیدہ سی عبا میں لپٹا ہوا مسیحا اس کے مکان سے بہت دور اپنے خالق کے آگے سجدہ ریز تھا۔

☆☆☆

حضرت امامؒ کی دعا سے ایک بیمار جسم کا صحت یاب ہونا یقیناً آپ کے مستجاب الدعوات ہونے کی روشن دلیل ہے مگر اس کرامت کے اثرات صرف دو افراد تک محدود تھے۔ ایک بوڑھی عورت دوسرا اس کا نوجوان بیٹا۔ یہ ایک لمحاتی عمل تھا جسے چند لوگوں نے دیکھا، محسوس کیا اور پھر فراموش کر دیا۔ دراصل حضرت امام احمد حنبلؒ کی عظیم الشان کرامت وہ ہے کہ جب آپ نے مریض ذہنوں کو توانائی بخشی اور مردہ دلوں کو دوبارہ زندہ کیا۔ حضرت امامؒ کے اس اندازِ مسیحائی سے بے شمار انسان فیض یاب ہوئے اور چارہ گری کا یہ وہ عمل تھا جس کے تذکرے قیامت تک جاری رہیں گے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا علمی کارنامہ یہ ہے کہ تحریر وتقریر کے ایک ایک حرف میں آپ کا اپنا لہو شامل تھا۔ آپ نے علم کو خلیفہ وقت کی نوازشات اور امیروں کے عطیات سے محفوظ رکھا۔ دنیا کا ایک سخت جان مزدور اپنی روزی کمانے کے لیے جس قدر محنت کر سکتا ہے، حضرت امام احمد حنبلؒ نے تحصیلِ علم کے راستے میں اس سے زیادہ مشقت اٹھائی اور جب علم کی آزمائشوں کا وقت آیا تو ایسی استقامت کا مظاہرہ کیا کہ اہل ایمان کے سینوں میں شگاف پڑ گئے اور مادہ پرستوں کی عقل ٹھوکریں کھانے لگی۔



حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی آزمائش کا دور اس وقت شروع ہوا جب خلافتِ عباسیہ میں معتزلہ کی جماعت نے اللہ کی آخری کتاب کو علی الاعلان مخلوق کہنا شروع کیا۔ اسلامی تاریخ کا یہ اذیت ناک واقعہ "فتنہ خلق قرآن" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مذہبی معاملات میں نئی نئی موشگافیوں کر کے ملتِ اسلامیہ کو منتشر کر دیا جائے۔

بنو امیہ کے عہد میں جعد بن درہم پہلا شخص تھا جس نے کہا "قرآن مخلوق ہے۔" اسے خالد بن عبداللہ نے عید الضحیٰ کے دن کوفے میں قتل کیا۔ وہ خالد کے سامنے اس طرح لایا گیا کہ اس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ خالد بن عبداللہ نے نماز کے بعد خطبہ دیا اور آخر میں کہا "لوگو! اپنی اپنی قربانی کے جانور ذبح کرو۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ جعد بن درہم کو ذبح کروں گا۔ یہ کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے باتیں نہیں کیں اور نہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنایا۔ یہ جو کچھ کہتا ہے، خدا اس سے بے نیاز ہے۔" اتنا کہہ کر خالد بن عبداللہ منبر سے نیچے اترا اور جعد بن درہم کو قتل کر دیا۔

جہم بن صفوان بھی اسی قسم کی باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ اللہ کی صفتِ کلام کا منکر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خدا بات چیت نہیں کر سکتا تھا اسی لیے جہم کا عقیدہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے۔

پھر معتزلہ کا دور شروع ہوا۔ ان لوگوں نے پہلے تو اللہ کی صفات کا انکار کیا۔ بعد میں اس کے بھی منکر ہو گئے کہ خدا کلام کر سکتا ہے۔ معتزلہ کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے جس طرح اور چیزیں پیدا کی ہیں، اسی طرح صفتِ کلام بھی پیدا کی ہے۔ اسی بنیاد پر ان کا دعویٰ تھا کہ قرآن مخلوق ہے۔

خلافِ عباسیہ میں معتزلہ نے زیادہ زور پکڑا اور خلقِ قرآن کے مسئلے میں نئے نئے نکتے پیدا کیے۔ اتفاق سے اس وقت کے کچھ فقیہہ بھی ان کے ہم نوا بن گئے۔ نتیجتاً یہ تحریک روز بروز طاقت ور ہوتی چلی گئی۔ مصری علما میں بشر بن غیاث کا یہی عقیدہ تھا۔ بشر کے استاد قاضی ابو یوسفؒ نے جو حضرت امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید تھے، اسے اس مسلک سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن بشر بن غیاث نہیں مانا۔ آخر امام ابو یوسفؒ نے اسے اپنی مجلس سے نکال دیا۔ خلیفہ ہارون رشید کی دیگر کوتاہیاں اپنی جگہ مگر عقائد کے سلسلے میں اس نے معتزلہ کی ذراسی بھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ یہاں تک کہ جب بشر بن غیاث کی باتیں اسے معلوم ہوئیں تو اس نے قسم کھا کر کہا "اگر خداوندِ ذوالجلال نے مجھے موقع دیا تو میں اپنے ہاتھ سے بشر کو قتل کروں گا۔" چنانچہ ہارون رشید کے عہدِ خلافت میں بشر بن غیاث منہ چھپائے پھرتا رہا۔

ہارون رشید کے بعد جب اس کے بیٹے مامون رشید کا دورِ خلافت شروع ہوا تو صورتِ حال یکسر بدل گئی اور معتزلہ اس پر چھا گئے۔ مامون کے حاشیہ برداروں اور مصاحبوں میں یہی لوگ نمایاں تھے۔ ایک بار معتزلہ کا امام ابو ہشام الفوطی اس سے ملاقات کے لیے دربار میں آیا تو وہ خم ہو کر اس سے ملا۔ حالانکہ مامون اپنی زندگی میں کسی کے ساتھ اس قدر احترام سے پیش نہیں آیا تھا۔ معتزلہ عقلی طور پر بحث کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ مامون اپنے سطحی علم کی وجہ سے مناظروں کے دوران شعلہ بار تقریروں اور منطقی دلائل سے اس قدر متاثر ہوا کہ پھر وہ آخری سانس تک معتزلہ کے طلسم سے آزاد نہ ہو سکا۔ آہستہ آہستہ اس جماعت کے چند افراد منصبِ وزارت تک پہنچ گئے۔ ان لوگوں میں احمد بن ابی داؤد سرِ فہرست تھا جس نے خلیفہ مامون کے دل و دماغ پر اتنے گہرے اثرات چھوڑے تھے کہ مسلمانوں کا امیر اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔

جب معتزلہ کو اپنی طاقت کا صحیح اندازہ ہو گیا تو انہوں نے مامون کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ خلقِ قرآن کے عقیدے کا عام اعلان کرے۔ احمد بن ابی داؤد کی منصوبہ بندی کامیاب ہوئی اور خلیفہ مامون الرشید نے بغداد کے نائب حاکم اسحٰق بن ابراہیم کے نام تین فرمان جاری کیے۔

پہلے فرمان میں کہا گیا "مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گروہ، عقل و دانش سے محروم ہے جس کے نتیجے میں وہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں اور انہوں نے اللہ اور اس کی مخلوق کو برابر سمجھ لیا ہے (مخلوق سے مراد قرآن کریم ہے) یہ جاہل اور جھوٹے ہیں۔ شیطان ان کی زبان سے بول رہا ہے انہیں ہمارا خط سنا دو۔ تمام عدالتوں کے قاضیوں کو بلا کر ان کے عقائد کا امتحان لو۔ اگر وہ قرآن کو مخلوق تسلیم کر کے امیر المومنین کے مسلک پر متفق ہو جائیں تو انہیں حکم دو کہ وہ عوام کے سامنے اپنے عقائد کا اعلان کریں اور اگر وہ اپنے جاہلانہ نظریات پر قائم رہیں تو انہیں سرکاری خدمات سے سبک دوش کر دیا جائے۔"

مامون نے اپنے پہلے فرمان میں علمائے اہلِ سنت سے دنیاوی عزت و آسائش چھین لینے کی دھمکی دی تھی تا کہ ان کی استقامت اور ضبطِ نفس کا امتحان لیا جا سکے۔

دوسرے فرمان میں سات مشہور عالموں کے نام لکھ کر اسحٰق بن ابراہیم کو حکم دیا گیا کہ وہ انہیں خلیفہ کی خدمت میں بھیج دے۔

اسحٰق نے امیر المومنین کے حکم پر فوراً عمل کیا۔ بغداد کے ساتوں نامور عالم مامون الرشید کے دربار میں پہنچے۔ خلیفہ نے خلقِ قرآن کے مسئلے پر ان کی رائے لی تو سب نے بیک زبان اعتراف کر لیا کہ



قرآن کریم مخلوق ہے۔ مامون نے انہیں واپس بغداد بھیج دیا۔ اسحٰق بن ابراہیم نے لوگوں کے اعتراف کو شہرت دی۔ یہاں تک کہ ایک مجلس میں تمام بڑے محدث اور فقیہہ جمع ہوئے۔ اس مجلس میں بھی ان ساتوں نے قرآن کریم کو مخلوق تسلیم کر لیا۔ نتیجتاً وہ آزاد کر دیے گئے۔ اس کے بعد دوسرے محدثوں اور فقیہوں کا امتحان لیا گیا۔ ان میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ بھی شامل تھے۔ کچھ لوگوں نے قرآنِ مقدس کے سلسلے میں خلیفہ مامون الرشید اور معتزلہ کے عقیدے کو تسلیم کر لیا اور باقی حضرات اپنے مسلک پر قائم رہے۔ انکار کرنے والی جماعت میں حضرت امام احمدؒ کا لہجہ سب سے زیادہ سخت اور بے باک تھا۔ یہ سب لوگ نو دن تک اسحٰق بن ابراہیم کے پاس رہے۔ اس نے فرداً فرداً تمام حضرات کے خیالات و عقائد قلم بند کیے اور مامون کی خدمت میں ارسال کر دیے۔

کچھ دن بعد دربارِ خلافت سے تیسرا فرمان جاری ہو گیا۔ جن لوگوں نے قرآن حکیم کو مخلوق تسلیم نہیں کیا تھا ان کے بارے میں مامون نے شرمناک تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

"وہ شخص جو سجادہ کے نام سے مشہور ہے اس سے کہہ دو کہ وہ علی بن یحییٰ کی امانتوں میں خیانت کرتے کرتے خدا کو فراموش کر بیٹھا ہے۔

قواریری کے حالات کی چھان بین کی گئی تو اس کی بے ایمانی اور بد اخلاقی کی بہت سی مثالیں سامنے آئیں، اسے بتا دو کہ وہ رشوت خور ہے۔

ابن نوح اور محمد بن حاتم سے کہہ دو کہ یہ سود خور لوگ بھلا توحید کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں اور امیر المومنین ان کے خلاف جہاد کو کیسے جائز قرار نہ دیں جبکہ قرآن حکیم میں ان ہی جیسے لوگوں کے لیے جہاد کا حکم نازل ہوا ہے۔

احمد بن حنبلؒ کے بارے میں تم نے جو کچھ لکھا، امیر المومنین نے اس کے ایک ایک حرف کو غور سے پڑھا۔ احمدؒ کو بتا دو کہ ہم اس کے مفہوم سے بخوبی واقف ہیں۔ کچھ بھی ہو اسے ایک نہ ایک دن اپنے جاہلانہ عقیدے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

اتنا لکھنے کے بعد مامون نے اسحٰق بن ابراہیم کو حکم دیا کہ اگر وہ اپنے شرک سے باز نہ آئیں اور قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہ کریں تو ان سب کو زنجیروں میں جکڑ کر ہمارے حضور بھیج دو تا کہ ہم بذاتِ خود ان کا امتحان لیں اور اگر وہ اپنے باطل عقیدے سے توبہ نہ کریں تو ہم ان کی گردنیں تلوار سے اڑا دیں۔"

مامون کے یہ وہ تینوں خطوط تھے جن میں اس نے اپنے خلاف عقیدہ رکھنے والوں کو جھوٹا، بے ایمان، خائن، رشوت خور اور شیطان تک کے ناموں سے پکارا تھا۔ جب تک خلیفہ بغداد میں رہا اس نے اپنے عقیدے کی تشہیر تو کی مگر انکار کرنے والوں کو بدکردار کہہ کر انہیں رسوا کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ انہیں پابندِ سلاسل کیا گیا اور نہ ان کی گردنوں پر خنجر آزمائی کی دھمکیاں دی گئیں پھر جب بغداد سے رخصت ہو کر بسترِ علالت پر دراز ہو گیا تو اس کے خیالات یکسر بدل گئے اور اس نے برگزیدہ ہستیوں کی شان میں اس قدر نازیبا کلمات کہے کہ جنہیں پڑھ کر شرم آتی ہے۔ آخر میں وہ ان معصوم اور بے ضرر انسانوں کے سر قلم کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ یہ کیسا انقلاب تھا، اس سلسلے میں بعض تحقیق کرنے والوں نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا ہے کہ مامون الرشید کے لکھے ہوئے دیگر خطوط اور ان تین فرمانوں کے اندازِ تحریر میں بڑا فرق ہے۔ یقیناً یہ مراسلے احمد بن داؤد کے تحریر کردہ تھے جو نہ صرف ایک مشہور معتزلہ تھا بلکہ مامون الرشید کے مزاج میں دخیل بھی تھا۔ بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو لیکن تاریخ کے دامن میں وہ تینوں فرمان اسی طرح محفوظ ہیں کہ ان پر خلافتِ عباسیہ کے حکمران مامون الرشید کی مہر صاف نظر آتی ہے۔

یہ ظلم وجہل میں ڈوبی ہوئی تحریریں کسی بھی نام سے وابستہ ہوں مگر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ابی داؤد جیسے مفسد نے تمام علما کے چہروں پر سیاہی مل دی اور ان کے بے داغ لباسوں کو مختلف تہمتوں کی غلاظت سے آلودہ کر دیا لیکن وہ تمام تر خباثت اس کے باوجود حضرت امام احمدؒ پر کوئی الزام عائد نہ کر سکا۔ بس شدید عالم کرب میں اتنا ہی کہہ سکا۔ ”احمد بن حنبلؒ کو اپنی جہالت کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔“ یہ حضرت امامؒ کی تقدیس وعظمت کا روشن ثبوت ہے کہ بدترین دشمن بھی آپ کے پیراہن پر کوئی دھبا نہ لگا سکا۔

☆☆☆

غرض آزادی کی بہاریں رخصت ہوئیں اور خزاں کے ساتھ اسیری کا موسم آ گیا جو چند اہل جنوں اس کے نام لیوا تھے، انہیں زنجیریں پہنا دی گئیں۔ جب سیاہ فام جلاد بیڑیاں لے کر آگے بڑھے تو کچھ شریف النفس علما نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ شاید اس کے ناتواں جسم میں حبشیوں کے کوڑے برداشت کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ اب قرآن کو مخلوق تسلیم کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی۔

(اگرچہ یہ سب کچھ جبراً ہوا تھا لیکن اسحٰق بن ابراہیم خوش تھا کہ وہ خلیفہ کے منصوبے کو کامیابی کے ساتھ تکمیل تک پہنچا رہا ہے)



پورے بغداد میں صرف چار افراد ایسے تھے جنہوں نے زنجیروں کی جھنکار سن کر ہاتھ آگے بڑھا دیے تھے۔ اسحٰق ابن ابراہیم نے ایک بار پھر ان چاروں کو دنیاوی جاہ وحشم کی پیش کش کی مگر وہ عنایاتِ شاہی سے بے نیاز تھے۔ اسحٰق بن ابراہیم کا غصہ بھڑک اٹھا۔ اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ حکومتِ وقت کے فرمانبردار آگے بڑھے۔ فضاؤں میں زنجیروں کا ہلکا سا شور ابھرا۔ چشمِ فلک نے اہلِ علم کی رسوائی کا یہ دردناک منظر دیکھا اور پھر اسیروں کا یہ مختصر قافلہ مامون کے دربار میں حاضری دینے کے لیے پیادہ پا روانہ ہوا۔ ان چاروں بزرگوں میں امام احمد بن حنبلؒ، ابن نوحؒ، قواریریؒ اور سجادہؒ شامل تھے۔ سپاہی انہیں کھینچ رہے تھے اور وہ اپنے رب کی حمد وثنا میں مشغول تھے۔

رات ہوئی تو اسحاق ابن ابراہیم نے سب سے پہلے سجادہؒ کو اپنے خیمے میں طلب کیا اور ان سے خلقِ قرآن کے سلسلے میں وہی سوالات کیے سجادہؒ کچھ دیر تک اپنے عقیدے پر قائم رہے۔ اسحٰق نے جبر وتشدد کے دروازے کھول دیے۔ شب کے اندھیروں میں ان کی پشت پر جلادوں کے کوڑے برستے رہے۔ یہاں تک کہ جب صبح ہوئی تو سجادہؒ ظلم کی سختیوں کو برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے اسحٰق کی بات مان لی۔ سجادہ کی بیڑیاں کاٹ دی گئیں۔ ایک ساتھی بچھڑ گیا اور اسیرانِ بغداد کا قافلہ پہلے سے زیادہ مختصر ہو گیا۔

دوسرے دن پھر رات کی تاریکی میں یہی عمل دہرایا گیا۔ اس بار تشدد کا نشانہ قواریریؒ تھے۔ وہ بھی سجادہؒ کی طرح شروع میں ثابت قدم رہے مگر جب تشدد کی لے زیادہ تیز ہوئی تو وہ بھی لڑکھڑا گئے۔ قواریری نے بھی اسحٰق کی بات مان لی۔ مامون الرشید اور معتزلہ کی فتوحات کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ قواریری آزاد ہو کر خلیفہ کے پسندیدہ انسانوں کی قطار میں شامل ہو گئے۔ اسیروں کا قافلہ کچھ مختصر ہو گیا۔ ساتھیوں کے بچھڑنے کا عمل اس قدر تیز تھا کہ اہلِ دل سوچتے ہی رہ گئے۔ اب صرف دو معتوب باقی رہ گئے تھے۔ ایک امام احمد بن حنبلؒ دوسرے ابن نوحؒ۔

تیسری رات پھر مجلس ستم آراستہ کی گئی۔ جلادوں نے اپنے فن کا بہترین مظاہرہ کیا مگر یہ دونوں طاقت کے آگے خم نہیں ہوئے۔ دوسرے علما کو جھکتے دیکھ کر اسحٰق بن ابراہیم مطمئن تھا کہ یہ دونوں بھی بالآخر سرِ تسلیم خم کر دیں گے جس کے نتیجے میں وہ خلافتِ عباسیہ کا ممتاز ترین رکن بن جائے گا۔ غرض اسی قسم کے لذت آمیز خواب دیکھتا ہوا اسحٰق بن ابراہیم سو گیا۔

صبح ہوئی تو احمد بن حنبلؒ اور ابن نوحؒ کو طرطوس کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ جہاں خلیفہ مامون الرشید

سکونت پذیر تھا۔ راستے بھر ظلم وستم کے مظاہرے ہوتے رہے مگر دونوں حضرات اپنے عقیدے پر قائم رہے۔ ابن نوحؒ جسمانی طور پر بہت کمزور تھے۔ مسلسل اذیتیں برداشت کرتے کرتے ان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ راستے ہی میں انتقال کر گئے۔ اس طرح کہ ان کی پیروں میں آہنی بیڑیاں تھیں اور لباس پر خون کے چھینٹے نمایاں تھے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو ان کے مرنے کا بے حد افسوس تھا۔ جب ابن نوحؒ کی لاش دفن کے لیے لے جائی جانے لگی تو آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا۔ ''تم خدا کی راہ میں یہاں تک ثابت قدم رہے کہ موت کو گلے لگالیا۔ ابن نوحؒ! تم پر خدا اپنی رحمتیں نازل کرے اور ہمیں بھی تمہاری استقامت بخشے۔''

ابن نوحؒ کی شہادت نے ان لوگوں پر گہرا اثر ڈالا تھا جو خلیفہ کا حکم ماننے پر مجبور ہو گئے تھے مگر احمد بن حنبلؒ کے سوا اب کسی میں یہ طاقت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے دل کی بات کہہ سکے۔ آزمائش کے اس مقام پر حضرت امام اکیلے کھڑے نظر آئے تھے۔

منزل عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کے اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

☆☆☆

اسی دوران اسحٰق بن ابراہیم کو خلیفہ کا نیا حکم موصول ہوا تھا کہ جن لوگوں نے اس کے عقیدے کو تسلیم کر لیا ہے اور جو ابھی تک انکار کر رہے ہیں ان دونوں جماعتوں کو طرطوس حاضر کیا جائے۔ چنانچہ قواریریؒ اور سجادہؒ بھی اس سفر میں احمد بن حنبلؒ کے ہمراہ تھے۔ مگر اس طرح کہ ان کے دونوں جسم زنجیروں سے آزاد تھے۔ اور امام احمدؒ کے بدن سے اب بھی آہنی بیڑیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک دن راستے میں خلیفہ مامون الرشید کے انتقال کی خبر ملی۔ اسحٰق بن ابراہیم کا چہرہ اتر گیا۔ وہ اپنے آقا کو فتوحاتِ مسلسل کی نوید سنانے سے محروم رہا۔ خود مامون الرشید کی لاش پر بھی ایک حسرتِ ناکام ماتم کر رہی تھی کہ وہ اپنے روبرو حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا جواب نہ سن سکا۔ دوسرے علما جو اس راہ میں تھک کر بیٹھ گئے تھے انہیں مامون کے انتقال سے بہت خوشی ہوئی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مخلوقِ خدا کو اس فتنہ عظیم سے نجات مل جائے گی مگر یہ ان لوگوں کا خیال خام تھا۔ مامون نے مرتے مرتے بھی مذہب کے راستے میں بے شمار کانٹے بچھا دیے تھے۔

مامون الرشید نے اپنے بھائی معتصم باللہ کے نام وصیت کرتے ہوئے لکھا تھا ''جو کچھ تو دیکھ رہا ہے



اس سے نصیحت حاصل کر اور اپنے بھائی کے قریب ہو جا۔ سختی کے ساتھ خلقِ قرآن کی دعوت دے اور احمد بن داؤد سے ہر حال میں اپنی وابستگی قائم رکھ۔''

مامون کی وصیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرتے وقت اسے صرف دو باتوں کا خیال تھا۔ ایک یہ کہ وہ خلقِ قرآن کے بندے کو باعثِ نجات سمجھتا تھا، اس حد تک کہ اس نے اپنے وارثوں کو بھی یہی کارِ ثواب جاری رکھنے کی وصیت کی تھی۔ کیسا نظریہ حیات تھا کہ شراب، رشوت اور سیاہ کاریوں پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ان جرائم کے مرتکب آزادی کے ساتھ گھومتے تھے اور قرآن کو مخلوق تسلیم نہ کرنے والوں پر قیامت نازل ہوتی رہتی تھی۔ دوسرے یہ کہ مامون، احمد بن ابی داؤد کو خلافتِ عباسیہ کے لیے ناگزیر سمجھتا تھا۔ نتیجتاً معتصم باللہ بھی اپنے پیش رو کے راستے پر آنکھیں بند کر کے چل پڑا۔ مامون کی وصیت کے مطابق اس نے محمد بن ابی داؤد کو اپنا روحانی اور سیاسی مشیر سمجھا۔ یہاں تک کہ معتصم باللہ نے ابی داؤد سے صاف صاف کہہ دیا۔

''تم خلقِ قرآن کے سلسلے میں مکمل طور پر بااختیار ہو، مامون کی وصیت کو جس طرح چاہو نافذ کرو اس مسئلے میں تم سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔'' معتزلہ اور کیا چاہتے تھے، معتصم باللہ کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی انہیں اپنی تحریک کی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ ویسے بھی ابی داؤد کا راستہ صاف تھا۔ بس ایک احمد بن حنبلؒ ہی رہ گئے تھے جو پوری توانائی کے ساتھ مزاحمت کر رہے تھے لیکن جب سے ابی داؤد کو نئے اختیارات حاصل ہوئے تھے وہ سوچ رہا تھا کہ راستے کا یہ پتھر بھی آسانی سے ہٹ جائے گا۔

جب معتصم باللہ اپنی خلافت کی ابتدائی تقریبات سے فارغ ہو گیا تو اس نے احمد بن ابی داؤد کے کہنے سے احمد بن حنبلؒ کی طرف توجہ کی۔ حضرت امامؒ اس وقت قید خانے میں مسلسل اذیتیں برداشت کر رہے تھے۔ آپ کو خلیفہ کے دربار میں طلب کیا گیا۔ پہلا موقع تھا کہ حضرت امام احمد حنبلؒ نے معتصم باللہ کو دیکھا جو اپنے عقیدے کے سلسلے میں مامون سے متشدد نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح معتصم باللہ نے بھی اس عظیم شخص کو پہلی بار دیکھا جو اپنے ارادوں میں سنگ و آہن سے زیادہ مضبوط تھا اور جسے سیم و زر کے انبار بھی اب تک نہیں خرید سکے تھے۔

احمد بن حنبلؒ کی دربار میں حاضری سے پہلے احمد بن ابی داؤد نے عجیب و غریب منصوبہ بندی کی تھی جیسے ہی حضرت امامؒ زنجیریں پہنے ہوئے دربار میں پہنچے اسی وقت معتصم باللہ کے سامنے دو مجرموں کو پیش کیا گیا۔ خلیفہ نے انہیں سزائے موت سنائی اور پھر اسی دربار میں ان کی گردنیں کاٹ دی گئیں۔ فرش

انسانی خون سے رنگین ہوگیا۔ اہلِ دربار دہشت سے کانپنے لگے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اس جان گداز منظر کو نہایت صبر و سکون سے دیکھا۔ اسی دوران میں آپ کی نظریں امام شافعیؒ کے ایک شاگرد پر پڑی جو معززین دربار کی صف میں بیٹھے تھے۔ احمد بن حنبلؒ نے ان سے پوچھا "موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں آپ کو امام شافعیؒ کا کوئی قول یاد ہے؟"

حضرت امام احمدؒ کو خوف زدہ کرنے کے لیے دونوں مجرم سرِ دربار قتل کیے گئے تھے مگر جب آپ کے اعصاب پر اس سنگین واقعے کا کوئی اثر نہیں ہوا تو احمد بن ابی داؤد چیخ پڑا۔ "اس شخص کو دیکھو جس کی گردن شمشیر سے کتنی قریب ہے مگر وہ پھر بھی فقہ کے مسائل میں الجھا ہوا ہے؟"

☆☆☆

جب قید و بند کی تکلیفیں بھی حضرت امامؒ کو متاثر نہ کرسکیں تو معتصم باللہ نے آپ کو دوبارہ طلب کیا۔ محبت آمیز لہجے میں گفتگو کی' انعام و اکرام اور منصب قضا کا لالچ دیا۔ دوسرے علما کے دلائل پیش کیے مگر حضرت امامؒ نے کسی بات کو تسلیم نہیں کیا۔ بالآخر جسم پر تازیانوں کی اس قدر بارش ہوئی کہ آپ خون میں نہا گئے۔ کئی بار بے ہوش ہوگئے مگر جب بھی ہوش میں آئے ایک ہی کلمہ ادا کیا۔ "قرآن مخلوق نہیں ہے۔" اسی حالت میں نمازِ ظہر ادا کی۔ تشدد کا یہ سلسلہ کم و بیش ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ اس طویل عرصے میں حضرت امامؒ کتنی بار جاں کنی کے عذاب سے گزرے۔ خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جب بھی جسمِ مبارک پر تازیانے پڑتے آپ بلند آواز سے قرآن کریم کی یہ آیت مقدسہ تلاوت کرتے۔

"ہم پر وہی مصیبت نازل ہوسکتی ہے جو اللہ نے ہمارے مقدر میں لکھ دی ہے۔"

بالآخر جب معتصم باللہ، احمد ابی داؤد اور دوسرے معتزلہ اس بات سے مایوس ہوگئے کہ احمد بن حنبلؒ ان کی خواہشات کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تو جبر و ستم کی روش میں تبدیلی آئی۔ یہاں تک کہ ایک دن حضرت امام کو آزاد کر کے اس حالت میں گھر پہنچایا گیا کہ آپ زخموں سے لہولہان تھے۔ مسلسل تشدد کے باعث ہڈیوں پر بھی کوڑوں کے نشانات ابھر آئے تھے۔ پورا بدن شکستہ تھا مگر امامؒ کے ارادوں نے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔

بہت دن بعد جب آپ بیٹھنے کے قابل ہوئے تو دوبارہ مجلسِ درس کو آراستہ کیا۔ لوگ دیوانہ وار اپنے محبوب کے گرد جمع ہوگئے۔ انسانی ہجوم زخموں کو بوسہ دینا چاہتا تھا مگر آپ نے سختی سے منع کر دیا کہ اس طرح بت پرستی کا آغاز ہوتا ہے۔



ایک دن حضرت امامؒ کے مکان پر خصوصی درس جاری تھا کہ کسی شاگرد نے آپ سے سوال کیا۔

"شیخ محترم! کیا آزمائش کے اس طویل دور میں ایسا بھی کوئی لمحہ آیا جب آپ پر مایوسی طاری ہوگئی ہو؟"

حضرت امام احمدؒ دیر تک سوچتے رہے پھر آپ نے آہستہ لہجے میں فرمایا "ہاں ایک بار مجھ پر دہشت ضرور طاری ہوگئی تھی مگر میں خدا کی رحمت سے مایوس کبھی نہیں ہوا۔ سرِ دربار برہنگی کے خوف سے مجھ پر جو کچھ گزر گئی میں آج بھی اسے بیان نہیں کرسکتا۔ ایسا اذیت ناک لمحہ میری زندگی میں کبھی نہیں آیا۔ میں عریاں ہونے ہی والا تھا کہ دو ہاتھ غیب سے نمودار ہوئے اور میرے زیر جامہ کو دوبارہ باندھ دیا گیا۔ یوں تو ہر لمحہ اس کی رحمت کے زیر اثر ہے مگر وہ ایک ساعتِ خاص تھی جب مجھ پر احسانِ عظیم کیا گیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں دعا کے لیے اپنے ہونٹوں کو جنبش بھی دے سکتا مگر اس نے پکارنے سے پہلے میری آواز سن لی اور مجھے دنیا کے سامنے رسوا ہونے سے بچالیا۔ اگر احمد بن حنبلؒ کی عمر قیامت تک دراز ہوجائے تب بھی اس ایک لمحے کا شکر ادا نہیں ہوسکتا۔"

☆☆☆

پھر ایک دن معتصم باللہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ مامون کے بعد یہ دوسرا جابر حکمراں تھا جس کے سینے پر موت کے وقت ناکامی کا ایک ہی داغ روشن تھا کہ وہ انتہائی جبر و تشدد کے بعد بھی حضرت امام احمد بن حنبل کو اپنے آگے نہیں جھکا سکا تھا۔ مامون نے حضرت امامؒ کو جس قدر تکلیفیں پہنچائی تھیں، انہیں دیکھ کر وہ مشہور فقرہ یاد آتا ہے جو ایک شخص نے حضرت امام سفیان ثوریؒ کے آلام و مصائب کے بارے میں کہا تھا۔

"یہاں درندوں کے سر چھپانے کے لیے بہت غار موجود ہیں مگر دنیا میں تمہارے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں۔"

یہ حقیقت ہے کہ معتصم کے دورِ خلافت میں تمام بدکاروں، شراب نوشوں، رشوت خوروں اور خوشامدیوں کو حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ بس ایک امام احمد بن حنبلؒ ہی تھے جن کے سر پر آسمان کے سوا کوئی دوسرا سایہ موجود نہیں تھا لیکن کب تک؟ ایک دن ہر شے کو فنا ہونا ہے۔ قدرت کے اسی نظام کے تحت معتصم باللہ بھی اپنے جابرانہ قانون کے ساتھ زیرِ زمین دفن ہوگیا۔ اس کے بعد واثق باللہ کا دور شروع ہوا۔ واثق نسبتاً کچھ نرم طبیعت کا مالک تھا۔ دوسرے یہ کہ اب لوگ خلقِ قرآن کے مسئلے سے بیزار ہوچکے تھے۔ اس لیے واثق نے جبر و تشدد کے بجائے سیاست سے کام لیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر

حضرت امام بن حنبلؒ کے بارے میں معتصم باللہ کی تجدید کی گئی تو عوام میں آپ کی مقبولیت اور بڑھ جائے گی۔ اس خیال سے واثق نے کوڑوں کی سزا موقوف کر کے نیا حکم جاری کر دیا۔

"کوئی شخص احمد بن حنبلؒ سے ملاقات نہیں کر سکتا اور نہ وہ خود کسی سے ملنے کے لیے اپنے مکان سے باہر جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اس شہر میں قیام کی اجازت نہیں جہاں خلیفہ سکونت پذیر ہو۔"

یہ نظر بندی ایک قسم کی قیدِ تنہائی تھی جو بذاتِ خود کسی اذیت سے کم نہیں تھی۔ بہر حال احمد بن حنبلؒ کے لیے تشدد اور طوق وسلاسل کا طویل دور ختم ہو گیا۔ اب امامؒ کو اس طرح محصور کر دیا گیا تھا کہ آپ نہ کھلی فضا میں سانس لے سکتے ہیں اور نہ کسی اہلِ کمال کا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ انتہا یہ کہ نمازِ باجماعت کے لیے اپنے گھر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔

واثق کے آخری زمانے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس نے اس کے خیالات کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ ایک دن ایک گمنام سا شخص خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ احمد بن ابی داؤد بھی موجود تھا۔ اجنبی نے واثق سے اجازت طلب کی اور پھر ابی داؤد سے مخاطب ہوا۔

"جس بات کی دعوت نہ رسالت مآبؐ نے دی اور نہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ نے پھر تم کیوں لوگوں کو اس طرف بلاتے ہو۔" ابی داؤد خاموش رہا۔ اجنبی نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اب دو صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ یا تو یہ حضرات قرآن کی حیثیت سے واقف نہیں یا پھر انہیں قرآن کی حقیقت کا علم ہی نہیں تھا۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ وہ لوگ واقف تھے لیکن اس معاملے میں سکوت اختیار کیا تو پھر تمہیں بھی خاموش رہنا چاہیے اور اگر تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ مسئلے سے آگاہ نہیں تھے تو پھر اسلام کہاں باقی رہ جاتا ہے؟"

خلیفہ واثق نے جب یہ بات سنی تو اپنی نشست سے اچھل پڑا اور بار بار یہ الفاظ دہرائے "میں نے اس شخص کو معاف کر دیا اور اب تک جو کچھ کرتا آیا تھا اس سے توبہ کر لی۔"

اس طرح خلقِ قرآن کا مسئلہ تقریباً ختم ہو گیا لیکن حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی نظر بندی برقرار رکھی یہاں تک کہ واثق بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس حال میں کہ اس نے امامؒ کے جسم پر کوڑے نہیں برسائے، پابندِ سلاسل نہیں کیا مگر قیدِ تنہائی کی اذیت ناک سزا جاری رکھی۔

☆☆☆

واثق کے بعد خلیفہ متوکل کا دور آیا۔ احمد بن ابی داؤد کو ذلت ورسوائی کے ساتھ معزول کیا جا چکا تھا۔



خلقِ قرآن کا مسئلہ مکمل طور پر ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی حضرت امامؒ پر سے حکومت کی عائد کردہ تمام پابندیاں اٹھالی گئیں۔ بظاہر جسمانی آزمائشوں کا دور ختم ہو گیا تھا مگر ابھی روح کا امتحان باقی تھا۔ خلیفہ متوکل کو حضرت امامؒ سے بے حد عقیدت تھی۔ ایک بار کسی خوشامدی مصاحب نے آپ کی شکایت کرتے ہوئے متوکل سے کہا "امام احمدؒ آپ کے عطیات کو ٹھکراتے ہیں۔ فرشِ دربار پر بیٹھنا گوارا نہیں کرتے بلکہ جو نبیذ آپ پیتے ہیں اسے بھی حرام کہتے ہیں۔"

یہ تلخ اور ناگوار باتیں سن کر متوکل کی پیشانی پر بل پڑ گئے، اس نے غصے کے عالم میں اپنے مخاطب کو جواب دیا "اگر معتصم دوبارہ زندہ ہو جائے اور مجھ سے امام احمدؒ کی شکایت کرے تو میں اس کی بات بھی تسلیم نہیں کروں گا۔" اپنی اسی عقیدت کے زیرِ اثر متوکل نے حضرت امامؒ کے سامنے سیم و زر کے انبار لگا دیے مگر آپ نے اس ڈھیر میں سے ایک درہم بھی قبول نہیں کیا۔ اگر کبھی خلیفہ کی شدید محبت اور اصرار سے آپ مجبور ہو گئے تو ساری دولت اسی وقت غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرا دی۔

اس سلسلے میں حضرت امام احمدؒ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آپ بغداد میں پیدا ہونے والے اناج کی روٹی استعمال نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ غذا کا تمام سامان شہر موصل سے آتا تھا۔ اپنے اس عمل کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے "حضرت عمر فاروقؓ نے بغداد کی زمین غازیوں کے لیے وقف کر دی تھی اور جو شے جس کے لیے وقف ہو جائے اسے غیر متعلق شخص استعمال نہیں کر سکتا۔

اسی طرح ایک بار خلیفہ متوکل نے حضرت امامؒ کو اپنے لشکر میں بطور مہمان بلایا۔ آپ اس کی دل جوئی کے لیے تشریف لے گئے۔ متوکل نے محض آپ کی خاطر نہایت پُر تکلف دعوتوں کا اہتمام کیا تھا مگر حضرت امامؒ نے شدید جسمانی کمزوری کے باوجود مسلسل آٹھ دن تک روزے رکھے اور خلیفہ کے دستر خوان سے ایک لقمہ تک نہیں کھایا۔ روزہ کشائی کے وقت صرف پانی پی لیا کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے۔ "اللہ نے اسے اپنی زمین کے چشموں سے جاری کیا ہے۔ اس پر کسی کا کوئی حق نہیں۔" جب متوکل کو یہ صورت حال معلوم ہوئی تو اس نے بصد احترام آپ کو جانے کی اجازت دے دی۔ اگر حضرت امامؒ خلیفہ کے لشکر میں مزید ایک آدھ دن قیام کرتے تو آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ غذا کا استعمال نہ کرنے سے نقاہت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

تین سال کی عمر میں داغِ یتیمی، سخت محنت ومشقت کے بعد تحصیلِ علم، ایک ایک سنت نبوی پر مسلسل عمل، قدموں میں دولت کے انبار مگر دل قناعت پسند کی بے نیازی، طویل دورِ آزمائش، پورے بدن پر

زخموں کی گل کاریاں، نہ چہرے پر رنگِ ملال، نہ ہونٹوں پر حرفِ شکایت، روز نئی زندگی اور نئی موت۔ اہلِ دنیا صبر و استقامت کی یہ مثال تاریخ اسلام کے سوا کہاں ڈھونڈیں گے؟ کس قوم کے پاس ایسا ہیرو ہے؟ کون سا معاشرہ ایسے انسان پیدا کر سکتا ہے۔

شمع پہ ایک رات یہ بھاری ہے جس طرح
اس نے تمام عمر گزاری تھی اس طرح

شاید اسی وجہ سے کچھ انتہا پسند کہا کرتے تھے "اگر امامؒ بنی اسرائیل میں ہوتے تو مرتبہ نبوت پر سرفراز ہوتے۔" عقیدت مندوں کے اس مبالغے سے قطع نظر حضرت امامؒ کی عظیم الشان قربانیاں کارِ پیمبراں ہی کا ہی ایک حصہ تھیں۔ آپ کو خداوند ذوالجلال نے اسی مشہور حدیث کے زیر اثر پیدا کیا تھا۔ "میری امت کے بعض علما انبیا بنی اسرائیل کے فرائض انجام دیں گے۔"

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو فتنہ خلقِ قرآن کے علاوہ بھی کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ ایک آزمائش سے گزر کر سکون کی سانس لینے بھی نہیں پائے تھے کہ دوسری آزمائش منتظر ہوتی تھی۔ خلیفہ متوکل کے دور میں حضرت امامؒ پر نازل ہونے والے جسمانی مصائب تو ختم ہو چکے تھے لیکن روحانی کرب کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کرب میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب مسلمانوں کی ایک جماعت نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات گرامی کو ہدفِ تنقید بنایا۔ پہلے معترضین کی آواز دھیمی اور لہجہ شائستہ تھا پھر آواز بھی بلند ہوئی اور لہجہ بھی درشت ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ دریدہ دہن لوگوں نے اس بات کا بھی لحاظ نہیں رکھا کہ حضرت علیؓ کو رسالت مآبؐ سے کتنی قربت تھی۔ نکتہ چینیوں نے اسلام کے لیے آپ کی خدماتِ جلیلہ کو فراموش کر دیا اور انہیں صرف وہ گستاخانہ کلمات یاد رہ گئے جن سے اس مردِ جلیل کی توہین ہوتی تھی۔

حضرت امامؒ کو اس موقع پر بھی نئے انداز سے آزمایا گیا کہ آپ کی زبان کو ذرا سی لغزش ہو اور پھر دوسرا ہنگامہ کھڑا کر دیا جائے۔ منصوبہ یہ تھا کہ فتنہ پردازوں کا ایک گروپ آپ کی مجلسِ درس میں داخل ہوتا اور حضرت علیؓ کے بارے میں عجیب و غریب سوالات کرتا۔ امامؒ کو ان لمحات میں اس قدر اذیت محسوس ہوتی کہ چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا۔ آپ سوال کرنے والوں کے ذہنی خلل کا ماتم کرتے اور پھر اسی باوقار لہجے میں جواب دیتے جس سے خلیفۂ وقت کی روح بھی کانپتی تھی۔ حضرت امامؒ برسرِ محفل بلند آواز میں فرماتے "جو علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتا، وہ گدھے سے بھی زیادہ گمراہ ہے۔ حضرت علیؓ قانونِ الٰہی کو نافذ کرنے والے تھے۔ اصحابِ رسولؐ ان سے راضی تھے ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، ان کے شانہ



بشانہ جہاد کرتے تھے۔ ان کی امامت میں سعادتِ حج سے شرف یاب ہوتے تھے، یہاں تک کہ انہیں امیر المومنین کہہ کر پکارتے تھے، کیا اصحاب رسولؐ کا یہ عمل مسلمانوں کے لیے حجت نہیں؟ کوئی کچھ عقیدہ رکھے لیکن میں احمد بن حنبلؒ ان ہی برگزیدہ ہستیوں کا پیروکار ہوں جس سے خدا راضی ہوا اور جو خدا سے راضی ہوئے؟" یہ کہہ کر آپ نہایت اثر انگیز لہجے میں مفسدوں کی جماعت کو مخاطب کرتے "لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہاری برباد عقل میں یہ نکتہ کیوں نہیں آتا کہ منصبِ خلافت سے علیؓ کی شان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ علیؓ تو وہ تھے کہ جن کی ذات سے خود مسندِ خلافت نے تزئین و آرائش حاصل کی۔

☆☆☆

حضرت امام احمد بن حنبلؒ پر آزمائش کے تین دور گزرے۔ پہلا دور غربت و افلاس کا تھا جس میں بڑے بڑے ثابت قدم اپنا ایمان کھو دیتے ہیں اگر ایمان محفوظ رہے تو لوگوں کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ اوصاف بھی برقرار رہتے تو انسان تارک الدنیا ہو جاتا لیکن حضرت امامؒ نے شادی بھی کی، اولاد کو رزقِ حلال بھی فراہم کیا، علمی کارنامے بھی انجام دیے اور وراثت میں ایسے شاگردوں کی بڑی تعداد چھوڑی جس نے علم و عمل کی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔

دوسرا دور آزمائش کا تھا۔ کسی معرکے میں قتل ہو جانا، زہر کا پیالہ پی لینا، پھانسی پر چڑھ جانا ایک آسان عمل ہے۔ چپک رہا ہے بدن پہ لہو سے پیراہن۔ جس شخص کا مسلسل پانچ سال تک یہ حال رہا ہو، اس کی آزمائش کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ اور پھر جس نے زخم کھا کر کسی کو بددعا نہ دی ہو، اس کے صبر و استقامت کے معیار تک کس کی رسائی ممکن ہے؟ آزادی کے بعد جس پر دنیا کی ہر آسائش کے دروازے کھول دیے گئے ہوں اور انہیں حقارت سے دیکھتا ہوا گزر گیا ہو، اس کی بلندیوں کو انسانی نگاہ کیسے چھو سکے گی؟

تیسرا دور شہرت و عقیدت کا تھا۔ جس کا روشن چہرہ دیکھنے کے لیے انسانی ہجوم اپنے گھروں سے نکل آیا ہو، جس کے نقشِ قدم پر عقیدت مندوں کی بھیڑ اپنا سر رکھ دینا چاہتی ہو۔ جس نے اپنے چاہنے والوں سے چیخ چیخ کر کہا ہو "یہ کھلی گمراہی ہے۔ یہ شیطان کا آخری حربہ ہے، خود کو اور مجھے ہلاکت میں نہ ڈالو" اور پھر جس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اپنے رب کی پناہ مانگی ہو۔ "اے اللہ! مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر۔" اور پھر جس کا سفینۂ حیات اس سیلاب بلا سے بھی بہ عافیت گزر گیا ہو، اس کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

عمر ہا در کعبہ وبت خانہ می نالد حیات
تاز بزم عشق ایک دنائے راز آید بروں

(کعبے اور بت خانے میں زندگی صدیوں تک روتی رہتی ہے پھر کہیں ایک دنائے رازِ عشق کی محفل سے باہر آتا ہے)

حضرت امام احمد بن حنبلؒ آزمائش کے تینوں ادوار سے سلامتی کے ساتھ گزر گئے مگر آپ آخری عمر میں فرمایا کرتے تھے۔"اگر مجھے راستہ ملے تو میں کسی نامعلوم مقام کی طرف بھاگ جاؤں تاکہ میرے ذکر کا سلسلہ ہی بند ہوجائے۔دل چاہتا ہے کہ مکہ کی کسی گھاٹی میں چھپ جاؤں۔یہاں تک کہ مجھے کوئی یاد بھی نہ کرے۔میں شہرت کی آزمائش میں مبتلا کیا گیا۔اس سے بچنے کے لیے صبح وشام موت کی آرزو کرتا رہتا ہوں۔"

بالاخر حضرت امامؒ کی تکمیلِ آرزو کا وقت آ گیا۔سخت ترین جسمانی اذیتوں نے آپ کی صحت کو تباہ کرڈالا تھا۔یہاں تک کہ بسترِ مرگ پر دراز ہوگئے۔بیماری کے دوران آپ فرماتے تھے۔"میں نے خدا سے خوف طلب کیا تو اس نے اتنا خوف عطا کردیا کہ مجھے اپنی عقل کے زوال کا خطرہ پیدا ہوگیا پھر میں نے اپنے خالق سے پوچھا کہ تیری قربت کس طرح حاصل کروں؟ جواب میں مجھ سے کہا گیا کہ تجھے میرا قرب قرآن سے حاصل ہوگا۔" کسی شاگرد نے آپ سے سوال کیا کہ زہد کیا ہے؟ حضرت امام نے فرمایا۔"عوام کا زہد حرام اشیا کو ترک کردینا ہے اور عارفین کے زہد کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

مرض تیزی سے بڑھتا جارہا تھا۔حضرت امامؒ نے خاموشی اختیار کرلی مگر جب بھی آپ کے ہونٹوں کو جنبش ہوتی تو ایک ہی دعا نکلتی۔"اے اللہ! ہر شے تیرے قبضہ قدرت میں ہے،تو ہر شے پر قادر ہے اور مجھ سے مت پوچھ کہ کیا طلب کرتا ہے؟"

آفتاب کی روشنی زرد ہوتی جارہی تھی۔جسمِ مبارک پر زخموں کے گہرے نشانات دیکھ کر کسی غم خوار نے پوچھا"جن فتنہ پردازوں نے آپ کو اس قدر اذیتیں پہنچائی تھیں،ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

حضرت امامؒ نے فرمایا"ان لوگوں نے اپنے خیال کے مطابق مجھے گمراہ سمجھا تھا اور تمام تکلیفیں خدا کی راہ میں دی تھیں اس لیے قیامت میں ان سے کوئی مواخذہ نہیں کروں گا۔" یہ کیسی قوتِ برداشت تھی؟ اہلِ خانہ شدتِ غم سے نڈھال ہوگئے۔شاگرد اتنا روئے کہ دامن بھیگ گئے۔پورا بغداد سوگوار تھا مگر اس



مردِ جلیل کے ماتھے پر شکن تک نہیں تھی۔

خلیفہ متوکل نے دروازے پر پہرا لگادیا تھا اور بڑی تعداد میں ایسے لوگ متعین کردیے تھے جو ایک ایک لمحے کی خبر دیتے رہے۔عیادت کے لیے آنے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ بازاروں کے راستے بند ہوگئے تھے۔جمعرات کے دن طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔بار بار غشی طاری ہوجاتی لیکن حالتِ نزع میں بھی آپ اپنے زخمی ہاتھ سے اشارے کرتے ہوئے فرماتے تھے۔"ابھی نہیں۔" ایک بار پھر کچھ لمحوں کے لیے ہوش آیا تو صاحب زادے نے طبیعت پوچھی۔آپ نے فرمایا"جواب کا وقت نہیں،دعا کرو کہ دنیا سے ایمان وسلامتی سے جاؤں۔شیطان کہہ رہا ہے کہ احمد بن حنبلؒ میرے ہاتھ سے بچ گیا۔میں کہہ رہا ہوں،ابھی نہیں،ابھی نہیں۔جب تک یہ نفسِ امارہ موجود ہے،خطرہ باقی ہے؟" یہ کہتے کہتے روح پرواز کرگئی۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کو آخری غسل دینے کے لیے لکڑی کے تختے پر لٹایا جاچکا تھا۔جب آپ کے جسم مبارک سے پیرہن علیحدہ کیا گیا تو غسل دینے والے بزرگ چونک پڑے۔کچھ دیر کے لیے انہیں اپنی بینائی پر شک ہوا مگر وہ ایک ایسی زندہ حقیقت تھی جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔ایک دوسرے مسلک کے ماننے والے بھی جنازے کے قریب موجود تھے۔ہر طرف ایک شور سا مچ گیا۔بہت سے لوگوں نے دیکھا،حضرت امام کے دائیں بازو پر بندھا ہوا تعویذ صاف نظر آرہا تھا۔یہ بڑی عجیب بات تھی کہ جس شخص نے تمام عمر بدعت کے خلاف جنگ کی تھی،آج وہ اپنے جسم پر بدعت کا ایک واضح نشان چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہورہا تھا۔حضرت امامؒ کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کے چہرے اتر گئے۔حاضرین سرگوشیاں کررہے تھے۔

"احمد بن حنبلؒ کے قول وفعل میں تضاد کیوں تھا؟ عاملِ سنت کو تعویذ کی کیا ضرورت تھی؟" بس یہی ایک سوال تھا۔جس کی بازگشت ہر طرف سنائی دے رہی تھی۔مخالفین اس خبر کو عام کردینا چاہتے تھے مگر اہلِ دل نے انہیں روکا کہ یہ اختلافات کے مظاہرے کا وقت نہیں تھا۔خود حضرت امامؒ کے صاحب زادے بھی بے قرار تھے اور چاہتے تھے کہ تعویذ اسی وقت کھول کر دیکھ لیا جائے لیکن کچھ بزرگوں کے نزدیک یہ جان گداز ساعتیں اس کام کے لیے مناسب نہیں تھیں۔بالاخر طے پایا کہ حضرت امامؒ کی تدفین کے بعد اس تعویذ کو کھولا جائے جسے بدعت کی روشن علامت قرار دیا جارہا تھا۔

☆☆☆

کسی نے لوگوں کے کانوں میں کہا ''تمہارا محبوب دنیا سے رخصت ہو گیا۔'' خبر فضا میں منتشر ہوئی اور ایسا لگا جیسے کچھ دیر کے لیے کائنات تھم گئی ہو پھر لوگوں کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ دریاؤں کے بند ٹوٹے تو سیلاب آ گیا۔ ایسی گریہ وزاری تھی کہ پورا بغداد ماتم کدہ بن گیا۔ مرنے والے نے اپنی زندگی میں لوگوں کے آنسوؤں پر پابندی لگا دی تھی مگر انہیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔ مامون سے معتصم اور معتصم سے واثق۔ عقیدت مندوں کی آنکھوں میں تمام جابروں کے زمانے گھوم گئے۔ امامؒ کی ایک ایک مصیبت کا ذکر کیا گیا پھر انسانی ہجوم نے چیخ کر کہا ''تیرے پاک جسم کو مشقِ ستم بنانے والے کہاں گئے؟ زیرِ زمین حشرات الارض ان کی ہڈیوں میں سوراخ کر رہے ہوں گے۔ لحد ان کے تنِ بوسیدہ کو فشار دے رہی ہو گی۔ ان کے مقبرے ابابیلوں کے مسکن ہیں۔ کوئی فاتحہ خواں نہیں، کوئی چراغ روشن نہیں۔ آج ان لوگوں پر کیا عالمِ تنہائی ہے اور وہ جو ستایا گیا، اس کے کتنے نام لیوا ہیں، اے جابرانِ وقت انسانی سروں کا شمار کرو۔ یہ معرفت کے شہنشاہ کا جنازہ ہے۔ سوگواروں کی تعداد دیکھو۔ اقلیم دل کا فرمانبروا اس طرح رخصت ہوتا ہے۔''

خلیفہ متوکل حیران و پریشان کھڑا انسانوں کے گزرتے ہوئے سیلاب کو دیکھ رہا تھا۔ ہر شے اپنے محور سے ہٹ گئی تھی اور کاروبارِ حیات معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ امامؒ سے اسے بھی عقیدت تھی۔ وہ بھی اداس تھا۔ بھیگی آنکھوں سے چپ چاپ دیکھتا رہا۔ فرمانِ شاہی کی آج کوئی حقیقت نہیں تھی۔ دلوں کا حکمراں اپنے سفر پر اس طرح جا رہا تھا کہ لوگ اس کی میت کو کاندھا دینے کے لیے وقت کے بنائے ہوئے سارے اصولوں کو پامال کر دینا چاہتے تھے۔ انتشار سے بچانے کے لیے پورے شہر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا تھا مگر بے قرار جذبے آج کسی قانون کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ احمد بن ابی داؤد لوگوں کے خوف سے منہ چھپائے پھر رہا تھا۔ معتزلہ اپنی موت سے پہلے مر چکے تھے۔ آج دربارِ خلافت ویران پڑا تھا۔ چند بھکاریوں کو چھوڑ کر سارے حاشیہ بردار چلے گئے تھے۔ محلاتِ شاہی کے بام و در سے ایک نامعلوم آواز ابھر رہی تھی۔

''شہنشاہ تو وہ ہے جسے قبر میں اتارا جا رہا ہے۔''

اور پھر نور کے مجسمے کو حصار میں رکھ دیا گیا۔

☆☆☆

پورا بغداد ایک قبرستان بن گیا تھا۔ سننے والے کان پتھروں کی سسکیاں سن رہے تھے اور دیکھنے والی



پورا بغداد ایک قبرستان بن گیا تھا۔ سننے والے کان پتھروں کی سسکیاں سن رہے تھے اور دیکھنے والی آنکھیں پرندوں کو اداس دیکھ رہی تھیں مگر یہ کیسی بے حسی تھی کہ کچھ انسانوں کے چہروں پر عکسِ ملال نہیں تھا۔ وہ تو بس یہی چاہتے تھے کہ جانے والے پر کوئی الزام ثابت ہو جائے۔ ان کی تو بس یہی خواہش تھی کہ کسی طرح اہلِ دنیا کو احمد بن حنبلؒ کے کفن پر ایک داغ نظر آ جائے۔ حضرت امامؒ کا ''یوم وصال'' مخالفین کے لیے ''یوم نجات'' تھا۔ آج انہیں اس اذیت ناک کرب سے نجات ملنے والی تھی جس میں وہ برسوں سے مبتلا تھے۔ امام کے بازو پر تعویذ کی موجودگی نے انہیں یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ احمد بن حنبلؒ کو ''بدعتی'' کہہ کر پکار سکیں۔

آخر وہ ساعت سنگین آ پہنچی۔ بڑا عجیب لمحہ تھا۔ ایک طرف حاسدوں کے ناآسودہ جذبے تسکین پانے والے تھے اور دوسری جانب عقیدت مندوں کی متاعِ حیات لٹنے والی تھی۔ امامؒ کے فرزند عبداللہؒ اور صالحؒ خاموش تھے مگر دل پر ایک ایسا بارِ گراں تھا کہ جس کے اظہار کے لیے الفاظ کے تمام ذخیرے ناکافی تھے۔

اکابرینِ وقت کی نگرانی میں تعویذ کھولا گیا۔ احمد بن حنبلؒ کے نام لیواؤں کے سانس رکنے لگیں۔ بدگمانوں کے چہرے شاداب ہو گئے۔ سادہ کپڑوں کے اندر سے خوشبو میں بسا ہوا ایک کاغذ برآمد ہوا۔ شکوک و شبہات یقین میں بدل گئے تھے مگر ابھی کاغذ کی ایک تہہ باقی تھی اور اس کے کھلتے ہی احمد بن حنبلؒ ہمیشہ کے لیے بدعتی قرار دیے جانے والے تھے پھر کاغذ کی آخری تہہ کھولی گئی اور اس کے ساتھ ہی نبضِ کائنات تھم گئی۔ احمد بن حنبلؒ کے غلام جوشِ جذبات میں چیخنے لگے ''واللہ! ہمارا امام ایسا ہی تھا۔''

پھر آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا جس میں عقیدتیں اور نفرتیں سب غرق ہو گئیں۔ اپنوں نے تو پہلے ہی دامن بھگو لیے تھے۔ اب دشمن بھی منہ پھیر کر رو رہے تھے۔ معتزلہ کی ہنگامہ آرائیوں کے بعد امامؒ کی ذات پر یہ سب سے بڑا حملہ تھا مگر خدا نے یہاں بھی ان کی دستگیری کی جس تعویذ کا سہارا لے کر مخالفین نے قیامت برپا کرنے کی کوشش کی تھی، وہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک تھے۔ ایک نشانِ امتیاز تھا۔ ایک تمغۂ شجاعت جس کا لمس ہر آزمائش کے وقت احمد بن حنبلؒ کے جسم میں نئی روح پھونکتا تھا۔

لاکھوں سوگوار، قبر کی مٹی اپنے چہروں پر ملنے کے لیے آگے بڑھے مگر متوکل کے سپاہیوں نے انہیں قبر پرستی کی بدعت سے روک دیا۔ تمنائیں سرکش تھیں اور امامؒ کے مرقد پر فوج کا پہرا تھا۔ پھر بھی مشتاقانِ

دید قطار در قطار آتے اور دور ہی سے اس روشنی کو دیکھتے رہتے جو خاک کی قید سے بیکراں فضا میں پھیلتی جا رہی تھی۔

یہ اتفاق ہے کہ قدرت کا کوئی راز کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ ربیع الاول میں پیدا ہوئے اور اسی ماہ مبارک میں انتقال فرمایا۔ بعض تاریخ نویسوں نے آپ کی تاریخ وفات 12 ربیع الاول تحریر کی ہے۔ حدیث کے موضوع پر "مسندِ امام احمد" ایک عظیم و جلیل کتاب ہے۔ جس کے روشن اوراق کو صدیوں کا غبار بھی دھندلا نہ کر سکے گا۔

مغل شہزادے دارالشکوہ نے اپنی مشہور کتاب "سفینۃ الاولیا" میں لکھا ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا جنازہ اٹھا تو بے شمار پرندے آ کر جسم مبارک پر سر ٹپکتے تھے۔ ہزاروں آتش پرست مسلمان ہوئے۔ وہ زنّار توڑ کر پھینکتے جا رہے تھے اور ان کی زبانوں پر بس ایک ہی کلمہ جاری تھا۔ "خدا ایک ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔"

بنا کر دند خوش رسمے، بخون وخاک غلطیدن
خدا رحمت کندایں عاشقان پاک طینت را

(عاشقان پاکباز نے خون وخاک میں نہا کر اچھی رسموں کی بنیاد ڈالی۔ خدا ان پر رحمتیں نازل کرے)

☆☆☆